تاریخ نظریۂ پاکستان

ین : کتب خانہ انجمن حمایتِ اسلام ریلوے روڈ لاہور

تاریخ نظریۂ پاکستان

مؤلفہ

پیام شاہجہان پوری

ناشرین: کتب خانہ انجمن حمایت اسلام، ریلوے روڈ، لاہور

نام کتاب	تاریخ نظریۂ پاکستان
مصنف	پیام شاہجہانپوری
بار اول	ایک ہزار
ضخامت	۴۶۴ صفحات
مطبع	فیروز سنز لمیٹڈ لاہور
طابع	عبد الحمید خاں
زیر اہتمام	مظفر احمد خاں (مینجر کتب خانہ انجمن حمایت اسلام لاہور)
تاریخ طباعت	یکم جولائی ۱۹۷۰ء
ناشر	کتب خانہ انجمن حمایت اسلام لاہور
قیمت	۱۷ روپے

بسمِ اللہِ الرّحمٰنِ الرّحیمِ ط

پیشِ لفظ

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے نام سے جو آزاد اسلامی ریاست معرضِ وجود میں آئی وہ کوئی اچانک یا اتفاقی واقعہ نہ تھا۔ اس کے پیچھے اسباب و علل کا ایک طویل سلسلہ کارفرما تھا۔ یہ واقعات برصغیر میں اسلامی سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی ظہور پذیر ہونے لگے تھے۔ تاریخ اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ برصغیر کے غیر مسلموں نے مسلمانوں کی حکومت کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا اور ہر زمانے میں ان کا ایک نہ ایک گروہ مسلمانوں کو مغلوب کرنے کے لئے ان کے خلاف نبرد آزما ہوتا رہا۔ انہوں نے مسلمانوں کی ریاست میں رہتے ہوئے اس ریاست اور اس کے حکمرانوں کے خلاف ریشہ دوانیاں جاری رکھیں اور جب اور جہاں موقع ملا وہ مسلمانوں کی ایذا رسانی پر کمر بستہ ہو گئے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے ان افسوس ناک افعال کا ارتکاب جہانگیر اور شاہجہاں جیسے عالی ظرف اور روادار بادشاہوں کے عہدِ حکومت میں بھی کیا۔ حالانکہ انہی دو بادشاہوں پر کیا منحصر ہے برصغیر کے ہر مسلمان حاکم نے یہاں کے غیر مسلموں کے ساتھ نہایت عزت و احترام کا سلوک کیا اور انہیں جاگیریں اور خلعت و انعامات دے کر اپنے درباروں میں اعلیٰ سے اعلیٰ مناصب عطا کیے۔ انہیں ہر قسم کی مذہبی آزادی بھی دی۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے انتقال کے بعد جب مغلیہ سلطنت کا شیرازہ منتشر ہونے لگا تو انہیں اپنے عزائم کو عملی جامہ پہنانے کا نہایت اچھا موقع ہاتھ آیا اور انہوں نے مغلیہ سلطنت کو تباہ و برباد کرنے اور مسلمانوں پر ظلم و ستم کرنے میں انسانیت اور شرافت کی ساری حدیں توڑ دیں۔ انہوں نے کھلم کھلا ایسے طریقے اختیار کیے جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہندوستان سے اسلامی سلطنت کا خاتمہ کر کے یہاں ہندو راج قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں مگر جب احمد شاہ ابدالی، نواب نجیب الدولہ، حافظ رحمت خاں اور ہندوستان کے دوسرے حریت پسند حکمرانوں کی متحدہ کوششوں سے پانی پت کے میدان میں غیر مسلموں کو عبرت ناک شکست ہو گئی تو گو اس صدمے سے وہ اس قابل تو نہ رہے کہ تختِ دہلی پر حکومت کرنے کے منصوبے کو عملی جامہ پہناتے لیکن برصغیر کے مسلمانوں پر ظلم و ستم کر کے وہ اپنی مسلم دشمنی کی آگ پھر بھی بجھاتے رہے۔ لیکن جب برصغیر پر انگریزوں نے تسلط قائم کر لیا اور یہاں کے غیر مسلموں کی حکمرانی کی آرزوؤں پر پانی پھر گیا تو انہوں نے مسلم دشمنی کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا۔ انہوں نے انگریزوں سے مل کر مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کا ایک

خوفناک منصوبہ بنایا۔ اس کا پہلا اظہار ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد ہوا جب انہوں نے اس کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی اور خود انگریزوں کے سایۂ عاطفت میں پناہ گزیں ہو گئے۔

یہ واقعات ایسے نہ تھے جن سے مسلمان اکابر غافل رہتے۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے لے کر حضرت سید احمد شہیدؒ اور پھر سر سید احمد خاں تک مختلف مسلمان مفکروں، مصلحین، دانشوروں اور صاحب سیف و قلم اکابر نے غیر مسلموں کے ان خوفناک عزائم سے مسلمانوں کو باخبر کیا اور انہیں منظم کرنے کی کوششیں جاری رکھیں تا آنکہ ۱۹۰۶ء میں قوم کا درد رکھنے والے مسلمانوں نے بنگال کے تاریخی شہر ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سنگ بنیاد رکھا جس نے آگے چل کر دنیا کے نقشے میں ایک نئی اور آزاد اسلامی ریاست کا اضافہ کیا۔ مسلم لیگ کے قیام سے اس آزاد اسلامی ریاست کے معرض وجود میں آنے تک تقریباً نصف صدی کا عرصہ برصغیر کی سیاست خصوصاً مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا نہایت ہنگامہ خیز دور تھا۔ یہ آزاد اسلامی مملکت جس کی آزاد فضا میں ہم زندگی گذار رہے ہیں کن ہولناک مصائب اور کتنی روح فرسا قربانیوں کے بعد معرض وجود میں آئی؟ اس سے وہ لوگ تو باخبر ہیں جنہیں ان مراحل سے گذرنا پڑا۔ لیکن موجودہ نسل جس نے آزاد فضا میں آنکھ کھولی اسے نہ تو ہندوستان کے غیر مسلموں کے مظالم برداشت کرنا پڑے اور نہ غیر ملکی حکمرانوں کے ظلم وستم سے سابقہ پڑا۔ اس لئے اگر وہ اس آزادی کی قدر و قیمت سے ناواقف ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

اس نئی نسل کو صحیح طور پر معلوم ہی نہیں کہ یہ ملک کن قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا ہے اور اس کے اسلاف نے ہندو اور انگریز کے کیسے کیسے چرکے برداشت کئے ہیں۔ آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہم نئی نسل کو پاکستان کی جدوجہد، اس کے مذہبی، سیاسی، تمدنی اور اقتصادی پس منظر سے آگاہ کریں تاکہ ہماری یہ نسل اپنی تاریخ سے پوری طرح باخبر ہو سکے۔

اسی ضرورت کے پیش نظر یہ کتاب تالیف کی گئی ہے اور اسے آریوں کی آمد سے شروع کیا گیا ہے تاکہ ہمارے نوجوانوں کو معلوم ہو سکے کہ ان کے اسلاف کا جس قوم سے سابقہ پڑا تھا وہ کس ذہنیت کی حامل تھی اور اس نے اپنے عہد اقتدار میں ان لوگوں سے کیا سلوک کیا جن کے مذہبی، سیاسی اور تمدنی نظریات اس سے مختلف و متضاد تھے۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ہندوؤں کے اس دعوے کی حقیقت معلوم ہو جائے کہ وہ بھارت کے اصل باشندے ہیں اس لئے صرف انہی کو اس مملکت پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے اس کے بعد برصغیر میں مسلمانوں کی آمد اور ان کی حکمرانی کی داستان قلم بند کی گئی ہے، اس کا مقصد ان غلط دعووں کی تردید کرنا ہے کہ برصغیر میں اسلام تلوار کے زور سے پھیلا اور مسلمان فاتحین نے یہاں کے لوگوں کو جبراً مسلمان بنایا، موجودہ مسلمان انہی فاتحین کی اولاد ہیں اس لئے یہ سب غیر ملکی ہیں انہیں اس ملک پر حکومت کرنے کا

کوئی حق حاصل نہیں۔ اس باب کے مطالعے سے وہ حقائق سامنے آئیں گے جن کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ کی۔ اس کے بعد برصغیر کے مسلمانوں کے انحطاط کی افسوسناک داستان بیان کی گئی ہے اس آئینے میں غیر مسلموں کے چہرے صاف نظر آئیں گے اور ان کے مکروہ عزائم کا اندازہ ہو سکے گا۔ پھر برصغیر میں انگریزوں کی آمد اور ان کی فریب کارانہ سیاست کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اسی عہد میں برصغیر کے مسلمانوں کی عظمت خاک بسر ہوئی اور اسی عہد میں ہندو سیاست نے نیا رنگ اختیار کیا جس نے ملک کے مسلمان مفکرین اور رہنماؤں کو اپنے اندازِ فکر میں تبدیلی پیدا کرنے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد برصغیر میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی قومی تحریکوں اور دونوں قوموں کی سیاسی کشمکش کی روداد بیان کی گئی ہے۔ یہیں سے برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ ایک نیا موڑ مڑتی ہے اور انہیں اپنے لئے ایک جداگانہ وطن کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس وطن کے حصول کے لئے انہیں کن کن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے اور بیگانوں ہی سے نہیں اپنوں سے بھی نبرد آزمائی کرنی پڑتی ہے۔ یہ داستان تلخ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ اس کے بعد وہ مرحلہ آتا ہے جب برصغیر کے مسلمانوں کا کاروانِ حریت خون میں نہا کر منزلِ مقصود سے ہمکنار ہوتا ہے۔

ممکن ہے بعض لوگ اس کتاب کے ابتدائی ابواب کی تفصیل کو غیر ضروری خیال کریں لیکن اہلِ نظر حضرات راقم الحروف کے اس خیال سے اتفاق کریں گے کہ نظریۂ پاکستان کی جو تاریخ اس پس منظر کو نظر انداز کر کے لکھی جائے گی وہ نامکمل ہو گی۔ یہ پس منظر جتنا واضح ہو گا اسی قدر قیام پاکستان کی تاریخ نکھر کر سامنے آئے گی۔

تاریخ نویس کا فرض نہایت ناخوشگوار ہوتا ہے خصوصاً اس تاریخ نویس کے لئے تو بیحد مشکلات ہوتی ہیں جو اپنے عہد کی تاریخ قلم بند کرتا ہے کیونکہ اس عہد کے بہت سے لوگ بقیدِ حیات ہوتے ہیں اور جب ان کے اعمال و اقوال کا ناقدانہ محاسبہ کیا جاتا ہے تو وہ اس محاسبے کی تاب نہ لا کر سیخ پا ہو جاتے ہیں۔ ایسے عالی ظرف اور شریف النفس لوگ کم ہوتے ہیں جو اپنے اعمال و اقوال کو نقد و نظر کی میزانِ عدل میں تلتا دیکھ کر قوتِ برداشت سے کام لیں اور تاریخ نویس کو اگر اس کی صاف گوئی اور حقیقت نگاری پر خراجِ تحسین ادا نہ کریں تو سکوت ہی اختیار کر لیں۔

بہر حال تاریخ کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے میرا یہ فرض تھا کہ میں مصلحتوں یا خطرات کی پرواہ کئے بغیر واقعات کو اصل صورت میں پیش کر دیتا۔ سو میں اپنے اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھ عاجز و ناتواں کو یہ توفیق عطا فرمائی۔

میں نے پوری کوشش کی ہے کہ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ جامع، معلومات افزا اور صحیح و مستند

واقعات کا مرقع بناؤں۔ اس مقصد کے لئے میں نے وہ تمام وسائل اختیار کئے جو میری دسترس میں تھے۔ ہفتوں نہیں مہینوں لائبریریوں میں وقت گذارا، کام کی چیز جہاں سے ملی میں نے حاصل کر لی۔ تحریک پاکستان کے بزرگ رہنماؤں سے ملا، نوجوان کارکنوں سے ملاقات کی، بعض حضرات سے خط و کتابت کی۔ بعض مسودات اور تحریروں کی دوسرے شہروں سے نقول منگوائیں۔ کتابوں کے علاوہ اخباروں میں شائع ہونے والے ان مضامین سے بھی استفادہ کیا جن کے مصنفوں نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا یا بعض مناظر بچشم خود دیکھے۔ اس مرحلہ پر میں شکریہ ادا کرتا ہوں پنجاب پبلک لائبریری کے شعبۂ مشرقیات کے سربراہ چوہدری محمد حنیف صاحب شاہد کا جنہوں نے پوری لائبریری میرے سپرد کر دی۔ اسی طرح اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے لائبریرین بشیر احمد صاحب اور محترم شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے اس موضوع سے متعلق بعض نہایت قیمتی اور کمیاب کتابیں مجھے عنایت فرمائیں۔

آخر میں میرا خوشگوار فرض ہے کہ میں اپنے مخدوم میاں امیر الدین صاحب (صدر انجمن حمایت اسلام) شیخ محمد لطیف صاحب (نائب صدر انجمن حمایت اسلام) خان ذوالفقار علی خاں صاحب (آنریری جنرل سیکرٹری انجمن حمایت اسلام) اور محترم خواجہ ضیاء الدین صاحب (آنریری سیکرٹری نشر و تالیفات کمیٹی انجمن حمایت اسلام) کا رسمی نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کروں جن کی توجہ اور عنایت سے یہ کتاب طبع ہو کر منظر عام پر آ رہی ہے۔

طباعت و اشاعت سے قبل اس کا مسودہ انجمن حمایت اسلام کی نشر و تالیفات کمیٹی کے چیئرمین لفٹیننٹ کرنل شہباز خاں صاحب کے سپرد کیا گیا تاکہ وہ اس کا مطالعہ فرما کر رائے دیں کہ انجمن کا کتب خانہ اسے شائع کرے یا نہ کرے؟ کرنل صاحب موصوف خود بھی اہل علم شخصیت ہیں اور تاریخ و سیاست پر ان کے مضامین قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ انہوں نے اس کتاب کے مسودے کا مطالعہ کیا اور مجھے نہایت قیمتی مشورے دیئے۔ ان مشوروں کی روشنی میں میں نے اس کتاب پر نظر ثانی کی۔ بلاشبہ وہ میرے اور اس کتاب کے ہر قاری کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

اس تمہید کے بعد میں اپنی یہ ناچیز تالیف جو میری سالہا سال کی محنت شاقہ کا نچوڑ ہے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور اپنے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اسے قبولیت عام عطا فرمائے اور اس کے مطالعے سے وہ مقاصد حاصل ہو جائیں جن کے لئے میں نے اس وادیٔ خارزار کا سفر اختیار کیا۔

۲۴ جون ۱۹۷۰ء

رئیس احمد جعفری (؟) — بہادر شاہ جہاں پوری

چاہ میراں گیلانی اسٹریٹ ۶۲ لاہور

فہرست عنوانات

برصغیر میں احیائے اسلام کی کوششیں

سرسید کی تحریک

کانگرس کا قیام

آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام

قائداعظم مطلع سیاست پر

برصغیر کی سیاست کا ہنگامہ خیز دور

شدھی سنگھٹن اور سائمن کمیشن

نہرو رپورٹ

گول میز کانفرنس

انڈیا ایکٹ

مسلم لیگ کی تنظیم نو

دو قومی نظریہ

نظریۂ پاکستان کی تاریخ

کانگرسی وزارتوں کی سیاہ کاریاں

قرارداد لاہور

نظریہ پاکستان پر یورش

دوسری جنگ عظیم اور مسلم لیگ

نظریہ پاکستان کے خلاف سازش

تحریک پاکستان

قیام پاکستان

پیامؔ شاہجہان پوری

برِ صغیر میں آریوں کی آمد

غیر منقسم ہندوستان کی تاریخِ قدیم کا سب سے اہم واقعہ آریوں کا اِس ملک میں ورود ہے۔ یہ واقعہ ۱۵۰۰ قبل مسیح کا ہے اور در اصل اسی زمانے سے برصغیر کی تاریخ کا آغاز ہونا چاہیئے۔ گو آریوں سے قبل دراوڑ، گکھڑ، بھوڑ، سنتھال، کول، بھیل، گونڈ، ٹوڈا، سک، کشان، ہن اور تبتی برمن تامی قومیں بھی باہر ہی سے آکر یہاں آباد ہوئی تھیں مگر ان میں سے دراوڑوں کے علاوہ جو تہذیب و تمدن اور شائستگی کے لحاظ سے آریوں سے کسی طرح کمتر نہ تھے باقی اقوام نے اس ملک پر کوئی قابلِ ذکر کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ دراوڑوں کے بعد آریہ سب سے بڑی قوم تھی جو اس برصغیر میں داخل ہوئی۔ اس قوم کا اصل وطن وسط ایشیا تھا وہاں سے یہ لوگ پہلے ایران آئے اور ایران سے ان کے کچھ قافلے مغربی دروں کے راستے برصغیر میں داخل ہوئے۔ یہاں اس امر کی صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ آریوں کا برصغیر میں داخلہ یکبارگی نہیں ہوا بلکہ ان کے قافلے سیکڑوں سال تک تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد یہاں آتے اور اس ملک کے مختلف علاقوں میں آباد ہوتے رہے۔

یہ تاریخ کی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ آریہ اس ملک کے باشندے نہ تھے، مگر جب برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے لئے ایک آزاد و خود مختار مملکت کا مطالبہ کیا اور ہندو قوم پرستی نے ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کی تو بعض ہندو مفکرین نے تاریخ کی اس اٹل حقیقت کو جھٹلاتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ آریہ در اصل اسی ملک کے باشندے ہیں اور یہیں سے نکل کر انہوں نے ایران اور یورپ کا رُخ کیا اور ان خطوں کو اپنا وطن بنا لیا۔[1] یہ دعویٰ پنڈت ہری اودھ نے پیش کیا۔ مشہور آریہ سماجی رہنما پنڈت دیا نند سرسوتی اس نظریے کے سب سے بڑے مبلّغ تھے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس نظریے کی تہہ میں کوئی تاریخی تحقیق نہیں بلکہ خالص مذہبی اور سیاسی اغراض پوشیدہ تھیں اور یہ مسلمانوں کے اس مطالبے کو رد کرنے کے لئے اختراع کیا گیا تھا کہ مسلمان اس ملک کے باشندے ہیں وہ ساڑھے تیرہ سو سال سے اس ملک میں آباد ہیں یہ ان کا وطن

---

[1] ہندی بھاشا اور ساہتیہ کا وکاس صد ۱۳ پنڈت ہری اودھ

ہے اس لئے انہیں ملک کا ایک حصہ جس میں ان کی اکثریت ہو، آزاد وطن کی حیثیت سے دیا جائے تاکہ وہ اس میں ہندو تسلط سے آزاد ہو کر اپنی قومی و مذہبی روایات کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ مسلمانوں کے اس مطالبے پر ہندوؤں نے یہ موقف اختیار کیا کہ مسلمانوں کا اصل وطن ہندوستان ہے ہی نہیں۔ یہ تو بدیسی لوگ ہیں جو عرب، ترکی، ایران اور افغانستان وغیرہ سے آکر یہاں آباد ہو گئے تھے اس لئے انہیں اس ملک کے کسی حصے پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اس کے جواب میں مسلمانوں کی طرف سے یہ دلیل پیش کی گئی کہ اگر ہم یہاں کے باشندے نہیں تو آریہ بھی بدیسی ہیں اور وسط ایشیا سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے۔ مسلمانوں کے اس جوابی حملے سے بچنے کے لئے ہندو مفکروں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ آریوں کا اصل وطن وسط ایشیا نہیں بلکہ وہ ہمیشہ سے اس ملک میں رہتے چلے آتے ہیں حالانکہ یہ دعویٰ کسی لحاظ سے درست نہیں۔ یہاں کے قدیم باشندوں کے خدو خال، رنگ روپ اور قدو قامت کا اگر آریوں کے خدو خال، رنگ روپ اور قدو قامت سے موازنہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب مختلف قومیں ہیں اور آریوں کا نسلی اور وطنی کسی لحاظ سے ان قوموں سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح آریوں کی زبان اور تہذیب و تمدن بھی برصغیر کی قدیم اقوام سے قطعی مختلف ہے۔ اس کے علاوہ آریوں کی مذہبی کتابوں سے داخلی شہادتیں اس دعوے کے حق میں پیش کی جا سکتی ہیں کہ آریہ باہر سے آکر اس ملک میں آباد ہوئے تھے۔ چنانچہ آریوں کی مذہبی کتاب "رگ وید" میں یہاں کے دیسی قبائل کے ساتھ ان کی لگاتار لڑائیوں سے متعلق جو اشارے ملتے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آریہ قبائل شمالی مغربی ہندوستان کے راستے داخل ہوئے اور لڑتے بھڑتے اور علاقے فتح کرتے ہوئے ہندوستان کے میدانوں میں پھیل گئے۔[1]

ہندوستانی زبانوں کا سب سے بڑا ماہر گریرسن بھی اسی خیال کی تائید کرتا ہے کہ آریہ باہر سے آکر اس ملک میں آباد ہوئے تھے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "رگ وید کے ابتدائی منتر اس وقت لکھے گئے تھے جب آریہ اس ملک میں داخل نہیں ہوئے تھے۔"[2]

آریوں کا اصل وطن اور مغربی محققین

انگلستان کے مشہور محقق مسٹر ونسنٹ اے اسمتھ بھی اپنی کتاب قدیم تاریخ ہند میں آریوں کو ہندی نہیں بلکہ بدیسی قوم قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قدیم ہندوستان میں جو شائستہ قومیں آباد

---

[1] تاریخ زبان اردو صد ۱۶ مولفہ ڈاکٹر مسعود حسین

[2] ہندوستانی زبانوں پر تبصرہ صد ۷، جلد اول مولفہ گریرسن

تھیں وہ شمال مغربی دروں کے راستے اس ملک میں داخل ہوئیں۔ ان باہر سے آنے والی قوموں میں دراوڑ بھی تھے اور ایک ایسی قوم بھی جو آریائی زبان بولتی تھی۔ ایک اور انگریز مورخ آنریبل مونٹ اسٹورٹ الفنسٹن جو عرصے تک صوبہ بمبئی کے گورنر رہے اور جنہوں نے ہندوؤں کی تہذیب، تمدن، سیاست، مذہب اور علوم و فنون پر نہایت تحقیق کی ہے آریوں کو بدیسی قوم قرار دیتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ "نو وارد پہنچنے والی قوموں (آریوں) کو بار بار تاکید کی گئی ہے کہ وہ ملک کے اس علاقے میں بود و باش اختیار کریں جو بحرِ مشرقی سے بحرِ مغربی تک کوہ ہمالیہ اور کوہ بندھیاچل کے درمیان واقع ہے۔ اس علاقے میں آباد ہونے کی ہدایت صرف تین بڑی قوموں کے لئے ہے۔ شودر کو اس صورت میں ہر جگہ آباد ہونے کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ معاشی لحاظ سے محتاج ہو۔ ان امور سے لازمی طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ نو وارد پہنچنے والی قومیں (آریہ) فاتح لوگ تھے اور شودر مفتوح جو اس ملک کے اصل باشندے تھے۔"[1]

ہندو مؤرخوں کی آراء

خود ہندو مورخوں نے آریوں کے اصل وطن کے متعلق جو تحقیق کی ہے وہ بھی یہی ہے کہ اس قوم کا اصل وطن ہندوستان نہیں بلکہ وسط ایشیا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر چٹرجی اور پروفیسر شریدھی آریہ قوم کا قدیم وطن جنوبی روس بعد دریائے وانگا کی وادی کو قرار دیتے ہیں۔ ان ہندو مصنفوں میں رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب بھی شامل ہیں جو نہایت فاضل اور غیر متعصب ہندو مصنف تھے اور کوئی وجہ نہیں کہ ان کی رائے اپنے بزرگوں اور اسلاف کے متعلق قابلِ اعتنا نہ سمجھی جائے۔ ان کا بیان ہے کہ "دھرم شاستروں اور پورانوں میں اس طرح سے بیان کیا ہے کہ ہندوؤں کی چاروں ذاتیں حقیقت میں برہما جی کے جسم ہی سے پیدا ہوئیں اور اس باب میں اور بھی بہت سی باتیں لکھی ہیں لیکن ظاہر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اصل میں ہندوستان کے باشندے نہیں ہیں بلکہ کسی زمانے میں پچھم کی طرف سے آئے تھے اور انہوں نے آہستہ آہستہ سارے ملک کو فتح کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ پھر ان لوگوں کو جو پہلے سے اس ملک میں رہتے تھے، اپنا فرمانبردار بنا کر ان کا نام شودر یعنی خدمت گار رکھا۔"[2]

اب آخر میں موجودہ عہد کے مشہور قوم پرست اور کٹر کانگریسی رہنما لالہ لاجپت کی رائے پیش کی جاتی ہے۔ انہوں نے برصغیر کی سیاست میں جو متعصبانہ کردار ادا کیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مگر اس کے باوجود

---

[1] دی ہسٹری آف انڈیا صفحہ ۵۳ مولفہ مونٹ اسٹورٹ الفنسٹن مطبوعہ لندن (۱۹۱۶ء)

[2] رسوم ہند صفحہ ۱ باب اول مولفہ رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب دہلوی۔

وہ بھی یہ حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے کہ آریہ برصغیر کے قدیمی باشندے نہیں بلکہ باہر سے آکر یہاں آباد ہو گئے تھے۔ چنانچہ ان کا بیان ہے کہ "ہندو آریہ ہندوستان میں شمال مغربی دروں سے تاریخی زمانے سے بہت پہلے داخل ہوئے۔ اس وقت کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں دراوڑی نسل اپنی تہذیب کے نصف النہار پر تھی اور آریہ لوگوں نے ان کو جنوب کی طرف دھکیل دیا جہاں اب تک اسی نسل کے لوگ آباد ہیں اور اس تہذیب کے نشانات موجود ہیں[1]۔"

غیر مسلم مورخوں اور محققوں کے ان بیانات کے بعد یہ مسئلہ طے ہو جاتا ہے کہ آریہ اس برصغیر کے باشندے نہیں بلکہ باہر سے آکر یہاں آباد ہو گئے تھے۔ اب ہم آریوں کے اس مذہب اور معاشرت کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں جو وہ اپنے ساتھ لے کر اس ملک میں داخل ہوئے تاکہ قارئین کرام فیصلہ کر سکیں کہ اس مذہب اور معاشرت کی حامل قوم کا مسلمانوں کی تہذیب اور مذہب کے ساتھ کوئی تعلق قائم ہو سکتا ہے؟ اسی سے یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آجائے گی کہ کیا ان دونوں کو ایک قوم قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس مسئلے کا ہمارے موضوع سے نہایت گہرا تعلق ہے۔

ہندوؤں کا تاریخی سرمایہ

لیکن قبل اس سے کہ ہم اس موضوع پر اظہار خیال کریں ایک اور بات جو نہایت عجیب ہے بیان کر دینا بے محل نہ ہوگا اور وہ یہ کہ دنیا کی شاید ہی کوئی متمدن قوم ایسی ہو جس کی تاریخ محفوظ نہ کر لی گئی ہو۔ لیکن آریہ دنیا کی واحد متمدن قوم ہے جس کی تاریخ کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔ اس کمی نے آریوں کی کوئی مضبوط اور جامع تاریخ لکھنا مورخوں کے لئے تقریباً ناممکن بنا دیا ہے سوائے اس کے کہ ان کے ویدوں سے امداد لی جائے یا رامائن اور مہابھارت سے۔ جہاں تک ویدوں کا تعلق ہے یہ مذہبی احکام کا مجموعہ ہیں اور ان میں سے بھی آخری وید خود ہندو عالموں کے نزدیک مشتبہ ہے۔ ان ویدوں سے آریوں کی تاریخ مرتب نہیں ہو سکتی صرف ان سے مذہبی عقائد کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ جہاں تک رامائن اور مہابھارت کا تعلق ہے یہ بہت بعد کی کتابیں ہیں اور یہ بھی محدود زمانے کے تھوڑے سے حالات بتاتی ہیں۔ مغرب کے محقق اور مورخ بھی آریوں کی تاریخ نویسی سے عدم دلچسپی پر حیرت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ مشہور انگریز محقق مسٹر الفنسٹن بھی جنہوں نے آریوں کی تہذیب و تمدن کی تعریف میں صفحے کے صفحے سیاہ کر دیئے یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ "دنیا کی جاہل سے جاہل قوم کے پاس بھی اپنے اسلاف کے حالات و واقعات

---

[1] تاریخ ہند صہ ۲۰ حصہ اول مؤلفہ لالہ لاجپت رائے مطبوعہ مرکنٹائل پریس لاہور

پر مشتمل کوئی نہ کوئی کتاب ضرور موجود ہے مگر یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ ہندو قوم کے پاس اپنی تاریخ یا تاریخ کی قسم کی کوئی کتاب موجود نہیں حالانکہ یہ لوگ تہذیب و تمدن کے اعلیٰ مرتبے پر پہنچ چکے تھے۔ ہندو قوم کے حالات سے متعلق جو مواد اس وقت موجود ہے اس میں جھوٹی کہانیاں اور مبالغہ آمیز واقعات اس طرح ایک دوسرے میں مخلوط ہو گئے ہیں کہ ان کی مدد سے ہندوؤں کی کوئی مسلسل اور صحیح تاریخ مرتب نہیں کی جا سکتی۔ حتیٰ کہ ایک عام تاریخی واقعہ کا تعین بھی سکندر کے حملے سے قبل نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح ہندوستان پر مسلمانوں کے حملے کے وقت تک کے ہندوؤں کے حالات کا کوئی سلسلہ وار بیان قلم بند نہیں ہو سکتا۔"[1]

برعکس اس کے مسلمانوں نے خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں اور کیسے ہی حالات میں رہے ہوں اپنی تاریخ کا ایک ایک واقعہ محفوظ کر لیا۔ یہاں تک کہ عربوں کے اُس زمانے کی تاریخ بھی محفوظ ہے جب ان میں نوشت و خواند کا رواج برائے نام تھا۔ صرف یہی ایک فرق ہندو اور مسلمانوں کی تہذیبی مغائرت ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ اب ہم آریوں کے مذہبی عقائد کی طرف آتے ہیں۔

آریوں کی مذہبی کتب

کسی قوم کے مذہبی عقائد معلوم کرنے کا سب سے معتبر ذریعہ اس کے صحائف سماوی ہوتے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے آریوں کے پاس کوئی ایسی کتاب نہیں جسے آسمانی صحیفہ قرار دیا جا سکے۔ اب تک جتنے ہندو عالموں نے اپنے مذہبی عقائد پر گفتگو کی ہے ان سب نے ویدوں کو بنیاد قرار دیا ہے مگر ویدوں کا معاملہ نہایت درجہ قابلِ رحم ہے۔ ان ویدوں کی تعداد چار بتائی جاتی ہے (۱) رگ وید (۲) سام وید (۳) یجروید (۴) اتھروید۔ ان میں رگ وید سب سے قدیم وید ہے اور اتھروید آخری۔ اس آخری وید کے متعلق بہت سے ہندو عالموں کا خیال ہے کہ یہ جعلی ہے اور قیاسی مصنفین کی جانب منسوب ہے۔[2] ان تین ویدوں کے متعلق بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کن رشیوں یا اوتاروں پر نازل ہوئے۔ بلکہ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ان میں سے ہر وید مختلف لوگوں نے مختلف زمانوں میں تھوڑا تھوڑا کر کے تحریر کیا۔ الفنسٹن صاحب کا خیال ہے کہ "ان ویدوں کی جو صورت آجکل ہے اس کے پیشِ نظر وہ چودہ سو سال قبل مسیح میں جمع کئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔"[3]

---

[1] دی ہسٹری آف انڈیا صد ۱۲ مولفہ الفنسٹن (مطبوعہ لندن)

[2] قدیم ہندوستان کی تہذیب کتاب اوّل باب ۱ مولفہ رامیشور چندر دت

[3] دی ہسٹری آف انڈیا صد ۰ہم مولفہ مسٹر الفنسٹن (مطبوعہ لندن)

پھر ان ویدوں کی اندرونی شہادتیں اس حقیقت کی غماز ہیں کہ ان میں سے بعض وید آریہ عالموں نے ایران کے دورانِ قیام میں مرتب کئے اور پھر جب آریوں کے قافلے برصغیر پاک و ہند میں داخل ہوئے تو بعض حصے یہاں مرتب کئے گئے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ وید کوئی مبسوط آسمانی کتاب نہیں جو کسی ایک رشی یا اوتار پر نازل ہوئی ہو بلکہ یہ مختلف آریہ علما و فضلا کی ذہنی کاوشوں کا مجموعہ ہے جو اس قدر ادق سنسکرت میں لکھی گئی ہے جسے معدودے چند سنسکرت داں برہمنوں کے عام برہمن بھی نہیں سمجھ سکتے۔ ایک نظریہ یہ بھی ہے اور ہمارے خیال میں یہی درست ہے کہ وید کے مضامین عرصے تک لوگوں کے سینوں میں محفوظ رہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے ۴۰۰ سال قبل ویاس جی نامی ایک ہندو عالم نے انہیں لوگوں سے پوچھ پوچھ کر جمع کیا اور پھر اس میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا چلا گیا تا آں کہ ایک دفتر بن گیا۔

یہ ہے آریوں کی مذہبی کتاب کی جمع و ترتیب کا ماجرا۔ اس کے بعد اس امر کی گنجائش کہاں باقی رہ جاتی ہے کہ اس کی تعلیم کی چھان بین کی جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ اس میں اصل کتنا ہے اور وضعی کتنا۔ ایک ستم یہ ہوا کہ جو کسر ویدوں نے چھوڑ دی تھی وہ "پورانوں" نے پوری کر دی۔ ان "پورانوں" کو بھی ہندو مذہب میں مقدس صحیفوں کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی تعداد اٹھارہ ہے اور انہیں بھی ویاس جی سے منسوب کیا جاتا ہے جنہوں نے وید مرتب کئے تھے۔ لیکن بعض ہندو علما کا خیال ہے کہ "پوران" مختلف رشیوں کی تصنیف ہیں مگر البیرونی اپنی شہرہ آفاق تصنیف "کتاب الہند" میں ان رشیوں کو محض فرضی اور جعلی وجود قرار دیتا ہے۔ الفنسٹن صاحب بھی "پورانوں" کو ویاس جی کی تصنیف قرار نہیں دیتے بلکہ ان کا خیال ہے کہ حقیقت میں یہ "پوران" آٹھویں اور سولہویں صدی کے درمیان مختلف مقامات پر تصنیف کئے گئے۔ ان کے مصنف بھی مختلف اور متعدد تھے۔ ان میں بڑا تضاد ہے[1]

آریوں کے مذہبی عقائد

صورتِ حال خواہ کچھ ہو ہم مجبور ہیں کہ آریوں کی تہذیب و معاشرت اور ان کے مذہبی عقائد کی کیفیت معلوم کرنے کے لئے انہیں ویدوں اور پرانوں کی طرف رجوع کریں۔ جب ہم کسی مذہب پر گفتگو کرتے ہیں تو سب سے پہلے خدا کا تصور ہمارے ذہن میں آتا ہے اور طبیعت میں یہ جستجو پیدا ہوتی ہے کہ یہ مذہب خداوند تعالیٰ کے متعلق کیا نظریہ پیش کرتا ہے۔ چنانچہ جب ہم ہندو مذہب کا مطالعہ کرتے ہیں تو

---

[1] دی ہسٹری آف انڈیا صہ ۹۳

اس میں خدا کی ہستی کے متعلق عجیب و غریب اور مضحکہ خیز تعلیم ملتی ہے جو باہم متناقض و متضاد بھی ہے مثلاً خدا اور مادہ ہمیشہ سے موجود تھے اس نے چاہا کہ اپنے مادہ سے دنیا کو پیدا کرے چنانچہ اس نے اپنے ہی مادے سے پہلے پانی پیدا کیا اور پھر اس میں ایک بیج ڈالا۔ اس بیج سے انڈا ظہور میں آیا اور انڈے میں سے خود خدا برہما کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔[1]

خدا کا تصوّر

گویا اس عقیدے کی رو سے خدا اور کائنات ایک ہی مادے سے پیدا ہوئے ہیں اور خدا کی طرح مادہ بھی قدیم ہے روحیں بھی قدیم ہیں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے تو خدا کو اس کی مخلوق پر کوئی برتری باقی نہیں رہتی اور خدا کا کام صرف ایک معمار یا نجار کا رہ جاتا ہے جو مختلف اشیا کو جو پہلے سے موجود ہوتی ہیں جوڑ جاڑ کر نئی صورت دے دیتا ہے۔ اس طرح خدا مادہ کا محتاج ثابت ہوتا ہے کہ اگر مادہ موجود نہ ہوتا تو وہ کائنات کو پیدا کرنے سے قاصر رہتا۔ پھر خدا کا خود انڈا پیدا کرنا اور اس انڈے میں سے خود ہی برہما کی صورت میں ظاہر ہونا ایک ایسا مضحکہ خیز عقیدہ ہے جسے اسلام کے اس خدا سے کوئی نسبت ہی نہیں جس کو قرآن حکیم نے ہر شے کا خالق قرار دیا ہے جو کسی کا محتاج نہیں مگر جس کے سب محتاج ہیں۔ اللہ الصمد

وید کی رو سے انسان کا مقام

خداوند تعالیٰ کے ساتھ اس ہتک آمیز سلوک کے بعد ہندو مذہب نے انسان کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اس کا جواب بھی ہمیں ویدوں سے مل جاتا ہے۔ چنانچہ انسان کا مرتبہ یوں متعین کیا گیا ہے:۔

"اللہ تعالیٰ نے جو اشیا تخلیق کی ہیں ان میں بعض کو انسان پر برتری عطا فرمائی ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ ان کی عبادت کرے۔ ان سے دعا کے ذریعے سلامتی حاصل کی جا سکتی ہے ان چیزوں میں ہوا، پانی، آگ، مٹی کے دیوتا، ستارے اور سیارے بھی شامل ہیں ان کے علاوہ اور صفات اور طاقتیں بھی بیان کی گئی ہیں جنہیں مجسم قرار دیا گیا ہے"[2]

اس تعلیم کی رو سے اس کائنات میں انسان سب سے برتر نہیں ہے بلکہ کچھ اور غیر انسانی مخلوقات بھی اس سے افضل ہیں جن کی اسے عبادت کرنی چاہیئے۔ برعکس اس کے اسلام انسان کو کائنات میں سب سے زیادہ افضل اور اشرف المخلوقات قرار دیتا ہے۔ قرآن کریم میں اسے خداوند تعالیٰ کا نائب کہا گیا ہے اور

---

[1] مجموعہ قوانین منو کتاب اول اشلوک ۵، ۱۳
[2] بیان کتاب وید "تحقیقات حالات ایشیا جلد ۸ صفحہ ۳۷۷ مولفہ مسٹر کالبروک

فرمایا ہے کہ ہم نے اس کائنات کی ہر شے کو انسان کی خدمت پر لگا دیا ہے۔ ویدک تعلیم کی رو سے خداوند تعالیٰ کے علاوہ انسان کے کچھ اور بھی معبود ہیں۔ مگر اس کے برعکس اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ لا الٰہ الا اللہ۔ خداوند تعالیٰ کے سوائے اور کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ آج کی ترقی یافتہ دنیا اور اس روشن ترین زمانے کے لوگوں کے لئے یہ انکشاف انتہائی حیرت انگیز ہوگا کہ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق ان کے معبودوں کی تعداد ۳۳ کروڑ ہے[1] جن میں سے لاکھوں ان روحوں اور فرشتوں پر مشتمل ہیں جو آسمانوں پر مقیم ہیں۔ کیا ایک خدا کے ماننے والوں اور ۳۳ کروڑ خداؤں کے ماننے والوں کو ایک قوم قرار دیا جا سکتا ہے؟

انسانیت سے سلوک

طبقاتی منافرت دنیا کی ہر قوم میں پائی جاتی ہے۔ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر و افضل سمجھنا انسانی فطرت میں داخل ہے۔ انسانی فطرت میں جو خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں انہی کو دور کرنے کے لئے انبیاء مبعوث ہوتے ہیں اور ایسی تعلیم پیش کرتے ہیں جس سے انسانوں میں اخوت و مساوات پیدا ہو۔ نفرت کی جگہ محبت حاصل کرے۔ تکبر کی جگہ عاجزی اور فروتنی پیدا ہو جائے۔ مگر دنیا میں ایک مذہب ایسا بھی ہے جو اپنی اتباع کرنے والوں کو تعلیم ہی نفرت و حقارت کی دیتا ہے۔ یہ ہے آریوں کا مذہب۔ اس کی کیفیت ایک ہندو مصنف یوں بیان کرتا ہے :-

"ہندوؤں کی سب سے پرانی کتاب رگ وید میں لکھا ہے کہ برہمن لوگ پرماتما جی کا منہ، چھتری ان کے بازو اور ویش ان کی رانیں اور شودر ان کے پاؤں سے نکلے ہیں"[2]

اس ہندو مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس سے صرف اتنا ہی ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوؤں کی مذہبی کتاب ان کو مختلف طبقوں میں تقسیم کرتی ہے جن میں سے ایک طبقہ سب سے زیادہ معزز اور ایک طبقہ پیر کی جوتی کی طرح سب سے زیادہ ذلیل ہے۔ لیکن جب وید کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو اس سے کہیں زیادہ عبرت ناک انکشافات ہوتے ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو مذہب ابتدا میں کتنا ہی حقانی مذہب ہو مگر بعد میں اس کی تعلیم کو بری طرح مسخ کر دیا گیا اور مسخ کرنے کا یہ فریضہ خود اس کے عالموں نے سرانجام دیا جنہیں برہمن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ویدک تعلیم کے مطابق ساری عزت و عظمت برہمنوں کو دی گئی ہے اور باقی ساری قوم ان کی خدمت گزار اور ان سے کمتر ہے۔ اب ذیل میں وید سے

---

[1] ہندوؤں کے دیوتاؤں کی تحقیق صہ ۲۵۷ مولفہ مسٹر کینیڈی

[2] رسوم ہند باب اول صہ۱ مولفہ رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب دہلوی

چند حوالے درج کئے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہو جائے گا کہ اس مذہب میں خود اس کے ماننے والوں کو کس طرح حقیر و ذلیل کیا گیا اور انسانوں کو کس طرح مختلف طبقوں میں تقسیم کر کے ان کی تذلیل کی گئی۔

برہمن کی برتری

"برہمن تمام مخلوقات میں سب سے بلند مرتبہ اور افضل ہے اور اس کائنات میں جو کچھ پیدا کیا گیا ہے وہ سب اس کی ملکیت ہے۔ اس ساری کائنات کو صرف برہمن کے لئے پیدا کیا گیا ہے کہ اگر وہ نہ ہوتا تو یہ کائنات بھی موجود نہ ہوتی[1]۔ اگر برہمن چاہے تو اپنے منتروں کے ذریعے راجہ، اس کی فوج، ہاتھیوں اور گھوڑوں کو تباہ کر سکتا ہے[2]۔ برہمن کو یہ طاقت دی گئی ہے کہ وہ اس دنیا کی طرح اور بہت سی دنیائیں، بادشاہ، دیوتا اور انسان تخلیق کر سکتا ہے[3]۔ اگر برہمن دوسری ذاتوں پر ظلم کرے تو اسے صرف معمولی تنبیہہ کی جا سکتی ہے مگر دوسری ذاتوں کے لوگ اگر برہمن پر ظلم کریں تو کس کس گنی سزا پائیں گے[4]۔"

برہمن کی اس عزت و عظمت اور آسمانی بلندی بلکہ خدائی صفات کے بعد اب شودر کا مرتبہ ملاحظہ فرمائیے جو ویدنے اس کے لئے متعین کیا ہے۔ ملحوظ خاطر رہے کہ سنسکرت میں شودر کے معنی ہیں ذلیل شخص۔

شودر کی پستی

شودر کا سب سے بڑا کام برہمن کی خدمت کرنا ہے[5]۔ شودر کو وید پڑھنے کی اجازت نہیں[6]۔ برہمن کو جائز نہیں کہ وہ شودر کو دینی مسائل سکھائے۔ نہ اسے کفارہ کا طریقہ سکھائے۔ ورنہ اسے اسم وریا نامی جہنم میں ڈالا جائے گا۔ دنیوی امور میں بھی برہمن کو اجازت نہیں کہ وہ شودر کو نصیحت کرے[7]۔ شودر کو چاہیئے کہ وہ اپنے مخدوم کا بچا ہوا کھانا کھائے اور اس کے اترے ہوئے کپڑے پہنے[8]۔ شودر میں اگر دولت جمع کرنے کی صلاحیت موجود ہو تو بھی اسے

---

[1] منو باب ۱ اشلوک ۹۶، ۱۰۰، ۱۰۱ [2] باب ۹ اشلوک ۳۱۳ [3] باب ۹ اشلوک ۳۱۵ [4] باب ۸ اشلوک ۲۷۲، ۲۸۳، ۳۲۵، ۳۷۷ و باب ۱۱ اشلوک ۲۰۵، ۲۰۶ [5] باب ۹ اشلوک ۳۴۴ [6] باب ۱۰ اشلوک ۱۲۷، ۱۲۸

[7] باب ۴ اشلوک ۸۰، ۸۱

[8] باب ۱۰ اشلوک ۱۲۵

اس کی اجازت نہیں کیونکہ وہ مالدار ہو کر وہ برہمن کی ایذا رسانی کا موجب ہو سکتا ہے[۱]
اگر شودر کسی اونچی ذات والے کو گالی دے تو اس کی زبان کاٹ دی جائے[۲]۔ شودر کو
اجازت نہیں کہ وہ برہمن کے ساتھ فرش پر بیٹھے۔ اگر وہ اس جرم کا مرتکب ہو تو اس کے
سرینوں کا گوشت کاٹ دیا جائے[۳]۔ شودر کے کان میں اگر دین دھرم کی باتیں پڑ جائیں
تو اس کے منہ اور کانوں میں کھولتا ہوا تیل ڈال دیا جائے[۴]۔"

گویا کوئی ظلم ایسا نہیں، کوئی ناانصافی ایسی نہیں اور کوئی ذلت و رسوائی ایسی نہیں جو غریب شودر کے لئے روا نہ رکھی گئی ہو۔ برعکس اس کے اسلام کسی انسان کو ذلیل قرار نہیں دیتا نہ کسی قسم کا طبقاتی امتیاز جائز رکھتا ہے۔ یہاں پنڈت پروہت کی طرح کوئی برتر طبقہ نہیں۔ مولوی، ملاں یا سید کو دوسرے مسلمانوں پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ قرآن حکیم نے یہ اعلان فرما کر کہ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم تم میں سب سے معزز و مکرم وہ ہے جس کے اعمال سب سے اچھے ہیں فتنہ کا سوراخ ہی بند کر دیا۔ یہاں کسی کو خواہ وہ چوہڑا اور چمار ہی کیوں نہ ہو دین سیکھنے بلکہ قرآن چھونے (بشرطیکہ وہ پاک ہو) اور پڑھنے کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ اس کا حکم ہے۔ وہ پاک صاف ہونے کی حالت میں مسجد میں جا کر بادشاہ وقت کے برابر کھڑا ہو سکتا ہے۔ ہندوؤں میں ایک غلام اور خدمت گار کسی معمولی برہمن چھتری یا ویش تک کی بیٹی سے شادی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور اسلام میں ایک زر خرید غلام مسلمانوں کے اس عظیم و جلیل پیغمبرؐ کی بہن سے شادی کرتا ہے جس عظیم و جلیل پیغمبر کی غلامی کی سابق انبیاء بھی آرزو کرتے رہے۔ وید کی رو سے برہمن کو گالی دینے والے شودر کی زبان کاٹ دی جاتی ہے اور شودر پر ظلم کرنے والے برہمن یا اعلیٰ ذات کے دوسرے ہندو کو صرف معمولی سی تنبیہہ کر دی جاتی ہے مگر اسلام میں گورنر مصر کا بیٹا جو حسب نسب کے لحاظ سے نہایت اعلیٰ ہے یعنی قریشی ایک ذمی کو چابک سے مارتا ہے وہ ذمی خلیفۂ وقت کی خدمت میں حاضر ہو کر فریاد کرتا ہے۔ خلیفہ فیصلہ کرتا ہے کہ یہ ذمی اس معزز قریشی کو جو گورنر کا بیٹا ہے اسی کے چابک سے مجمع عام میں مارے۔ اسلام نے مساوات کا جو اصول اور عزت و تکریم کا جو معیار پیش کیا ہے کیا اس سے وید کی تعلیم کو کچھ بھی نسبت ہے؟ کیا اس بعد المشرقین

۱؎ باب ۱۰ اشلوک ۱۲۹ ۲؎ باب ۸ اشلوک ۲۷۰ ۳؎ باب ۸ اشلوک ۲۸۱
۴؎ باب ۸ اشلوک ۲۷۲ (یہ سارے اشلوک مسٹر الفنسٹن کی کتاب دی ہسٹری آف انڈیا سے ماخوذ ہیں۔ اس صفحے کے علاوہ جہاں بھی اشلوک درج کئے گئے ہیں وہ سب اسی کتاب سے اخذ کئے گئے ہیں مؤلف)

کے باوجود ہندو اور مسلمان دونوں کو ایک قوم کہا جا سکتا ہے؟ اور دونوں ایک نظام حکومت میں شریک کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں؟

چانکیہ کا تصورِ سیاست

کسی قوم کا کردار آزمانے کے دو موقعے ہوتے ہیں ایک دسترخوان پہ اور دوسرا بساطِ جنگ پہ۔ ایک بلند کردار قوم دشمنی کرتے وقت بھی اونچے کردار کا مظاہرہ کرتی اور بعض اصولوں کو مدِ نظر رکھتی ہے۔ شریف دشمن کی اصطلاح ایسی ہی اقوام کے متعلق استعمال ہوتی ہے مگر جب ہم آریوں خصوصاً برہمنوں کے کردار کو اس نقطۂ نگاہ سے جانچتے ہیں تو ہمیں اس میں بڑی پستی نظر آتی ہے۔ آریوں کی تاریخ میں چندر گپت موریا بڑا نامور فرماں روا گذرا ہے اور بلاشبہ وہ دنیا کے نہایت مدبر اور اولوالعزم حکمرانوں میں سے تھا۔ اسے جو مشیرِ سلطنت میسر آیا تھا وہ ایک فاضل برہمن چانکیہ تھا۔ چانکیہ کی فراست اور قابلیت کا تاریخ سے کوئی باخبر انسان انکار نہیں کر سکتا۔ اس نے انتظامِ مملکت اور سیاست پہ ایک نہایت معلومات افزا کتاب لکھی تھی مگر اسی کتاب سے برہمنی ذہنیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ سیاست اور دشمنی میں ہر فعل جائز سمجھتے تھے۔ چانکیہ کا نظریہ یہ تھا کہ دو ہمسایہ بادشاہوں میں پائدار اور دیرپا امن کبھی قائم نہیں ہو سکتا اس لئے وہ کہتا ہے :-

"جو بادشاہ زیادہ قوت حاصل کرے اسے چاہیئے کہ ہمسایہ بادشاہ پر حملہ کرنے میں دیر نہ کرے[1] جو بادشاہ دیکھے کہ اس کی طاقت بڑھ رہی ہے اسے چاہیئے کہ کسی جھجک کے بغیر میثاقِ صلح کو توڑ کر دوسرے پر حملہ کر دے[2] جس بادشاہ کی سلطنت فاتح کی حدودِ سلطنت کے قریب واقع ہو وہ فاتح کا دشمن ہوتا ہے[3]۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آریوں اور خصوصاً برہمنوں کے نزدیک سیاست اور جنگ میں کسی پہ اعتماد کرنا درست نہیں اور سیاست اور جنگ میں ایک ہی اصول کارگر ہو سکتا ہے یعنی جب طاقت حاصل ہو اپنے پڑوسی پر حملہ کر دو۔ ان کے نزدیک معاہدات کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ عہد شکنی سیاست کے لئے نہایت ضروری ہے اور چانکیہ آریوں کو اسی اصول کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ دو ہمسایہ بادشاہوں اور سلطنتوں میں باہمی اعتماد کا قائل نہیں بلکہ ان کے تعلقات کو شکوک و شبہات کی نظر سے دیکھتا ہے چنانچہ

---

[1] انڈین انٹی کویری ۱۹۰۹ء صفحہ ۳۰۳

[2]،[3] انڈین انٹی کویری ۱۹۱۰ء صفحہ ۵۹

ہم دیکھتے ہیں کہ ہند و عہد حکومت میں :-

"ہمسایہ سلطنتوں کے تعلقات میں ہمیشہ بدمزگی رہتی تھی۔ طاقتور کا ہر طرف ڈنکا بجتا تھا ایک بادشاہ دوسرے پر ذراسی دیر کے لئے بھی اعتماد نہیں کرتا تھا اگر کسی بادشاہ میں طاقت ہوتی تو دوسرے بادشاہ سے کئے ہوئے عہد و پیمان توڑنے میں قطعاً دیر نہ کرتا سیاست میں شرافت اور اخلاق کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس میدان میں مکر و فریب، دھوکہ بازی اور اپنے حریف کو چھپ کر قتل کر دینا بھی جائز تھا اور اس قسم کے واقعات آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ اس عہد کی تاریخ گواہی دیتی ہے کہ اس اصول کو اختیار کر لیا گیا تھا کہ جو بات عوام کے لئے عیب ہے وہ بادشاہ کے لئے خوبی ہے۔" [۱]

ہمارا خیال ہے کہ ہم نے اس باب میں مغربی مورخین و محققین اور ہند و فاضلوں کے بیانات سے بخوبی ثابت کر دیا ہے کہ آریوں کا ضابطۂ سیاست مکر و فریب اور طاقت کے استعمال پر مبنی تھا عہد شکنی ان کی سیاست کا لازمی جزو تھا۔ ہم نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ آریہ برصغیر کے نہیں بلکہ دراصل وسط ایشیا کے رہنے والے لوگ تھے جو شمال مغربی دروں کے راستے اس ملک میں داخل ہوئے اور رفتہ رفتہ یہاں کی قدیم اقوام کو جن میں سے بعض تہذیب و تمدن اور شجاعت کے لحاظ سے اعلیٰ تھیں، باہم باہم بالآخر مغلوب کر لیا۔ ہم نے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں سے ان کے مذہبی و قومی نظریات پر بھی خاصی تفصیل سے روشنی ڈال دی ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ یہ لوگ خود کو ساری دنیا سے برتر سمجھتے تھے ان کے نزدیک غیر آریہ نہایت رذیل لوگ تھے جو صرف آریوں کی خدمت کرنے کے لئے پیدا کئے گئے تھے۔ آریہ لوگ اس ملک میں سیکڑوں سال حکومت کرتے رہے اور اپنی زبان اور مذہب کو یہاں رائج کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ مگر تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کے لوگوں نے ان کی زبان کو کبھی قبول نہیں کیا ہاں ان کا مذہب ضرور اختیار کر لیا مگر وہ بھی سب نے نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ آریوں کے اصل مذہب میں بہت سی خوبیاں تھیں اور وید کے جو تراجم ہم تک پہنچے ہیں ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے اس مذہب میں بعض بنیادی صداقتیں بھی موجود تھیں۔ مگر جیسا کہ اسلام کے سوائے ہر مذہب کی مقدس کتابوں میں بعد کے لوگوں نے آمیزش کر کے اصل تعلیم کو مسخ کر دیا۔ اسی طرح ویدوں میں بھی برہمنوں نے حسب ضرورت سیاسی اغراض کے تحت ترمیم و تنسیخ اور اضافے کئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ویدوں کا مذہب مضحکہ خیز بن گیا

---

[۱] انڈین انٹی کویری ۱۹۰۹ء صہ ۳۰۷ باب ۷

اور یہاں کے مقامی لوگوں نے محسوس کیا کہ اس مذہب کو اختیار کر لینے کے بعد وہ زندگی کے ہر شعبے میں اپنی انفرادیت کھو بیٹھے ہیں۔ ہندو مت قبول کر لینے کے بعد بھی ان کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ ذات پات کی تقسیم اور مقامی و غیر مقامی کے امتیازات نے یہاں کے قدیم باشندوں کو ایک ایسے جہنم میں ڈال دیا تھا جس سے نکلنے کے لئے وہ بے تاب تھے کہ اسی اثنا میں کوہ ہمالیہ کی ترائی سے محبت و شفقت کا ایک رسیلا نغمہ بلند ہوا۔

بدھ مذہب

یہ آواز مقدس گوتم کی تھی جو ہمالیہ کے دامن میں واقع ایک ریاست کپل وستو[1] کے راجہ کا بیٹا تھا اور ۵۶۳ قبل مسیح میں پیدا ہوا تھا۔ یہ نہایت حسین، نہایت قوی اور بہادر انسان تھا اس کی بیوی کا نام گپا تھا۔ یہ بھی اپنے حسن و جمال میں نہایت درجہ ممتاز تھی۔ گوتم چھتری ذات کا شہزادہ تھا۔ اس کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دنیوی حیثیت سے نہایت پر مسرت زندگی گذار رہا تھا۔ ایک شہزادہ جو بعد میں اپنی ریاست کا بادشاہ ہونے والا تھا، حسن اور جوانی دونوں نعمتوں سے مالامال تھا۔ اس کی شریک حیات بھی حسن و جمال میں نہایت ممتاز تھی۔ وہ صاحب اولاد بھی تھا۔ آخر کیوں ہر چیز سے منہ موڑ کر اور پر مسرت زندگی کو خیر باد کہہ کر جنگلوں میں نکل جاتا ہے؟ اسے کس چیز کی تمنا تھی؟ کس چیز کی کمی تھی؟ جسے حاصل کرنے کی آرزو نے اسے بے چین کیا؟ تاریخ اس کا ایک ہی جواب دیتی ہے کہ اس کے زمانے کے معاشرتی اور مذہبی حالات نہایت ابتر تھے۔ برہمن ملک کی معاشرتی زندگی پر بری طرح حاوی تھے۔ ملک کی سیادت انہی کو حاصل تھی۔ راجہ بھی ان کے سامنے ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ ذات پات کے امتیاز اور چھوت چھات نے معاشرے کی فضا کو بے حد متعفن کر دیا تھا۔ ہر طرف ایک گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ غربا اور نچلے طبقے کے لوگ جانوروں سے بھی بدتر زندگی گذار رہے تھے۔ گوتم جنہیں بدھ یعنی عارف کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، فطرت کی طرف سے ایک حساس دل لے کر آئے تھے۔ اپنے عہد کے حالات، ویدوں کی مسخ شدہ تعلیم، ذات پات کی ظالمانہ تفریق، غربا اور نیچی ذات والوں کی ناگفتہ بہ کیفیت دیکھ کر ان کا دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا اور تاریخ کہتی ہے کہ ایک رات وہ رتھ میں بیٹھ کر دار السلطنت سے نکل گئے اور جنگلوں میں ریاضت اور گیان دھیان میں مصروف ہو گئے۔ آخر ایک روز انہیں خدا تعالیٰ[2] کا عرفان حاصل ہو گیا۔ وہ

---

[1] کپل وستو یوپی کے مشرقی ضلع بستی کی شمالی سمت میں واقع تھا۔ (مؤلف)

[2] بعض مورخوں کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ گوتم بدھ خداوند تعالیٰ کی ہستی کے قائل نہ تھے دراصل بعد میں بدھ مذہب کی تعلیم کو بھی مسخ کر دیا گیا ورنہ ابتدا میں بدھ دھرم خدا اور ایک خدا کی تعلیم دیتا تھا (مؤلف)

جنگلوں سے آبادیوں کی طرف لوٹے اور دنیا کو عرفان و محبت کا ایسا نغمہ سنایا جس نے ایشیا کے بہت بڑے حصے کو متاثر کیا۔ بدھ کی تعلیم ویدوں کی مسخ شدہ تعلیم کے مقابلے میں کہیں زیادہ حقیقت پسندانہ تھی یہ نہایت سیدھی سادی تعلیم تھی جس میں ذات پات کی تفریق کی سخت مخالفت کی گئی تھی۔ برہمنی مذہب میں جن خونیں قربانیوں کا رواج تھا اور جنہوں نے اس مذہب کو بربریت کا مذہب بنا دیا تھا۔ گوتم بدھ نے ان قربانیوں کو بالکل ناجائز قرار دیا۔ انہوں نے ہر انسان بلکہ ہر جاندار سے محبت اور مہربانی کا سلوک کرنے کا حکم دیا۔

اشوک برصغیر کا نہایت عظیم المرتبت اور بیدار مغز فرماں روا گذرا ہے۔ وہ بدھ مذہب کا پیرو اور اس کا عاشق تھا۔ اس نے سلطنت کے مختلف مقامات پر جو فرامین کندہ کرائے تھے ان سے بدھ مذہب کی پاکیزہ تعلیم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے :-

"والدین کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ تمام جانداروں کے ساتھ محبت کا سلوک کرنا چاہیئے۔ سچ بولنا زندگی کا شعار بنانا چاہیئے۔ یہ پاکیزگی کے قانون کی وہ خوبیاں ہیں جن پر عمل کرنا لازم ہے۔ شاگردوں کا فرض ہے کہ وہ استاد کا ادب کریں۔ رشتہ داروں اور قرابت داروں سے حسن سلوک کرنا چاہیئے۔ ان باتوں سے انسان کی عمر دراز ہوتی ہے"[1]

"مزاج پر قابو پانا، صفائی قلب و جذبۂ شکر گذاری پیدا کرنا اور وفاداری پر قائم رہنا ہر شخص کے لئے ممکن ہے اور یہ چیزیں تو اس شخص کے لئے اور بھی زیادہ مفید ہیں جو غربت کی وجہ سے صدقہ و خیرات نہیں دے سکتا"

"انسان کی نگاہ صرف اپنے اچھے اعمال پر رہتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ میں نے فلاں اچھا کام کیا وہ اپنے برے اعمال کی طرف توجہ نہیں کرتا اور کبھی یہ نہیں کہتا کہ مجھ سے فلاں برا فعل بھی سرزد ہوا۔ اس طرح کا اندرونی احتساب بے شک سخت مشکل ہے مگر انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنی حالت کا جائزہ لیتا رہے اور یہ خیال بھی دل میں لائے کہ فلاں فلاں امور کا انجام خراب ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ظلم و ستم، وحشی پن، تکبر اور غیظ و غضب۔ میں اس امر کو ہر وقت مدنظر رکھوں گا کہ کسی کی برائی از روئے بغض و حسد نہ کروں۔ اگر میں ایسا کروں گا تو مجھے دنیا میں بھی فوائد حاصل ہوں گے اور عقبیٰ میں بھی یہ امر میرے لئے مفید ثابت ہوگا"[2]

---

[1] قدیم تاریخ ہند ص۱۸۰ مؤلفہ ونسنٹ اے سمتھ مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن۔ ایڈیشن چہارم۔

[2] بدھسٹ انڈیا ص۲۹۵ و ص۲۹۷ مؤلفہ مسٹر ٹی ڈبلیو رہس ڈیوڈس (مطبوعہ لندن فروری ۱۹۱۷ء)

جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ آریوں خصوصاً برہمنوں نے جن کا اقتدار بدھ مذہب کی مقبولیت کی وجہ سے ختم ہو گیا تھا گوتم بدھ اور ان کی تعلیم کے خلاف ایک منظم تحریک چلائی جس کا ایک بڑا حربہ یہ ثابت کرنا تھا کہ گوتم بدھ خدا کے منکر تھے۔ حالانکہ گوتم ساری عمر خدائے واحد کی پرستش کی تعلیم دیتے رہے۔ اشوک کے مندرجہ بالا فرمان میں بھی عقبیٰ کا ذکر موجود ہے جو یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ گوتم بدھ ایک بالاتر ہستی پر اعتقاد رکھتے تھے جو مرنے کے بعد انسان کو اس کے اعمال کے مطابق عقبیٰ میں جزا سزا دیتی ہے۔ اب ذیل میں خود گوتم بدھ کے بعض اقوال درج کئے جاتے ہیں جن کے مطالعے سے معلوم ہو جائے گا کہ دکھی اور سسکتی ہوئی انسانیت کا یہ نجات دہندہ ایک ایسی ہستی کی طرف بلاتا تھا جو اس کائنات کی خالق ہے اور بدھ کی تعلیم کے مطابق ہر انسان پر اس کی اطاعت لازم ہے۔ وہ کہتا ہے :۔

بدھ کا تصورِ الٰہی

"وہ چیز جس کا نام "حقیقت"[1] ہے سب گہرائیوں سے گہری، آسمان سے بلند، ستاروں سے دور اور برہما سے بہت آگے ازلی و ابدی ہے۔ یہ ایک ایسی طاقت ہے جو نہایت بلند اور ہمہ گیر ہے جو ازل سے اچھائیوں کو پسند کرتی ہے کیونکہ وہ خود اچھائی ہے۔ جو کچھ ہے اس کی ذات سے ہے اور جو کچھ ہے اس کی طرف واپس جائے گا۔ وہی ہے جو ماں کی چھاتیوں میں دودھ عطا کرتی ہے۔ سانپ کے منہ میں زہر پیدا کرتی ہے۔ کبھی بیاباں کو گلستان بنا دیتی ہے اور کبھی گلستان کو بیاباں میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اس کی کچھ صفات سے تو ہم واقف ہیں مگر اس کی لاتعداد صفات ایسی بھی ہیں جن کا ہمیں مطلق علم نہیں۔ وہ ہمیں نظر نہیں آتی مگر اس کے باوجود ہمارے جملہ امور میں ہماری امداد کرتی ہے۔ اگر تم اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مارو گے تو وہ ہستی تمہیں معاف نہیں کرے گی۔ وہ کسی کی طرفداری نہیں کرتی۔ صرف یہ چاہتی ہے کہ ہم اپنے فرائض ادا کرتے رہیں۔ اس کی میزانِ عدل نصب ہے۔ اسے اختیار ہے جب چاہے گی ہمارے اعمال کا وزن کرے گی۔ اس وقت اس حقیقت کا انکشاف ہو گا کہ ہم جو کچھ کرتے رہے غلط تھا۔ اس وقت کوئی ہماری مدد نہیں کرے گا۔ اس (خدا) کا انصاف برقرار ہے کوئی قوت نہیں جو اس سے عظیم ہو۔ محبت اس کا آغاز ہے اور آشتی اس کا انجام۔ اس کی اطاعت ہر ایک پر واجب ہے"[2]

---

[1] "حقیقت" خاص کنایہ ہے جو گوتم بدھ جا بجا خداوند تعالیٰ کی ہستی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔
[2] "دی لائٹ آف ایشیا" مؤلفہ مسٹر ایڈون آرنلڈ (مطبوعہ لندن) ۱۸۸۸ء سے ماخوذ۔

ہم نہیں سمجھتے کہ برصغیر کے قدیم ترین روحانی پیشواؤں میں سے کسی نے اس سے بہتر تعلیم پیش کی ہو اور خداوند تعالیٰ کی ہستی سے اس رنگ میں روشناس کرایا ہو۔ کتنا بڑا ظلم ہے کہ وہ شخصیت جس نے خداوند تعالیٰ کے متعلق ایسا دل کش اور پاکیزہ تصور دیا اور انسانوں کو اس بزرگ و برتر ہستی کی اطاعت و فرماں برداری کی ہدایت کی، اس کے متعلق یہ مشہور کر دیا گیا کہ وہ خدا کے وجود ہی کی منکر تھی جیسا کہ ہم قبل ازیں اشارہ کر چکے ہیں اور آئندہ صفحات میں قدرے تفصیل سے بیان کریں گے کہ یہ برہمنوں کی ایک منظم سازش تھی جو اس معرفتِ الٰہی سے سرشار گوتم کے خلاف کی گئی اور ستم یہ ہوا کہ بعد کے بعض بدھ راہب بھی اس کا شکار ہو گئے۔ اس سازش کے اثرات آج تک موجود ہیں اور عام طور پر اب بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ گوتم بدھ روح اور خدا دونوں کے منکر تھے حالانکہ وہ نہ روح کے منکر تھے نہ خدا کے۔ ہاں روح کے اس نظریہ کے ضرور منکر تھے جسے مسخ شدہ ویدوں میں پیش کیا جا رہا تھا۔

بہر حال بدھ کی تعلیم برصغیر کے متوسط اور ستم رسیدہ طبقوں کے لئے نئی زندگی اور شادمانی کا پیغامبر ثابت ہوئی۔ گوتم بدھ نے اپنے بلند کردار، حسنِ اخلاق اور پاکیزہ تعلیم سے لوگوں کے دل موہ لئے۔ انہوں نے اپنے پیروؤں میں سے مبلغین کے گروہ تیار کئے جنہیں بھکشو کہا جاتا تھا۔ ان بھکشوؤں نے شہر شہر اور قریہ قریہ گھوم پھر کر بدھ کا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔ اس پیغام کی بڑی سرعت سے پذیرائی ہوئی اور گوتم بدھ کے زمانے ہی میں عوام الناس کے علاوہ بہت سے بااثر لوگوں نے بھی بدھ مذہب قبول کر لیا اور پھر یہ مذہب ایک وسیع و عریض اور عظیم الشان سلطنت کا سرکاری مذہب بن گیا جس کی سرحدیں ایک طرف مغرب میں کابل سے شروع ہو کر مشرق میں بنگال تک اور دوسری طرف شمال میں ہمالیہ کی ترائی سے لے کر جنوب میں ساحلِ سمندر تک پہنچی تھیں۔ اشوک اور کنشک دو عظیم المرتبت حکمران بدھ مذہب کے پیرو تھے جنہوں نے اس مذہب کو فروغ دینے میں غیر معمولی سرگرمی دکھائی۔ ان میں سے اشوک نے تو اپنی زندگی کا نصب العین ہی بدھ مذہب کی تبلیغ کو بنا لیا تھا۔ اس نے برصغیر کے علاوہ مصر، یونان، شام اور بہت سے دوسرے ملکوں میں جن سے اس کے سفارتی تعلقات قائم تھے بدھ مذہب کے مبلغ اور واعظ بھیجے جنہوں نے اس مذہب کو پھیلانے کی بھرپور کوشش کی۔ انہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ یہ مذہب ایشیا کے خاصے بڑے حصے میں پھیل گیا۔

بدھوں پر برہمنوں کے مظالم

یہ تاریخ ہند کا بہت بڑا المیہ ہے کہ وہ مذہب جس نے برصغیر کے لوگوں کو جہنم سے نکال کر خوش حالی مساوات، رواداری اور امن و آشتی کی بہشت میں پہنچا دیا تھا ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ مذہب اس

ملک سے نہایت ہی کس مپرسی کے عالم میں نکال دیا گیا۔ یہ داستان بڑی دردناک ہے اور ہندو مذہب کے ماننے والوں خصوصاً برہمنوں کے دامن کا ایک ایسا داغ ہے جس کی سیاہی کبھی دور نہیں ہو سکتی۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ بدھ مذہب اپنی سادہ اور پاکیزہ تعلیم کی وجہ سے ایسے اچانک اور غیر متوقع طور پر پھیلا کہ برہمن حیرت زدہ رہ گئے۔ برہمنیت کے ستائے ہوئے لوگوں نے اس محبت بھرے پیغام کو دل کی گہرائیوں میں جگہ دی اور اشوک جیسے صاحب قوت بادشاہ کی حمایت نے اسے اور بھی تقویت بخشی۔ یہ صورت حال آریوں خصوصاً برہمنوں کے لئے نہایت تکلیف دہ تھی لیکن اس سیلاب کے سامنے بند باندھنا ان کے بس کی بات نہ رہی تھی اس لئے انہوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ اس صورت حال سے مصالحت کر لی جائے مگر واقعات شہادت دیتے ہیں کہ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے اور اس مذہب کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش میں مصروف رہے۔ جب اشوک کے جانشینوں میں کوئی لائق شخص باقی نہ رہا اور خاندان موریہ پر زوال آ گیا تو برہمنوں کو کھل کھیلنے کا پھر موقع مل گیا اور انہوں نے اس مذہب کے خلاف ایک منظم تحریک چلائی۔ شنکر اچاریہ نے جو اس مذہب کا سخت دشمن تھا جنوبی ہند کے حکمرانوں کو بدھ مذہب کے خلاف اس قدر مشتعل کیا کہ وہ اس کے تباہ کرنے کے درپے ہو گئے اور پھر اس مذہب اور اس کے ماننے والوں پر ایسی قیامت گذر گئی کہ مغرب کا محتاط مورخ ریورینڈ۔ ڈبلو۔ ٹی۔ ولکنس بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ :۔

> "بدھ کے ماننے والوں پر اس قدر ظلم و ستم توڑے گئے کہ یا تو انہیں قتل کر دیا گیا یا ملک بدر کر دیا گیا یا مجبور کیا گیا کہ وہ اپنا مذہب ترک کر کے ہندو مت میں داخل ہو جائیں تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسی نظیر ملے کہ کسی تحریک کو مذہبی ظلم و جبر میں اتنی کامیابی حاصل ہوئی ہو جتنی کامیابی (برہمنوں کی تحریک نے) بدھ مذہب کو ہندوستان سے دیس نکالا دینے میں حاصل کی"[1]

تاریخ میں ایک اور برہمن کا نام بھی آتا ہے جس نے بدھ مت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی نہایت سفاکانہ کوششیں کیں۔ یہ کمارلہ بھٹہ تھا جس کا دل بدھ مت کے خلاف نفرت و حقارت اور غیظ و غضب کی وجہ سے جوالا مکھی بنا ہوا تھا۔ برصغیر کے بعض حصوں میں دوبارہ ہندو راج کے قیام کے بعد بدھ مذہب اور اس کے پیروؤں پر مصائب کے جو پہاڑ توڑے گئے ان میں اس کمارلہ بھٹہ کا

---

[1] ڈیلی لائف اینڈ ورک ان انڈیا مولفہ مسٹر ٹی ولکنس

بھی بڑا دخل تھا۔ اس دور میں بدھوں کی خانقاہیں گرائی گئیں، ان کی مذہبی کتب کو جلایا گیا۔ بدھ مذہب کے ماننے والوں کو ملک بدر کیا گیا انہیں طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ سورج بنسیوں اور چندر بنسیوں نے ہندو مذہب کی حمایت کا بیڑا اٹھالیا۔ ان لوگوں کا جہاں بس چلتا بدھوں کے مندروں اور خانقاہوں کو منہدم کر دیتے اور ان کی جگہ ہندو مذہب کے معابد تعمیر کر لیتے۔ یہ بیان ہمارا نہیں کسی مسلمان یا مغربی مورخ کا نہیں بلکہ مشہور کانگریسی رہنما مسٹر رامیشور چندر دت کا ہے جو انہوں نے اپنی کتاب "قدیم ہندوستان کی تہذیب" میں درج کیا ہے۔

"تاریخ ہند قدیم کے اسی بدترین دور میں شمالی ہند کی سرزمین پر پشپی منتر نامی ایک برہمن نمودار ہوا جو بدھوں کی ایذا رسانی میں اپنے جملہ ہم خیالوں پر سبقت لے گیا۔ اس ظالم برہمن نے بدھوں کو ارض ہند سے مٹانے کے لئے ایسی وحشیانہ حرکتیں کیں کہ بدھوں کے لئے اس ملک میں رہنا دوبھر ہو گیا اور ان میں سے بہت سے لوگ جنہوں نے اپنی زندگیاں اس مذہب کی اشاعت کے لئے وقف کر دی تھیں، بوجھبر سے اپنی جانیں بچانے کی غرض سے نکل بھاگے۔ مشہور مغربی مورخ بورنات نے اپنی تاریخ کے دیباچے میں پشپی منتر کے مظالم پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"بدھ مت کے پیرووں پر وحشیانہ مظالم کئے گئے۔ ان کی خانقاہوں کو جلا کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا گیا اور مگدھ سے لے کر پنجاب کے علاقے تک بدھ راہبوں کا قتل عام کیا گیا۔ جو راہب پشپی منتر کی چلائی ہوئی تلوار کی زد میں نہ آسکے وہ اپنی جانیں بچانے کے لئے دوسرے ممالک میں پناہ گزیں ہو گئے۔"[۱]

صرف یہی نہیں بلکہ اس متعصب برہمن پشپی منتر نے اشوک کے آخری جانشین مہاراجہ برہدرتھ کو بھی قتل کرا دیا[۲] تاکہ اس مذہب کے حامی فرماں روا کے خاتمے کے بعد اس راہ کی آخری رکاوٹ بھی دور ہو جائے اور اسے اپنے ظالمانہ عزائم کو عملی جامہ پہنانے کا آزادی سے موقع مل سکے۔

بدھ مذہب کے ساتھ ساتھ اس عہد کی ایک اور تحریک بھی جو جینی مذہب کے نام سے مشہور ہے، برہمنوں کے مظالم کا نشانہ بنی اور اس مذہب کے ماننے والوں کو بھی بری طرح ستایا گیا۔ ان کا جرم بھی اتنا تھا کہ یہ لوگ بھی بدھوں کی طرح ویدوں کی تعلیم کے قائل نہ تھے۔

---

[۱] دیباچہ بورنات صفحہ ۳۸

[۲] قدیم تاریخ ہند صفحہ ۲۰۲ مولفہ ونسنٹ۔ اے۔ اسمتھ (مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن)۔

ان تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ برہمن مذہبی لحاظ سے نہایت کٹر فرقہ پرست اور متعصب تھے اور ہندو مذہب کے پیروکاروں کے لئے غیر ہندو نظریہ کو برداشت کرنا ہمیشہ ناممکن رہا۔ ان لوگوں نے بدھ جیسے امن و آشتی کے مذہب کو مٹانے کے لئے نہایت ہی وحشیانہ حرکات کیں۔ صرف اس لئے کہ بدھ مذہب کے فروغ کے بعد معاشرے میں مساوات اور مذہبی رواداری قائم ہو گئی تھی اور برہمنوں کی اجارہ داری ختم ہو گئی تھی۔ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر کی تفریق جاتی رہی تھی اور سارے بنی نوع انسان ایک سطح پر آ گئے تھے۔ وید پس منظر میں چلے گئے تھے اور گوتم بدھ کی سیدھی سادی اور پاکیزہ تعلیم دلوں میں گھر کر گئی تھی۔ معلوم نہیں بدھوں پر مظالم کے یہ پہاڑ کب تک ٹوٹتے رہتے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد شروع ہوئی اور انہوں نے برہمنوں کا زور توڑ کر بدھوں کو ان قیامت خیز مظالم سے نجات دلائی۔

برِ صغیر میں مسلمانوں کی آمد

عین اس وقت جب برصغیر پاک و ہند ذات پات کے امتیاز ات اور چھوت چھات کی لعنت کی وجہ سے جہنم کدہ بنا ہوا تھا اور برہمنوں نے "نیچ ذات" والوں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی، مطلعِ عرب پر ایک ایسا خورشید جہاں تاب طلوع ہوا جس کی کرنوں نے اقصائے عالم کو منور کر دیا۔ ہادیٔ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت بنی نوعِ انسان کے لئے محبت و شفقت اور عدل و مساوات کا ایسا لافانی پیغام تھا کہ جس نے اسے قبول کر لیا وہ اور اس کی آئندہ نسلیں (بشرطیکہ وہ اسے فراموش نہ کر دیں) ایک ایسی بہشت میں آ گئے جس کے لذائذ اس پیغام کی طرح لافانی ہیں۔ اسلام کی سادہ مگر دلوں میں گھر کرنے والی تعلیم نے عرب کے بت پرستوں اور خونخواروں کی زندگی میں وہ انقلاب پیدا کر دیا جس کی نظیر چشمِ فلک نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ ایک دوسرے کا خون بہانے اور دوسروں کی بہو بیٹیوں کی آبروریزی پر فخر کرنے والے محبت و شفقت اور شرم و حیا کے ایسے پیکر بن گئے جن پر فرشتے بھی رشک کرنے لگے۔ ان لوگوں نے جو پیغام قبول کیا تھا اس میں انہیں ہدایت کی گئی تھی کہ تم یہ نعمت خود قبول کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں تک بھی پہنچاؤ تاکہ روئے زمین سے مصنوعی خداؤں کی بندگی ختم ہو اور ساری دنیا خدائے واحد و قادرِ مطلق کی پرستار بن جائے۔ انسان انسان کی غلامی سے آزاد ہو، نفرت و حقارت کے آتش کدے سرد ہو جائیں اور ہر طرف عدل و مساوات کی نسیم عطر بیز چلنے لگے۔

تاریخ گواہ ہے کہ عربوں نے اس پیغام کو گوشِ دل سے سنا اور اپنے آقا و مولا کے ارشاد کی تعمیل میں مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں پھیل گئے۔ خواہ وہ سرکشوں اور مفسدوں کو سزا دینے کے لئے شمشیر بدست ہو کر نکلے یا کسبِ معاش کی غرض سے تجارتی قافلوں کی صورت میں روانہ ہوئے۔ انہوں نے یہ فرض ہر حال میں ادا کیا اور یہ محبت آمیز پیغام ہر جگہ اور ہر رنگ میں پہنچایا بلکہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ توسیعِ اسلام کا عظیم کارنامہ تاجروں، واعظوں اور مبلغوں ہی کی مساعیٔ جمیلہ سے سر انجام پایا اور بیشتر لوگوں نے مسلم فاتحوں کی وجہ سے نہیں بلکہ مبلغین اور واعظین کے ذاتی کردار، حسنِ اخلاق اور اس پاکیزہ تعلیم کی وجہ سے اسلام قبول کیا۔ چنانچہ خود برصغیر پاک و ہند میں جب کہ ابھی کسی فاتح کا قدم بھی نہ آیا تھا، اسلام

اس سرزمین پر اپنے قدم جما چکا تھا۔

عربوں کے اہل ہند سے تعلقات

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ تجارت عربوں کا قدیم ترین پیشہ تھا اور فرانس کے مشہور مستشرق ڈاکٹر گستاولی بان کے بقول عربوں کی تجارت دنیا کے کناروں تک پہنچی ہوئی تھی۔ چین کے مشرقی سواحل اور مجمع الجزائر سے لے کر جبل الطارق تک عربی تجارت کے جہازوں کا بیڑا بغرض تجارت پھرا کرتا تھا۔ افریقہ، ایران، ہندوستان، خطا، ترکستان، روس اور ایشیائے کوچک وغیرہ ممالک کی سرزمین ان کے قافلوں کی جولانگاہ تھی۔[1] غرض اقصائے عالم کی تجارت عربوں کے ہاتھ میں تھی اور دو ہزار برس تک ملکِ عرب تمام عالم کا مرکزِ تجارت بنا رہا تھا۔[2]

"عرب ہندوستان کو بری اور بحری دونوں راستوں سے آیا جایا کرتے تھے۔ بری راستہ ایران، سمرقند، کشمیر سے ہوتا ہوا ہند کو جاتا تھا۔ بحری راستہ سیراف اور عدن سے تھا۔ خشکی کے راستے سے ان لوگوں کی تجارت کشمیر، قنوج وغیرہ ممالک میں ہوتی تھی۔ بحری راستے سے سندھ، ملیبار اور سیلون وغیرہ ملکوں میں تجارت کیا کرتے تھے۔"[3]

جنوبی ہند میں ظہورِ اسلام

اس طرح عربوں اور اہل ہند میں کم و بیش دو ہزار سال سے روابط قائم تھے۔ مگر ان کی زیادہ آمد و رفت سندھ اور ملیبار کے ساحلوں تک محدود تھی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد عرب تاجروں نے اس علاقے کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور اس دعوت کا خاطر خواہ اثر بھی ہوا۔ اسی دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے سواحلِ ہند پر تبلیغ کے لئے ایک نیا دروازہ کھول دیا "جب حجاج عراق کا گورنر ہوا تو ہاشمیوں کی ایک بڑی جماعت یہ علاقہ چھوڑ کر ہندوستان آگئی۔ ان میں سے جو لوگ ہندوستان کے مغربی ساحل (بالخصوص کونکن کے کنارے) پر آباد ہوئے ان کی اولاد کو نوائت (نو وارد) یا نوائط اور جو لوگ راس کماری کے مشرق میں آباد ہوئے اور یہاں کی تامل عورتوں سے شادی کر کے ایک مخلوط قوم کے بانی ہوئے انہیں لبی کہتے ہیں۔ چونکہ اس زمانے میں ہندو جہاز رانی کو پاپ سمجھتے تھے اس لئے ان لوگوں نے جہاز رانی اور تجارت سے اپنے نئے وطن میں عزت و وقار حاصل کر لیا۔ اب بھی ساحلی علاقوں کے مسلمانوں میں ان لوگوں کی کثرت ہے ... یہ لوگ اچھے جہاز ران ہوتے ہیں اور دکن کے ساحل پر نوائط تاجروں کی اچھی آبادیاں ہیں۔"[4]

---

[1]، [2]، [3] تجارت العرب قبل الاسلام ص۴ ص۹ ص۱۲ مولفہ سید سلیمان ندوی

[4] آبِ کوثر ص۴۵ مولفہ شیخ محمد اکرام

مشہور مستشرق اور علی گڑھ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ بھی اپنی شہرۂ آفاق کتاب "دی پریچنگ آف اسلام" میں تسلیم کرتے ہیں کہ جنوبی ہند میں اسلام کی اشاعت کا ذریعہ کسی مسلمان فاتح نے نہیں بلکہ عرب تاجروں نے ادا کیا اور انہی کی کوششوں سے اس علاقے میں اسلام کی نشر و اشاعت ہوئی چنانچہ ان کا بیان ہے کہ:-

"جنوبی ہندوستان میں اسلامی تحریک کا آغاز آٹھویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے کہ چند مسلمان جن کو موپلا قوم اپنا بزرگ مانتی ہے ملک عراق سے آئے اور اس ملک کے جنوبی حصے پر آباد ہو گئے۔ گرم مسالوں اور ہاتھی دانت اور جواہرات وغیرہ کی تجارت سیکڑوں برس سے ہندوستان اور یورپ کے درمیان عربوں اور ایرانیوں کے توسل سے جاری تھی اس لئے اسلام کا اثر جنوبی ہند کے مغربی ساحل پر برابر پہنچتا رہا۔ باہر کے مسلمانوں کی کثرت آمد و رفت سے مغربی ساحل ہند کے تجارتی شہروں کی آبادی خلط ملط ہو گئی اور اکثر لوگ آدھے ہندو، آدھے عرب اور آدھے ایرانی ہو گئے۔ یہ تحقیق ہے کہ مسلمان تاجروں اور ہندو راجاؤں میں آشتی پیدا ہو گئی تھی۔ والیانِ ملک نے تجارت کا بازار گرم رکھنے کے خیال سے اور ملک کی ترقی کو جو مسلمان سوداگروں کی بود و باش کا نتیجہ تھی، مدنظر رکھ کر اپنی حفاظت اور سرپرستی میں لیا۔"[1]

چنانچہ تبلیغِ اسلام میں اسی سرگرمی کا نتیجہ تھا کہ پہلی صدی ہجری ہی میں ملیبار، کارومنڈل، گجرات اور بمبئی کے ساحلی علاقوں میں اسلام بہت تیزی سے پھیل گیا۔ حالانکہ اس وقت تک اس علاقے میں مسلمان فاتحین کے قدم نہیں آئے تھے۔ یہ سب عرب تاجروں اور ان کے ساتھ آنے والے مسلمان واعظوں اور مبلغوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ہزاروں ہزار بت پرست کسی جبر یا لالچ کے بغیر صرف مسلمانوں کا اخلاق و کردار دیکھ کر اور اسلامی تعلیم سے متاثر ہو کر مشرف باسلام ہو گئے۔ چنانچہ "جب ابن بطوطہ نے آٹھویں صدی ہجری میں کھنبائت سے چین کا سفر کیا تو اس نے مالابار کے ساحل پر جابجا مسلمانوں کی معقول آبادیاں دیکھیں۔ ضلع کاردار صوبہ بمبئی کی قدیم بندرگاہ ہوناور میں سلطان جمال الدین ایک ہندو راجہ کی طرف سے حکمران تھے۔ اور اس شہر میں مسلمان عالم اور اسلامی مدارس موجود تھے۔ منگلور میں مسلمانوں کی آبادی چار ہزار

---

[1] دی پریچنگ آف اسلام مؤلفہ مسٹر ٹی ڈبلیو آرنلڈ ترجمہ مولوی محمد عنایت اللہ ص۲۰۸ اس کتاب میں پریچنگ آف اسلام کا جہاں جہاں حوالہ دیا جائے گا وہ مولوی محمد عنایت اللہ مرحوم ہی کے ترجمے "دعوتِ اسلام" سے ماخوذ ہے۔

کے قریب تھی۔ کالی کٹ کا راجہ ہندو تھا لیکن سوداگروں اور تاجروں کا سردار مسلمان تھا اور بحری تجارت میں انہیں بڑا دخل حاصل تھا۔"[1]

پروفیسر آرنلڈ نے اپنی کتاب میں اس مغالطے کا بھی ازالہ کر دیا ہے کہ ملیبار کے یہ مسلمان عرب یا عراق کے لوگوں پر مشتمل نہ تھے بلکہ اسی سرزمین کے رہنے والے تھے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں "سولہویں صدی عیسوی کے شروع میں موپلا قوم کے نومسلم ملیبار کی کل آبادی کا پانچواں حصہ تھے۔ ان کی زبان وہی تھی جو ہندوؤں کی زبان ہے اور صرف لمبی داڑھی اور سر کے عجیب لباس سے ان کو اور لوگوں سے تمیز کیا جا سکتا ہے۔"[2]

یہ تو جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں سے تعلق رکھنے والے عوام الناس کا ذکر ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام کی پاکیزہ تعلیم اور عرب تاجروں اور واعظوں کے حسن اخلاق سے ان علاقوں کے حکمران اور امراء بھی متاثر ہوئے۔ نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ اسلام کی غلامی کا جوا اپنے کندھے پر رکھ کر فخر کیا۔ چنانچہ تاریخ میں آتا ہے کہ کنانور کے راجہ کا وزیر اسلامی تعلیم سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اس نومسلم وزیر کا خلوص اللہ تعالیٰ کو نہایت پسند آیا اور اس کا قبول اسلام بارگاہ رب العزت میں اس قدر مقبول ہوا کہ اس کے خاندان نے حیرت انگیز عروج حاصل کیا۔ رفتہ رفتہ یہ خاندان مسند حکومت[3] پر متمکن ہو گیا اور زمانہ دراز تک اس کی عظمت و سطوت کا ڈنکا جنوبی ہند میں بجتا رہا۔

ظاہر ہے کہ اسلام قبول کرنے والے ان حکمران خاندانوں کے اثر سے ہزاروں ہزار مقامی غیر مسلم دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ اس طرح جنوبی ہند میں مسلمانوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا۔ باہر سے آنے والے عرب تاجروں اور واعظوں کی دعوت و تبلیغ سے ان کے ایمانوں میں پختگی پیدا ہوئی۔ اور ان کی دینی تعلیم و تربیت مضبوط بنیادوں پر ہونے لگی۔

اسلامی دعوت کا حلقۂ اثر صرف ہندو وزراء و امراء تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ جنوبی ہند کے غیر مسلم حکمرانوں نے بھی اسلامی تعلیم کی صداقت کو محسوس کیا اور انہوں نے کسی مسلمان حکمران سے میدان جنگ میں مغلوب ہونے کے بعد نہیں بلکہ عرب تاجروں اور مبلغوں سے اسلام کی خوبیاں سن کر اسلام قبول کیا۔ چنانچہ ملیبار کے راجہ کے قبول اسلام کا واقعہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ شیخ شریف ابن ملک نامی ایک عرب اپنے بھائی ملک ابن دینار اور بھتیجے ملک ابن حبیب

ا۔ آب کوثر صفحہ ۵۲

۲۔ دی پریچنگ آف اسلام صفحہ ۲۶۳

۳۔ تاریخ ملیبار صفحہ ۳۴ مولفہ شمس اللہ قادری

کے ہمراہ قلعۂ آدم کی زیارت کی غرض سے لنکا جا رہے تھے۔ گرانکا نور پہنچ کر ان لوگوں نے قیام کیا۔ ملیبار کے راجہ نے ان نو واردوں کو اپنے محل میں طلب کیا اور ان کے ساتھ نہایت مدارات کا سلوک کیا۔ شیخ شریف نے راجہ کا حسن سلوک دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات بیان کئے اور اسے اسلام کی تعلیم سے روشناس کیا۔ انہوں نے شق القمر کے معجزے کا بھی ذکر کیا اور اسے حضورؐ کے دعوی کی صداقت کے طور پر پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے راجہ شیخ شریف کی تقریر سے نہایت متاثر ہوا اور آنحضرتؐ کی رسالت کا اقرار کر کے اس نے اسلام قبول کر لیا۔

شیخ شریف کے بھتیجے ملک ابن حبیب نے اس علاقے میں تبلیغ اسلام کا فریضہ نہایت تن دہی سے ادا کیا۔ انہوں نے کوگن، بوباٹی، مرادی، بانگور، منگلور، کنجر کوٹ، زرا فتن، دریا فتن، فندریہ اور شالیات کے شہروں میں جا کر مساجد تعمیر کیں اور اسلام کی روشنی سے ان علاقوں کو منور کیا[1]۔

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنوبی ہند میں توسیع اسلام کی مہم کسی مادی طاقت یا جبر کا نتیجہ نہ تھی بلکہ یہ اسلام کی تاثیر اور اس کی پاکیزہ تعلیم کی مرہون منت تھی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جنوبی ہند میں جو مسلمان پائے جاتے ہیں یہ سب قافلہ در قافلہ اور گروہ در گروہ عرب، ایران، ترکی یا افغانستان سے آکر یہاں آباد نہیں ہوئے بلکہ ان کی بہت بڑی اکثریت مقامی باشندوں پر مشتمل تھی۔

سندھ میں ظہورِ اسلام

عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ محمد بن قاسم کے حملے نے سندھ کے لوگوں کو اسلام سے روشناس کیا اور فتح سندھ کے بعد ہی بہت سے اہل سندھ نے اپنے حاکم کا مذہب قبول کر لیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ سندھ کے عوام پر محمد بن قاسم کی آمد کے بعد ہی اسلام کی حقانیت ظاہر ہوئی اور انہوں نے اس واقعہ کے بعد ہی اسلام قبول کرنا شروع کیا مگر اس تبدیلیٔ مذہب میں محمد بن قاسم کے جبر کو دخل نہ تھا بلکہ یہ کرشمہ تھا فاتحین کے حسنِ اخلاق، بلندی کردار، دانشمندی اور اسلام کی پاکیزہ تعلیم کا کہ اہل سندھ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے ورنہ جہاں تک محمد بن قاسم کا تعلق ہے ہندو مورخین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس نے سندھ کے لوگوں پر مذہب کے معاملے میں تو کیا کسی معاملے میں سختی نہ کی بلکہ نہایت مہربانی اور فیاضی کا سلوک کیا۔ چنانچہ برصغیر کے مشہور ہندو مورخ ڈاکٹر تارا چند اپنی کتاب میں لکھتے ہیں :-

"اس فتح مند مسلمان نے مفتوحین کے ساتھ جو سلوک کیا وہ فیاضی اور دانشمندی پر مبنی

---

[1] تحفۃ المجاہدین صہ ۴۹

تھا۔ اس نے مال گذاری کے اس نظام میں کوئی تبدیلی نہ کی جو اس علاقہ میں پہلے سے رائج تھا۔ علاوہ ازیں اس نے بہت سے پرانے اہل کاروں کو بھی ان کے عہدوں پر برقرار رکھا۔ پجاریوں اور برہمنوں کو آزادی تھی کہ وہ مندروں میں جا کر اپنے طریقے کے مطابق عبادت کریں۔ ہندو کاشت کاروں کو برہمنوں اور مندروں کو وہ ٹیکس دینے کی بھی اجازت تھی جو وہ قدیم سے دیتے چلے آرہے تھے۔[1]

محمد بن قاسم کے اسی حسن سلوک اور مذہبی رواداری کا نتیجہ تھا کہ سندھ کے غیر مسلم برضا و رغبت اسلام قبول کرنے لگے۔ جن ہندوؤں نے اسلام قبول نہیں کیا وہ بھی محمد بن قاسم کے حسن سلوک اور فیاضی سے بے حد متاثر تھے اور اسے اپنے لئے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی رحمت سمجھتے تھے کیونکہ اس نے سندھ فتح کرنے کے بعد یہاں کے لوگوں کو برہمنوں کے ظلم و ستم سے نجات دلا دی تھی اور ایک ایسا نظام حکومت قائم کیا تھا جس میں ادنیٰ و اعلیٰ سب برابر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب محمد بن قاسم پر خلیفہ وقت کا عتاب نازل ہوا اور وہ قید خانے میں وفات پا گیا تو سندھ کے لوگوں نے اس کی موت کو بہت بڑا سانحہ قرار دیا اس کا ماتم کیا اور اس کی یادگار کے طور پر کیرج میں اس کا مجسمہ نصب کیا۔[2]

محمد بن قاسم کی وفات کے بعد سندھ کے حالات میں متعدد تغیر و تبدل رونما ہوئے۔ بعض علاقوں سے عربوں کی حکومت ختم ہوگئی مگر اسلام کی تبلیغ کا کام جاری رہا اور عرب تاجر اور واعظ یہاں آ کر لوگوں کو اسلام کی خوبیاں بتاتے اور انہیں دائرہ اسلام میں داخل کرتے رہے۔ ان میں سے بعض مبلغوں کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی اور ان کے ذریعے خاندان کے خاندان مسلمان ہوگئے۔ چنانچہ پروفیسر آرنلڈ کا بیان ہے کہ:

"یہاں کے داعیان اسلام میں سب سے مشہور و معروف سید یوسف الدین تھے۔ جو سنہ ۱۴۲۲ء میں سندھ میں آئے تھے۔ دس برس کی محنت اور جستجو کے بعد لوہانا قوم کے سات سو خاندانوں کو انہوں نے مسلمان کر لیا۔ اول اس قسم کے دو آدمی سندرجی اور ہنس راج شاہ صاحب کی کرامات دیکھ کر مسلمان ہوئے تھے اور اپنا نام انہوں نے آدم جی اور تاج محمد رکھا تھا۔ جب یہ لوگ مسلمان ہوگئے تو پھر ان کی قوم کے سات سو

---

[1] تاریخ اہل ہندوستان صہ ۱۲۲ مولفہ ڈاکٹر تارا چند
[2] فتوح البلدان صہ ۴۴۴ مولفہ احمد بن جابر البلاذری

گھرانوں نے اسلام قبول کر لیا۔ آدم جی کا پوتا جب لوہانوں کا سردار ہوا تو اس کے وقت میں یہ قوم سندھ سے اٹھ کر کچھ میں چلی گئی اور جب وہاں پہنچی تو کچھ کے لوہانوں نے بھی اسلام قبول کر کے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کیا[1]"

عوام الناس کے علاوہ علاقہ سندھ کے بعض حکمرانوں نے بھی برضا و رغبت اسلام قبول کیا ان میں سے ایک راجہ کے قبول اسلام کا واقعہ تاریخ سندھ کے مولف نے بلاذری کے حوالے سے درج کیا ہے جو نہایت دلچسپ بھی ہے اور اس کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سندھ میں تبلیغ اسلام کا اصل کام فاتحین نے نہیں بلکہ واعظوں نے کیا یا عرب تاجروں نے۔ یہ ریاست جس کے راجہ کے قبول اسلام کا واقعہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے ملتان کے شمال میں واقع تھی۔ اس کا نام عرب مورخین نے عسیفان اور عسیقان لکھا ہے۔ واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اس راجہ نے ایک مندر بنوایا تھا۔ اس میں جو مورتی رکھی ہوئی تھی اس کی اس علاقے کے سب لوگ پرستش کرتے تھے۔ ایک دفعہ راجہ کا لڑکا بیمار ہوا۔ مگر جب ہر قسم کے علاج کے بعد اسے صحت نہ ہوئی تو اس نے پجاریوں کو بلا کر دعا کی استدعا کی کہ دیوتاؤں سے لڑکے کی صحت کے لئے درخواست کریں۔ پجاری مندر میں گئے اور کچھ دیر بعد واپس آئے اور کہا ہم نے دیوتاؤں سے دعا کی انہوں نے قبول کر لی۔ اب آپ کا لڑکا جلد اچھا ہو جائے گا آپ مطمئن رہیں۔ لیکن ہوا یہ کہ لڑکا جلد ہی موت کا شکار ہو گیا۔ راجہ کو اس صریح کذب بیانی پر اس قدر غصہ آیا کہ اس نے تمام پجاریوں کو قتل کر ڈالا اور مندر کو بھی گرا کر زمین کے ہموار کرا دیا۔

اس واقعہ کے بعد راجہ سخت غمزدہ رہنے لگا۔ اتفاق سے چند مسلمان تاجر وہاں موجود تھے۔ راجہ کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے ان کو بلا کر مذہب کے متعلق حقیقت دریافت کی۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا مذہب بت پرستی سے سخت بیزار ہے اور ہم لوگ صرف ایک خدا کو مانتے ہیں جو قادر مطلق ہے اور کوئی اس کا شریک نہیں اور ہمارا مذہب اخلاق حمیدہ کی بہترین تعلیم دیتا ہے راجہ اس (تقریر) سے بڑا متاثر ہوا اور تبدیل مذہب کر کے مسلمان ہو گیا[2]"

اسی تاریخ یعنی تاریخ سندھ میں ایک علاقے کے ایک اور راجہ کا حال بیان کیا گیا ہے جس نے سندھ کے ایک مسلمان حکمران سے درخواست کی تھی کہ اسے سندھی زبان میں اسلامی تعلیم کا خلاصہ لکھ کر بھیج دیا جائے۔

---

[1] دی پریچنگ آف اسلام صفحہ ۲۹

[2] تاریخ سندھ صفحہ ۱۸۴ مولفہ مولانا سید ابوظفر ندوی

جب یہ خلاصہ اسے ملا تو اس نے اس خلاصے کے محرر کو جو سندھی زبان کا شاعر بھی تھا اپنے پاس بلایا اور اس سے سندھی زبان میں قرآن حکیم کی تفسیر لکھنے کی فرمائش کی۔ ایک موقع پر جب اسے اس تفسیر کا کچھ حصہ سنایا جا رہا تھا تو وہ جواہرات سے مرصع تخت سے اتر کر سجدے میں گر پڑا اور اپنا گال خاک پر رکھ کر کہا کہ بے شک خارب معبود ہے جو ازلی اور ابدی ہے۔[۱]

تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کے بعض حکمرانوں نے تبلیغی خطوط سے متاثر ہو کر بھی اسلام قبول کیا۔ یہ خط وقتاً فوقتاً خلفا اور ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے انہیں لکھے۔ چنانچہ مشہور اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحؒ نے سریر آرائے مسندِ خلافت ہونے کے بعد ہندوستان کے راجاؤں اور امرا کو خطوط کے ذریعے دعوتِ اسلام دی۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور بہت سے راجاؤں اور بعض امراء نے اسلام قبول کر لیا۔ ان میں سندھ کے راجہ داہر کا بیٹا جے سنگھ بھی تھا۔[۲] اسی طرح عباسی خلیفہ مہدی نے بھی مسند نشین خلافت ہونے کے بعد ہندوستان کے بہت سے حکمرانوں کو تبلیغی خطوط ارسال کئے۔ ان میں سے پندرہ حکمرانوں نے اسلام کی دعوت قبول کر لی۔ ان لوگوں میں علاقہ سندھ کا ایک حاکم بھی تھا جو رائے[۳] کے لقب سے مشہور تھا۔

پنجاب میں تبلیغِ اسلام

سندھ کے بعد برصغیر کی جس سرزمین کو مسلمانوں کے قدم چومنے کا شرف حاصل ہوا، وہ پنجاب کی سرزمین تھی۔ یہ درست ہے کہ اس وقت تک کی تحقیق کے مطابق اس سرزمین پر مسلمانوں نے فاتح کی حیثیت سے قدم رکھا اور مبلغین و واعظین ان کے بعد آئے۔ لیکن تاریخ اس امر کی بھی شہادت دیتی ہے کہ یہاں کے لوگوں کی روحانی زندگی پر فاتحین نے نہیں واعظین نے اثر ڈالا کیونکہ مسلمانوں کے سب سے پہلے فاتح سلطان سبکتگین نے پنجاب پر حملہ ضرور کیا مگر یہاں کے سرکش راجہ کو جو اسلامی سرحدوں پر حملے کرتا رہتا تھا، سزا دے کر یہ مسلمان فاتح واپس چلا گیا۔ اسی طرح محمود غزنوی نے بھی یہاں مستقل قیام کبھی نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے کسی فاتح کی آمد یہاں کے لوگوں کی تبدیلیٔ مذہب کا موجب نہیں ہوئی۔ اس سرزمین پر مذہبی انقلاب سب سے پہلے ایک بزرگ واعظ حضرت سید اسماعیل بخاری کے ہاتھوں رونما ہوا جو ۱۰۰۵ء میں لاہور

۱۔ تاریخ سندھ ص ۱۹۶

۲۔ فتوح البلدان ص ۴۴۱ مطبوعہ لیڈن

۳۔ تاریخ یعقوبی جلد دوم ص ۴۷۹

تشریف لائے۔ ان دنوں لاہور کا حکمران ایک ہندو راجہ تھا جو سلطان محمود غزنوی کو خراج دیا کرتا تھا۔ حضرت اسماعیل بخاری رح نے لاہور آکر اس سرزمین پر سب سے پہلی مجلس وعظ منعقد کی۔ آپ کا بیان اتنا پرلطف اور زبان اتنی پرتاثیر تھی کہ لوگ آپ کی تقریر سننے کے لئے کھنچے چلے آتے تھے اور روزانہ کثیر تعداد میں اسلام قبول کرتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق صرف ایک دن ہی آپ کے دستِ حق پرست پر ایک ہزار غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔[1]

حضرت اسماعیل بخاری رح کے بعد دوسرے بزرگ جنہوں نے لاہور میں سجادۂ رشد و ہدایت آراستہ کیا حضرت شاہ حسین زنجانی رح ہیں آپ لاہور میں پینتیس چھتیس سال مقیم رہے اور تبلیغ اسلام کے لئے مختلف صوبوں اور شہروں کے دورے بھی کئے۔ حضرت شاہ حسین نہایت متقی، نہایت صاحب علم اور نہایت بلند اخلاق کے بزرگ تھے۔ آپ کے علم کے ساتھ ساتھ عمل نے بھی بڑا کام کیا اور ہزاروں افراد آپ کا اعلیٰ نمونہ دیکھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

تیسرے بزرگ جن کی مساعی جمیلہ سے سابق پنجاب میں اسلام کا نور پھیلا حضرت مخدوم سید علی ہجویری رح ہیں جو عوام میں داتا گنج بخش رح کے نام سے مشہور ہیں۔ بلاشبہ برصغیر کی روحانی تاریخ میں آپ کا نہایت بلند مقام ہے۔ حضرت علی ہجویری رح کی تبلیغی کوششوں کے بہت دور رس نتائج نکلے اور آپ کا فیض آپ کے بعد بھی جاری رہا۔ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے زمانے میں غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی۔ ایک روایت کے مطابق آپ کی محفل میں دن کو طالب علموں کو تدریس اور رات کو طالبانِ حق کی تلقین ہوتی۔ ہزاروں جاہل ان کے ذریعے سے عالم، ہزاروں کافر مسلمان، ہزاروں گمراہ رہ براہ، ہزاروں دیوانے صاحبِ عقل و ہوش، ہزاروں ناقص کامل اور ہزاروں فاسق نیکوکار بن گئے۔ تمام زمانے نے ان کی غلامی کو اپنا فخر تصور کیا۔ اس وقت لاہور مرجع علما و فضلا کا تھا۔ دور دور سے شیخ حضرت کی خدمت میں آکر بہرہ یاب ہوتے۔[2]"

آپ کی تبلیغ سے جو شخص سب سے پہلے مسلمان ہوا وہ پنجاب کا ہندو گورنر رائے راجو تھا جو سلطان مودود والی افغانستان کی طرف سے اس علاقے کا انتظام کرتا تھا۔ حضرت علی ہجویری رح نے اس کا اسلامی نام شیخ ہندی[3] تجویز کیا۔

---

[1] خزینۃ الاصفیا صد ۲۳
[2] حدیقۃ الاولیا صد ۹۳ مولفہ مفتی غلام سرور
[3] آب کوثر صد ۸۶ مولفہ شیخ محمد اکرام

حضرت علی ہجویری رح کے علاوہ اس خطے میں حضرت سید احمد توختہ ترمذی رح اور حضرت شیخ عزیز الدین مکی رح کے اسمائے گرامی بھی قابلِ ذکر ہیں کہ ان حضرات کی شبانہ روز کوششوں سے ہزاروں صنم پرست دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔

لاہور کے علاوہ بہاول پور، جھنگ، ساہیوال اور ملتان میں بھی اسلام کی توسیع و اشاعت کا فریضہ انہی درویشوں نے سرانجام دیا جن کے پاس اپنے اعلیٰ کردار اور اوصافِ حمیدہ کے علاوہ کوئی مادی طاقت نہ تھی۔ ان بزرگوں میں شیخ بہاالدین زکریا رح، سید جلال الدین منیر شاہ رح، حضرت موسیٰ نواب رح، حضرت مخدوم جہانیاں رح، حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رح اور شیخ صدر الدین رح کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اسلام کے اولین مبلغوں حضرت شاہ اسماعیل بخاری رح اور حضرت مخدوم سید علی ہجویری رح کے مشن کو جاری رکھنے اور اسے آگے بڑھانے میں ان بزرگوں نے بڑا حصہ لیا۔ ان کی شبانہ روز کوششوں سے صوبۂ پنجاب میں اسلام کا پیغام گھر گھر پہنچا اور ان میں سے بہت سے بزرگوں نے تو قبیلوں کے قبیلوں کو مسلمان کر لیا۔ مثلاً سید جلال الدین منیر شاہ کے ہاتھ پر بہاول پور کے کئی قبیلوں نے اسلام قبول کیا۔ حضرت موسیٰ نواب کے ہاتھ پر "اچہ" میں دو قبیلے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ پروفیسر آرنلڈ کے بقول پنجاب کے مغربی صوبوں کے باشندوں نے خواجہ بہاءالحق اور بابا فرید گنج شکر رح کی تعلیم و تلقین سے اسلام قبول کیا۔ اور سولہ قومیں تو صرف بابا گنج شکر رح کی کوشش سے مسلمان ہوئیں۔[1] حضرت مخدوم جہانیاں رح کے ہاتھ پر مغربی پنجاب کے جن قبیلوں نے اسلام قبول کیا ان قبیلوں کی تعداد ۲۸ تک پہنچتی ہے۔[2] ان میں راجپوتوں کا ایک بڑا قبیلہ کھرل بھی شامل ہے۔ اسی طرح صوبۂ پنجاب کے دو معروف قبیلے سیال[3] اور وٹو[4] بھی حضرت مخدوم جہانیاں رح اور حضرت مسعود گنج شکر رح کی تبلیغ و تلقین سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ ایک اور مشہور و ممتاز قبیلے لون کو بھی حضرت مخدوم جہانیاں اور جویہ راجپوتوں کو حضرت شیخ رکن العالم رح کے ذریعے اسلام کی نعمت میسر آئی۔[5]

کشمیر میں اشاعتِ اسلام

پنجاب سے بھی زیادہ دلچسپ تاریخ اہل کشمیر کے قبول اسلام کی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ کشمیر میں اس کثرت سے صوفیا اور مبلغین اسلام تشریف نہیں لے گئے جس کثرت سے سندھ، پنجاب اور جنوبی ہند میں

---

[1] دی پریچنگ آف اسلام صد ۲۹۷

[2]، [3]، [4]، [5] آبِ کوثر صد ۳۱۸، ۳۲۵، ۳۲۶ مولفہ شیخ محمد اکرام

گئے۔ مگر اس کے باوجود اس خطے میں اسلام نہایت سرعت سے پھیل گیا اور کثیر تعداد میں کشمیری مشرف بہ اسلام ہوئے۔ کشمیر میں منظم طور پر تبلیغ اسلام کا آغاز ۱۳۲۴ء میں ہوتا ہے جب شرف الدین بلبل شاہؒ نامی ایک بزرگ نے اس سرزمین پر قدم رکھا۔ ان دنوں رنچن دیو نامی ایک راجہ کشمیر کا حاکم تھا۔ یہ مذہباً بدھ تھا مگر اسے اپنے مذہب کے متعلق کچھ شبہات تھے اور کسی ایسے دین کا متلاشی تھا جو اس کے اطمینان قلب کا موجب ثابت ہو۔ چنانچہ ایک روز علی الصبح بیدار ہو کر اس نے اپنے محل کی چھت پر سے بیرونی فضا پر نظر ڈالی، تو ایک شخص کو دیکھا کہ ایک چشمے کے پاس عبادت میں مصروف ہیں۔ کچھ تو ان کی پاکیزہ و نورانی صورت اور کچھ ارکان نماز کی ادائیگی غرض یہ منظر راجہ رنچن دیو کو ایسا پسند آیا کہ وہ اسی وقت پا پیادہ اس بزرگ کی طرف چل پڑا۔ اس نے ان سے مذہب پر گفتگو کی اور پہلی ہی ملاقات میں وہ اسلامی تعلیم سے متاثر ہو گیا۔ یہ بزرگ حضرت شرف الدین المعروف بلبل شاہ تھے جو سری نگر کے قریب فروکش تھے۔ رفتہ رفتہ مہاراجہ رنچن دیو کے علاوہ اس کے دربار کے امراء و وزراء نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ حضرت بلبل شاہ رح کی کوشش سے کشمیر کے جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ان کی تعداد دس ہزار بیان کی جاتی ہے۔ رنچن دیو نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنا لقب صدر الدین اختیار کیا۔ کشمیر کے دوسرے قابل ذکر مبلغ سوات کے ایک بزرگ شاہ مرزا تھے جو راجہ کشمیر سنگھ دیو کے دربار سے وابستہ تھے اور نہایت ذمہ دارانہ عہدوں پر وابستہ رہے۔ صدر الدین کی وفات کے بعد جب کشمیر میں سیاسی لحاظ سے ابتری پیدا ہو گئی تو اہل کشمیر نے انہی شاہ مرزا کو تخت سلطنت پر بٹھایا انہوں نے سلطان شمس الدین کا لقب اختیار کیا۔ شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے عہد میں کشمیر کے سیاسی حالات رو بہ اصلاح ہوئے اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ بھی نہایت منظم طریقے سے ادا کیا گیا۔

۱۳۸۸ء کے قریب سید علی ہمدانی کشمیر میں آئے اور ان کی وجہ سے اسلام کو بہت ترقی ہوئی۔ یہ بزرگ جب تیمور کے معتوب ہوئے تو اپنے وطن ہمدان کو چھوڑ کر کشمیر میں چلے آئے۔ سات سو سید ان کے ہمراہ تھے جو کشمیر پہنچ کر مختلف مقامات میں عزلت نشیں ہوئے اور اپنے اثر سے ہندوؤں کو مسلمان کرتے رہے کہا جاتا ہے کہ ان کی کوشش سے کشمیر کے ۳۷ ہزار افراد نے اسلام قبول کیا[1]

وسط ہند میں تبلیغ اسلام

برصغیر کے صوفیا اور واعظین میں جس بزرگ کا دائرۂ اثر سب سے زیادہ وسیع ہوا وہ معین اسلام

---

[1] دی پریچنگ آف اسلام صفحہ ۳۱۰

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ ہیں۔ آپ مشرقی ایران کے علاقہ سجستان میں پیدا ہوئے۔ ایران، سمرقند اور عراق میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اس کے بعد حج کرنے تشریف لے گئے۔ وہیں آپ کو خواب میں ہندوستان جاکر تبلیغ اسلام کرنے کا حکم ملا۔ چنانچہ آپ غزنی کے راستے پہلے لاہور تشریف لائے۔ کچھ عرصہ قیام کرکے ملتان گئے اور وہاں سے اجمیر جاکر مستقل اقامت اختیار کرلی۔ اجمیر کے لوگوں پر آپ کی شخصیت کا نہایت گہرا اثر ہوا۔ اور راجہ اجمیر کا گرو تو آپ کا اس قدر گرویدہ ہوا کہ کلمہ توحید پڑھ کر داخلِ اسلام ہوگیا۔ گرو کے مسلمان ہونے کا اجمیر کے غیر مسلم عوام پر نہایت اچھا ردعمل ہوا۔ اور وہ بھی گروہ در گروہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے[1]۔

آپ کے ایک تذکرہ نگار شیخ جمالی لکھتے ہیں کہ اس علاقے کے بہت سے سربرآوردہ غیر مسلموں نے آپ کی برکت سے دولتِ اسلام و ایمان حاصل کی اور بہت سے لوگ جو ایمان نہیں لائے وہ بھی آپ کے عقیدت مند ہوگئے اور آپ کی خدمت میں تحائف و ہدایہ پیش کرتے رہے[2]۔"

ایک روایت کے مطابق جو پروفیسر آرنلڈ نے اپنی کتاب میں درج کی ہے۔ آپؒ نے دہلی سے اجمیر جاتے ہوئے راستے میں سات سو ہندوؤں کو داخلِ اسلام کیا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا سب سے بڑا کارنامہ اپنے خلفاء کی ایک ایسی جماعت تیار کرنا ہے جس نے وسطِ ہند، دہلی، یوپی اور پنجاب کے بہت سے علاقوں میں آپ کے مشن کو آگے بڑھایا۔ ان بزرگوں میں حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت شیخ حمید الدین ناگوریؒ اور حضرت فرید الدین گنج شکرؒ اور پھر ان سے جو سلسلہ چلا، اس میں حضرت مخدوم علاء الدین صابرؒ، شیخ جمال ہانسویؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان بزرگوں نے بعض دفعہ نہایت ہی ناخوشگوار حالات میں فریضۂ تبلیغ جاری رکھا اور ہزاروں ہزار بت پرست آپ کے دستِ حق پرست پر داخلِ اسلام ہوئے۔

بنگال میں اشاعتِ اسلام

بنگال میں تبلیغ اسلام کے سامان قدرت کی طرف سے پیدا ہوگئے۔ جب یہاں کے راجہ کنس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے جیٹ مل نے اپنے ہندو امراء کی ایک مجلس منعقد کی اور اس میں اعلان

---

[1] تاریخ ہند بی۔ ایس۔ ایلیٹ جلد ۲ صفحہ ۵۴۸

[2] سیر العارفین صفحہ ۱۳ مولفہ شیخ جمالی

کیا کہ وہ مسلمان ہونا چاہتا ہے۔ اگر اس کا قبول اسلام امورِ مملکت میں خرابی کا باعث ہو تو وہ تاج و تخت سے دست بردار ہونے کو تیار ہے (جیٹ مل کو بنگال کے ایک مشہور بزرگ حضرت نور قطب عالم رح نے اسلام کی تبلیغ اس خوش اسلوبی سے کی تھی کہ دینِ حق اس کے دل میں گھر کر گیا تھا اور وہ بادشاہت جیسی دولت چھوڑنے کو تیار ہو گیا تھا مگر اس کے سرداروں نے بیک زبان ہو کر کہا کہ آپ جو مذہب چاہیں اختیار کریں ہم میں سے کوئی معترض نہ ہوگا۔ اس کے بعد جیٹ مل نے مسلمانوں کی ایک مجلس طلب کی اور اس میں اپنے اسلام کا اعلان کیا[1]۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ جیٹ مل نے اپنا نام جلال الدین محمد شاہ رکھا اور پھر تبلیغ اسلام میں مصروف ہو گیا۔ اس کے عہد میں کثیر تعداد میں لوگ داخل اسلام ہوئے۔ بنگال میں افغانوں نے آ کر بھی بڑے انہماک سے تبلیغ کی۔ انہوں نے بنگال کی عورتوں سے شادیاں کیں اور ان سے جو نسل چلی وہ آج تک بنگالی پٹھانوں کی صورت میں موجود ہے۔

پروفیسر آرنلڈ نے بنگال میں تبلیغ اسلام کی جو داستان قلم بند کی ہے اس کے مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے بنگال کے صوفیا و مبلغین کا کوئی جامع تذکرہ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس سرزمین پر تبلیغ اسلام کرنے والے ابتدائی مبلغوں میں سے کسی مبلغ کا ذکر نہیں کیا۔ حال ہی میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق نے "پوربا پاکستانے اسلام" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چاٹگام کے علاقے میں عرب جہازرانوں کی آمد غزنوی اور غوریوں کے حملے سے بہت قبل شروع ہو گئی تھی اور عربوں کی خاصی تعداد بھی اس علاقے میں مقیم تھی۔ یہ تاجر صرف کاروبار ہی نہ کرتے تھے بلکہ جس علاقے میں جاتے وہاں اسلام کی تبلیغ کرتے اور اپنے اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ کردار سے بنگال کے غیر مسلموں کو دائرہ اسلام میں لے آتے۔ انہی کی کوششوں سے ان علاقوں میں متعدد مساجد قائم ہوئیں اور چاٹگام کے علاقے میں اسلام پھیلا۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ عرب تاجروں اور مقامی مسلمانوں کے اشتراک سے مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی ریاست بھی قائم ہو گئی۔ چند سال قبل ضلع راجشاہی کے مقام پہاڑپور میں محکمہ آثار قدیمہ کے تحت کھدائی کے نتیجے میں بدھوں کے ایک مندر کے نیچے سے ہارون الرشید کے زمانے کا ایک عربی سکہ برآمد ہوا جس پر ۱۷۲ھ کندہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بنگال سے عربوں کے تعلقات دوسری صدی ہجری میں قائم تھے۔

بنگال میں جو بزرگ تبلیغ اسلام کے لئے سب سے پہلے تشریف لائے ان کا اسم گرامی حضرت جلال الدین

---

[1] دی پریچنگ آف اسلام ص ۲۹۴

تبریزیؒ ہے۔ آپ کے بعد حضرت عثمان اخی سراجؒ اس علاقے میں وارد ہوئے۔ حضرت بدیع الزمان زندہ شاہ رارؒ، حضرت سید جلال الدین بخاریؒ، حضرت بایزید بسطامیؒ[1]، حضرت شرف الدین ابو توامہؒ، حضرت شاہ جلال سلہٹیؒ، حضرت پیر بدر عالم زاہدیؒ اور حضرت خواجہ جہاں علیؒ مختلف زمانوں میں سرزمینِ بنگال پر وارد ہوتے اور دور دراز علاقوں میں جاکر مشرکوں کو اسلام کا پیغام دیا۔ ان بزرگوں کی دعوت و تبلیغ سے بنگال کے ہزاروں افراد دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ ان بزرگوں نے جن علاقوں میں تبلیغ کرکے اہلِ بنگال کو مشرف بہ اسلام کیا ان علاقوں میں مساجد تعمیر کیں، رفاہِ عامہ کے کارنامے سرانجام دیئے۔ یعنی کنوئیں کھدوائے، تالاب بنوائے، سڑکیں تعمیر کرائیں اور مسافروں کے لئے لنگر قائم کئے۔ اس طرح ان مبلغین کی آمد سے اہلِ بنگال صرف اسلام ہی کی نعمت سے متمتع نہیں ہوئے، بلکہ انہیں معاشرتی لحاظ سے بھی بڑا فائدہ پہنچا۔[2]

برصغیر میں اشاعتِ اسلام پر تبصرہ

یہ کتاب اشاعت اسلام کی تاریخ نہیں ہے اس لئے ہم اس سے زیادہ تفصیل میں نہیں جا سکتے۔ نہ ہر عہد اور برصغیر کے ہر علاقے میں تبلیغ اسلام کی تاریخ بیان کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے برصغیر میں تبلیغِ اسلام کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا ہے اور اپنے بیان کو اکثر و بیشتر ابتدائی عہد تک محدود رکھا ہے۔ لیکن اس سرسری جائزے سے بھی چند امور روزِ روشن کی طرح ثابت ہو جاتے ہیں۔

(۱) برصغیر میں اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا بلکہ اپنی پاکیزہ تعلیم، داعیانِ اسلام کے بلند کردار اور ان کے اوصافِ حمیدہ کی وجہ سے پھیلا۔ کیونکہ برصغیر میں اسلام کا آغاز اس وقت ہو گیا تھا جب فاتحین نے اس سرزمین پر قدم بھی نہ رکھا تھا۔

(۲) اسلام کی تبلیغ کا فریضہ شاہانِ اسلام نے نہیں بلکہ اکثر و بیشتر ان درویشوں نے سرانجام دیا جو ہر قسم کی مادی طاقت سے محروم تھے مگر جن کے پاس اخلاق کی تلوار اور تعلیماتِ اسلامی کی ڈھال تھی۔

(۳) عرب تاجروں اور مبلغوں کی تبلیغ و تلقین سے عام غیر مسلموں کے علاوہ ہندوستان کے بہت سے امراء و حکمران بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی رعایا بھی مسلمان ہو گئی۔ اس طرح ایک

---

[1] یہ وہ حضرت بایزید بسطامیؒ نہیں ہیں جن کا تعلق عراق سے تھا۔ (مولف)

[2] یہ معلومات شمیم احمد صاحب کے مضمون بعنوان "مشرقی پاکستان میں اسلام کیسے پھیلا" سے ماخوذ ہے۔ مذکورہ مضمون ہفت روزہ پاک جمہوریت لاہور کے شمارہ ۳۰ مارچ ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا ہے۔ (مولف)

شخص کے قبول اسلام کے نتیجے میں سیکڑوں بلکہ بعض اوقات ہزاروں غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

(۴) ہماری مندرجہ بالا تصریحات سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کی واضح اکثریت عرب، افغانستان، ترکستان یا ایران سے آئے ہوئے مسلمانوں کی نہیں بلکہ ان لوگوں کی ہے جو آریوں کے زمانے میں بلکہ بعض ان سے بھی پہلے سے اس ملک میں آباد ہیں۔ عرب، افغانستان، ترکستان اور ایران سے آنے والے مسلمانوں کی نسلیں بھی یہاں کے لوگوں میں رہنے بسنے اور مقامی باشندوں میں شادیاں کرنے سے نہ افغانی رہیں نہ ایرانی نہ ترکستانی رہیں نہ عربی بلکہ خالص ہندوستانی ہو گئیں۔ جس طرح وسط ایشیا سے آئے ہوئے آریہ ہزاروں برس سے اس ملک میں آباد ہوتے اور یہاں کے لوگوں میں شادیاں کرنے کے بعد اپنے آپ کو خالص ہندی قرار دیتے ہیں پس جس طرح آریوں یا ہندوؤں کا یہاں کے باشندے ہونے کی وجہ سے اس ملک پر حق ہے اسی طرح مسلمانوں کا بھی اس ملک پر اتنا ہی حق ہے کیونکہ وہ بھی اس ملک میں سیکڑوں سال سے آباد ہیں اور اگر ان کے غیر مسلم آباؤ اجداد کی قدامتِ وطن کو مدنظر رکھا جائے تو یہ حق اور بھی دیرینہ ہو جاتا ہے۔ پھر انہوں نے یورپی اقوام کی طرح اس ملک کو اپنی چراگاہ نہیں بنایا نہ تجارتی منڈی کہ سامان سمیٹا اور اپنے وطن کی راہ لی بلکہ آریوں کی طرح انہوں نے اسے اپنا مستقل وطن بنایا انہوں نے اس سے جو کچھ حاصل کیا اس سے زیادہ اسے عطا کیا۔ انہوں نے اس ملک کے لوگوں کو رہنے سہنے کا ڈھنگ سکھایا۔ کھانے اور پہننے کا سلیقہ سکھایا۔ ان کے تمدن اور معاشرت میں انقلابی تبدیلیاں کیں۔ انہیں توہمات سے نجات دلائی۔ ان کے افکار کو جلا بخشی، انہیں علوم سے آراستہ کیا، انہوں نے یہاں سڑکیں، نہریں، پل، مدارس، دارالعلوم، شفاخانے، باغ قلعے، منارے، رصدگاہیں اور قصر و ایوان تعمیر کئے۔ صرف ان پر حکومت ہی نہیں کی بلکہ انہیں امورِ مملکت میں شریک بھی کیا انہیں دربار میں بڑے بڑے مناصب عطا کئے، جاگیریں عنایت کیں، خطاب بخشے، اپنی افواج کا کمانڈر بنایا، وزارتیں مرحمت کیں، عزت افزائی کے لئے ان کی بیٹیوں کو اپنے حرم میں داخل کیا اور اپنی ملکہ بنایا۔ غرض انہوں نے یہاں ایک نیا نظام قائم کیا۔ نئی زمین اور نیا آسمان بنایا۔ انہوں نے مختلف ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہندوستان کو ایک وحدت میں تبدیل کر دیا جس میں انسانیت کا اجالا اور عدل و مساوات کا بول بالا رہتا تھا انہوں نے کم و بیش ایک ہزار سال تک اس ملک پر بڑے جاہ و جلال سے حکومت کی۔ ان کے پاس ہر قسم کی طاقت تھی مگر تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے اپنی یہ طاقت ہندوؤں کو مسلمان بنانے پر صرف نہیں کی۔ ان کے عہد میں مندر، گرجے اور گردوارے آباد رہتے تھے۔ ہر مذہب کے پیرو کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی تھی اور مسلمان حکمران نہ صرف غیر مسلموں سے رواداری کا سلوک کرتے تھے بلکہ انہیں اہم عہدوں پر بھی فائز کرتے تھے۔ آئندہ صفحات میں ہم تاریخ کی اسی حقیقت سے نقاب کشائی کریں گے۔

مسلمان حکمرانوں کی ہندو نوازی

عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے بھی آریوں کی طرح زرخیز زمین کی تلاش اور خوشگوار آب و ہوا کی جستجو میں برصغیر کا رخ کیا۔ ان کا مقصد اس ملک پر قبضہ کرکے یہاں اپنی سلطنت قائم کرنا اور یہاں کے لوگوں کو تلوار کے زور سے دائرہ اسلام میں داخل کرنا تھا۔ بعض متعصب مورخوں نے اسلامی عہد کے ہندوستان کی جو تصویر کھینچی ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان یہاں اس طور سے حکومت کرتے تھے کہ غیر مسلموں کی زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ ان کا کام مسلمانوں کی غلامی کرنے کے سوائے اور کچھ نہ تھا۔ لیکن ان خیالات کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں اور ان کی تہہ میں ہندوؤں کا منظم پروپگنڈہ کارفرما ہے۔ تاریخ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاید مسلمان اس ملک میں فاتح کی حیثیت سے کبھی داخل نہ ہوتے اگر یہاں کے بعض سرکش اور متعصب راجہ ان سے چھیڑ چھاڑ نہ کرتے۔ چنانچہ تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ سندھ پر مسلمانوں کے حملے کی وجہ ان مسلمان عورتوں اور بچوں کی قزاقوں کے ہاتھوں گرفتاری ہے جو جزیرہ سیلون سے عرب جا رہے تھے۔ جب سندھ کے راجہ داہر سے ان عورتوں اور بچوں کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا اور قزاقوں کو سزا دینے کی ہدایت کی گئی تو اس نے اس سلسلے میں کوئی قدم نہ اٹھایا اور پھر سندھ کی فتح کے بعد یہ عورتیں اور بچے داہر ہی کی حدودِ سلطنت سے برآمد کئے گئے۔ اسی طرح شمال مغرب کے دروں سے آنے والا پہلا مسلمان فاتح سلطان ناصر الدین سبکتگین بھی اس سرزمین پر فاتح کی حیثیت سے قدم نہ رکھتا اگر اس کا پڑوسی راجہ جے پال سبکتگین کی حدودِ سلطنت پر وقتاً فوقتاً حملے کرکے اسے دعوتِ پیکار نہ دیتا۔ پس یہ تھے وہ حالات جو برصغیر میں اسلامی سلطنت کے قیام کا باعث بنے۔ مسلمانوں نے سندھ کی فتح سے لے کر پلاسی کی جنگ تک اس ملک پر کم و بیش ایک ہزار سال حکومت کی۔ اس ایک ہزار سالہ مسلم عہدِ حکومت کی تاریخ ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ مسلمان حکمراں عرب، افغانستان، ایران اور ترکستان سے آئے اور برصغیر پر اسلام کا پرچم لہرایا۔ مگر انہوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنالیا۔ اس کی تعمیر و ترقی اور استحکام کے لئے انہوں نے شبانہ روز کوشش کی۔ یہاں آکر وہ اپنے اصلی وطن کو بالکل بھول گئے۔ انہوں نے اس ملک پر

غیر ملکی باشندوں کی حیثیت سے حکومت نہیں کی بلکہ اس ملک کے باشندوں کی حیثیت سے یہاں کا نظام حکومت چلایا اور یہاں کے لوگوں کو اپنا شریک کار بنایا۔ انہیں بڑے بڑے عہدے دیئے۔ نہایت اہم مہمات ان کے سپرد کیں۔ انہیں خطابات، انعامات اور جاگیروں سے نوازا۔ ذیل میں اس اجمال کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

محمد بن قاسم کا غیر مسلموں سے سلوک

برصغیر میں اسلامی حکومت کا آغاز سندھ کے فاتح اور پہلے مسلمان حاکم محمد بن قاسم سے ہوا۔ اس کا مختصر تذکرہ تبلیغ اسلام کے باب میں کیا جا چکا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ نہایت منصفانہ سلوک کیا لیکن اس کا یہ سلوک صرف عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنے تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے سندھ کے غیر مسلموں کو امور مملکت میں بھی شریک کیا۔ چنانچہ سی ساکر کو جو راجہ داہر کا وزیر تھا محمد بن قاسم نے بھی اپنی حکومت میں وزارت کا عہدہ عطا کیا۔ ایک اور ہندو سردار نوبہ بن ہارن کو دھلیلہ کی قلعداری پر فائز کیا۔ راجہ داہر کے خاندان کے ایک قابل شخص کسکا کو وزیر مال مقرر کیا اور اسے "مبارک مشیر" کا خطاب عطا کیا۔ برہمن آباد فتح کرنے کے بعد اس شہر کے مالی امور کے انتظامات کے لئے چار معزز ہندوؤں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جسے دیوانی عدالت کے اختیارات تفویض کئے۔ چار برہمن سرداروں کو قلعہ کی حفاظت پر مامور کیا اور ان میں سے ہر ایک کو ایک ایک لشکر مرتب کرنے کا حکم دیا جو غیر مسلموں پر مشتمل تھا۔ سندھ کے اس وقت کے مشہور شہر ارور کا حاکم ایک ہندو لونبر بن داس کو مقرر کیا۔ علاقہ بیزون کی حکومت ایک سندھی غیر مسلم بھدرکن کو عطا کی۔ حتیٰ کہ محمد بن قاسم اور اس کے جانشینوں نے مندروں کی سرپرستی بھی کی اور ان کے انتظام و انصرام کے لئے مناسب مالی امداد کا بندوبست کیا۔ برہمن آباد کے بڑے مندر کے اخراجات کا سرکاری طور پر انتظام کیا گیا اور اس مندر سے وابستہ برہمنوں کے وظیفے بھی مقرر کئے گئے۔ مال گذاری کی رقم میں سے تین فی صد حصہ برہمنوں کے لئے مخصوص کیا گیا۔[1]

سلاطین غزنی کا غیر مسلموں سے سلوک

سندھ کے بعد غزنویوں کا عہد حکومت مسلم تاریخ کا وہ عہد ہے جس میں شمالی ہند کے لوگ اسلام سے روشناس ہوئے۔ لیکن اس عہد میں تبلیغ اسلام کا کارنامہ جیسا کہ ہم گذشتہ باب میں تحریر کر چکے ہیں

---

[1] تاریخ سندھ ص ۶۹، ۷۰، ۷۸، ۳۷۷ مولفہ سید ابوظفر ندوی

ان سلاطین نے نہیں بلکہ درویشوں اور صوفیوں نے انجام دیا۔ یہ درست ہے کہ ان سلاطین نے برصغیر کے دور دراز علاقوں تک پیش قدمی کی لیکن پنجاب کے سوائے اس خاندان کے حکمرانوں نے کسی علاقے میں بھی اپنی حکومت قائم نہیں کی۔ اپنے مختصر عہد حکومت میں سلاطین غزنی نے سابق پنجاب کے غیر مسلم سرداروں کے ساتھ نہایت رواداری اور عالی ظرفی کا سلوک کیا۔ انہیں اپنا معتمد و مشیر بنایا اور فوجی خدمات پر مامور کیا۔ اس حقیقت کا اعتراف ہندو مورخوں نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ بمبئی یونیورسٹی کے فیلو اور مشہور مورخ مسٹر سی۔ وی۔ ویدیہ محمود غزنوی کے نامور فرزند سلطان مسعود کے عہد کا ایک واقعہ درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"جب احمد نیا لتگین ہندوستان کا سپہ سالار مقرر ہوا تو اس کو خلعت دیا گیا۔ پھر زبانی حکم سنایا گیا اور ایک سند دی گئی۔ اس سے حلف اٹھوایا گیا اور پھر اس نے ایک تحریری معاہدے پر دستخط کئے جس میں یہ لکھا تھا کہ وہ وفادار بن کر اپنے فرائض انجام دیتا رہے گا اور جب یہ معاہدہ سلطان نے دیکھ لیا تو پھر .... اس کو بحفاظت تمام رکھ دیا گیا۔ احمد نیا لتگین نے ہندوستان میں بنارس تک یلغار کی جہاں تک کہ بیہقی کا بیان ہے کہ محمود بھی نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس کامیابی نے نیا لتگین کے دماغ میں فتور پیدا کر دیا اور اس نے ایک آزاد سلطنت قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن قاضی نے اس کی اطلاع مسعود کو دی تو اس نے ایک ہندو فوجی سردار کو اس کی گرفتاری پر مامور کیا اور بالآخر نیا لتگین پسپا ہوا اور ہندو (جاٹوں) کے ہاتھوں مارا گیا۔"[1]

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد مسٹر سی۔ وی۔ ویدیہ لکھتے ہیں:۔

"اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو غزنی کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں بڑے ذمہ دار عہدوں پر مامور تھے۔ محمود (غزنوی) نے اپنے دور میں ان کا تقرر کرنا شروع کر دیا تھا۔"[2]

اسی ہندو مورخ کا بیان ہے کہ مسعود کی جانشینی کی جنگ میں سوندرائے اس کی حمایت میں لڑا تھا۔ تیجے رائے محمود اور مسعود دونوں کے دور میں ایک فوجی سردار رہا۔[3]

ترکوں کے عہد میں ہندو نوازی

غزنویوں کے بعد سلطان شہاب الدین محمد غوری کا دور حکومت شروع ہوا۔ اس کے جانشین

---

[1]، [2]، [3] ہسٹری آف مڈیول ہندو انڈیا بحوالہ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک صد ۴۲ مولفہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن۔

خاندان غلاماں کے نام سے مشہور ہوئے۔ پھر خلجیوں اور تغلقوں کا دور حکومت آیا اور یہ سب ترک لوگ تھے۔ ان مسلم حکومتوں میں بھی غیر مسلم امرا، سرداروں اور عالموں کی بڑی قدر و منزلت کی گئی۔ اور انہیں ذمہ دارانہ عہدوں پر فائز کیا گیا۔ چنانچہ ڈاکٹر تارا چند جو مشہور ہندو مورخ گذرے ہیں، اس عہد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"جب مسلمانوں کی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی تو انہوں نے ہندوؤں کو مختلف عہدوں پر مقرر کرنا ضروری سمجھا۔ محمود غزنوی کی فوج میں بھی بکثرت ہندو سپاہی تھے جو اس کی حمایت میں وسط ایشیا تک جاکر لڑے اور اس کے ایک ہندو فوجی کمانڈر تلک نے اس کے ایک مسلمان فوجی عہدیدار کی بغاوت کو فرو کیا۔ اور جب قطب الدین ایبک نے ہندوستان میں رہ کر حکومت کرنے کا فیصلہ کیا تو اس نے ملکی نظام کو چلانے کے لئے ہندوؤں ہی کو مقرر کیا۔ ہندوؤں ہی نے ان کے لئے عمارتیں بنائیں جن میں پرانی چیزیں نئے حالات کے مطابق شامل کی گئیں۔ ہندو سناروں ہی نے ان کے لئے سکے ڈھالے اور ہندو محاسبوں نے ان کے حساب کتاب درست کئے۔ پنڈتوں نے ہندو قوانین پر عمل درآمد کرانے میں ان سلاطین کو مشورے دیئے اور برہمن نجومیوں کی رائے سے حکومت اور دربار کے مختلف کام انجام پاتے تھے"[1]

غیاث الدین بلبن، علاء الدین خلجی، محمد تغلق اور فیروز تغلق برصغیر کے ترک سلاطین میں نہایت نامور اور پر شوکت بادشاہ گذرے ہیں۔ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان جلیل القدر سلاطین نے بھی اپنے اپنے عہد حکومت میں ہندو امراء اور ہندو علما کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی۔ چنانچہ مورخین نے لکھا ہے کہ :

"بلبن ہندو سرداروں کو بڑا اعزاز بخشا کرتا تھا۔ ہندو سرداروں کا اقتدار علاء الدین کے عہد میں اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس کو کم کرنا پڑا گو اس نے مسلمان امرا کو بھی نہیں چھوڑا۔ علاء الدین کے بعد ہندو سرداروں کی حیثیت اور بھی نمایاں ہوتی گئی۔ محمد بن تغلق کے عہد میں وہ اور بھی زیادہ طاقتور ہو گئے۔ وہ نہ صرف صوبوں کے گورنر اور محکمہ مال کے اعلیٰ

---

[1] ڈاکٹر تارا چند بحوالہ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک صد ۱۱۲، ۱۱۱ مولفہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن۔

عہدیدار مقرر کیے جانے لگے بلکہ ان کے اثرات اتنے بڑھ گئے تھے کہ مسلمان مورخین ان کا ذکر رشک و حسد سے کرنے لگے تھے۔ فیروز شاہ کے محبوب ہم جلیسوں میں ہندو سردار بھی شامل تھے اور اس کے بعد جب حکومت میں انتشار پھیلا تو ہندو راجاؤں نے سیاسی ریشہ دوانیوں میں بھی حصہ لیا اور پھر مشرقی ہندوستان میں ان کی قوت اتنی بڑھ گئی تھی کہ یہ مشکوک نظر آنے لگا تھا کہ مسلمانوں کی حکومت پھر اس حصے میں قائم ہو سکے گی کہ نہیں۔۔۔۔ "فتاویٰ جہانداری" میں ہے کہ محمد تغلق کے عہد میں خراجیوں اور ذمیوں (غیر مسلموں) نے بڑی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ ان کا بڑا اعزاز کیا جاتا ہے۔ ان کو نقارے اور علم دیئے جاتے ہیں جن میں جواہرات ٹکے ہوتے ہیں۔ کمخواب کا خلعت اور مرصع زین کسے ہوئے گھوڑے پیش کیے جاتے ہیں اور ان کو صوبوں کا حاکم اعلیٰ اور دوسرے بڑے بڑے ممتاز عہدوں پر مامور کیا جاتا ہے ہندو دارالسلطنت میں بھی بڑے بڑے مکانات محلات ہی کی طرح بناتے ہیں وہ کمخواب کے لباس پہنتے ہیں۔ عربی گھوڑوں کی سواری کرتے ہیں جن پر چاندی اور سونے کا ساز ہوتا ہے اور ان کی عظمت طرح طرح سے ظاہر ہوتی ہے اور وہ عیش و تنعم کی زندگی گذارتے ہیں ان کے یہاں مسلمان بھی نوکر ہیں جو ان کی سواری کے آگے دوڑتے ہوئے چلتے ہیں[1]"

ایک اور غیر مسلم مورخ پروفیسر کے ایم پانیکار جو تاریخ کے پروفیسر ہیں اور بھارت کی طرف سے مصر میں سفیر بھی رہ چکے ہیں ترک سلاطین کی غیر مسلم نوازی پر انہیں خراج تحسین ادا کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگر تحقیق کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ کہنا بھی غلط ہو گا کہ مسلمان حکمران ہندو تہذیب کو تحقیر کی نظر سے دیکھتے تھے۔ علاء الدین خلجی اور فیروز تغلق متعصب حکمران سمجھے جاتے ہیں لیکن ان دونوں نے بھی ہندو پیشواؤں کی بڑی عزت اور توقیر کی جینیوں کے ماخذ سے پتہ چلتا ہے کہ علاء الدین نے اچاریہ مہاسین کو کرناٹک سے اپنے دربار میں مدعو کیا۔ اس سے مذہبی مناظرے کیے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فرقہ دیگمبر جین کے پیشوا پورنا چند جو دہلی ہی میں رہتے تھے اور سو تمبر یوگی رام چندر سوری کی پذیرائی سلطان علاء الدین

---

[1] دی ایڈمنسٹریشن آف دی سلطنیٹ آف دہلی مولفہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی بحوالہ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک ص ۴۰۹، ۴۰۸، ۴۰۷

خلجی کے یہاں بہت تھی۔ غیاث الدین تغلق کے عمال میں دو جین تھے جن کا اثر سلطنت پر بہت تھا۔ فیروز تغلق رتن سیکھر شاعر کا بڑا احترام کرتا تھا۔[۱]"

مغل سلاطین کی ہندو نوازی

ترکوں کے بعد برصغیر پر افغانوں نے اپنی حکومت قائم کی اور پھر مغلوں کا ستارۂ اقبال طلوع ہوا۔ مغل سلاطین نے برصغیر پر کم و بیش تین سو سال حکومت کی۔ تاریخ اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ مغل مذہب کے معاملے میں سب سے زیادہ رواداد تھے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اورنگ زیب عالمگیر کے سوائے کسی مغل بادشاہ نے اشاعتِ اسلام کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔ یہ لوگ مسلمان ضرور تھے مگر ان کو مذہب سے وہ لگاؤ نہ تھا جو ترک اور افغان سلاطین کو تھا۔ ان کی ساری توجہ ملک کی وسعت اور رعایا کی فلاح و بہبود پر مرکوز رہی۔ ان کے زمانے میں ملک نے اقتصادی، تمدنی اور علمی لحاظ سے حیرت انگیز ترقی کی۔ اگرچہ وہ مسلمان ہونے کی وجہ سے بت پرستی کے مخالف تھے لیکن انہوں نے اس مخالفت کو امورِ سلطنت میں دخیل نہ ہونے دیا۔ ان کے عہد میں ہندوؤں نے جو ترقی کی اس کی مثال برصغیر کی پوری تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ چنانچہ ڈاکٹر برنیر جو مغلوں کے عہد میں ہندوستان میں مقیم تھے اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں کہ "مغل سلاطین کا مذہب باوجودیکہ بت پرستوں کے مذہب سے بالکل مختلف و متضاد ہے لیکن متعدد ہندو راجا ان کے درباروں سے وابستہ ہیں اور اکثر اوقات ان کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہ (مغل سلاطین) ان لوگوں (ہندو امراء) سے بالکل ایسا ہی سلوک کرتے ہیں جیسا اپنے مسلمان امرا سے کرتے ہیں۔ وہ ہندو امراء کو مسلمان سرداروں کی طرح فوجی عہدوں پر متعین کرتے ہیں اور انہیں سردار مقرر کرتے ہیں۔[۲]"

ان مغل سلاطین میں اکبر تو وہ عالی ظرف حکمران گذرا ہے جس کی مذہبی رواداری لامذہبیت کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے ہندو راجکماریوں سے اپنی اور اپنے بیٹے کی شادیاں کیں۔ انہیں اپنے دربار کے نورتنوں میں شامل کیا۔ فوجی مہمات ان کے سپرد کیں۔ سول عہدوں پر بھی انہیں فائز کیا حتیٰ کہ ان کی بعض مذہبی رسوم بھی اختیار کر لیں۔ راجکماریوں سے اکبر اور اس کے بیٹے کی شادیوں کے سلسلے میں مشہور ہندو مورخ سجان رائے بٹالوی کا بیان ہے کہ اکبر نے راجپوتانے کے سب سے بڑے راجا بھاڑامل کچھواہہ کو اس کی بیٹی کے لئے اپنی شادی کا پیغام دیا۔ راجہ نے ابتدا میں مذہبی اختلاف کی بنا پر کچھ

۱۔ اے سروے آف انڈین ہسٹری بحوالہ ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک جھلک صـ ۳۴۵

۲۔ سفرنامہ ڈاکٹر برنیر جلد ۱ صـ ۷۶

تامل کیا مگر بالآخر اس نے اکبر کا پیغام قبول کر لیا اور اپنی بیٹی اس کے عقد میں دے دی۔ پھر اس نے اپنے بیٹے شہزادہ سلیم کا رشتہ جو بعد میں جہانگیر کے لقب سے سریر آرائے سلطنت ہوا۔ راجہ بھگوان داس کی بیٹی کے لئے پیش کیا۔ راجہ بھگوان داس نے بھی رشتہ قبول کر لیا۔ جہانگیر کی دوسری شادی جودھپور کے راجہ موٹا راجہ کی بیٹی سے کی۔ مغل حکمران شاہجہان اسی ہندو ملکہ کے بطن سے پیدا ہوا[1]۔

اب ذیل میں عہد مغلیہ کے ان ہندو سرداروں کی فہرست درج کی جاتی ہے جو اہم فوجی اور سول عہدوں پر مامور ہوئے۔ اس کے مطالعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مغل سلاطین کس قدر غیر متعصب روادار اور عالی ظرف تھے۔ ان کے عہد میں کوئی شخص مذہبی اختلاف کی بنا پر اپنے حقوق سے محروم نہیں ہو سکتا تھا اور نہ اس کی اعلیٰ صلاحیتیں محض اختلاف مذہب کی وجہ سے ضائع ہوتی تھیں۔

عہد اکبری

(۱) راجہ اودے سنگھ (۲) راجہ آسکرن کچھواہا (۳) راجہ انوپ سنگھ بڑگوجر (۴) راجہ اندرمن دھندیرہ (۵) راجہ بھاڑا مل کچھواہا (۶) امیر الامرا راجہ بھگوان داس کچھواہا (۷) راجہ بیربل (۸) رائے بھوج ہاڈا (۹) راجہ باسو (۱۰) راجہ بھاؤ سنگھ (۱۱) راجہ بکرماجیت پتر داس (۱۲) عمدۃ الملک راجہ ٹوڈر مل (۱۳) راجہ جگناتھ کچھواہا (۱۴) جگمل کچھواہا (۱۵) راجہ جے مل کچھواہا (۱۶) کنور جگت سنگھ کچھواہا (۱۷) رائے درگا داس سیسودیہ (۱۸) رائے دلیپ سنگھ (۱۹) راجہ رام چند چوہان (۲۰) راجہ روپسی کچھواہا (۲۱) راجہ رام چند اوڑیسہ (۲۲) راجہ راج سنگھ کچھواہا (۲۳) راجہ رام چند بگھیلا (۲۴) راجہ رام داس کچھواہا (۲۵) رائے کلیان مل راٹھور (۲۶) راجہ رائے سنگھ بیکانیری (۲۷) راجہ رائے سنگھ جھالا (۲۸) رائے سرجن ہاڈا (۲۹) رانا شنکر (۳۰) راجہ شیام سنگھ (۳۱) رائے کلیان مل بیکانیری (۳۲) راجہ کشن داس (۳۳) راجہ راول بھیم (۳۴) کیشو داس مارو راٹھور (۳۵) راجہ لکھمن بھدوریہ (۳۶) رائے لون کرن کچھواہا (۳۷) راجہ مان سنگھ (۳۸) مادھو سنگھ کچھواہا (۳۹) راجہ مہان سنگھ کچھواہا (۴۰) رائے منوہر داس کچھواہا۔

عہد جہانگیری

(۴۱) اودے جی رام (۴۲) لالہ ابن راجہ بیربل (۴۳) راجہ باسو (۴۴) راجہ بھاؤ سنگھ کچھواہا۔ (۴۵) بسونت راؤ (کار طلب خاں) (۴۶) رائے بہاری داس بخشی (۴۷) رائے بنوالی داس (۴۸) راؤ

---

[1] خلاصۃ التواریخ مولفہ سجان رائے بٹالوی

بھارت بندیلہ (۴۹) راجہ جھجار سنگھ بندیلہ (۵۰) راجہ جگت سنگھ (۵۱) مرزا راجہ جے سنگھ کچھواہا (۵۲) رائے
دلیپ سنگھ (۵۳) راجہ امر سنگھ (۵۴) سربلند رائے راؤ رتن ہاڈا (۵۵) روپ چند گوالیاری (۵۶)
راجہ رام داس نروری (۵۷) راجہ سورج سنگھ راٹھور (۵۸) راجہ سورج مل (۵۹) رائے سورج سنگھ
(راؤ سور) (۶۰) رائے رایاں راجہ بکرماجیت (۶۱) راجہ سارنگ دیو (۶۲) راجہ سنگرام (۶۳) راجہ راول
کلیان (۶۴) کشن سنگھ راٹھور (۶۵) راجہ کلیان (۶۶) کرسی راٹھور (۶۷) راجہ بکرماجیت بھدوریہ (۶۸)
راجہ بھوج بھدوریہ (۶۹) رائے گوردھن سورج دھج (۷۰) رائے گردھر کچھواہا (۷۱) راجہ گج سنگھ راٹھور
(۷۲) رائے مانی داس (۷۳) راجہ مان سنگھ (۷۴) راجہ ادے سنگھ (۷۵) مہاراجہ نرسنگھ دیو۔

عہدِ شاہجہانی

(۷۶) راجہ انرودہ گوڑ (۷۷) راجہ امر سنگھ نروری (۷۸) راؤ امر سنگھ راٹھور (۷۹) راؤ امر سنگھ
چندراوت (۸۰) اندر سال ہاڈہ (۸۱) جگ راج بکرماجیت بندیلہ (۸۲) راجہ بدن سنگھ بھدوریہ (۸۳)
راجہ بیٹھل داس گوڑ (۸۴) ارجن ابن بیٹھل داس (۸۵) بلبھدر شیخاوت (۸۶) بہاری داس کچھواہا (۸۷)
راجہ بھیم راٹھور (۸۸) رائے بلوی چوہان (۸۹) رائے بہاری مل دیوان (۹۰) راجہ پہاڑ سنگھ بندیلہ (۹۱)
پرتھی راج راٹھور (۹۲) پرسوجی بھونسلا (۹۳) راجہ پرتاب چند اجینیہ (۹۴) راجہ پرتھی چند (۹۵) پرم
دیو سیسودیہ (۹۶) رائے تلوک چند شیخاوت (۹۷) راجہ رائے ٹوڈرمل افضل خانی (۹۸) مہاراجہ جسونت
سنگھ راٹھور (۹۹) چتر بھوج چوہان (۱۰۰) چندربھان نروکا (۱۰۱) منشی رائے چندربھان (۱۰۲) چندرمن
بندیلہ (۱۰۳) راجہ دیبی سنگھ بندیلہ (۱۰۴) راؤ دودا سیسودیہ (۱۰۵) راجہ دوارکا داس کچھواہا (۱۰۶) رائے
رایاں دیانت رائے گجراتی (۱۰۷) راوت دیال داس جھالا (۱۰۸) راجہ رائے سنگھ راٹھور (۱۰۹) رائے
سنگھ جھالا (۱۱۰) راجہ روپ سنگھ راٹھور (۱۱۱) راؤ روپ سنگھ راٹھور (۱۱۲) راؤ روپ سنگھ چندراوت
(۱۱۳) راجہ راج روپ (۱۱۴) راج سنگھ راٹھور پردھان (۱۱۵) رائے رایاں راجہ رگھناتھ داس (۱۱۶)
رام سنگھ راٹھور (۱۱۷) راجہ رام سنگھ کچھواہا (۱۱۸) سنگرام گونڈ (۱۱۹) [1] ستر سال کچھواہا (۱۲۰) اگرسین کچھواہا
(۱۲۱) راؤ ستر سال ہاڈا (۱۲۲) راجہ سیورام گوڑ (۱۲۳) سجان سنگھ سیسودیہ (۱۲۴) راجہ سجان سنگھ بندیلہ
(۱۲۵) سبل سنگھ سیسودیہ (۱۲۶) رانا راج سنگھ (۱۲۷) راؤ کرن بیکانیری (۱۲۸) راجہ کشن سنگھ بھدوریہ

---

[1] یہ عہد جہانگیری کا منصب دار تھا مگر شاہجہاں کے عہد میں بادشاہ کی طرف سے نہایت بہادری سے
لڑتا ہوا مارا گیا اس لئے ہم نے اس کا ذکر امرائے شاہجہانی میں کیا ہے (مولف)

(۱۲۹) غیرت سنگھ کچھواہا (۱۳۰) رائے کاشی داس (۱۳۱) گردھر داس گوڑ (۱۳۲) گوکل داس سیودیہ (۱۳۳) گوردھن راٹھور (۱۳۴) راجہ مان سنگھ گوالیاری (۱۳۵) رائے مکند داس نارنولی (۱۳۶) مہیش داس راٹھور جہابت خانی (۱۳۷) مہیش داس راٹھور (۱۳۸) مادھو سنگھ ہاڈا (۱۳۹) مکند سنگھ ہاڈا (۱۴۰) مالوجی بھونسلا (۱۴۱) راجہ جہا سنگھ بھدوریہ (۱۴۲) ہری سنگھ راٹھور (۱۴۳) ہردے رام کچھواہا (۱۴۴) ہمیر سنگھ سیودیہ [1]

عہد عالم گیری

اورنگ زیب عالمگیر برصغیر کا "بدنام ترین" حکمران ہے جسے اکثر ہندوؤں اور بعض انگریز مورخوں نے ہنود کا دشمن اور سخت ترین متعصب قرار دیا ہے۔ ہندوؤں پر اس کے مظالم کی ایسی ایسی داستانیں وضع کی گئی ہیں کہ انہیں پڑھ کر غیر مسلموں کے دلوں میں اس کے خلاف نفرت کا آتش فشاں جوش زن ہو جانا قدرتی امر ہے مگر ان داستانوں کو حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں وہ بھی اپنے اسلاف کی طرح لائق ہندوؤں کی قدر و منزلت کرتا تھا اور انہیں بڑے بڑے مناصب اور اعزاز عطا کرتا تھا بلکہ تاریخ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کبھی اسے غیر مسلموں کی سرپرستی کرنے سے روکا گیا تو اس نے اس مشورے کو سختی سے رد کر دیا چنانچہ پروفیسر آرنلڈ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "دی پریچنگ آف اسلام" میں اس کا ایک واقعہ درج کیا ہے :-

"عالمگیر کو کسی شخص نے عرضی دی کہ دو پارسی ملازموں کو جو تنخواہ تقسیم کرنے پر مقرر تھے اس علت میں برخاست کر دیا جائے کہ وہ آتش پرست ہیں اور اُن کی جگہ کسی تجربہ کار مسلمان کو مقرر کیا جائے کیونکہ قرآن شریف میں آیا ہے یا ایھا الذین آمنوا لا تتخذوا عدوی و عدوکم اولیاء (اے ایمان والو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت جانو) عالمگیر نے عرضی پر حکم لکھا کہ مذہب کو دنیا کے کاروبار میں دخل نہیں ہے اور نہ ان معاملات میں تعصب کو جگہ مل سکتی ہے اور اس قول کی تائید میں یہ آیت نقل کی لکم دینکم ولی دین (تم کو تمہارا دین اور ہم کو ہمارا دین) بادشاہ نے لکھا کہ

---

[1] مغل سلاطین کے ہندو امراء کی یہ فہرست "امرائے ہنود" نامی کتاب مؤلفہ منشی محمد سعید احمد مارہروی سے ماخوذ ہے جو انہوں نے انجمن ترقی اردو کی فرمائش پر لکھی تھی اور ایم اے او کالج بک ڈپو علی گڑھ نے شائع کی تھی (مطبوعہ نامی پریس کانپور ماہ مئی ۱۹۱۰ء) اس کے علاوہ بادشاہ نامہ، شاہجہاں نامہ اور منتخب اللباب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

جو آیت عرضی نویس نے نقل کی ہے اگر یہی سلطنت کا دستور العمل ہوتا تو ہم کو چاہیئے تھا کہ اس ملک کے سب راجاؤں اور ان کی رعیت کو غارت کر دیتے مگر یہ کس طرح ہو سکتا تھا۔ بادشاہی نوکریاں لوگوں کو ان کی لیاقت اور قابلیت کے موافق ملیں گی اور کسی لحاظ سے نہیں مل سکیتیں[1]۔"

یہ اورنگ زیب کا وہ دستور العمل تھا جس پر وہ تمام عمر قائم رہا۔ اس کے دربار میں نہایت اہم مناصب پر ہندو فائز تھے جن پر وہ حد درجہ اعتماد کرتا تھا۔ نہایت اہم مہمات ان کے سپرد کرتا تھا قلعوں کی حفاظت پر انہیں مامور کرتا تھا۔ مالیات کے شعبے ان کے سپرد کرتا تھا اور ان کی دلدہی اور دلجوئی میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑتا تھا۔ شمس العلما مولانا شبلی نے اپنی ایک کتاب میں عہد اورنگ زیب کے ہندو امرا کی ایک فہرست درج کی ہے۔ اس کے مطالعے سے اورنگ زیب کی ہندو نوازی اور مذہبی رواداری میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ یہ فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

(۱) راجہ بھیم سنگھ۔ پنج ہزاری کے منصب پر فائز تھا اور عالمگیر کی طرف سے برہان پور کی جنگ میں شریک ہوا (۲) اندر سنگھ۔ اودے پور کے مہارانا جے سنگھ کا بھائی تھا۔ پنج ہزاری کے منصب تک ترقی کی (۳) بہادر سنگھ۔ یہ بھی اودے پور کے مہارانا جے سنگھ کا بھائی تھا اور نگ زیب نے ایک ہزاری پانچ صد کے منصب پر ترقی دی (۴) راجہ مان سنگھ۔ مانڈل پور اور دیدہنور کا فوجدار مقرر ہوا۔ پھر سہ ہزاری کا منصب عطا کیا گیا (۵) اچلاجی۔ سیواجی کا داماد تھا۔ پنج ہزاری منصب کے علاوہ علم و نقارہ عطا ہوا (۶) ارجوجی۔ سیواجی کے بیٹے سنبھا کا چچازاد بھائی تھا۔ منصب دو ہزاری پر فائز کیا گیا۔ (۷) مانکوجی۔ سنبھا کے ملازمین میں سے تھا۔ عالمگیر نے منصب دو ہزاری عطا کیا (۸) راؤ انوپ سنگھ۔ یہ بھی اورنگ زیب کے عہد میں منصب دار تھا۔ (۹) راجہ انوپ سنگھ۔ سکہ کا قلعدار مقرر ہوا (۱۰) راجہ اودیت سنگھ۔ ایرج کا فوجدار اور دو ہزار پانچ صد کے منصب پر فائز کیا گیا (۱۱) اودے سنگھ۔ اسے بھی ایرج کا فوجدار مقرر کیا گیا اور دو ہزار پانچ صد کا منصب عطا ہوا (۱۲) باسدیو سنگھ پہلے سہ ہزاری پھر پنج ہزاری اور آخر میں ششش ہزاری کا منصب دیا گیا (۱۳) کانہوجی میر کمہ۔ پہلے پنج ہزاری پھر ایک ہزاری کا اضافہ ہوا (۱۴) سنر سال بندیلہ۔ قلعہ تارا کا قلعدار مقرر ہوا (۱۵) بشن سنگھ یک ہزار و چہار صد کے منصب پر فائز کیا گیا (۱۶) رام چند۔ دو ہزار و پانچ صد کا منصب عطا کیا گیا۔

---

[1] دی پریچنگ آف اسلام ص ۲۷۵

(۱۷) کوکب چند۔ پہاڑ سنگھ کو شکست دینے کے صلے میں رائے رایاں کا خطاب ملا (۱۸) بیھا کو۔ بخارہ پنج ہزاری منصب پر فائز کیا گیا (۱۹) جگیا۔ سہ ہزاری کا منصب عطا ہوا۔ (۲۰) درگا داس راٹھور۔ سہ ہزاری کے منصب پر بحال کیا گیا (۲۱) روپ سنگھ۔ ایک ہزاری کے منصب پر ترقی دی گئی (۲۲) سوبھان۔ پنج ہزاری منصب اور خلعت و نقارہ وغیرہ عطا ہوا (۲۳) شیو سنگھ۔ یک نیم ہزاری کا منصب عطا ہوا (۲۴) مانڈھاتا۔ قلعہ جیمت کی تسخیر کرنے والے لشکر کا کماندار مقرر ہوا (۲۵) کشور داس۔ شولاپور کا قلعدار مقرر کیا گیا (۲۶) راجہ کلیان سنگھ۔ ہفت صدی پر دو صدی کا اضافہ ہوا۔[1]

یہ نامکمل فہرست ہے اور مولانا شبلی نے ماثر عالمگیری سے مرتب کی ہے۔ بعض اور کتابوں میں عہد عالمگیری کے جن ہندو امرا کے نام درج ہیں ان سے یہ تعداد چالیس سے بھی تجاوز کر جاتی ہے۔ مثال کے طور پر رگھناتھ سنگھ سیسودیہ جو رانا اودے پور کی ملازمت میں تھا اور وہاں سے علیحدہ ہو کر عالمگیر کے دربار میں حاضر ہوا۔ یہاں اس کی نہایت قدر و منزلت کی گئی۔ اورنگ زیب نے اسے ایک ہزار روپے مالیت کی مرصع تلوار عطا کی۔ منصب ہزاری پر مقرر کیا اور بسانہ و امان کے علاقوں کے انتظام پر مامور کیا۔ اسی طرح ہر رائے عہد عالمگیری میں شہر سورت کا ناظم تھا جو اس زمانے کا بہت بڑا تجارتی شہر تھا۔ رائے مکرند بریلی کا ناظم تھا۔ پھر بنگال میں تبدیل کر دیا گیا۔ رائے لعل چند۔ یہ بھی عہد عالمگیری کا نامور عہدے دار تھا۔ دیوان خالصہ کے منصب پر فائز تھا۔ پھر اورنگ زیب نے اسے کابل کی مال گذاری کی تشخیص اور بعض مقدمات فیصل کرنے کے لئے متعین کیا۔ یہی نہیں اس نے بعض مواقع پر ہندوؤں کو سفارت کا منصب بھی عطا کیا چنانچہ خافی خاں کا بیان ہے کہ جب شہزادہ مراد کی طرف سے اس کے ہندو جرنیل جسونت سنگھ نے اورنگ زیب کا راستہ روکا تو اس نے کب[2] نامی ایک برہمن کو جو نہایت اچھا خطیب اور ہندی بھاشا کا شاعر تھا راجہ جسونت سنگھ کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا کہ وہ اورنگ زیب کی راہ میں مزاحم نہ ہو۔ اورنگ زیب نے مرہٹوں، راجپوتوں اور اپنے مسلمان حریفوں سے جتنی جنگیں لڑیں ان سب میں مسلمان جرنیلوں کے ساتھ ساتھ ہندو جرنیل بھی اس کی طرف سے شریک ہوئے۔ اگر اورنگ زیب ہندوؤں کا دشمن اور ان سے بدظن ہوتا تو وہ سیواجی جیسے سرکش اور باغی کی سرکوبی پر ہندو جرنیل مہاراجہ جے[3] سنگھ کو کبھی مامور نہ کرتا اور اس کی امداد کے لئے ریاست بوندی کے مہاراجہ بھاؤ سنگھ کو کبھی متعین نہ کرتا۔

۱؎ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ص ۷۹ تا ص ۸۷ مولفہ مولانا شبلی نعمانی

۲؎ منتخب اللباب حصہ دوم ص ۱۲ مولفہ نظام الملک خافی خاں مطبوعہ مظہر العجائب کلکتہ

۳؎ خافی خاں جلد دوم ص ۱۷۱

آخری مغل سلاطین کی ہندو نوازی

اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مغلیہ سلطنت کا دورِ زوال شروع ہو گیا۔ اس دور میں بہادر شاہ اول ابن اورنگ زیب کے سوائے کوئی بہادر اور منتظم شخص تخت مغلیہ پر نہیں بیٹھ سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ لیکن اس دور میں بھی مغل سلاطین نے اپنی ہندو نوازی کی روش میں فرق نہ آنے دیا۔ نہ صرف مغل سلاطین نے بلکہ ان کے گورنروں اور امرائے بھی ہندوؤں کی سرپرستی کی۔ ذیل میں ان ہندو امرا کی ایک مختصر سی فہرست درج کی جاتی ہے۔

(۱) راجہ اجیت سنگھ جو بہادر شاہ ابن اورنگ زیب کی طرف سے گجرات کا گورنر تھا (۲) جے سنگھ سوائی بہادر شاہ کے عہد کا ایک ممتاز منصب دار تھا (۳) مہاراجہ ابھی سنگھ راٹھور محمد شاہ کی طرف سے گجرات کا گورنر تھا (۴) رام راج بدھ سنگھ بہادر شاہ کے عہد کا ممتاز عہدیدار تھا (۵) مہاراؤ تو جی جسونت بنا لکر نواب نظام الملک آصف جاہ کی سرکار سے وابستہ تھا اور نواب ناصر جنگ کے عہد میں اسے مہاراؤ اور جسونت کے خطابات ملے (۶) راجہ چندر سین جادون فرخ سیر کے دربار میں منصب ہفت ہزاری پر فائز ہوا (۷) راجہ چھبیلا رام ناگر فرخ سیر کے عہد میں منصب پنج ہزاری پر فائز ہوا۔ اکبر آباد اور الہ آباد کا گورنر مقرر کیا گیا (۸) رائے خوش حال چند محمد شاہ کا پیش کار میر بخشی تھا (۹) رام سنگھ ہاڈا شاہزادہ محمد اعظم شاہ ابن اورنگ زیب کی طرف سے منصب چہار ہزاری پر فائز کیا گیا (۱۰) بھیم سنگھ نظام الملک کے حریف سید دلاور علی خاں کی فوج کا نامور جرنیل تھا (۱۱) راجہ رتن چند۔ فرخ سیر کی سرکار سے منصب دہ ہزاری اور راجہ کا خطاب ملا۔ الہ آباد کے گورنر سید عبد اللہ خاں کا دیوان تھا اور رفتہ رفتہ اتنا اقتدار حاصل کیا کہ فرخ سیر کے عہد سے محمد شاہ کے عہد تک مغلیہ سلطنت کی نظامت مال اور نظامت قضا کے سیاہ و سپید کا مالک ہو گیا (۱۲) ہنونت راؤ نواب صلابت جنگ کے عہد میں خطاب دھیراج سے نوازا گیا اور بہت سی جاگیریں عطا ہوئیں (۱۳) راجہ گردھر بہادر محمد شاہ کی طرف سے مالوہ کا گورنر تھا (۱۴) راجہ محکم سنگھ امیر الامرا سید حسین علی خاں کا دیوان تھا۔ حسین علی خاں کے قتل کے بعد شاہی امراء میں شامل کر لیا گیا اور ہفت ہزاری کا منصب عطا ہوا (۱۵) بینیا سندھیا مرہٹہ بہادر شاہ کے امرا میں سے تھا۔ منصب ہفت ہزاری نقارہ و علم اور اسپ و فیل سے نوازا گیا۔ دو لاکھ روپے نقد انعام بھی ملا۔ (۱۶) راجہ نول رائے احمد شاہ کے عہد میں اودھ اور الہ آباد کے صوبوں کا نائب گورنر تھا۔ صفدر جنگ نے اسے قنوج کی حکومت عطا کی (۱۷) رائے شیو داس محمد شاہ کے عہد حکومت میں صوبہ آگرہ کا نائب گورنر تھا (۱۸) کیشو رائے فرخ سیر کے عہدِ حکومت سے محمد شاہ کے

ابتدائی دور تک صوبہ دہلی کا گورنر رہا[۱]۔ یہ چند نام ہیں ورنہ اس عہد کے ہندو امرا کی فہرست بھی بہت طویل ہے۔

اکبر کے عہد سے لے کر دور انحطاط کے مغل سلاطین حتیٰ کہ ان کے گورنروں تک جتنے امرا برسر اقتدار آئے ان سب کا تذکرہ اس کتاب میں ناممکن ہے۔ کیونکہ اس کتاب کا موضوع مسلمان سلاطین کی ہندو نوازی نہیں ہے بلکہ اس باب میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ضمنی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس سے زیادہ تفصیل میں جانا ممکن نہیں، دکھانا صرف یہ مقصود ہے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں ہندوؤں کے ساتھ نہ صرف رواداری کا سلوک کیا بلکہ برابر والوں جیسا سلوک کیا اور ان کی دلدہی کی پوری کوشش کی۔ انہوں نے ہندوؤں کو جو عہدے دیئے وہ معمولی نہ تھے۔ بلکہ ان ہندو عہدیداروں میں وزرا، مختلف صوبوں کے گورنر، محکمہ مال کے اعلیٰ افسر، فوج کے جرنیل، وقائع نویسوں کے نگراں، پولیس کے اعلیٰ حکام، سلاطین کے سیکریٹری اور بڑی بڑی جاگیروں کے مالک شامل تھے مگر اس ہندو نوازی کا مسلمانوں کو نہایت سخت خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اور جب موقع ملا ہندو راجاؤں، امرا، برہمنوں اور ہندو عوام تک نے مسلمانوں کو تباہ کرنے اور ان کے قصر اقتدار کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ جن ہندو امرا کو مسلمان سلاطین نے ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچایا اور قوت و اقتدار بخشا ان امرا نے انہی سلاطین کی کمر میں خنجر پیوست کرنے کی کوشش کی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کو کبھی اپنا نہیں سمجھا انہوں نے موقع ملنے پر مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا زیادتیاں کیں اور ان کی ہندو نوازی کا کس کس طرح صلہ دیا؟ آئندہ صفحات میں اس اجمال کی تفصیل بیان کی جائے گی۔

---

[۱] یہ فہرست خلاصۃ التواریخ مولفہ سبحان رائے، خزانۂ عامرہ مولفہ میر غلام علی آزاد بلگرامی، تاریخ فرشتہ، ہندوستان گذشتہ و حال مولفہ رائے بہادر بیج ناتھ، تاریخ ہندوستان مولفہ مولانا ذکاء اللہ سے مرتب کی گئی ہے (مولف)

ہندوؤں کی مسلم دشمنی

ہندوؤں کے مشہور سیاست دان اور مفکر چانکیہ نے ہندوؤں کے لئے جو اصولِ سیاست وضع کئے تھے ان میں ایک اصول یہ بھی تھا کہ صاحبِ قوت بادشاہ کو چاہیئے کہ وہ اپنے ہمسایہ بادشاہ پر حملہ کرنے میں دیر نہ کرے اور صلح ہو جانے کی صورت میں جب دیکھے کہ اس نے دوبارہ طاقت حاصل کر لی ہے تو فوراً میثاقِ صلح کو توڑ کر اپنے حریف پر حملہ کر دے۔[1]

ہمیں نہیں معلوم کہ ہندوؤں نے اپنے اس سیاست دان اور مفکر کے کون کون سے اصول فراموش کر دیئے مگر اس میں شک نہیں کہ انہوں نے چانکیہ کے اس اصول کو کبھی فراموش نہ کیا۔ اسے وید کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ مقدس سمجھا اور اس سے سرِ مو انحراف نہ کیا۔ کم سے کم ہمیں تو ہندوؤں کی طویل تاریخ میں اس اصول سے انحراف کا ایک واقعہ بھی نہیں ملا۔ ویدوں کی بگڑی ہوئی تعلیم کے مطابق ہندوؤں کو یہ بھی سبق دیا گیا تھا کہ غیر مذاہب کے لوگوں کو ملیچھ سمجھو اور ان سے نفرت کرو۔ اس سبق کو بھی انہوں نے خوب یاد رکھا اور اپنے اعلیٰ درجے کے "حافظہ" کا ہر دور میں ثبوت دیا۔ چونکہ باقی ادوار ہمارے موضوع سے خارج ہیں اس لئے ہم اس سلسلے کا آغاز اس دور سے کرتے ہیں جب ہندوستان کے ہمسایہ میں غزنی کی سلطنت ایک اسلامی طاقت بن کر ابھری۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ پہلے غزنی اور کابل کی حیثیت مستقل سلطنت کی نہیں بلکہ صوبوں کی تھی اور یہ صوبے بخارا کی سامانی سلطنت کے ماتحت تھے۔

سبکتگین پر برہمنوں کا حملہ

جس زمانے کا ہم ذکر رہے ہیں اس دور میں غزنی اور کابل کے علاقوں کا گورنر ایک ترک نژاد امیر سبکتگین تھا۔ سبکتگین کی گورنری کے زمانے میں بخارا کا بادشاہ گھوڑے سے گر کر ہلاک ہو گیا اور اس کے بعد سلطنتِ بخارا اختلافات و انتشار میں مبتلا ہو گئی۔ صورتِ حال اتنی خراب ہو گئی کہ امیر سبکتگین کو یہ علاقے بچانے کے لئے اپنی حکومت کے قیام کا اعلان کرنا پڑا۔ اس کے بعد مختلف حوادث پیش آئے اور سبکتگین عرصے

---

[1] انڈین انٹی کویری ۱۹۰۹ء صہ ۳۰۳ و ۱۹۱۰ء صہ ۵۹

تک لڑائیوں میں مصروف رہا۔ اس زمانے میں پنجاب اور اس کے ملحقات پر ایک برہمن راجہ جے پال کی حکومت تھی اور پنجاب کی سرحد سبکتگین کی حدودِ سلطنت سے ملتی تھی۔ جے پال نہایت ہوشیار حکمران تھا۔ اور چانکیہ برہمن کے اصولِ سیاست و حکمرانی سے بخوبی واقف تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے ہمسایہ میں ایک طاقتور سلطنت ابھر رہی ہے مگر اس کا حکمران اندرونی جھگڑوں میں الجھا ہوا ہے تو جے پال نے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر سلطنتِ غزنی پر بلا کسی وجہ کے حملہ کر دیا حالانکہ اس سے قبل سبکتگین یا اس کے کسی پیشرو نے ہندوستان کے کسی حکمران سے کبھی تعرض نہیں کیا مگر جے پال کو ان باتوں سے کوئی غرض نہ تھی اسے تو صرف اس کی فکر تھی کہ اس کے پڑوس میں غیر مذہب کے لوگوں کی سلطنت قائم ہو گئی ہے جو ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔ چنانچہ ایک ایسے موقع پر جب دیلمیوں کی فوجیں سبکتگین کے علاقہ نیشاپور پر بڑھ دوڑی تھیں اور وہ اس جنگ میں الجھا ہوا تھا جے پال نے سبکتگین کی حدودِ سلطنت پر یلغار کر دی۔ چانکیہ کا فلسفہ بھی یہی تھا کہ اپنی ہمسایہ سلطنت کو طاقتور نہ ہونے دو اور جب موقع دیکھو اس پر حملہ کر دو چنانچہ اس نے اسی اصول کو مدنظر رکھ کر ایک ٹڈی دل لشکر کے ہمراہ غزنی پر چڑھائی کر دی۔ دونوں فوجوں کا مقابلہ ایک چشمے کے قریب ہوا۔ یہ چشمہ علاقہ غزنی میں واقع تھا۔

جے پال کی مسلم کشی

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حملہ آور سبکتگین نہیں بلکہ جے پال تھا کیونکہ اگر سبکتگین جے پال پر حملہ کرتا تو میدانِ جنگ غزنی کی بجائے جہلم، لاہور یا بھٹنڈا بنتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا بلکہ غزنی میدانِ جنگ بنا۔ پس اس سے ان غیر مسلم مورخوں کے اس دعوے کی تردید ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے برصغیر پر حملہ کا آغاز کیا بلکہ اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہ کہ پنجاب کے برہمن راجہ جے پال نے محض مذہبی تعصب کی بنا پر اور چانکیہ کی تعلیم کے مطابق اپنی ہمسایہ اسلامی سلطنت پر حملہ کرکے اس جنگ کا آغاز کیا جو برصغیر میں مسلمانوں کی سلطنت کے قیام کا باعث بنی۔ اس جنگ میں جے پال کو شکست ہوئی اور اس نے ایک لاکھ درہم اور پچاس ہاتھی تاوانِ جنگ کے طور پر نذر کرنے کا وعدہ کرکے سبکتگین سے صلح کر لی۔ ضمانت کے طور پر اس نے اپنے ایک معزز درباری دولت نامی کو سبکتگین کے حوالے کر دیا اور اس کی فوج کے کچھ افراد کو یہ وعدہ کرکے اپنے ساتھ لے آیا کہ موعودہ رقم اور ہاتھی ان لوگوں کے سپرد کر دے گا۔ مگر بھٹنڈا پہنچ کر وہ اپنے وعدے سے منحرف ہو گیا اور سبکتگین کی فوج کے ان افراد کو قید کرکے اسے یہ پیغام بھیجا کہ جب تک اس کے

لے جغرافیہ اقلیم ہند مولفہ سبحان رائے بٹالوی

دربار کی دولت کو واپس نہیں کیا جائے گا یہ مسلمان قید رہیں گے[1]

ظاہر ہے کہ کوئی عزت دار حکمران یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کا حریف نہ صرف یہ کہ معاہدہ توڑ دے، بلکہ اس کے دربار یا فوج کے کچھ افراد کو دھوکے سے جا کر قید کر لے۔ سبکتگین کو جے پال کی اس عہد شکنی پر غصہ آنا فطری تھا مگر پھر بھی اس نے ضبط و تحمل سے کام لیا اور اپنے چند معتمد افراد کو حقیقت حال معلوم کرنے کے لئے بھٹنڈا روانہ کیا۔ اسی دوران جے پال نے ایک اور حرکت کی اور وہ یہ کہ سبکتگین کی فوج کے جن افراد کو وہ اپنے ساتھ لایا تھا انہیں بغیر کسی قصور کے قتل کرا دیا۔ اس کے بعد ہی اس نے ایک متحدہ فوج کے ساتھ جس میں ہندوستان کے دوسرے راجاؤں مثلاً گجرات اور کالنجر وغیرہ کے لشکر بھی شامل تھے دریائے سندھ عبور کر کے سبکتگین کے علاقے پر حملہ کر دیا۔ یہ خبر سن کر سبکتگین بھی اپنا لشکر لے کر روانہ ہوا۔ اس وقت تک جے پال لمغان تک پہنچ چکا تھا۔ لمغان جلال آباد کے قریب واقع تھا۔ یہیں سبکتگین اور جے پال میں جنگ ہوئی۔ اگرچہ جے پال کے ساتھ تین لاکھ کا ٹڈی دل لشکر اور جنگی ہاتھیوں کی ایک بڑی تعداد تھی اور سبکتگین کے ساتھ صرف ساٹھ ہزار افغان تھے[2] مگر اس جنگ میں بھی سبکتگین فتح یاب ہوا اور جے پال اپنی فوج کے ہزاروں ہزار افراد کو مولی گاجر کی طرح کٹوا کر میدان جنگ سے فرار ہو گیا۔ سبکتگین نے دریائے سندھ تک اس کا پیچھا کیا اور جے پال کے ہزیمت خوردہ سپاہیوں کو قتل کرتا چلا گیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی سبکتگین کا انتقال ہو گیا اور اس کا اقبال مند بیٹا محمود غزنوی تخت نشین ہوا۔

جے پال کا محمود غزنوی پر حملہ

تخت نشینی کے بعد کچھ عرصے تو وہ اندرونی جھگڑوں میں الجھا رہا اسی دوران میں جے پال نے اس کی سرحد پر ایک ٹڈی دل لشکر کے ہمراہ حملہ کیا۔ یہ ذیقعدہ ۳۹۱ھ کا واقعہ ہے۔ پشاور کے قریب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ اس جنگ میں بھی جے پال کو شکست ہوئی۔ غیر مسلم مورخوں نے اس جنگ کی ذمہ داری بھی محمود پر عاید کی ہے اور لکھا ہے کہ محمود غزنوی نے مال غنیمت کے لالچ میں جے پال کی کسی اشتعال انگیزی کے بغیر اس پر حملہ کیا۔ لیکن ایک ہندو مورخ مسٹر رام چندر کے بیان سے اس غلط بیانی اور بہتان عظیم کی تردید ہو جاتی ہے۔ رام چندر کا بیان ہے کہ "اختتام جنگ کے بعد محمود نے

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۹ فارسی نسخہ مطبوعہ نولکشور

[2] زینت التواریخ

سرحد کے ان قبائلیوں کی گوشمالی کی جن کے ساتھ جے پال نے پہلے سے سازباز کر کے انہیں اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔[1]

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس حملے کا منصوبہ خود جے پال نے بنایا تھا اور اپنی فوجی طاقت بڑھانے کے لیے بہت سے سرحدی قبائل کو پہلے سے اپنے ساتھ ملا لیا تھا جنہیں محمود نے اس سرکشی کی سزا دی۔ اگر محمود جے پال پر حملہ کرتا تو ان قبائل کو جو اس راستے میں آباد تھے وہ اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتا مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس ہوا۔ پس اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جے پال سبکتگین کے بعد اب محمود غزنوی سے نبرد آزما ہو رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اس اصلاحی سلطنت کو مٹا کر اسے اپنے زیر تسلط لے آئے۔ اس جنگ میں جے پال نے صرف شکست ہی نہیں کھائی بلکہ اپنے بہت سے سرداروں کے ساتھ محمود غزنوی کی فوجوں کے ہاتھوں گرفتار بھی ہؤا۔ اگر محمود چاہتا تو اسے مع اس کے سرداروں کے قتل کرا دیتا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا اور جب جے پال نے اس سے اپنی غلطی کی معافی مانگ کر یہ وعدہ کیا کہ وہ آئندہ کبھی اس قسم کی جرأت نہ کرے گا۔ مزید یہ کہ اب پنجاب حکومتِ غزنی کا ایک صوبہ ہو گا اور وہ اس صوبے پر محمود کے نائب اور باج گزار کی حیثیت سے حکومت کرے گا۔ تو محمود نے نہایت عالی ظرفی اور فراخ دلی سے کام لے کر اسے معاف کر دیا۔ جے پال نے سالانہ خراج بھیجنے کا بھی وعدہ کیا اس پر محمود نے اسے رہا کر دیا اور اُسے وطن جانے کی اجازت دے دی۔ جے پال جب پنجاب واپس آیا تو اس کی پیشانی پر مسلمانوں سے تین بار شکست کھانے کا داغ موجود تھا۔ ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ جو راجہ دو بار کسی غیر مذہب والے بادشاہ سے شکست کھائے تو پھر وہ حکومت کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ اس پاپ کو دور کرنے کا صرف ایک ہی علاج ہے کہ ایسا راجہ خود کو آگ میں ڈال کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرے۔[2]

چنانچہ جے پال نے اپنے بیٹے انند پال کو اپنا جانشین مقرر کیا اور خود آگ میں جل کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ انند پال اب محمود غزنوی کا باج گزار تھا۔ کچھ عرصے تک تو وہ خراج کی رقم باقاعدگی سے غزنی بھیجتا رہا مگر اندر ہی اندر محمود سے مقابلے کی تیاری بھی جاری رکھی اور جب محمود غزنوی نے ملتان کے حاکم داؤد بن نصر پر جو اس کا باج گزار تھا اس کی سرکشی کی وجہ سے حملہ کرنا چاہا تو اس نے انند پال کو اطلاع دی کہ ملتان جاتے ہوئے اس کی فوجیں پنجاب سے گزریں گی اس لئے وہ مزاحم نہ ہو۔

---

[1] تاریخ حالاتِ ہند مولفہ مسٹر رام چندر

[2] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۴ (فارسی نسخہ مطبوعہ منشی نولکشور)

مگر انند پال نے بجائے اس کے کہ اپنے آقا کے لئے سفر کی آسانیاں فراہم کرتا ایک لشکرِ عظیم اس کا راستہ روکنے کے لئے بھیج دیا۔ دریائے سندھ کے کنارے اس لشکر سے محمود غزنوی کے لشکر کا مقابلہ ہوا مگر انند پال کی فوجوں کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد خود انند پال بھی ایک ٹڈی دل لشکر لے کر محمود کے مقابلے پر پہنچ گیا۔ محمود نے اس دوسرے لشکر کو بھی شکست دی۔ انند پال شکست کھا کر کشمیر کی طرف بھاگا۔ محمود نے اس کا تعاقب کیا اور جب انند پال کشمیر کے پہاڑوں میں روپوش ہو گیا تو محمود واپس آ گیا۔ دوسری روایت کے مطابق محمود نے یہ سن کر کہ انند پال کشمیر کی طرف بھاگ گیا ہے اس کا تعاقب نہ کیا اور اپنی اصل مہم پر روانہ ہو گیا۔

مذہبی جنگ

اس جنگ میں انند پال کی شکست سے سارے شمالی ہند میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ اس سے قبل جے پال کی خودکشی کا واقعہ کیا کم اشتعال انگیز تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اسی وقت سے برہمنوں، ہندو راجاؤں اور ملک کے مذہبی رجحانات کے حامل سیاست دانوں نے جے پال اور سبکتگین کی جنگوں کو ہندو مسلم مسئلے کی حیثیت دے دی تھی۔ اب انند پال کی شکست نے ہندوؤں میں ایک آگ سی لگا دی اور پنڈتوں نے ایک ملک گیر مہم چلائی جس کا نعرہ تھا کہ ہندو مذہب خطرے میں ہے۔ ادھر انند پال نے ہندوستان کے راجاؤں کو خطوط لکھ کر اور قاصد بھیج کر اپنی امداد کی تحریک کی۔ اس مہم کا خاطر خواہ اثر ہوا اور گجرات، متھرا، قنوج، کالنجر، اجمیر، گوالیار، دہلی، تھانیسر، دہرہ دون، مالوہ، میرٹھ، سونی پت، بندیل کھنڈ اور یوپی کے راجاؤں نے اپنے لشکروں اور زرکثیر سے انند پال کی امداد کی۔ برہمنوں نے اس جنگ کو ایک مقدس جنگ کا نام دیا اور دین دھرم کی حفاظت کے لئے ایسی موثر تحریک کی کہ ایک یورپی مورخ جے۔ سی۔ ایلیٹ کے بیان کے مطابق ہندو عورتوں نے اپنے سونے کے زیورات اتار کر جنگی تیاریوں کے لئے دے دیئے۔ ایک اور مغربی مورخ ڈاکٹر ہنٹر کا بیان ہے کہ اس جنگ کے لئے ہندو عورتوں نے سوت کات کات کر روپیہ جمع کیا اور اپنے زیور اتار کر اپنے ہم مذہبوں کی امداد کی۔ اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اس جنگ کی وہی حیثیت تھی جو صلاح الدین ایوبی کے زمانے میں صلیبی جنگوں کو حاصل تھی۔ مگر ہندوستان کی اس متحدہ فوج کو بھی محمود غزنوی کے مقابلے میں کامیابی نہ ہوئی۔ اور پشاور کے قریب جب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا تو باوجود اس کے کہ ہندوؤں کی فوج کی تعداد لاکھوں افراد پر مشتمل تھی، دیو پیکر ہاتھی اس کے علاوہ تھے۔ ہر ہندو فوجی مذہبی جذبے سے سرشار تھا مگر انجام کار انہیں عبرت ناک شکست ہوئی اور انند پال افغان لشکر سے جو تعداد میں نہایت قلیل تھا بمشکل جان بچا کر بھاگا۔

اس کے بعد اس نے پھر معافی کی درخواست کی اور خراج دینے کا وعدہ کیا۔ عالی ظرف محمود نے اب کے بار بھی اسے معاف کر دیا۔ انندپال کے علاوہ ہندوستان کے اور بہت سے راجاؤں نے بھی معافی کی درخواست پیش کی سلطان نے انہیں بھی معاف کر دیا۔ ہندوستان کے راجاؤں نے اطاعت کرنے کا وعدہ کیا، خراج کی پیش کش کی اور دس ہزار فوجی سلطان محمود نے ہندوؤں میں سے اپنی فوج میں شامل کرلئے تاکہ ہندوؤں کو یقین ہو جائے کہ محمود ان کا مذہبی دشمن نہیں ہے اور ان پر اعتماد کرتا ہے۔

سبکتگین نے جے پال کے حملے کے بعد جب کامیابی حاصل کی تو اسے حق حاصل تھا کہ وہ جے پال کے علاقے پر قبضہ کر لیتا مگر اس نے ایسا نہ کیا کیونکہ اس کے مدنظر توسیع سلطنت کا کوئی منصوبہ نہ تھا۔ محمود غزنوی نے بھی جے پال اور انندپال کی بار بار شرارتوں سے مجبور ہو کر صرف خراج پر اکتفا کی مگر جب ہندو راجاؤں کی سرکشی اور مسلم آزاری کم نہ ہوئی تو افغان سلاطین نے اس ملک کے بعض حصوں کو باقاعدہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

ہم نے اس باب میں اب تک جو کچھ لکھا ہے اس سے بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ ان جنگوں کی حیثیت سیاسی نہ تھی بلکہ ہندو راجاؤں نے یہ ساری جنگیں مذہب کے نام پر لڑیں۔ خصوصاً انندپال اور محمود کی جنگ جو پشاور کے قریب ہوئی خالص مذہبی نوعیت کی تھی ورنہ کیسے ممکن ہے کہ ہندوستان کے وہ راجہ جو سالہا سال سے ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار تھے جے پال کی خودکشی اور مسلمانوں کے ہاتھوں انندپال کی عبرتناک شکست کی خبر سن کر اپنے سارے دیرینہ اختلافات یک دم بھلا بیٹھے۔ اور وہ تلواریں جو کل تک ایک دوسرے کا خون بہاتی تھیں اب ایک تنظیم کے تحت مسلمانوں کا خون بہانے کے لئے وقف ہو گئیں۔

ان صفحات میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہر مسلمان بادشاہ کے عہد حکومت کے وہ تمام واقعات بیان کئے جائیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے ہمیشہ مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھا اور انہیں نقصان پہنچانے کے درپے رہے۔ نمونے کے طور پر صرف چند واقعات بیان کر کے ہم اصل موضوع کی طرف رجوع کریں گے۔

عہد خلجی کے ایک مسلم نما ہندو کی مسلم کشی

ہندوستان کے ترک سلاطین میں علاء الدین خلجی بڑا اولوالعزم بادشاہ گزرا ہے۔ اس کے ایک سردار ملک شادی خاں نے گجرات (کاٹھیاواڑ) کے ایک ہندو بچے کی پرورش کی اور اس کا نام حسن رکھا۔ سلطان مبارک شاہ خلجی نے اس ہندو نژاد کو طرح طرح سے نوازا۔ اسے خسرو خاں کا خطاب دیا، وزارت کے عہدے پر فائز کیا۔ ملک کافور کی وسیع جاگیر اور دیگر قیمتی املاک اس کے نام منتقل کر دی،

دکن کی ریاستوں کی نگرانی اور خراج کی وصولی کا انتظام اس کے سپرد کیا۔ ایک لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ ہندو نژاد حسن (خسرو خاں) سلطان مبارک شاہ خلجی کے نام پر حکومت کرتا تھا اور کم از کم دکن کے تو سیاہ و سپید کا مالک تھا۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ یہ شخص نام کا حسن تھا دل سے کٹر ہندو اور مسلمانوں کا جانی دشمن تھا۔ اس کے بھائی اور نام کے مسلمان حسام الدین نے ایک منصوبہ کے تحت سلطان مبارک شاہ کو امور سلطنت سے غافل کرنے کے لئے اسے لہو و لعب میں مبتلا کیا اور ایسے لوگوں کو اس کے دربار میں بھیجا جو اسے عیش و عشرت کی طرف مائل کر سکیں۔ خسرو خاں کے مظالم اور مسلم کشی کا آغاز جنوبی ہند سے ہوتا ہے۔ اس علاقے کے بندرگاہوں پر مسلمان تاجر آباد تھے۔ یہ بڑے مال دار لوگ تھے۔ اس ہندو نژاد نے سب سے پہلے ان پر ہاتھ صاف کیا۔ ان کے اموال پر جبراً قبضہ کر لیا اور پھر ان میں سے بعض کو قتل کرا دیا۔ اس کے بعد اس نے ہندوستان پر رام راج کے منصوبہ کو جامۂ عمل پہنانے کے لئے اپنے ہم قوم اور ہم مذہب لوگوں کی ایک زبردست فوج تیار کی۔ مورخ فرشتہ نے اس کی تعداد بیس ہزار افراد لکھی ہے۔ یہ لوگ خسرو خاں کے وطن گجرات کے خانہ بدوش ہندو تھے۔ اس نے دکن کے بعض ہندو راجاؤں کو اپنے ساتھ ملایا اور ان سے بھی فوجی امداد لی۔ یہ فوج رفتہ رفتہ یعنی کئی مرحلوں میں دہلی پہنچ گئی اور پھر ہندو نژاد خسرو خاں بھی دربار میں آ گیا۔ آخر کار ایک روز جب سلطان مبارک شاہ خسرو خاں کے ساتھ بزم عیش و عشرت میں مصروف تھا۔ خسرو خاں کے ایک ہندو سردار جاہر دیو نے بادشاہ کا سر تن سے جدا کر دیا اور پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق ہندو سپاہی شاہی محل میں داخل ہو گئے۔ سلطان کا سر محل کے نیچے پھینک دیا گیا۔ ہندو سپاہیوں اور افسروں نے شاہی مستورات کی توہین میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔ سلطان مبارک شاہ خلجی کے بیٹوں فرید خاں، عمر خاں اور علی خاں کو قتل کر دیا گیا۔ خاندان کا جو نوجوان شہزادہ ہاتھ آیا اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا حتیٰ کہ سلطان کی بیگم اور شہزادہ فرید خاں کی والدہ کو بھی قتل کر دیا گیا۔ سلطان علاء الدین خلجی کی بیٹی اس ہندو نژاد خسرو خاں نے اپنے بھائی کو "بخش" دی اور سلطان مبارک شاہ خلجی کی ایک بیگم کو اپنے تصرف میں لے آیا۔ خاندان شاہی کی باقی عورتیں ہندو سپاہیوں اور افسروں کو دے دی گئیں۔[1]

اس کے بعد خسرو خاں سلطان ناصر الدین کا لقب اختیار کر کے تخت سلطنت پر متمکن ہو گیا۔ اس نے تمام بڑے بڑے مسلمان سرداروں کو قتل کرا دیا اور ان کی عورتیں اور کمسن بچے گجرات کے ہندوؤں کے حوالے کر دیئے۔ ایک ہندو سردار مندل کو رائے رایان کا خطاب دے کر وزیر سلطنت مقرر کیا۔ اس طرح دہلی جو

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۲۵ فارسی نسخہ مطبوعہ نولکشور

پایۂ تخت تھا پوری طرح ہندوؤں کے قبضے میں آ گیا اور چالیس ہزار ہندو فوجیوں کے سامنے مسلمان بے بس ہو گئے۔ ان لوگوں کی جرأتیں اتنی بڑھ گئیں کہ انہوں نے مساجد پر قبضہ کر لیا، اذانیں بند ہو گئیں، محرابوں میں بت رکھے گئے۔ انتہا تو یہ ہے کہ خسرو خاں کے دربار میں ہندو امراء قرآن حکیم کے نسخوں کو اوپر تلے رکھ کر چبوترے سے بناتے اور پھر ان پر بیٹھ جاتے اور خسرو خاں یہ منظر دیکھتا رہتا۔ مورخ فرشتہ کی عبارت ہے "ہندوان بت پرست آغاز نہادہ مصحف را بجائے کرسی بکار میبردند و بالائے آں ہمے نشستند"[1]

ان تصریحات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خسرو خاں دل سے مسلمان نہیں ہوا تھا بلکہ اس نے اسلام کا لبادہ عبداللہ بن سبا کی طرح اسلام کو تباہ کرنے کے لئے اوڑھا تھا۔ وہ دل سے کافر اور اسلام کا دشمن تھا اور اس نے ہندوستان کو ہندو اسٹیٹ بنانے کے لئے ہر ظلم روا رکھا حتیٰ کہ اپنے آقا سے غداری کی اسے نہایت بے دردی سے قتل کیا۔ شاہی خاندان کی عصمت مآب خواتین کی آبرو ریزی کی۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی سیاسی بغاوت نہ تھی بلکہ خالص مذہبی بغاوت تھی اور اس کا مقصد برصغیر سے اسلام کو بے دخل کرنا تھا۔ اگر اس موقع پر سلطان مبارک شاہ مقتول کا ایک وفادار سردار ملک فخرالدین جونا خاں میدان میں نہ آتا تو شاید آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔ وہ ایک روز موقع پا کر دہلی سے نکلا اور اپنے باپ غازی ملک حاکم دیپال پور کے پاس پہنچ کر سارا ماجرا سنایا۔ غازی ملک ایک لشکر لے کر دیپال پور سے روانہ ہوا اور دہلی پہنچ کر خسرو خاں سے نبرد آزما ہو گیا۔ آخر میدان غازی ملک کے ہاتھ رہا۔ خسرو خاں بھاگا مگر گرفتار ہوا اور غازی ملک کے ہاتھوں قتل ہو کر اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ یہ پہلا منظم انقلاب تھا جو مذہب کے نام پر برپا کیا گیا تھا اور جس میں مسلمان حکمران، اس کے اہل خاندان اور مسلمان امراء نہایت سفاکی سے قتل کئے گئے۔ ان کی خواتین کی آبرو ریزی کی گئی اور ان کے مذہب کے ساتھ ایسا شرمناک مذاق کیا گیا جس کے تصور سے بھی بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

دکن میں مسلم کشی

اب ہم دکن کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ دکن ایسا علاقہ ہے جہاں مسلمان فاتحین کی آمد سے قبل ہی عرب تاجر ساحلی علاقوں میں مقیم تھے۔ یہ لوگ نہایت پر امن زندگی گزارتے تھے اور بحری تاجر ہونے کی وجہ سے برصغیر کے لوگوں کے لئے خداوند تعالیٰ کی بہت بڑی رحمت تھے۔ ان لوگوں نے اسلام کی تبلیغ ضرور کی مگر نہایت احسن طریقے سے اور ان کا زہد و تقویٰ، ان کا اعلیٰ اخلاق اور اسلام کی پاکیزہ تعلیم سے

---

[1] تاریخ فرشتہ صفحہ ۱۲۸ فارسی نسخہ مطبوعہ نولکشور

متاثر ہو کر دکن کے ہزاروں ہزار افراد مسلمان ہو گئے۔ اگر غور کیا جائے تو دکن میں اسلام کی روز افزوں ترقی اور شمالی ہند میں مسلمانوں کا اقتدار ہی دکن کے ہندوؤں کے لئے مسلم آزاری کا باعث بنا۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ دکن میں جس سرعت سے اسلام پھیل رہا ہے اگر اس کے سامنے بند نہ باندھا گیا تو ان کا اقتدار ختم ہو جائے گا اور اس حصۂ ملک پر ہمیشہ کے لئے اسلامی پرچم لہرانے لگے گا۔ چنانچہ دکن کے ہندو راجاؤں نے مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کی منظم سازشیں شروع کر دیں جن کی ایک کڑی خسرو خاں کی بغاوت کا منصوبہ تھا جو اس نے دکن ہی کے ہندوؤں کے اشتراک سے تیار کیا۔ لیکن اس سازش میں ناکامی کے بعد دکن کے ہندوؤں نے مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دینے کے لئے ایک نئی مہم کا آغاز کیا۔ انہوں نے مسلمان امراء کے باہمی اختلاف سے فائدہ اٹھایا۔ اسے ہوا دی اور ان کی طاقت کو کمزور کرنے کے لئے کبھی ایک مسلمان حکمران کا ساتھ دیا اور کبھی دوسرے کا۔ نظام شاہی عہد میں انہوں نے یہی حربہ استعمال کیا اور اسلامی طاقت کو کمزور کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ چنانچہ سلطان محمد شاہ کے مشہور جرنیل نظام الملک کو دو ہندوؤں ہی نے دھوکے سے قتل کیا۔

مورخ فرشتہ لکھتا ہے کہ دکن کے دو ہندو راجہ رائے سنگیر اور رائے کہینہ کا مشن ہی یہ تھا کہ ان کی تین سو کشتیاں سمندر میں ہر وقت تیار کھڑی رہتی تھیں جن کے ذریعے وہ مسلمانوں کو قتل کرتے اور ان کا مال و اسباب لوٹ لیتے تھے۔ بحری راستے کے علاوہ خشکی کے راستوں سے بھی یہ لوگ مسلمانوں کو وسیع پیمانے پر قتل کرتے اور ان کی املاک کو برباد کرتے رہتے۔ جب دکن کے مسلمان حاکم سلطان محمد شاہ نے اپنے جرنیل محمود گاواں کو ان کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا تو انہوں نے مسلمانوں کا قتل عام کرنے پر باہمی معاہدہ کیا اور اسے کارِ ثواب اور حصولِ جنت کا ذریعہ قرار دیا۔[1]

راجہ بیجانگر کے مظالم

دکن کے ہندوؤں کی اسلام دشمنی کا ایک شرمناک واقعہ اس وقت رونما ہوا جب علی عادل شاہ اور حسین نظام شاہ بحری کے درمیان کشمکش شروع ہوئی۔ علی عادل شاہ نے محسوس کیا کہ اس کی فوجی طاقت حسین نظام شاہ کے مقابلے میں کمزور ہے اور اگر وہ تنہا مقابلے پر نکلا تو یقیناً اپنے حریف سے شکست کھا جائے گا اس لئے اس نے بیجانگر کے ہندو راجہ رام راج سے امداد طلب کی اور دونوں میں یہ معاہدہ طے پایا کہ رام راج کی فوجیں اسلامی سلطنت میں داخل ہونے کے بعد مسلمانوں سے کوئی تعرض نہ کریں

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۴۹ فارسی نسخہ مطبوعہ نولکشور

گی مگر رام راج نے یہ معاہدہ پسِ پشت ڈال دیا اور علی عادل شاہ کی حدودِ سلطنت میں داخل ہونے کے بعد نہتے مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم توڑے۔ مساجد کو برباد کیا ان میں بتوں کی پرستش کی حتیٰ کہ کلام اللہ کے نسخوں کی ہتک تک سے بھی باز نہ آیا۔[1]

اب تک جو واقعات پیش کئے گئے ہیں ان میں سے بیشتر اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب مسلمان سلاطین اور ہندو راجاؤں میں جنگیں ہو رہی تھیں۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ان واقعات کی حیثیت سیاسی انتقام کی تھی لیکن سیاسی انتقام سیاسی حدود تک رہتا ہے جب ایک فریق دوسرے کے معابد کو برباد کرنا شروع کر دے۔ اس کی مقدس کتب کی توہین کرے اور اس فریق کے نہتے عوام کو قتل کرنا کارِ ثواب قرار دے تو اسے سیاسی جنگ یا سیاسی بغاوت نہیں کہا جا سکتا پھر تو وہ خالص مذہبی نوعیت کا غدر ہوتا ہے۔ چنانچہ جو واقعات سطورِ بالا میں پیش کئے گئے ہیں ان سے صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہندوؤں کے ان شرمناک اقدامات کا مقصد برصغیر سے اسلام کا نام و نشان مٹانے کے سوائے اور کچھ نہ تھا۔ لیکن جو واقعات اب درج کئے جاتے ہیں ان کے مطالعے کے بعد اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ برصغیر میں ہندوؤں کی اکثریت ہمیشہ مسلمانوں کو تباہ کرنے کے درپے رہی اور انہیں طرح طرح سے آزار پہنچاتی رہی۔

عہدِ شاہجہانی میں ہندوؤں کے حوصلے

کون نہیں جانتا کہ مغل بادشاہ اور خصوصاً شاہجہان نہایت وسیع النظر، عالی ظرف اور غیر متعصب حکمران تھا جس کا عہد برصغیر کی تاریخ کا سنہرا دور کہلاتا ہے۔ اس نے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کو بھی اپنا ہمدم و ہمراز بنایا۔ انہیں بڑے بڑے مناصب، جاگیریں اور خطابات دیئے جن کا ایک سرسری خاکہ گذشتہ صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے مگر اس غیر متعصب بادشاہ کے عہدِ حکومت میں ہندوؤں کے عزائم کیا تھے؟ اور مسلمانوں کے ساتھ وہ کیسا سلوک کرتے تھے؟ اس کا اندازہ صرف ایک واقعے سے کیا جا سکتا ہے۔ شاہجہاں کے عہد کا ایک مورخ لکھتا ہے کہ جب بادشاہ کشمیر کے سفر سے واپس آتے ہوئے بھمبر پہنچا تو یہاں علاقہ گجرات (پنجاب) کے سادات و مشائخ نے اس کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ عریضہ پیش کیا کہ اس علاقے کے ہندوؤں نے بہت سی مسلمان عورتوں کو جبراً اپنے گھروں میں ڈال لیا ہے اور ان سے نکاح کر لیا ہے بہت سی مساجد پر قبضہ کر لیا ہے اور انہیں مندروں میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ عرضداشت سن کر

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۳۷ فارسی نسخہ مطبوعہ نولکشور

شاہجہاں نے ایک دانش مند بزرگ شیخ محمود گجراتی کو تحقیق حال پر مقرر فرمایا۔ شیخ محمود نے اس علاقے میں جاکر حقیقت حال کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ مستغیثوں کا بیان درست ہے چنانچہ انہوں نے ان مظلوم مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے گھروں سے برآمد کیا اور دین دار و پرہیزگار مسلمانوں سے ان کا عقد کیا۔ جن مساجد پر ہندوؤں نے قبضہ کر لیا تھا انہیں پھر مسلمانوں کے حوالے کیا۔ ایسی مساجد کی تعداد سات تھی۔ مزید تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ بعض ہندو قرآن مجید کی ہتک کے مرتکب ہوئے ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں پر جرم ثابت ہو گیا ان کی گردن مار دی گئی۔ اسی دوران اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ علاقہ پنجاب میں عام طور پر یہی صورت ہے اور متعدد مساجد اور مسلمان عورتیں ہندوؤں کے تصرف میں ہیں۔ چنانچہ شاہجہاں نے حکم دیا کہ سارے ممالکِ محروسہ میں تحقیق کی جائے اور جہاں اس قسم کے واقعات کا سراغ لگے ان کا تدارک کیا جائے۔ چنانچہ مختلف مقامات سے بہت سی مسلم عورتیں ہندوؤں کے قبضے سے برآمد کر لی گئیں اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے از سرِ نو عقد کئے گئے۔[1]

عہدِ عالمگیری میں مسلم آزاری

ہندو عرصۂ دراز سے مسلمانوں کے خلاف جن سازشوں میں مصروف تھے ان کی تکمیل کے اسباب عہدِ عالمگیری میں پیدا ہو گئے۔ اورنگ زیب بلاشبہ ایک دین دار اور راسخ العقیدہ مسلمان بادشاہ تھا مگر اس کے باوجود وہ مذہبی لحاظ سے تنگ نظر نہ تھا۔ وہ ایسے لوگوں کو اپنا قرب ضرور عطا کرتا اور ان کی حوصلہ افزائی کرتا تھا جنہیں اسلام سے محبت ہوتی تھی اور جو شعائرِ دین کا احترام کرتے تھے۔ وہ غیر مسلموں کو دین کی دعوت بھی دیتا تھا اور جو یہ دعوت قبول کر لیتا تھا اسے انعام و اکرام سے نوازتا تھا مگر تاریخ سے ایک واقعہ بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے کسی غیر مسلم کو جبراً مسلمان بنایا ہو۔ لیکن اس کی اسلام دوستی اور دعوتِ دین میں یہ سرگرمی ہندوؤں کو ناگوار گزری۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کا ہر مسلمان بادشاہ اکبر کی طرح ہندوؤں کے رنگ میں رنگ جائے اور انہیں کھل کھیلنے کا موقع ملے۔ مگر جب اورنگ زیب کی صورت میں ایک ایسا بادشاہ نظر آیا جو گو ہندوؤں کے مذہبی معاملات میں دخل تو نہ دیتا تھا مگر مسلمانوں کو حقیقی مسلمان اور حکومت کو اسلامی حکومت بنانا چاہتا تھا تو انہوں نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ اپنے ناپاک مقاصد کے حصول کے لئے انہوں نے مختلف ذرائع اختیار کئے۔ انہوں نے کھلم کھلا بغاوتیں بھی کیں۔ اورنگ زیب کے حریف مسلمان بادشاہوں کی امداد بھی کی۔ مسلمانوں کا دوست اور وفادار

---

[1] بادشاہ نامہ جلد اول صفحہ ۵۸۔۵۷ مصنفہ ملا عبد الحمید لاہوری مطبوعہ کالج پریس کلکتہ و شاہجہاں نامہ جلد دوم صفحہ ۵ مصنفہ محمد صالح کنبو مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔

بن کر انہیں برباد کرنے کی سازشیں بھی کیں اور مسلمانوں کے عقائد کو مسخ کرنے اور مسلمان بچوں کو ہندو مذہب کی طرف مائل کرنے کا سنہرا جال بھی بچھایا۔ چنانچہ عہد عالمگیری کے ایک مشہور مورخ کا بیان ہے کہ ٹھٹھہ، ملتان اور بنارس میں برہمنوں نے ایسے مدارس قائم کئے جن میں مسلمان بچوں کو ہندوؤں کی مذہبی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ جب عالمگیر کو برہمنوں کے اس منصوبے کی خبر ہوئی تو اس نے حکم دیا کہ ایسے تمام مدارس بند کر دیئے جائیں۔

ہندوؤں کے حوصلے اس قدر بڑھے ہوئے تھے کہ وہ اس حکم کے خلاف سرکشی پر آمادہ ہو گئے چنانچہ مولانا شبلی نعمانی نے اپنے رسالے میں لکھا ہے کہ :

"ذی قعدہ ۱۰۷۹ھ یعنی تخت نشینی کے بارھویں برس عالمگیر کو جب اطلاع ملی کہ ہندو مسلمانوں کو اپنے علوم پڑھاتے ہیں تو اس نے اس کے انسداد کا حکم دیا۔ اس واقعے کے مہینے ہی بھر کے بعد متھرا کے اطراف میں ہندوؤں نے شورش برپا کی جس کے فرو کرنے کے لئے عبدالنغنی خاں متھرا کا فوجدار مقرر کیا گیا اور مارا گیا۔"[۱]

اسی عہد میں حیدر آباد کے حکمران ابوالحسن تانا شاہ کے ایک برہمن سردار ماڈنا اور اس کے بھائی اکنّا نے غیر معمولی اقتدار حاصل کر لیا۔ بادشاہ نے اپنے مسلمان وزیر سلطنت کو برطرف کر کے ان دونوں برہمنوں کو سارے اختیارات دے دیئے۔ ماڈنا کٹر ہندو تھا اور برصغیر میں ہندو راج کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ ان دونوں بھائیوں کی وجہ سے حیدر آباد کے مسلمانوں پر سخت مظالم ٹوٹے۔[۲] مولف خافی خاں کا بیان ہے کہ اورنگ زیب اور ابوالحسن تانا شاہ میں خونریز جنگ کرانے اور حیدر آباد کو تباہ و برباد کرانے میں دراصل انہی دونوں برہمنوں کا حصہ تھا۔ یہی برہمن وزیر ماڈنا جس نے ابوالحسن تانا شاہ کو ورغلا کر مرہٹوں کو سرکاری خزانے سے لاکھوں روپے دلوائے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کر لیں اور اسلامی سلطنت کا شیرازہ منتشر ہو جائے۔

مرہٹوں کی مسلم کشی

مرہٹوں نے برصغیر کے مسلمانوں پر جو مظالم کئے ہیں ان کی نظیر شاید ہی مل سکے۔ لیکن شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ مرہٹوں کی حوصلہ افزائی خود مسلمانوں نے کی۔ انہیں جاگیریں دیں، منصب دیئے، فوجوں

۱۔ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر مولفہ مولانا شبلی نعمانی

۲۔ منتخب اللباب حصہ دوم ص ۳۰۸ مولفہ خافی خاں

میں داخل کیا۔ مگر مسلمانوں کی ان نوازشات کا جو صلہ مرہٹوں نے انہیں دیا وہ دنیا میں شاید ہی کسی محسن کو دیا گیا ہوگا۔ جیساکہ مورخین نے صراحت کی ہے ابتدا میں ان لوگوں کی جمعیت بالکل منتشر تھی یہ ایک بے حقیقت قوم تھی۔ البتہ اس کے لیکسی پیشوا حکمراں خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سیواجی کے آبا و اجداد دراصل راجپوت تھے اور ریاست اودے پور (راجپوتانہ) کے رہنے والے تھے۔ بلکہ بعض تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے کہ راجہ اودے پور کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس خاندان کا ایک شخص کہ نام جس کا مالوجی تھا اپنے عزیزوں سے خفا ہوکر دکن کے مقام ایلورہ میں آبسا اور یہاں کے ایک ہندو تحصیلدار کا ملازم ہوگیا۔ اس کا بیٹا ساہوجی تھا جو پہلے دکن کے مشہور خاندان نظام شاہی سے وابستہ ہوگیا۔ وہاں سے الگ ہوکر شاہجہاں کے دربار میں حاضر ہوا۔ شاہجہاں نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور اسے پنج ہزاری کا منصب عطا کیا۔ خلعت اور مرصع تلوار عنایت کی۔ علم و نقارہ اور اسپ و فیل کے علاوہ دولاکھ نقد عطا فرمائے اور کچھ علاقے بہ طور جاگیر عنایت کئے۔[1]

یہ پہلا موقع تھا کہ ایک مغل بادشاہ نے کسی مرہٹہ کو سردار بنایا اور عزت کی مسند پہ بیٹھایا۔ یہیں سے مرہٹوں کی تاریخ اور ان کے اقتدار کا آغاز ہوتا ہے۔ مگر مورخ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ کچھ ہی عرصے کے بعد جب شاہجہاں نے ساہو سے جاگیرے کر ایک اور سردار کو دے دی، تو اتنی بات پر یہ مرہٹہ سردار بگڑ گیا اور اپنے محسن شاہجہاں سے غداری کرکے بیجاپور کے حاکم عادل شاہ سے جا ملا جو مغلوں کا حریف تھا۔ اس نے بیجاپور میں ایک زبردست فوج منظم کی اور شاہجہاں کی حدودِ سلطنت پر حملے کرکے ہزاروں مسلمانوں کا خون بہایا۔ سیواجی اسی ساہوجی مرہٹہ کا بیٹا تھا۔

راجہ جسونت سنگھ کی غداری

راجہ جسونت سنگھ مغل عہد کا مشہور ہندو سردار تھا جسے شاہجہاں نے خلعت، مرصع تلوار، علم و نقارہ، اسپ و فیل اور شش ہزاری کا منصب عطا کیا۔ پہلے آگرہ اور پھر مالوہ کے گورنر کا عہدہ دیا۔ حالانکہ جسونت سنگھ نے داراشکوہ کی طرف سے اورنگ زیب کے ساتھ کئی جنگیں لڑیں اور عالمگیری فوج کو سخت نقصان پہنچایا۔ مگر جب عالمگیر کامیاب ہوگیا اور جے سنگھ اس کے حضور عفوِ تقصیر کے لئے حاضر ہوا تو اورنگ زیب نے خاندانی شرافت اور اپنی عالی ظرفی سے کام لے کر نہ صرف اسے معاف کر دیا بلکہ اس کے اعزاز و اکرام میں اضافہ کرکے گجرات کا گورنر مقرر کیا۔ لیکن اس اسلام دشمن اور محسن کش ہندو

---

[1] مآثر الامرا جلد اول ص ۵۲۲، ۵۲۴

سردار نے اورنگ زیب کی نوازشوں کا صلہ یہ دیا کہ جب سیواجی مرہٹہ نے طاقت حاصل کر لی اور مغلیہ سلطنت کو اس سے خطرہ لاحق ہو گیا تو اورنگ زیب نے جسونت سنگھ کو اس کی سرکوبی پر مامور کیا۔ اس نے دکن پہنچ کر یہ ظاہر تو فوجی کارروائیاں شروع کر دیں مگر در پردہ سیواجی سے سازش کر لی۔ مورخین کا بیان ہے کہ راجہ جسونت سنگھ بادشاہ کے مقابلے میں ہندوؤں کا کہیں زیادہ ہمدرد و بہی خواہ تھا۔ وہ حریص بھی تھا اور دولت دیکھ کر بدل جاتا تھا۔ انہی طریقوں سے کام لے کر سیواجی نے اسے اپنا دوست بنا لیا۔ جسونت سنگھ نے نہ صرف خود سیواجی سے سازش کر لی بلکہ ریاست بوندی کے راجہ بھاؤ سنگھ کو بھی اپنے ساتھ ملانا چاہا جو سیواجی کی سرکوبی کے لئے جسونت سنگھ کے ساتھ مامور کیا گیا تھا تاکہ اورنگ زیب کے مقابلے میں سیواجی کی طاقت میں اضافہ ہو جائے اور برصغیر مغلوں کے قبضے سے نکل کر ہندو راج کے زیر سایہ آ جائے۔

اورنگ زیب کے زمانے تک برصغیر کے مسلمانوں کا وقار قائم تھا۔ ان کی عظمت کا آفتاب نصف النہار پر ضو فشاں تھا اور غیر مسلموں کی سازشیں ناکام ہو جاتی تھیں۔ مگر اس مغلِ اعظم کی آنکھ بند ہوتے ہی مسلمانوں کی بساطِ عظمت الٹ گئی۔ اورنگ زیب کے جانشینوں میں اس کے بیٹے بہادر شاہ کے بعد کوئی مدبر، منتظم، شجاع اور فرض شناس حکمران پیدا نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ انہوں نے خفیہ ریشہ دوانیوں کے ساتھ ساتھ کھلم کھلا مسلم کشی اور مسلم آزاری کی کارروائیاں شروع کر دیں۔

فرخ سیر کا عہد

فرخ سیر کے عہد میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا جانے لگا اور ہندوؤں نے علانیہ ایسی حرکات شروع کر دیں جن کا مقصد یہ بتانا تھا کہ اب اس ملک میں مسلمانوں کی حیثیت حاکموں کی نہیں محکوموں کی ہو گی اور سیاسی زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی مذہبی زندگی کا بھی خاتمہ ہونے والا ہے۔ واضح رہے کہ ابھی مرکزی حکومت مسلمانوں کے ہاتھ ہی میں تھی۔ بادشاہ، وزرا، صوبوں کے گورنر اور فوجی جرنیل بکثرت مسلمان ہی تھے۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود ہندو امراء اور سردارانِ فوج معاملاتِ حکومت میں اس قدر دخیل ہو چکے تھے کہ دن کی روشنی میں مسلمان ہندوؤں کے ہاتھوں قتل ہو رہے تھے اور کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ چنانچہ فرخ سیر کے عہد کا واقعہ ہے کہ احمد آباد دگجرات میں سخت ہندو مسلم فساد ہوا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہولی کے ایام میں ایک ہندو نے جو ایسے محلے میں رہتا تھا جس میں ہندو مسلمان دونوں آباد تھے اپنے مکان کے سامنے مشترکہ چوک میں ہولی جلانا چاہی۔ مسلمانوں

نے منع کیا۔ مقدمہ گجرات کے گورنر داؤد خاں تک پہنچا۔ اس نے اس حجت پر کہ ہر شخص کو اپنے مکان کے سامنے اپنے رسوم مذہبی بجالانے کا اختیار حاصل ہے اجازت دے دی۔ خوب دھوم دھام سے ہولی جلائی گئی۔ دوسرے دن اتفاق سے بارہ وفات کا دن تھا۔ مسلمانوں نے اسی حجت پر (کہ ہر شخص کو اپنے مکان کے سامنے اپنی مذہبی رسوم ادا کرنے کی اجازت ہے) اپنے مکانوں کے سامنے فاتحہ کے واسطے گائے ذبح کی۔ یہ دیکھ کر ہندوؤں نے اکھٹے ہوکر مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور قصاب کے لڑکے کو جس کی عمر چودہ پندرہ برس کی تھی پکڑ کر اسی مقام پر ذبح کر ڈالا۔ جب احمد آباد کے پٹھانوں کو اس واقعے کا علم ہوا تو وہ قاضی شہر کے پاس گئے۔ قاضی شہر پر ایک مقتدر ہندو کپور چند کا بڑا اثر تھا۔ اس کے ڈر سے قاضی نے اپنا دروازہ بند کر لیا اور مظلوم مسلمانوں کی فریاد نہ سنی۔ ادھر کپور چند کو اندیشہ پیدا ہوا کہ مسلمان اس پر حملہ کریں گے اس لئے اس نے مسلح ہندوؤں کی ایک جماعت کو اپنی حفاظت کے لئے بلا لیا۔ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں سخت فساد ہوا اور ہزاروں قتل و زخمی ہوئے۔ تین چار روز تک شہر میں ہڑتال رہی اور فتنہ و فساد کا بازار گرم رہا۔ جب یہ مقدمہ بادشاہ کے روبرو پیش ہونے کے لئے دہلی بھیجا گیا تو گجرات کے گورنر داؤد خاں نے کپور چند کی وجہ سے قاضی شہر اور دیگر حکام سے الٹا مسلمانوں کی زیادتی کا محضر مرتب کرا کر اپنے دستخطوں کے ساتھ دہلی روانہ کیا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ محضر ہندو لے کر گئے (وہاں رتن چند نامی ایک ہندو چیف جسٹس آف انڈیا کے عہدے پر متمکن تھا) رتن چند نے انصاف کرنے یا فریقین میں مصالحت کرانے کی بجائے الٹا عبدالعزیز، شیخ عبدالوحید، شیخ محمد علی واعظ اور دوسرے ہمراہی مسلمانوں کو قید کر دیا[1]۔"

اسی عہد کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے جس سے ہندو ذہنیت اور ہندوؤں کے عزائم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ "۲۷ رمضان المبارک ۱۱۳۱ھ کو جمعہ کے دن اکبر آباد میں ایک ہندو عورت کسی مسلمان مرد کے عشق و محبت میں سرشار ہوکر اپنی خوشی سے مسلمان ہو گئی۔ اس کے رشتہ داروں نے رتن چند کے پاس پہنچ کر شکایت کی۔ رتن چند نے اسی وقت کوتوال اکبر آباد کے نام حکم بھیجا کہ اس عورت کو نہایت ذلت و خواری سے شہر میں تشہیر کرا کے اس کے رشتہ داروں کے سپرد کر دو اور اس مرد کو بے آبرو کر کے جلا وطن کر دو۔ جب اس حکم کی تعمیل ہوئی تو مسلمانوں کو بہت جوش آیا۔ مگر زمانے کا رنگ دیکھ کر چپ ہی رہے[2]۔"

---

[1] امرائے ہنود صہ ۲۴۵ مولفہ منشی محمد سعید احمد مارہروی

[2] امرائے ہنود صہ ۲۴۹

واجد علی شاہ کا عہد

مغلیہ سلطنت کے دورِ انحطاط کا ایک واقعہ بیان کرکے اب ہم اس باب کو ختم کرتے ہیں۔ یہ واقعہ اودھ سے تعلق رکھتا ہے اور زمانہ واجد علی شاہ اختر کا تھا۔ اودھ میں فیض آباد کے قریب ہندوؤں کا ایک متبرک مقام اجودھیا ہے۔ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس مقام پر رام چندر جی کی ولادت ہوئی تھی۔ جب بابر نے ہندوستان پر اسلامی سلطنت کا علم لہرایا تو اس نے اجودھیا میں ایک مسجد تعمیر کروائی۔ یہ نہایت عالی شان مسجد تھی اور مسجد جامع کہلاتی تھی۔ اس کے قریب ہی رام گھاٹ کے مقام پر فدائی خان صوبہ دار نے بھی ایک مسجد تعمیر کرائی۔ مگر مغلیہ سلطنت کو کمزور ہوتا دیکھ کر ہندوؤں کے حوصلے بڑھ گئے اور انہوں نے اس مسجد کو منہدم کر دیا۔ صرف اس کے ایک دو مینار اور دیوار کا تھوڑا سا حصہ باقی رہ گیا۔ ایک مسجد اجودھیا کے قلعے میں بھی تعمیر کی گئی تھی۔ مگر یہ قلعہ لچھمن نامی ایک مہنت کو بخش دیا گیا اس لئے مسلمان اس مسجد سے بھی محروم ہو گئے۔ ایک اور مسجد اورنگ زیب نے اجودھیا میں تعمیر کرائی۔ اس مسجد کو برہان الملک کے عہد میں ہندوؤں نے منہدم کر دیا۔ اور اس کی بجائے مندر تعمیر کر لیا۔ جب برہان الملک کے پاس شکایت کی گئی تو اس نے فوج بھیج کر مفسدوں کو سزا دی اور مندر گرا کر یہ مسجد دوبارہ تعمیر کروائی۔ مگر کچھ عرصے کے بعد نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں بیراگی فرقے کے ہندوؤں نے اس پر قبضہ کر لیا اور ممبر کو توڑ ڈالا۔ اسی دوران میں نواب اودھ نے اس علاقے پر ایک ہندو راجہ درشن سنگھ کو مامور کیا۔ درشن سنگھ کے زمانے میں ہنومانوں نے اس قدر طاقت حاصل کر لی کہ انہوں نے مسجد کے محراب و منبر منہدم کرکے اس کی صورت ہی بدل دی اور کئی سال تک اجودھیا میں اذان اور گئوکشی بند رہی۔ اسی عہد میں بابر بادشاہ کی تعمیر کردہ مسجد کو بت خانے میں تبدیل کر لیا گیا اور رام گھاٹ کی مسجد کے صحن میں علاقے کا کوڑا کرکٹ ڈالا جانے لگا۔ صرف یہی نہیں بلکہ قبروں کی اینٹیں اور پتھر اکھیڑ کر ان سے مندر تعمیر کئے گئے۔

یہ صورت حال ایسی نہ تھی جسے مسلمان دیکھتے اور خاموش رہتے۔ چنانچہ واجد علی شاہ کے عہد میں شاہ غلام حسین، مولوی محمد صالح، حسن علی خاں بانکے، احسان علی خاں رسالدار، رستم علی خاں اور بہادر علی خاں جو اس عہد کے جوشیلے مسلمان تھے مساجد کی بے حرمتی کے خلاف محمدی جھنڈا لے کر میدان میں نکل آئے۔ ۱۰ یا ۱۲ ذی قعد ۱۲۷۱ھ مطابق جولائی ۱۸۵۵ء میں دو تین سو مسلمان نماز ادا کرنے کے لئے مسجد بابری میں داخل ہوئے مگر ہندوؤں اور بیراگیوں نے مزاحمت کی اور مسلمان نماز ادا نہ کر سکے۔ دوسرے روز پھر بیراگیوں نے حملہ کیا اور عین اس وقت کہ مسلمان ہتھیار اتار کر کھانا کھانے میں مصروف تھے

ہزاروں بیراگیوں نے مسجد پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کی تعداد کم تھی اور بیراگی ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیراگیوں نے مسجد میں گھس کر مسلمانوں کو ذبح کر ڈالا۔ ان کے جسم کے ٹکڑے کر دیئے اور صحن مسجد مسلمانوں کے خون سے رنگین ہو گیا۔ اکثر مسلمانوں کے گلے میں قرآن شریف حمائل تھے۔ بیراگیوں نے انہیں پرزے پرزے کرکے پاؤں سے روندا اور جلایا۔ ایک ہندو مصنف رام سہائے نے بھی اس واقعہ کا اعتراف کیا ہے اور اپنی کتاب "افضل التواریخ" میں لکھا ہے کہ "غلام حسین کے ساتھ ایک سو تئیس آدمی کام آئے تھے۔" اس کے بعد بیراگی جوتے پہن کر مسجد میں آئے، سنکھ بجایا، ہون کیا اور بہت بے ادبیاں کیں صرف یہی نہیں بلکہ راجہ مان سنگھ اور راجہ کشن دت کے سیکڑوں ہندو ملازمین اور گرد و پیش کے ہندو زمیندار امداد کو پہنچ گئے۔ ان کی تعداد دس بارہ ہزار کے قریب ہو گئی۔ ان لوگوں نے بیگم پورہ کے مسلمانوں پر حملہ کیا۔ یہ حملہ اتنا سخت تھا کہ لوگ عزت و ناموس کی حفاظت کی خاطر اپنے گھر چھوڑ کر فیض آباد چلے گئے۔[1]"

گزشتہ صفحات میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف کس قدر بغض تھا۔ وہ ان کی جان کے بھی دشمن تھے اور ایمان کے بھی۔ واجد علی شاہ کے عہد تک اودھ میں حکومت مسلمانوں کی ہی تھی۔ مگر اس کے باوجود انہیں جس علاقے میں تھوڑا سا بھی اقتدار حاصل ہو جاتا تھا وہ مسلمانوں کی ایذا رسانی پر کمر بستہ ہو جاتے تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر انہیں ہندوستان پر مکمل اقتدار حاصل ہو جاتا تو وہ مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے اور ان مظلوموں کا کیا حشر ہوتا۔ یہ چند واقعات ہیں جو بطور نمونہ درج کئے گئے ہیں ورنہ ان واقعات کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔

---

[1] تاریخ اودھ ملخص صفحات ۲۰۰ تا ۲۰۷ مولفہ مولانا حکیم نجم الغنی خاں رامپوری

زوالِ سلطنتِ مغلیہ اور مظالمِ ہنود

اب ہم تاریخ کے ایک نازک بلکہ نازک ترین دور میں داخل ہوتے ہیں یہ وہ دور ہے جب مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ ملتِ اسلامیہ کا سفینہ ہچکولے کھا رہا تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے اور پھر پوتے جانشینی کے لئے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے۔ مرکز کمزور ہو چکا تھا۔ غیر مسلم جو طویل عرصے سے اس نازک وقت کے منتظر تھے اپنے خطرناک عزائم کے ساتھ میدان میں آ چکے تھے۔ مرہٹے، جاٹ اور سکھ یہ تین غیر مسلم طاقتیں برصغیر پر اپنا تسلط قائم کر چکی تھیں اور پھر ایک دور ایسا بھی آیا جب دہلی کے مغل سلاطین اور صوبوں کے گورنر ان میں سے کسی نہ کسی غیر مسلم طاقت سے امداد لینے پر مجبور ہو گئے اس طرح ان غیر مسلموں کے اقتدار میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ جن لوگوں نے اُس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ برصغیر کی یہ تینوں غیر مسلم طاقتیں اسلام اور مسلمانوں کی شدید دشمن تھیں اور ان کا مقصد برصغیر سے اسلام کو جلا وطن کر کے یہاں غیر مسلم حکومت قائم کرنے کے سوائے اور کچھ نہ تھا اور اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ انہوں نے اپنے اقتدار کو اس مقصد کے حصول کے لئے پوری طرح استعمال کیا۔ ذیل کی تصریحات سے ہمارے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے۔

مرہٹوں کا فتنہ

جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے کہ مرہٹے اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے ہی میں ایک سیاسی اور مذہبی طاقت کی حیثیت سے ابھر آئے تھے۔ ان کے سردار سیواجی نے دکن میں لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا تھا مگر اورنگ زیب کے مضبوط ہاتھ نے سیواجی اور مرہٹوں کو اپنی گرفت میں لے کر وقتی طور پر ان کا زور توڑ دیا۔ سیواجی تو اورنگ زیب کی زندگی ہی میں فوت ہو گیا مگر اس نے جس فتنے کی تخم ریزی کی تھی وہ آہستہ آہستہ بڑھا، پھلا پھولا اور ایک تناور درخت بن گیا۔ سیواجی کے بعد اس کا بیٹا سنبھاجی اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ یہ نہایت بدکردار، عیاش، جنگجو مگر ظالم انسان تھا۔ اس نے مرہٹوں کو از سرِ نو منظم کیا اور تین ہزار سواروں کو لے کر پہلے برہان پور کے مضافات پر حملہ کیا اس کی فوجوں نے شہر بہادر پور کو جہاں لکھ پتی تاجر اور صراف آباد تھے لوٹ کر

تباہ و برباد کر دیا۔ اس کے بعد مضافاتی بستیوں کو تین دن تک لوٹتا اور باشندوں کو قتل کرتا رہا[1]۔ آبادیوں سے آگ کے شعلے اور دھوئیں کے بادل اٹھتے رہے اور عورتیں، بچے اور بوڑھے ان میں بلبلاتے اور جل کر راکھ ہوتے رہے۔ خافی خاں کا بیان ہے کہ مرہٹوں کے مظالم اس حد تک بڑھ گئے کہ بعض علاقوں کے شیوخ و سادات نے بادشاہ کی خدمت میں محضر نامہ بھیجا کہ کافروں کے ہاتھوں ہمارا دین و ایمان بھی خطرے میں پڑ گیا ہے اور اذان و نماز بند ہو گئی ہے۔ اورنگ زیب کو جب اس صورت حال کی خبر ہوئی تو وہ خود مرہٹوں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا۔ اس جنگ میں مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی اور سنبھاجی گرفتار ہو کر بادشاہ کے حضور پیش ہوا۔ اورنگ زیب کے حکم سے اس کی گردن مار دی گئی مگر اس کے سات سالہ بیٹے ساہو، سنبھا کی والدہ اور بیٹی کے ساتھ اورنگ زیب نے نہایت عزت و احترام کا سلوک کیا اور ساہو کو سات ہزاری کا منصب دے کر اس کی پرورش اور تربیت اپنے ذمے لے لی مگر بعد میں اسی ساہو نے مغلیہ سلطنت اور مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔

رام راجہ کی غارت گری

سنبھاجی کے قتل کے بعد مرہٹوں نے اس کے بھائی رام راجہ کو اپنا سردار بنا لیا۔ رام راجہ نے مرہٹوں کو از سر نو منظم کیا اور ایک زبردست لشکر لے کر مغلیہ سلطنت پر حملے شروع کر دیئے۔ بہت سے مرہٹے شاہی فوج میں بھی ملازم تھے۔ انہوں نے رام راجہ کے لئے جاسوسی کی خدمات سرانجام دیں اور اس طرح شاہی فوج کو بعض مواقع پر سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ رام راجہ نے مرہٹوں کو ہدایت کی کہ دکن اور ان شاہی علاقوں کو بے دریغ لوٹ لیں جو چوتھ دینے سے انکار کریں۔ اس اعلان کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوٹ مار کے لالچ میں بے شمار دکنی مرہٹوں کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے جو بغیر تنخواہ کے مرہٹوں کے لئے خدمات سرانجام دیتے تھے کیونکہ انہیں لوٹ مار سے اتنا کچھ مل جاتا تھا جس کا دسواں حصہ بھی تنخواہ سے حاصل نہیں ہوتا تھا۔ اس ڈاکہ زن فوج کے دو سردار سنتاجی اور دھناجی بہت مشہور ہوئے اور ان لوگوں کی سرکردگی میں مرہٹوں نے نہ صرف دکن اور مغلیہ سلطنت کے بعض علاقوں کو لوٹا بلکہ کئی بار تو شاہی خزانہ بھی ان کی لوٹ مار سے نہ بچ سکا[2]۔

آخر اورنگ زیب کے ایک جرنیل ذوالفقار خاں نے ۶ شعبان ۱۱۰۸ھ مطابق ۱۶۹۶ء میں

---

[1] منتخب اللباب حصہ دوم صفحہ ۲۷۲ مؤلفہ خافی خاں

[2] تاریخ مرہٹہ صفحہ ۳۷ مؤلفہ مولوی محمد ادریس خاں

قلعہ جنجی فتح کرلیا۔ اور ایک خوں ریز جنگ کے بعد مرہٹوں کا مشہور سردار سنتاجی مارا گیا۔ رام راجہ میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے پھر لشکر فراہم کرلیا اور صوبہ برار میں لوٹ مار اور قتل و غارت سے قیامت برپا کردی۔ دریائے نربدا کے کنارے پھر ذوالفقار خاں سے اس کا مقابلہ ہوا اور شعبان ۱۱۱۱ھ مطابق ۱۷۰۰ء میں راجہ رام کو ذلت ناک شکست ہوئی اور اس غم میں ایک ماہ کے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔

راجہ رام کے انتقال کے بعد اس کی بیوی تارا بائی راجہ رام کی جانشین ہوئی۔ اس نے سارے مرہٹہ سرداروں کو جمع کرکے فوجیں منظم کیں اور بہت سے قلعے فتح کرکے اورنگ زیب کو مجبور کردیا کہ پیرانہ سالی کے باوجود وہ خود میدان میں آئے۔ چنانچہ یہ بوڑھا مگر جوانوں سے زیادہ باہمت، چاق چوبند اور مستعد بادشاہ خود فوجوں کی قیادت کرنے مرہٹوں کے مقابلے میں آیا اور ایک ایک کرکے ان کے سارے قلعے فتح کرلئے جن کی تعداد چالیس بیان کی جاتی ہے۔ مرہٹے مولی گاجر کی طرح کاٹ کر پھینک دیئے گئے اور ان کی جمعیت بہ ظاہر منتشر ہوگئی۔ یہ شوال ۱۱۱۷ھ کا واقعہ ہے۔ اس کے ایک سال بعد اورنگ زیب کا انتقال ہوگیا۔

ساہوجی کے مظالم

اورنگ زیب کے انتقال کے ساتھ ہی مغلیہ سلطنت شاہزادوں کی باہمی رقابت اور حصولِ اقتدار کی کشمکش کی بدولت نہایت تیزی سے رو بہ زوال ہونے لگی۔ شہزادہ اعظم، معظم اور کام بخش کی معرکہ آرائیوں نے مرہٹوں کے لئے ایک سنہرا موقع مہیا کردیا۔ اس موقع پر ساہو جسے سنبھاجی کے قتل کے بعد اورنگ زیب نے ہفت ہزاری کا منصب دیا تھا اور خورد سال ہونے کی وجہ سے اس کی پرورش اپنے ذمے لی تھی، مغلوں کا سب سے بڑا دشمن ثابت ہوا۔ حالانکہ شاہزادہ اعظم نے تخت نشین ہونے کے بعد ساہو کو نہایت اعزاز واکرام کے ساتھ اس کے وطن جانے کی اجازت دے دی اور اسے اس کی آبائی جاگیر بھی عطا کردی۔ ایک اور مرہٹہ سردار نیماجی سندھیا کو بھی ہفت ہزاری کا منصب اور خلعت عطا کیا گیا اور اورنگ آباد کا کچھ حصہ بطور جاگیر دیا گیا۔ بجائے اس کے کہ یہ لوگ بادشاہ کی عنایات کے شکر گزار ہوتے اور اس کی سلطنت کے استحکام کا باعث بنتے، ان لوگوں نے اپنی طاقت مجتمع کرکے پھر مغلیہ سلطنت کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا۔ ساہوجی کو جملہ مرہٹوں نے اپنا سردار بنایا اور وہ تمام قلعے واپس لے لئے جنہیں اورنگ زیب نے نہایت جانفشانی سے فتح کیا تھا۔ اس کے بعد مرہٹوں نے دکن میں قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم کردیا۔ دیہات کے دیہات اور

بعض اوقات شہر کے شہران کے ہاتھوں ویران ہو گئے اور جنوبی ہند سے امن و امان نہ صرف رخصت ہو گیا بلکہ اس نام کی کسی چیز کا وجود ہی باقی نہ رہا۔ اس کے بعد داؤد خاں افغان اور پھر آصف جاہ اول یکے بعد دیگرے دکن کے گورنر مقرر ہوئے اور ان دونوں نے اپنی شجاعت و تدبر سے مرہٹوں کا زور توڑ کر دوبارہ امن و امان بحال کیا۔ مگر دہلی میں تلوار کے ذریعے انتقالِ اقتدار کا جو ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا اس کا اثر دکن کے حالات پر پڑنا ناگزیر تھا۔

سید برادران کی مرہٹہ نوازی

اسی دوران میں فرخ سیر تخت دہلی پر متمکن ہو گیا۔ نظام الملک کی بجائے سید حسن علی جس کی خود غرضی اور فتنہ آرائی نے مغلیہ سلطنت کو تباہ کر دیا تھا دکن کا گورنر مقرر ہوا۔ اس نے اپنی طاقت بڑھانے کے لئے مرہٹوں کی سرپرستی کی۔ انہیں مغلیہ سلطنت میں اپنے کارندے مقرر کر کے مال گزاری وصول کرنے کا اختیار دیا۔ حفاظتی پولیس میں انہیں عہدے دیئے اور جب فرخ سیر نے سید عبد اللہ اور سید حسن علی (یہ وہی سید بھائی ہیں جو تاریخ میں بادشاہ گر کے نام سے مشہور ہوئے) کے باغیانہ د منافقانہ عزائم کا بیقین حاصل کر لینے کے بعد ان کی گوشمالی کا فیصلہ کیا تو یہی مرہٹے سید حسن علی کی فوج میں گروہ در گروہ شامل ہو کر دہلی پہنچے اور ان دونوں سید بھائیوں نے انہی مرہٹوں کی امداد سے فرخ سیر کو معزول کر کے رفیع الدرجات کے سر پر تاج حکومت رکھ دیا۔ اب یہ دونوں بھائی دہلی میں سیاہ و سپید کے مالک تھے اور دکن میں مرہٹے من مانی کارروائیاں کر رہے تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں ان دونوں بھائیوں نے رفیع الدرجات اور پھر رفیع الدولہ کو تخت سلطنت پر بٹھایا۔ پھر محمد شاہ کے سر پر تاج شاہی رکھا گیا۔

نظام الملک اور مرہٹے

اسی دوران میں سید برادران اور نظام الملک آصف جاہ میں کشمکش شروع ہو گئی اور جب نظام الملک دکن کی طرف روانہ ہوا تو سید برادران نے بعض سرداروں کو جن میں مرہٹہ سردار بھی شامل تھے ہدایت کی کہ نظام الملک کو دکن میں داخل نہ ہونے دیا جائے مگر ایک خونریز جنگ کے بعد جس میں کثیر تعداد میں مرہٹے کام آئے نظام الملک کو کامیابی ہوئی۔ یہ دیکھ کر سید حسن علی نے محمد شاہ کو نظام الملک کے خلاف بھڑکایا اور اسے نظام الملک کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لئے دکن روانہ ہونے پر آمادہ کر لیا۔ محمد شاہ بظاہر تو فوجیں لے کر دکن کی طرف روانہ ہو گیا مگر اثنائے راہ میں اس کے اشاروں سے سید حسن علی کا کام تمام کر دیا گیا اور پھر دوسرے بھائی کو بھی گرفتار کر کے اسے اس کے کیفر کردار تک

پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد محمد شاہ دہلی واپس آ گیا اور اس نے نظام الملک کو ہندوستان کا وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ مگر کچھ ہی عرصے کے بعد بعض خود غرض درباری سرداروں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے نظام الملک اور محمد شاہ میں کشمکش شروع ہو گئی۔ آخر کار نظام الملک نے یہ دیکھ کر کہ مرکز روز بروز کمزور ہوتا جا رہا ہے اور خود غرض امرا بادشاہ پر حاوی ہو چکے ہیں بہتری اسی میں سمجھی کہ کم از کم دکن کو ان فتنوں سے محفوظ رکھا جائے اور وہاں ایک مضبوط حکومت قائم ہو جائے۔ چنانچہ دکن میں اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ابتدا میں اسے مرہٹوں کی امداد حاصل کرنی پڑی تاکہ اپنی نوزائیدہ سلطنت کو مستحکم کر لے۔ اس کا خیال تھا کہ استحکام سلطنت کے بعد آہستہ آہستہ مرہٹوں کا زور توڑ کر انہیں ختم کر دے گا اس طرح جنوبی ہند میں ایک مضبوط اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹے پھر خود سر ہو گئے۔ صوبہ گجرات اور قرب و جوار کے علاقے مرہٹوں کی غارت گری کا بری طرح نشانہ بنے۔ غربا تو غربا امرا روٹیوں کو محتاج ہو گئے۔ اسی دوران میں بالاجی بشواناتھ نامی ایک لائق اور مدبر برہمن نے ساہوجی کا قرب حاصل کر کے اسے نہایت مفید مشورے دیئے۔ اب بالاجی ساہو کا وزیر بن چکا تھا اور اس نے مرہٹوں کو ایک منظم طاقت میں تبدیل کر دیا تھا۔ اب ان کے حوصلے اتنے بلند ہو گئے کہ انہوں نے خاندیس، مالوہ، راجپوتانہ اور آگرہ و الہ آباد تک یورشیں شروع کر دیں اور ان کی راہ میں جو آیا خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا۔ مکانات ویران، فصلیں تباہ، ہر طرف انسانی لاشوں کے انبار غرض آگ اور خون کا سیلاب تھا کہ ہر طرف موجزن ہو چکا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے دہلی کا رخ کیا اور نواح دہلی میں خوب لوٹ مار کی۔ آخر محمد شاہ نے نظام الملک آصف جاہ کو امداد کے لئے بلایا۔ آصف جاہ کی آمد کی خبر سن کر مرہٹے دکن کی طرف پسپا ہو گئے[۱]۔

نادر شاہ کا حملہ

مرہٹوں کے ہاتھوں دکن اور شمالی ہند کے مسلمان برباد ہو کر سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ایران کے حکمران نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کر دیا اور رمضان ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۸ء میں پہلے لاہور اور پھر کرنال میں مغلیہ فوجوں کا نادر شاہ سے مقابلہ ہوا۔ دونوں مقابلوں میں نادر شاہ کو فتح ہوئی۔ آخر برہان الملک اور آصف جاہ کی کوشش سے محمد شاہ اور نادر شاہ میں صلح ہو گئی۔ غالب و مغلوب دونوں بادشاہ دہلی آئے اور نادر شاہ لال قلعہ میں فروکش ہوا۔ اسی دوران میں کسی چنڈو باز نے یہ غلط

---

[۱] ماثر الامرا جلد ۳ صفحہ ۵۴۸

خبر اڑا دی کہ محمد شاہ نے نادر شاہ کو قتل کر دیا ہے۔ اس خبر کا پھیلنا تھا کہ مغل سپاہی بلائے ناگہانی کی طرح ایرانی سپاہیوں پر ٹوٹ پڑے۔ جب نادر شاہ کو اس واقعے کی خبر ہوئی اور اس نے قلعے سے نکل کر جا بجا ایرانی سپاہیوں کی لاشیں دیکھیں تو وہ غضب ناک ہو گیا اور اس نے قتل عام کا حکم دے دیا۔ مورخین کا اندازہ ہے کہ اس قتل عام میں دہلی کے ڈیڑھ لاکھ باشندے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور کروڑوں روپے کی املاک لوٹ لی گئی۔ آخر محمد شاہ کی درخواست اور معافی مانگنے پر نادر شاہ نے قتل عام بند کیا اور جب وہ ہندوستان سے واپس ہوا تو اس کے پاس ستر کروڑ روپے کی مالیت کے جواہرات، زیورات اور نقدی تھی اس کے علاوہ محمد شاہ کی بیٹی بھی ساتھ تھی جو اس نے نادر شاہ کے بیٹے نصر اللہ مرزا کے عقد میں دے دی تھی۔

نادر شاہ کے بعد

نادر شاہ کی واپسی کے بعد مغلیہ سلطنت کا رہا سہا وقار بھی خاک میں مل گیا۔ صوبوں کے گورنروں نے کھلم کھلا بغاوت کر دی۔ بنگال کے گورنر علی وردی خاں نے بنگال، بہار اور اڑیسہ پر اپنی مستقل حکومت قائم کر لی، اودھ کے علاقے پر صفدر جنگ قابض ہو گیا اور پھر ان امرا میں کش مکش شروع ہو گئی۔ ان حالات میں مرہٹوں نے پھر سر اٹھایا اور دکن سے بنگال اور دہلی سے پنجاب تک حملے شروع کر دیئے۔ ان حملوں میں مسلمانوں کو سخت بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔ گو علی وردی خاں نے بڑی بہادری سے ان کا مقابلہ کیا کئی بار انہیں ذلت ناک شکست دی اور ان کے بڑے بڑے سرداروں کو قتل کر دیا مگر کوئل کے مقام پر بادشاہ دہلی کو انہوں نے بری طرح شکست دی اور ملہار راؤ نے دہلی تک بادشاہ کا تعاقب کیا۔ اس کے بعد وہ پنجاب کی طرف بڑھے جہاں آدینہ بیگ نامی ایک خود غرض اور دھوکے باز سردار جالندھر کے دوآبے کا حاکم تھا۔ یہ حملہ انہوں نے اسی کے ایما پر کیا تھا تاکہ اپنے حریف مراد خاں کو زک دے سکے۔ پنجاب پہنچ کر مرہٹوں نے خوں ریز جنگ کے بعد بہت بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح دکن سے پنجاب تک وسیع و عریض علاقہ ان کے قبضے میں آ گیا۔ اب ہم مرہٹوں کی غارت گری کا بیان ختم کر کے اس عہد کی دوسری غیر مسلم طاقت یعنی جاٹوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

جاٹوں کی غارت گری

یہاں مراد ان جاٹوں سے ہے جو اکبر آباد (آگرہ) اور اس کے گرد و نواح میں آباد تھے یہ نہایت سرکش لوگ تھے۔ اورنگ زیب کے دسویں سال جلوس میں نارنول کے ستنامی فرقے کے ہندوؤں کے ساتھ مل کر آگرہ کے جاٹوں نے سرکشی اختیار کی اور اکبر آباد سے اجمیر تک قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم

کر دیا۔ ۱۰۹۵ھ میں جاٹوں کے سردار نے سنسی کے مقام پر ایک مضبوط گڑھی تعمیر کی۔ دشوار گزار مقامات پر بھی گڑھیاں بنائیں اور قرب و جوار کے مسلمانوں کے گاؤں تہس نہس کر دیئے۔ آخر اورنگ زیب نے اپنے بہادر اور تجربہ کار جرنیل خان جہان کو ان کی سرکوبی پر مامور کیا جس نے اس علاقے کو گھیر کر جاٹوں کو بری طرح تہہ تیغ کیا اور ان کی گڑھیاں مسمار کر دیں۔ ۱۱۰۰ھ میں انہوں نے پھر سر اٹھایا اور اس بار مغلیہ سلطنت کا ایک بہت بڑا جرنیل آغر خاں ان کے ہاتھوں شہید ہو گیا۔ ۱۱۰۶ھ میں ایک بار پھر انہوں نے مسلم کشی کا بازار گرم کر دیا۔ آخر تنگ آکر اورنگ زیب نے اس بار ان کے انسداد کا مستقل انتظام کیا اور اپنے بیٹے شہزادہ محمد معظم بہادر شاہ کو آگرہ کا گورنر مقرر کیا۔ اور اسے اختیار دے دیا کہ جاٹوں کی سرکوبی کے لئے وہ جو چاہے تدابیر اختیار کرے۔ بہادر شاہ نے ان پر پے در پے حملے کئے اور شکستوں پر شکستیں دیں۔

اورنگ زیب کی وفات سے بعد حالات جاٹوں کے لئے حوصلہ افزا ثابت ہوئے اور اورنگ زیب کے جانشینوں خصوصاً فرخ سیر، محمد شاہ اور شاہ عالم کو ان لوگوں کے ہاتھوں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چورامن جاٹ ان کا مشہور سردار تھا۔ اکبر آباد کے علاقے کے مسلمان اس کے ظلم و ستم کا سب سے زیادہ نشانہ بنے آخر بادشاہ نے ان کی سرکوبی کے لئے ایک لشکر جرار روانہ کیا۔ خونریز جنگ کے بعد چورامن نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس موقع پر سید عبداللہ (بادشاہ گر) نے اپنی ذاتی اغراض کے تحت جاٹوں کا مکمل استیصال کرنے کی بجائے ان سے صلح کر لی اور فرخ سیر کی مرضی کے خلاف اس پر زور ڈال کر نہ صرف چورامن کو معافی دلوا دی بلکہ منصب بھی دلوایا۔ اس طرح ایک غدار مسلمان کے ہاتھوں ایک ظالم ہندو کو تحفظ مل گیا۔

نادر شاہ کے حملے کے بعد جب مغلیہ سردار آپس میں دست و گریباں ہو گئے تو اس موقع سے جاٹوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ اب وہ ایک منتظم سردار سورج مل کی قیادت میں شمالی ہند کی ناقابل نظر انداز طاقت بن گئے۔ چنانچہ صفدر جنگ اور روہیلکھنڈ کے افغان سرداروں کی جنگ میں سورج مل نے صفدر جنگ سے مل کر فرخ آباد پر حملہ کر دیا۔ راستے میں ان جاٹوں نے مسلم آبادیوں کو خاص طور سے تباہ و برباد کیا لیکن افغان سردار نواب احمد خاں نے بہادری سے صفدر جنگ اور سورج مل کی متحدہ فوج کو شکست دے کر روہیلکھنڈ سے نکال دیا مگر ۱۱۶۴ھ میں جب صفدر جنگ سے مل کر جاٹوں اور مرہٹوں نے روہیلکھنڈ کے افغان سرداروں پر حملہ کیا تو اس وقت افغانوں میں اتحاد نہ تھا۔ اس لئے انہیں شکست ہوئی۔ ایک روایت کے مطابق الہ آباد سے ہمالیہ کی ترائی تک سارا علاقہ مرہٹوں اور جاٹوں کی لوٹ مار سے تباہ و برباد ہو گیا۔

اس سے قبل ۱۱۶۱ھ[1] میں جاٹوں نے سفدر جنگ سے مل کر دہلی اور اس کے مضافات کو تختۂ مشق ستم بنایا۔ ان کی لوٹ مار سے شاید ہی کوئی گھر محفوظ رہا ہو۔ بقول حضرت شاہ ولی اللہ رح جاٹوں نے دہلی کے شہر کہنہ کو لوٹا اور حکومت اس فساد و شرارت کو دفع کرنے سے عاجز رہی۔ انہوں نے مال لوٹے، عزت و ناموس کو برباد کیا اور مکانات کو آگ لگائی۔"

اس طرح مرہٹوں کے بعد جاٹوں کے ہاتھوں شمالی ہند کا خاصہ بڑا حصہ بری طرح تباہ و برباد ہوا اور مسلمانوں کی آبادی کے علاقے خاص طور پر ان کی زد میں آئے۔ اب ہم جاٹوں کی غارت گری کا بیان ختم کر کے اس عہد کی تیسری غیر مسلم طاقت یعنی سکھوں کی غارت گری کا اجمالی خاکہ پیش کرتے ہیں۔

سکھوں کی غارت گری

سکھ ابتدا میں خالص مذہبی فرقے کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔ اس فرقے کے بانی بابا نانک رح صاحب ایک صوفی منش بزرگ تھے اور اپنے پیروؤں کو خدائے واحد کی پرستش کی تعلیم دیتے تھے۔ ان کا مسلک صلح و آشتی تھا۔ مسلمان انہیں اہل اللہ میں شمار کرتے تھے اور بلا شبہ ان کی پاکیزہ تعلیم اور پاکیزہ سیرت کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے مصلح اور روحانی پیشوا تھے۔

مغل بادشاہوں کا سکھوں سے سلوک

یہی وجہ ہے کہ بابا نانک صاحب اور ان کے جانشینوں کے ساتھ مسلمان سلاطین نے نہایت عزت و احترام کا سلوک کیا۔ چنانچہ مورخین نے لکھا ہے کہ جب جہانگیر کو معلوم ہوا کہ پنجاب میں ہرگوبند نام کے ایک گرو ہیں جنہیں ہزاروں آدمی اپنا پیشوا مانتے ہیں تو اس نے ہرگوبند کو سات توپیں، ایک ہزار پیادے اور پانچ سو سوار رکھنے کی اجازت عطا فرمائی اور پنجاب کے گورنر کے نام احکام جاری کئے کہ گرو صاحب کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اور انہیں جس چیز کی ضرورت ہو دی جائے۔ اس سے قبل اکبر بھی سکھوں کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ اس نے سکھوں کی مقدس کتاب گرنتھ صاحب پر اظہار عقیدت کے طور پر ایکاون اشرفیاں چڑھائیں۔ کچھ عرصے کے بعد جب وہ پنجاب آیا تو اس نے گرو ارجن سے ملاقات کی اور ان کی سفارش پر قحط سالی کی وجہ سے سارے پنجاب کا لگان معاف کر دیا۔[2] جہانگیر کے بعد جب

---

[1] بعض مورخوں نے ۱۱۶۶ھ لکھا ہے مگر یہ درست نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ رح کے ایک مکتوب سے بھی ۱۱۶۱ھ ہی درست ہے۔

[2] تاریخ ہندوستان جلد نہم صفحہ ۵۲ مولفہ شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ۔

شاہجہاں سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے سکھوں کے گرو ہرگوبند کی نہایت عزت کی اور انہیں خلعت فاخرہ سے نوازا۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ ان گرو حضرات نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان عوام دونوں کو ان نوازشات کا بہت بڑا صلہ دیا اور انہیں تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ انتہا تو یہ ہے کہ یہی گرو ہرگوبند جن پر جہانگیر اور شاہجہاں نے کیسے کیسے احسانات کئے شاہجہاں سے باغی ہو گئے اور کئی بار اس کی فوجوں سے جنگ کی۔ گرو گوبند سنگھ نے تو مسلمانوں سے مخاصمت کو اپنا نصب العین بنا لیا۔ ان کی اور اورنگ زیب کی فوجوں کی کئی لڑائیاں ہوئیں جن میں آخر کار انہیں شکست ہوئی اور وہ سرہند سے فرار ہو گئے۔

بندہ بیراگی اور اس کے مظالم

اورنگ زیب کی فوجوں سے شکست کھاکر گرو گوبند سنگھ نے فارسی میں ایک منظوم خط لکھ کر اورنگ زیب سے اپنی گزشتہ غلطیوں کی معافی مانگی اور کچھ عرصہ پنجاب میں قیام کرکے مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے دکن پہنچے۔ یہاں ان کی ملاقات ایک ہندو فقیر سے ہوئی جس کا نام نرائن داس تھا۔ یہ قوم کا راجپوت اور بیراگی فرقے کا رہنما تھا۔ گرو گوبند سنگھ نے اسے اپنا معتقد بناکر اس کے فرقے کے لوگوں کو بھی سکھ مذہب میں شامل کر لیا۔ نرائن داس بیراگی نے سکھ ہو کر اپنا نام بندہ تجویز کیا۔ گرو گوبند سنگھ نے اسے سکھ مذہب کی تعلیم دی اور پھر خلعتِ جانشینی عطا کرکے ایک سند بھی دی جس میں تمام سکھوں کو بندہ کی اطاعت و فرمانبرداری کا حکم دیا گیا تھا۔ سکھوں نے گرو گوبند سنگھ کے انتقال کے بعد بندہ کو اپنا سربراہ تسلیم کر لیا۔ اس نے پنجاب آکر لوٹ مار سے اپنی مہم کا آغاز کیا اور پھر چالیس ہزار جنگجو سکھوں کا لشکر مرتب کرکے سارے پنجاب میں قتل و غارت سے قیامت برپا کر دی جب بادشاہ (بہادر شاہ ابن اورنگ زیب) کو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو اس نے سکھوں پر کاری ضرب لگانے کا حکم دیا۔ مگر اب سکھ طاقت پکڑ چکے تھے۔ انہوں نے بندہ کی سرکردگی میں سرہند پر حملہ کرکے مغل فوجوں کو شکست دی، پرامن شہریوں کو قتل کیا، عورتوں کو بے آبرو کیا، حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کئے، عمارتوں کو جلاکر خاک کر دیا، مساجد اور مقابر کو منہدم کیا، مزاروں میں سے مردوں کی ہڈیاں نکال کر اپنی مسلم دشمنی کی آگ ٹھنڈی کی، شہر کو ویران کرکے اس نے یکے بعد دیگرے سہارنپور، مظفر نگر اور جالندھر کا رخ کیا۔ ان تینوں شہروں میں افغانوں کی اکثریت تھی۔ انہوں نے نہایت شجاعت سے سکھوں کا مقابلہ کیا اور انہیں شکست فاش دی۔ جالندھر سے ہزیمت اٹھانے کے بعد بندہ نے لاہور پر یورش کی۔ یہاں کاظم خاں ناظم لاہور اور اسلم خاں نائب ناظم لاہور نے نہایت پامردی

سے ان کا مقابلہ کیا۔ اہل شہر تو ان کے ظلم و ستم سے محفوظ رہے مگر دیہات بلکہ شالامار کے علاقے تک سکھوں نے تباہی مچا دی۔ آبادیاں ویران کر دیں جو ہاتھ لگا لوٹ لیا۔ آٹھ نو ماہ میں انہوں نے سہارنپور سے لاہور تک ہزاروں ہزار افراد کو قتل کیا۔ مساجد اور مقابر کو مسمار کیا، عورتوں کی آبروریزی کی اور گاؤں کے گاؤں نذر آتش کر دیئے۔

بندہ بیراگی کا قتل

پنجاب میں سکھوں کی غارت گری کی خبریں بہادر شاہ (ابن اورنگ زیب) تک پہنچ رہی تھیں مگر وہ مرہٹوں اور جاٹوں کی سرکوبی میں مصروف تھا اس لئے سکھوں کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دے سکا۔ جب مرہٹوں اور جاٹوں کا زور ٹوٹ گیا تو وہ اپنے آزمودہ کار جرنیلوں کو لے کر پنجاب روانہ ہوا۔ کئی خوں ریز جنگوں کے بعد سکھوں کو شکست فاش دی اور بندہ ہزیمت خوردہ فوج کے ساتھ لوہ گڑھ (ضلع گورداسپور) کے قلعے میں محصور ہو گیا اور کچھ دن کے بعد وہاں سے فرار ہو کر جنگلوں میں جا چھپا اسی اثنا میں بہادر شاہ کے انتقال اور جہاندار شاہ اور فرخ سیر کی خانہ جنگی کی وجہ سے ملک کی سیاسی صورت حال نہایت ابتر ہو گئی۔ سکھ جو بندہ بیراگی کی قیادت میں کسی مناسب موقع کا انتظار کر رہے تھے پہاڑوں اور جنگلوں سے نکل کر پھر میدان میں آ گئے اور پنجاب پھر فتنہ و فساد اور قتل و غارتگری کی آماجگاہ بن گیا۔ اب بندہ نے گورداسپور کو اپنا مرکز بنایا۔ لوہ گڑھ کو مضبوط قلعے کی شکل دی۔ پچاس ساٹھ ہزار سواروں اور پیادوں کا لشکر منظم کیا۔ سرہند اور لاہور تک لوٹ مار کرکے اس نے زر کثیر، اسلحہ اور گھوڑے جمع کیئے اور گورداسپور کے مضافاتی علاقوں پر تصرف کرکے ایک چھوٹی سی سلطنت کی بنیاد ڈالی ادھر مغل شاہزادوں کی خانہ جنگی میں میدان فرخ سیر کے ہاتھ رہا۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد اس نے سب سے پہلے بندہ بیراگی اور سکھوں کے استیصال کا فیصلہ کیا اور نواب عبدالصمد خاں کو پنجاب کا گورنر مقرر کرکے مغل اور افغان جرنیلوں کو اس کی امداد پر مامور کیا۔ نواب عبدالصمد خاں نے گورداسپور پہنچ کر سکھوں پر حملے شروع کر دیئے۔ سکھ ٹڈی دل کی طرح مغلیہ فوج پر چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے اور جی توڑ کر لڑے مگر آخرکار انہیں شکست ہوئی۔ بندہ مع اپنے خوردسالہ بیٹے کے گرفتار ہوا۔ اس کے ساتھ تین چار ہزار سکھ بھی گرفتار ہوئے۔ نواب عبدالصمد خاں کے حکم سے ان میں سے دو ہزار سکھوں کی گردنیں وہیں مار دی گئیں۔ باقی ماندہ سکھ بندہ کے ہمراہ قیدی بنا کر دہلی بھیج دیئے گئے جہاں فرخ سیر نے انہیں ہلاک کر دیا۔ ان کے سرداروں کے سر کٹوا کر نیزوں پر چڑھائے گئے اور شہر کے گلی کوچوں میں ان کی تشہیر کی گئی۔ مورخین نے لکھا ہے کہ بندہ کے جسم کا گوشت گرم چمٹوں سے نوچ نوچ کر

اسے ہلاک کر دیا گیا۔ اس طرح وقتی طور پر سکھوں کا زور ٹوٹ گیا۔[1] ہمارے خیال میں فرخ سیر کے نامۂ اعمال میں اگر کوئی نیکی ہے تو وہ یہی کہ اس نے پنجاب کے مسلمانوں کو بندہ کے انسانیت سوز مظالم سے نجات دلائی اور اسے اس کے کیفرِ کردار تک پہنچایا۔

کچھ عرصے کے بعد جب فرخ سیر کو تخت سے معزول کر دیا گیا اور ہر طرف افراتفری پیدا ہو گئی تو سکھوں نے پھر سر اٹھایا۔ مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہنے لگا۔ ان کی عزت و ناموس لٹنے لگی، اذانیں بند ہو گئیں، مساجد اصطبل میں تبدیل کر دی گئیں۔ گئوکشی ممنوع قرار دے دی گئی۔ کبھی سکھ اور کبھی مرہٹے پنجاب کی قسمت کے مالک بنے۔

---

[1] اس باب کو قلمبند کرتے وقت سیر المتاخرین، تاریخ ہندوستان (مولفہ مولوی ذکاء اللہ) منتخب اللباب، فال آف دی مغل ایمپائر، ہسٹری آف دی سکھس، تاریخ پنجاب (رائے بہادر کنہیا لال) ملٹری سسٹم آف دی مرہٹاز اور "شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سیاسی مکتوبات" سے استفادہ کیا گیا ہے (مولف)

برِصغیر میں احیائے اسلام کی کوششیں

گذشتہ صفحات میں مسلمانوں پر غیر مسلموں کے مظالم کا جو اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس عہد کے مسلمانوں پر کیسی قیامت گزر گئی۔ برصغیر کی ساری مسلم سوسائٹی کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ ان کی معاشی، تہذیبی، اخلاقی اور دینی حالت غرض سب کچھ شکست و ریخت کی زد میں آ گیا۔ اس وقت حالات کو روبہ اصلاح کرنے اور مسلمانوں کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دینے کے لئے دو طاقتیں میدان میں اتریں۔ ایک روحانی طاقت جس کا مرکز حضرت شاہ ولی اللہ کی شخصیت تھی۔ دوسری مادی طاقت جس کا محور نظام الملک آصف جاہ، نواب نجیب الدولہ، حافظ رحمت خاں والی روہیلکھنڈ، سلطان حیدر علی اور سلطان ٹیپو شہید تھے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس دوسری طاقت کو غیر مسلموں کے استیصال کے لئے استعمال کرنے کا سہرا بھی شاہ ولی اللہ محدثؒ کے سر بندھتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تحریک

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ بارھویں صدی کے مجدد اور علم و فضل کے بحرِ ناپیدا کنار تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ان خاص بندوں میں سے تھے جنہیں وہ خالص دینی اغراض کے لئے مامور فرماتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے نہایت تحدی سے دعویٰ کیا کہ میں اس صدی کا مجدد ہوں اور خداوند تعالیٰ نے مجھے اس منصب پر فائز کیا ہے۔ ایک اور مقام پر اپنی تصنیف "فیوض الحرمین" میں اپنا ایک رویا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "میں قائم الزماں ہوں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا منشا کسی ایسے نظام کو قائم کرنا ہوتا ہے جس کا مقصد خیر و فلاح ہو تو وہ اس مقصد کے حصول کے لئے مجھے ذریعہ بناتا ہے"[1]
ظاہر ہے کہ جس شخص کا یہ دعویٰ ہو وہ مسلمانوں کی بربادی کا خاموش تماشائی نہیں بن سکتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو آپ نے مسلمانوں کی اخلاقی کمزوریاں دور کرنے اور انہیں حقیقی مسلمان بنانے کے لئے

---

[1] فیوض الحرمین صہ۸۹
مصنفہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

"فتح الرحمان"[1] کے نام سے قرآن حکیم کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور حواشی لکھے تاکہ وہ لوگ جو عربی نہیں جانتے قرآن حکیم کی پاکیزہ تعلیم سے فیضان حاصل کر سکیں۔ اس کے بعد آپ نے قرآن حکیم کا درس دینا شروع کیا تاکہ اس ذریعے سے بھی مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ ان کی پستی اور انحطاط کا اصل سبب قرآن حکیم کی تعلیم سے غفلت ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے بیعت لینے کا بھی سلسلہ شروع کیا، اس طرح آپ نے پاکیزہ خیال اور پاکیزہ کردار مسلمانوں کی ایک جماعت تیار کی تاکہ وہ آپ کے مقاصد کے لئے کام کر سکے۔ اس سلسلے میں آپ نے متعدد دینی موضوعات پر جو مفید لٹریچر تخلیق کیا اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آپ برصغیر کے علمائے ربانی میں وہ ممتاز اور اہل بصیرت بزرگ تھے جنہوں نے مسلمانوں کو اسلام کے اقتصادی نظام کی طرف متوجہ کیا اور بادشاہ، امرا، عوام اور صوفیا چاروں طبقوں کو مخاطب کر کے بتایا کہ مسلم معاشرے کی ابتری کی بڑی وجہ اقتصادی ناہمواری بھی ہے۔ آپ نے صوفیا کو سرزنش کی کہ حجروں میں بیٹھ کر پیری مریدی کرنا اور مریدوں سے نذرانے وصول کرنا ترک کر دو اور فعال زندگی گزارو۔ بادشاہ کو اس کے فرائض یاد دلانے میں آپ نے کسی تامل یا جھجک سے کام نہیں لیا بلکہ نہایت صاف گوئی اور جرأت سے یہ فرض ادا کیا۔[2]

دوسری طرف آپ نے نظام الملک، نجیب الدولہ، حافظ رحمت خاں اور تاج محمد بلوچ جیسے مدبر اور صاحبِ قوت مسلمان حکمرانوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے برصغیر میں غیر مسلم طاقتوں کے استیصال کا ایک جامع منصوبہ بنایا۔ آپ نے افغانستان کے مدبر اور بہادر حکمراں احمد شاہ ابدالی سے بھی رابطہ قائم کر کے اسے برصغیر کے مسلمانوں کی امداد پر آمادہ کیا۔ چنانچہ آپ نے اسے لکھا کہ:

احمد شاہ ابدالی کو دعوت

"اس زمانے میں ایسا بادشاہ جو صاحبِ اقتدار و شوکت ہو اور لشکرِ مخالفین کو شکست دے سکتا ہو، دور اندیش اور جنگ آزما ہو، سوائے اس جناب کے اور کوئی موجود نہیں ہے۔ یقینی طور پر جنابِ عالی کا فرضِ عین ہے ہندوستان کا قصد کرنا اور مرہٹوں کا تسلط توڑنا اور ضعفائے مسلمین کو غیر مسلموں کے پنجے سے آزاد کرنا۔ اگر غلبۂ کفر معاذ اللہ اسی انداز پر رہا تو مسلمان اسلام کو فراموش کر دیں گے۔ اور

---

[1] شاہ ولی اللہؒ سے قبل شیر شاہ سوری کے استاد علامہ شہاب الدین دولت آبادی نے بھی قرآن حکیم کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا مگر وہ رواج نہ پا سکا (مولف)

[2] ملاحظہ ہو تفہیمات صفحہ ۲۱۶ مولفہ حضرت شاہ ولی اللہ محدثؒ

تھوڑا زمانہ نہ گزرے گا کہ یہ قوم ایسی قوم بن جائے گی کہ اسلام اور غیر اسلام میں تمیز نہ ہو سکے گی یہ بھی ایک بلائے عظیم ہے۔ اس بلائے عظیم کے دفع کرنے کی قدرت بہ فضل خداوندی جناب کے علاوہ کسی کو میسر نہیں ہے۔ ہم بندگانِ الٰہی حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو شفیع گردانتے ہیں اور خدائے عزوجل کے نام پر التماس کرتے ہیں کہ ہمتِ مبارک کو اس جانب متوجہ فرما کر مخالفین سے مقابلہ کریں تاکہ خداوند تعالےٰ کے یہاں بہت بڑا ثواب آپ کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے[1]۔"

نجیب الدولہ کو تحریک

احمد شاہ ابدالی کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے اس عہد کے نامور افغان سردار نواب نجیب الدولہ کو مخاطب کیا اور انہیں برصغیر کے مسلمانوں کو غیر مسلموں کے تسلط سے نجات دلانے کی پُر زور تحریک کی چنانچہ آپ نواب موصوف کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"خدائے تعالیٰ آں منبع الحسنات، امیر المجاہدین، رئیس الغزات کو فتوحاتِ تازہ اور برکات بے اندازہ سے مشرف و ممتاز کرے۔ فقیر ولی اللہ عفی عنہ، کی طرف سے التماس ہے کہ اکثر اوقات مجیب الدعوات کی درگاہ میں دعا کی جاتی ہے کہ وہ مخالفین اسلام کے فرقوں کو شکست خوردہ کر دے اور فضلِ باری سے امید ہے کہ یہ بات عنقریب وجود میں آجائے گی، ہندوستان میں تین فرقے شدت وصلابت کی صفت سے موصوف ہیں، جب تک ان تینوں کا استیصال نہ ہوگا نہ کوئی بادشاہ چین سے بیٹھے گا نہ امراء چین سے بیٹھیں گے اور نہ رعیت خاطر جمعی سے زندگی بسر کر سکے گی۔ دینی و دنیاوی مصلحت اسی میں ہے کہ مرہٹوں سے جنگ جیتنے کے بعد فوراً قلعہ جات جٹ (جاٹ) کی جانب متوجہ ہو جائیں اور اس مہم کو بھی برکاتِ غیبیہ کی مدد سے آسانی کے ساتھ سر کر لیں اس کے بعد نوبتِ سکھ ہے اس جماعت کو بھی شکست دینی چاہیئے اور رحمتِ الٰہی کا منتظر رہنا چاہیئے[2]۔"

آصف جاہ کو دعوت

اس عہد کی تیسری بڑی شخصیت نظام الملک آصف جاہ کی تھی جس نے کمال تدبر اور شجاعت سے ہر محاذ پر مرہٹوں کو شکست دی اور جو چاہتا تھا کہ برصغیر میں ایک مضبوط اسلامی حکومت قائم ہو جائے مگر افسوس کہ بادشاہِ وقت کی نادانی اور امراء کی خود غرضی نے آصف جاہ کو اس کے بلند مقاصد میں کامیاب

---

[1] شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سیاسی مکتوبات صفحہ ۱۰۶-۹۹ مولفہ پروفیسر خلیق نظامی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

[2] شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سیاسی مکتوبات صفحہ ۱۱۸

نہ ہونے دیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے برصغیر کے اس سب سے زیادہ صاحب قوت و شوکت اور اسلام دوست حاکم سے بھی رابطہ قائم کیا اور اسے نصرت اسلام و مسلمین کے لئے وقتاً فوقتاً تحریک کی چنانچہ اس کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں :

"بعد حمد و صلوٰۃ کے واضح ہو کہ اس فقیر کے دل پہ یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ عالم ملکوت میں یہ بات مقرر شدہ ہے کہ مخالفین اسلام ذلیل و خوار ہوں گے۔ بعد ازاں باغی لوگ رسوا اور خانہ خراب ہوں گے۔ اگر جناب عالی ان بدمعاشوں کے مقابلے میں کمر ہمت باندھ کر آجائیں تو یہ تمام کارنامے جناب کی طرف منسوب ہوں گے اور دنیا آپ کی تابعدار ہو جائے گی اور ملت مرحومہ کے رواج اور مسلم حکومت کی استقامت کا باعث جناب عالی کو قرار دیا جائے گا"[1]

حضرت شاہ صاحب کی ان کوششوں کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا نظام الملک آصف جاہ، نواب نجیب الدولہ حافظ رحمت خاں اور تاج محمد خاں بلوچ نے شاہ صاحب کی تحریک پر اپنے اپنے علاقوں میں مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کا نہایت پامردی سے مقابلہ کیا انہیں پے درپے شکستیں دیں اور ان کا منصوبہ جس کا مقصد ہندوستان پر رام راج قائم کرنا تھا خاک میں ملا دیا۔ اس میں شک نہیں کہ ان جنگوں میں مسلمانوں کا بے اندازہ جانی و مالی نقصان ہوا اور علاقے کے علاقے ویران ہو گئے۔ اگر صفدر جنگ، سید حسن علی خاں، سید عبداللہ، شجاع الدولہ، آدینہ بیگ اور غازی الدین خاں خود غرضی، فتنہ و فساد، شرارت اور غداری سے کام نہ لیتے اور حضرت شاہ صاحب کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے برصغیر کے مسلمان سرداروں کا ساتھ دیتے تو آج برصغیر کی تاریخ بہت مختلف ہوتی لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا مگر اس میں شبہ نہیں کہ حضرت شاہ صاحب کی مساعی جمیلہ سے مرہٹوں کی کمر ہمت ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گئی۔

جنگ پانی پت

اس عہد کی غیر مسلم طاقتوں میں سب سے زیادہ منظم طاقت مرہٹوں کی تھی جنہوں نے دکن کے علاوہ پنجاب پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور سکھ بھی ان سے مغلوب ہو گئے تھے اس لئے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے سب سے زیادہ توجہ اسی قوت کو پاش پاش کرنے پر مرکوز کر دی۔ انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو ذاتی طور پر دعوت دینے کے ساتھ ساتھ نواب نجیب الدولہ اور حافظ الملک حافظ رحمت خاں والی روہیلکھنڈ کے ذریعہ بھی اسے برصغیر آنے اور مرہٹوں پہ کاری ضرب لگا کر انہیں نیست و نابود کرنے کی تحریک کی۔

---

[1] شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سیاسی مکتوبات ص ۱۴۲

چنانچہ احمد شاہ ابدالی صرف تیس ہزار افغانوں کو اپنے ساتھ لے کر پنجاب روانہ ہو گیا۔ ادھر مرہٹے بھی مقابلے کی تیاری کر کے ٹڈی دل لشکر کے ساتھ بڑھے۔ ان کے بڑے بڑے جرنیل سداشو راؤ، بسواس راؤ، بلونت سنگھ، ملہار راؤ ہلکر، جاجی سندھیا، جھنکو جی اور مہاراجہ گائیکواڑ کے علاوہ راجپوت اور جاٹ بھی جن میں راجہ سورج مل بھی شامل تھا احمد شاہ ابدالی کے مقابلے کے لئے روانہ ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آخری جنگ تھی جو کفر و اسلام کے نام پر لڑی گئی تھی اور تاریخ گواہ ہے کہ اس جنگ میں ہندوستان کے تمام قابل ذکر راجہ مسلمانوں کو مٹانے اور انہیں ہندوستان میں غلامی کی زندگی گذارنے پر مجبور کرنے کے لئے متحد ہو گئے تھے۔ ان کے عزائم کا اندازہ کرنے کے لئے یہ امر کافی ہے کہ بھاؤ اور دیگر مرہٹہ سردار یہ فیصلہ کر کے دکن سے روانہ ہوئے تھے کہ جنگ میں کامیابی کے بعد بادشاہ دہلی اور افغان سرداروں کا خاتمہ کر دیا جائے گا اور بسواس راؤ کو ہندوستان کا بادشاہ بنایا جائے گا وہ اپنے ساتھ پتھر کا ایک بہت بڑا بت بھی لے گئے تھے تاکہ دہلی فتح کرنے کے بعد اس بت کو جامع مسجد میں نصب کر دیں اور اذان کی آواز کی بجائے صدائے ناقوس جامع مسجد دہلی سے بلند ہو۔[1]

ان کا ارادہ تھا کہ بسواس راؤ کو تخت سلطنت پر بٹھا کر شجاع الدولہ کو وزیر اعظم مقرر کیا جائے تاکہ اس مہم میں شجاع الدولہ کی خدمات کا صلہ بھی اسے مل جائے اور ایک مسلمان کے وزیر اعظم مقرر ہونے سے باقی مسلمانوں کی اشک شوئی بھی ہو جائے اور وہ یہ نہ سمجھیں کہ ہندوستان پر ہندوؤں کا مکمل عمل دخل ہو گیا ہے۔ لیکن جب احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پہنچ کر دتاجی سندھیا اور جھنکو جی کو شکست فاش دے کر اپنی فتح کا علم لہرا دیا اور اس جنگ میں مرہٹوں کی دو تہائی فوج دتاجی کے ہمراہ میدان میں کام آئی تو مرہٹوں کی آنکھیں کھلیں اور انہوں نے بسواس راؤ کو تخت دہلی پر بٹھانے کا ارادہ اس وقت تک ملتوی کر دیا جب تک کہ احمد شاہ ابدالی سے فیصلہ کن جنگ نہ ہو جائے۔ ۲۶ اپریل ۱۷۶۱ء کو پانی پت کے میدان میں یہ فیصلہ کن اور تاریخی جنگ شروع ہوئی۔ جس میں ایک طرف پانچ لاکھ مرہٹے اور ان کا اعلیٰ درجہ کا توپ خانہ تھا۔ دوسری طرف احمد شاہ ابدالی کے جھنڈے کے نیچے صرف پچاس ہزار سوار اور چالیس ہزار پیادے تھے۔ روہیلکھنڈ کے نواب دوندے خاں، حافظ رحمت خاں، نواب نجیب الدولہ، نواب احمد خاں بنگش اور نواب فیض اللہ کی سرکردگی میں جو روہیلہ فوجیں احمد شاہ ابدالی کے جھنڈے کے نیچے جمع تھیں وہ بھی ان نوے ہزار میں شامل تھیں۔ مسلمانوں کے پاس صرف

---

[1] تاریخ احمد صد ۱۲ بحوالہ نواب نجیب الدولہ اور جنگ پانی پت صد ۱۶ مولفہ مفتی انتظام اللہ شہابی

تیس توپیں تھیں جن میں سے بیس استعمال کے قابل تھیں۔ گویا یہ نوے ہزار مسلمانوں کا پچاس لاکھ ہندوؤں سے مقابلہ تھا مگر اس قلیل تعداد کے باوجود محض اللہ تعالٰی کے فضل، مسلمانوں کی جنگی حکمت عملی اور شجاعت و پامردی کی بدولت میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا اور مرہٹوں کے تمام بڑے بڑے سردار مثلاً بھاؤ (جسے عنایت خاں[1] ابن حافظ رحمت خاں نے قتل کیا تھا) بشواس راؤ، جسونت راؤ، سنبھاجی اور جنکوجی سندھیا وغیرہ بہادر روہیلوں اور ابدالی فوجوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ اس جنگ میں ایک محتاط اندازے کے مطابق ۲ لاکھ مرہٹے اور ان کے سردار کام آئے۔ اور مرہٹوں کا شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جس کا کوئی نہ کوئی شخص میدان پانی پت میں ہلاک نہ ہوا ہو۔ مرہٹوں کا راجہ بالاجی پیشوا اسی صدمے سے جلد ہی وفات پا گیا۔ افسوس کہ اس جنگ میں شجاع الدولہ نے نہایت ہی شرمناک کردار ادا کیا۔ ادھر تو اس نے مرہٹوں سے خط و کتابت جاری رکھی تاکہ ابدالی کی شکست کی صورت میں اس کی ریاست پر آنچ نہ آئے اور دوسری طرف ابدالی کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتا رہا۔ تاریخ گواہ ہے کہ وہ نیم دلی سے اس جنگ میں شریک ہوا اور آخر وقت تک کوشش کرتا رہا کہ ابدالی اور مرہٹوں میں صلح ہو جائے۔ ایک موقع پر تو عین میدان جنگ میں جب ابدالی کے جرنیل شاہ پسند خاں نے امداد کی درخواست کی تو وہ چپ چاپ کھڑا تماشہ دیکھتا رہا۔[2] بہر حال پانی پت میں مرہٹوں کو ایسی شکست ہوئی جس نے ہمیشہ کے لئے ان کی کمر توڑ دی۔ اس طرح حضرت شاہ ولی اللہ رح کے پروگرام کی ایک شق مکمل ہو گئی اور مرہٹوں نے مغلیہ تخت پر بیٹھ کر حکومت کرنے کا جو خواب دیکھا تھا وہ احمد شاہ ابدالی اور روہیلہ سرداروں کی مساعیٔ جمیلہ کی وجہ سے شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

سکھوں کی سرکوبی

احمد شاہ کی واپسی کے بعد سکھ پہاڑوں اور جنگلوں سے نکل آئے اور لاہور، سیالکوٹ، سرہند اور جالندھر میں لوٹ مار اور قتل و غارت سے قیامت برپا کر دی۔ جب ان واقعات کی خبر احمد شاہ ابدالی کو ہوئی تو وہ چالیس ہزار افغانوں کا لشکر لے کر آندھی اور طوفان کی طرح پنجاب آیا۔ اور مورخین کا بیان ہے کہ درانیوں کی ٹوپیاں دیکھتے ہی سکھ بھاگ کھڑے ہوئے مگر افغان فوجوں نے

---

[1] حیات حافظ رحمت خاں صفحہ ۱۰۵ مولفہ سید الطاف علی بریلوی۔

[2] تاریخ ہندوستان جلد نہم صفحہ ۲۹۹ مولفہ شمس العلما مولانا ذکاء اللہ۔

انہیں چاروں طرف سے گھیر کر مولی گاجر کی طرح کاٹ ڈالا۔ اس معرکے میں ۲۴ ہزار سکھ تہ تیغ ہوئے، زخمیوں کا کوئی شمار نہیں۔ سردار آلہ سنگھ والی پٹیالہ گرفتار ہو کر احمد شاہ کے حضور پیش ہوا اور سات لاکھ روپیہ بطور تاوان جنگ ادا کرکے گلو خلاصی کرائی۔ سکھوں کی تاریخ میں یہ سب سے زیادہ خونریز جنگ تھی جس نے سکھوں کو بری طرح تباہ کیا۔[1]

مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں

اسی دوران میں ہندوستان مغربی طاقتوں سے روشناس ہوا۔ روشناس وہ پہلے بھی تھا، مگر یہ روشناسی کچھ اور ہی قسم کی تھی۔ واسکوڈی گاما پہلا مغربی سیاح ہے جو ایک عرب جہازراں کی رہنمائی میں راس امید سے ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا۔ اس کا جہاز کالی کٹ کے بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ یہ واقعہ ۱۴۹۸ء کا ہے اس کے بعد پرتگیزی تاجروں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا اور انہوں نے اس علاقے کے راجہ "زمورن" سے تجارتی مراعات حاصل کر لیں۔ رفتہ رفتہ کوچین، گوا، دمن، دیو، لسی، بمبئی، اور ہگلی میں پرتگیزی نوآبادیاں قائم ہو گئیں۔ ان علاقوں کی حفاظت کے لئے انہوں نے نہایت مضبوط بحری بیڑہ تیار کیا۔ اس بیڑے کے جہازوں پر توپیں نصب رہتی تھیں۔ مذہبی لحاظ سے یہ نہایت متعصب لوگ تھے۔ اپنے علاقوں میں مسلمانوں کو اذان دینے اور نماز تک پڑھنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ ان کے علاقے کا اگر کوئی ہندوستانی باشندہ نابالغ اولاد چھوڑ کر فوت ہو جاتا تو یہ لوگ ان کمسن بچوں کو جبراً اپنی تحویل میں لے کر عیسائی پرورش گاہوں میں بھیج دیتے۔ ان لوگوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ قزاقی کا پیشہ اختیار کر لیا اور انتہا یہ ہے کہ حج سے واپس آنے والے جہاز بھی ان کی دست برد سے محفوظ نہ رہے۔ انہوں نے سلطان محمود حاکم گجرات کو سمندری جنگ میں شکست دے کر گوا پر قبضہ کر لیا۔ ۱۶۱۳ء میں پرتگیزیوں نے گوا کے قریب مغلوں کے کچھ جہاز پکڑ لئے۔ آخر ۱۶۳۲ء میں شاہجہاں کے حکم سے ہگلی پر حملہ کیا گیا۔ پرتگیزیوں کو سخت شکست ہوئی اور وہ یہاں سے نکال دیئے گئے۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں بھی پرتگیزیوں نے اپنی خاطمانہ روش ترک نہ کی کیونکہ ابھی گوا، دمن، دیو اور کچھ دیگر علاقے ان کے قبضے میں تھے اور ان کے پاس مضبوط بحری بیڑے بھی تھے۔ ان کے فتنہ سے اورنگ زیب کو سخت تشویش ہوئی اور اس کے حکم سے معتبر خاں نے کوکن پر حملہ کرکے پرتگیزیوں کو سخت شکست دی۔ جب یہ خبر گوا کے پرتگیزی کپتان کو ملی تو اس نے اورنگ زیب کے حضور معافی کی درخواست کی۔ اورنگ زیب نے معاف کر دیا۔[2] اسی دوران میں فرانسیسیوں اور انگریزوں نے ہندوستان کا رخ کیا

---

[1] تاریخ پنجاب صفحہ ۸۵ مولفہ رائے بہادر کنہیا لال

[2] یہ واقعہ خافی خاں نے منتخب اللباب کے حصہ دوم میں بھی درج کیا ہے۔

اور ان کے جہاز پرتگیزیوں کے سدِراہ ہوئے اس طرح ان کا ہندوستان پر قبضہ کرنے کا منصوبہ ناکام ہوگیا۔

انگریزوں کی برصغیر میں آمد

پرتگیزیوں کے بعد ولندیزی ہندوستان آئے اور پٹنہ، قاسم بازار، سورت اور کوچین وغیرہ میں تجارتی کوٹھیاں تعمیر کیں۔ یہ دوسری مغربی قوم تھی جس نے ہندوستان کو تجارتی منڈی کے طور پر استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی بحری قوت کا مظاہرہ کیا اور پرتگیزوں کے بہت سے مقامات چھین لئے۔ ہندوستان میں ان کی آمد سولہویں صدی عیسوی کے اختتام پر ہوئی۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد انگریز پرتگیزوں اور ولندیزیوں کے حریف کی حیثیت سے نمودار ہوئے اور انہوں نے اپنے دونوں پیش رو حریفوں کو شکست دے کر برصغیر میں تجارتی اجارہ داری حاصل کرلی۔ سنہ ۱۶۰۰ء میں انگریز تاجروں نے ملکہ الزبتھ کی اجازت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ایک تجارتی کمپنی قائم کی۔ سنہ ۱۶۰۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلا جہاز کپتان ہاکنز کی قیادت میں سورت پہنچا۔ اس زمانے میں جہانگیر ہندوستان کا فرماں روا تھا۔ ہاکنز نے جہانگیر سے سورت میں تجارتی مرکز قائم کرنے کی اجازت مانگی۔ جہانگیر نے اجازت دے دی۔[1] اس طرح ہندوستان میں سنہ ۱۶۱۳ء میں پہلی بار انگریزوں نے تاجروں کی حیثیت سے اقامت اختیار کی اور اپنا ایک مرکز قائم کرلیا۔ اس واقعے کے دو سال بعد یعنی سنہ ۱۶۱۵ء میں حکومت انگلستان کی طرف سے سر ٹامس رو (تھامس رو) ہندوستان میں سفیر بن کر آیا۔ اس نے نہایت قابلیت سے فرائض سفارت ادا کئے اور جہانگیر سے انگریز تاجروں کے لئے مزید مراعات حاصل کرلیں۔ بعد ازاں سنہ ۱۶۶۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بمبئی کی بندرگاہ جو اس وقت انگلستان کے بادشاہ چارلس دوم کے قبضے میں تھی، بادشاہ سے حاصل کرکے اپنی تجارتی کوٹھیاں سورت سے بمبئی منتقل کرلیں۔ یہ بندرگاہ پہلے پرتگیزوں کے پاس تھی مگر جب پرتگال کی شہزادی کی چارلس دوم سے شادی ہوگئی تو بمبئی شاہ پرتگال کی طرف سے اس کی بیٹی کے جہیز میں شاہ انگلستان کو دے دیا گیا۔ اس طرح بمبئی انگلستان کے بادشاہ کی ملکیت ہوگیا۔

سورت کے علاوہ انگریزوں نے جہانگیر سے ہگلی، کلکتہ، مدراس اور مچھلی پٹم میں بھی تجارتی مراکز قائم کرنے کی اجازت حاصل کرلی۔ فرخ سیر کے زمانے میں انہیں ہندوستان میں مضبوطی سے قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ فرخ سیر ایک خطرناک مرض میں مبتلا ہوا، اور ایک

---

[1] اوکس ہس ص ۳۷۹

انگریز ڈاکٹر ہملٹن نے اس کا علاج کیا۔ بیماری سے شفایاب ہونے کے بعد اس عاقبت نا اندیش بادشاہ نے خوش ہوکر ڈاکٹر ہملٹن کو پیش کش کی کہ وہ جو چاہے مانگ لے۔ اپنی قوم کے اس سچے ہمدرد اور انگریز قوم کے لیے اس واجب الاحترام ڈاکٹر نے نہ تو اپنے وزن کے برابر زر و جواہر طلب کیے نہ کسی جاگیر کا مطالبہ کیا بلکہ اپنی قوم کے لیے تجارتی مراعات کی درخواست کی یعنی انگریزوں کو بنگال میں آزادانہ تجارت کی اجازت دے دی جائے اور ان سے تین ہزار روپے سالانہ کی حقیر رقم قبول کر لی جایا کرے جو نہ ہونے کے برابر تھی۔ فرخ سیر نے یہ درخواست قبول کر لی۔ اس طرح انگریزوں کی جڑیں ہندوستان میں نہایت مضبوط ہوگئیں اور وہ بنگال کی معیشت پر پوری طرح حاوی ہو گئے۔ اس زمانے میں انگریزوں نے کلکتہ میں ایک قلعہ تعمیر کیا جس کا نام انگلستان کے بادشاہ ولیم (سوم) کے نام پر فورٹ ولیم رکھا بعد میں یہی قلعہ بنگال میں انگریزی حکومت کے قیام کا باعث بنا۔

فرانسیسیوں کی برصغیر میں آمد

پرتگیزوں اور پھر انگریزوں کی ہندوستان میں تجارتی کامیابی نے فرانس کے تاجروں کو بھی طالع آزمائی پر ابھارا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی حکومت کی اجازت اور ایک فرانسیسی وزیر کے ایما سے ۱۶۶۴ء میں فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ایک تجارتی ادارہ قائم کیا۔ اس کمپنی نے پہلے سورت پھر پانڈیچری، چندر نگر اور بعض دیگر مقامات پر تجارتی کوٹھیاں تعمیر کیں۔ رفتہ رفتہ فرانسیسی نوآبادیوں نے ہندوستان میں ایک سلطنت کی شکل اختیار کر لی۔ ڈوما اس سلطنت کا پہلا گورنر تھا اور ڈوپلے دوسرا۔ مقبوضہ جات میں اب تک جتنے گورنر مقرر ہوئے تھے حقیقت یہ ہے کہ ان سب میں ڈوپلے سب سے زیادہ دوراندیش، مدبر، بہادر اور بہت بڑا سیاست دان تھا جو عرصے تک انگریزوں کے لیے بھی باعث خوف و تشویش بنا رہا۔

انگریزوں اور فرانسیسیوں میں کشمکش

۱۷۴۱ء میں یورپ میں فرانس اور انگریزوں کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا ہندوستان کے فرانسیسی اور انگریزی مقبوضہ جات کے بحری بیڑے اور بری فوجیں بھی حرکت میں آگئیں اور فرانسیسی فوجوں نے مدراس پر حملہ کر دیا جو انگریزوں کا تجارتی مرکز اور ان کی نوآبادی تھی مگر چونکہ مدراس کرناٹک کے نواب کے حدود سلطنت میں شامل تھا اس لئے اس نے اسے کرناٹک پر حملہ تصور کیا ادھر انگریزوں نے اس کی پیٹھ ٹھونکی چنانچہ اس نے انگریزوں کی امداد کے لئے ایک فوج روانہ کر دی۔ فرانس کی فوج نے اس متحدہ فوج کو شکست دی۔ مدراس کی فتح ڈوپلے کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ اس سے انگریزوں کی ساکھ کو سخت نقصان پہنچا۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا اور جلد ہی ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ فرانسیسیوں

کے قدم ہندوستان سے اکھڑنے لگے اور انگریزوں کی طاقت مستحکم ہونے لگی۔ ایک مدبر اور بہادر مگر عیار انگریز کلائو نے انگریزوں کی قسمت کے ستارے کو گردش سے نکال دیا۔ اس نے پانچ سو سواروں اور پیادوں کی مدد سے کرناٹک کے دارالسلطنت ارکاٹ پر حملہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مرہٹوں اور تنجور کے راجہ کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ ستمبر ۱۷۵۱ء میں اس متحدہ فوج نے ترچناپلی پر قبضہ کر لیا۔ کرناٹک کا نواب چندا صاحب اس جنگ میں کام آیا۔ انگریزوں کا حامی نواب محمد علی کرناٹک کا حکمراں بن گیا جو پورے طور پر انگریزوں کے زیر اثر تھا۔

۱۷۵۶ء میں فرانس اور انگریز پھر ایک دوسرے سے برسرپیکار ہو گئے۔ یہ جنگ سات سال جاری رہی۔ ہندوستان پر بھی اس کا اثر پڑا۔ اور انگریزوں نے آگے بڑھ کر فرانس کے مقبوضہ علاقے چندر نگر پر قبضہ کر لیا۔ دوسری طرف شاطر کلائو نے دربار حیدرآباد سے بھی رابطہ قائم کیا اور نظام کو اپنے زیر اثر لانے میں کامیاب ہو گیا۔ ادھر حیدرآباد میں انگریزوں کے اقتدار کی بنیاد قائم ہوئی اور ادھر مشہور فرانسیسی جرنیل کونٹ لالی ۱۷۶۰ء اور ۱۷۶۱ء میں مدراس، پانڈیچری اور ماہی کی لڑائیوں میں انگریزوں سے شکست کھا گیا۔ اس طرح بنگال کے ساحلی علاقے مدراس اور مالابار مکمل طور پر انگریزوں کے قبضے میں آگئے اور فرانسیسی حکومت کے سیاسی عزائم ہندوستان میں ہمیشہ کے لئے ناکام ہو گئے۔

جنگِ پلاسی

اسی دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہندوستان کی تاریخ سیاست پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔ ہم گزشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں کہ جب دہلی کی مرکزی سلطنت کمزور ہو گئی تو بنگال کے گورنر نے بھی سرکشی اختیار کی۔ بنگال کے ان خود مختار حکمرانوں میں نواب علی وردی خاں ایک نہایت دور اندیش، اعلیٰ پایہ کا منتظم اور بہادر انسان تھا۔ وہ جب تک زندہ رہا اس نے ایک طرف مرہٹوں کو دبائے رکھا اور دوسری طرف انگریزوں کی سرگرمیوں پر بھی کڑی نظر رکھی اور انہیں قلعہ بندیوں سے روک دیا۔ مگر جب ۱۷۵۶ء میں اس قابل اور بہادر حکمراں علی وردی خاں کا انتقال ہو گیا اور اُس کا نواسہ سراج الدولہ بنگال کا حکمراں ہوا تو انگریزوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور قبل اس کے کہ سراج الدولہ کی حکومت مستحکم ہو انہوں نے جنگ کی طرح ڈال دی۔ اس میں شک نہیں کہ سراج الدولہ حریت پسند حاکم تھا اور وہ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو نہ صرف اپنے لئے بلکہ سارے ہندوستان کے لئے بہت بڑا خطرہ سمجھتا تھا۔ وہ اپنے ایک خاندانی حریف شوکت جنگ کو شکست دینے کے بعد انگریزوں کی طرف متوجہ ہوا اور انہوں نے سراج الدولہ کی ممانعت کے باوجود جو قلعے تعمیر کرلئے تھے انہیں منہدم کرنے کے لئے روانہ ہو

گیا۔ اس نے قاسم بازار اور کلکتہ پر قبضہ کر لیا اور انگریزوں کو شکست فاش دی۔ قاسم بازار اور کلکتہ کے معرکوں میں شکست کھانے کے بعد ہزیمت خوردہ انگریزوں نے کلائیو اور انگریزی بحریہ کے کمانڈر انچیف واٹسن کو اس واقعے کی اطلاع دی جو ان دنوں مدراس میں تھے۔ یہ دونوں جنگی جہازوں کے ساتھ بنگال روانہ ہو گئے اور انہوں نے کلکتہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد انگریزوں اور سراج الدولہ میں صلح ہو گئی۔ صلح نامے کی شرائط سے صاف پتہ چلتا ہے کہ سراج الدولہ نے یہ صلح دب کر کی تھی۔ انگریزوں پر نواب کی کمزوری واضح ہو گئی تھی۔ ادھر خود سراج الدولہ کے بعض ارکانِ دولت مثلاً میر جعفر جو علی وردی خاں کا بہنوئی تھا انگریزوں سے نواب کے خلاف سازشیں کر رہا تھا۔ اس سازش میں بنگال کے تمام سرکردہ ہندو بھی شامل تھے۔ جنہیں سراج الدولہ نے ممتاز عہدوں پر فائز کیا تھا۔ صرف ایک یا دو ہندو اس کے وفادار رہے۔ چنانچہ جب یہ سازش پایہ تکمیل کو پہنچ گئی تو کلائیو نے جون ۱۷۵۷ء میں کلکتہ سے اپنی فوجوں کو مارچ کرنے کا حکم دے دیا۔ ادھر نواب سراج الدولہ اپنا لشکر لے کر مقابلے کے لئے روانہ ہوا۔ پلاسی کے تاریخی میدان میں دونوں فوجیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوئیں، مگر میدان انگریزوں کے ہاتھ رہا اس کی وجہ میر جعفر اور ہندو سپہ سالاروں کی غداری تھی وہ میدانِ جنگ میں کھڑے نواب سراج الدولہ کی بربادی کا تماشہ دیکھتے رہے۔ آخر سراج الدولہ میدانِ جنگ سے پسپا ہوا مگر راستے ہی میں گرفتار کر لیا گیا اور انگریزوں[1] کے ایما اور سازش سے میر جعفر کے بیٹے میر مدن نے اسے قتل کر دیا۔ اس غداری کے صلے میں میر جعفر کو بنگال کا گورنر بنا دیا گیا مگر کچھ ہی عرصے کے بعد میر جعفر کو بھی معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ میر قاسم کو بنگال کا نواب مقرر کیا گیا جو میر جعفر کا داماد تھا۔ مگر یہ داماد اپنے خسر سے بالکل مختلف ثابت ہوا۔ میر قاسم انگریزوں کے آلہ کار اور حاشیہ بردار کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک آزاد اور خود دار حکمران کی حیثیت سے حکومت کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بنگال کے نظم و نسق میں بعض مفید اصلاحات کرنی چاہیں اور یہ دیکھ کر کہ انگریز آزاد تجارت کے نام پر بنگال کے عوام کو بری طرح لوٹ رہے ہیں، ملکی صنعتیں اور مقامی تجارتیں تباہ ہوتی جا رہی ہیں اس نے انگریزوں کے ساتھ ساتھ ہر تاجر کو محصول سے مستثنیٰ کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت پر سے انگریزوں کی اجارہ داری ختم ہو گئی۔ میر قاسم کے یہ اقدامات انگریزوں کو ناگوار گزرے اور انہوں نے میر قاسم کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ پٹنہ کی جنگ میں میر قاسم نے انگریزوں کو شکست دی مگر اس کے بعد کی لڑائیوں میں

---

[1] ریاض السلاطین صفحہ ۳۷۳

انگریز فتح یاب ہوئے اور میر قاسم کو معزول کر کے پھر میر جعفر کو بنگال کا نواب بنا دیا گیا۔ میر قاسم نے ایک بار پھر انگریزی اقتدار کو چیلنج کیا اور اودھ کے حکمراں شجاع الدولہ اور دہلی کے بادشاہ شاہ عالم کی امداد سے ۱۷۶۴ء میں بکسر کے مقام پر انگریزوں سے ایک فیصلہ کن جنگ لڑی۔ اس جنگ میں بھی انگریزوں کا پلہ بھاری رہا اور صرف ان متحدہ فوجوں کو شکست ہی نہیں ہوئی بلکہ شاہ عالم کو تاوانِ جنگ کے طور پر بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی سے بھی محروم ہونا پڑا۔ اس طرح ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی نے اور ۱۷۶۴ء میں جنگ بکسر نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور اس سرزمین سے اسلامی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ ان دونوں جنگوں میں ہندوستان نے انگریزوں کو ایک عارضی فاتح کی نہیں بلکہ مستقل حاکم کی حیثیت دے دی اور ان کی آئندہ فتوحات کے لئے راستہ کھول دیا بلکہ میدان ہموار کر دیا۔

سلطان حیدر علی کا جہاد آزادی

عین اس وقت جب بنگال، بہار اور اڑیسہ میں اسلامی اقتدار کا آفتاب غروب ہو رہا تھا دکن کے علاقہ میسور میں ایک غیور، بہادر اور مدبر مسلمان قوم کی عظمتِ رفتہ کو بحال کرنے میں کوشاں تھا۔ یہ مردِ مومن سلطان حیدر علی تھا جو معمولی حیثیت سے ترقی کر کے میسور کا حکمراں بنا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ انگریز، فرانسیسی اور مرہٹے یہ تینوں اسلامی اقتدار کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں اس لئے اس نے بڑی حکمتِ عملی سے کام لے کر پہلے فرانسیسیوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور کرناٹک کی جنگ میں انگریزی فوجوں کے مقابلے میں فرانسیسیوں کی امداد کے لئے اپنا لشکر بھیجا۔ دوسری طرف نظام حیدرآباد کو یہ یاد کرانے کی کوشش کی کہ انگریز اور مرہٹے مسلمانوں کے یکساں دشمن ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے ارکاٹ کے حکمراں نواب محمد علی والا جاہ کے ساتھ بھی اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس کی خواہش تھی کہ مسلم ریاستوں کے حکمراں ذاتی اغراض کو قربان کر کے صرف ملی مفاد کی خاطر ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو جائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے سلطان نے متعدد کوششیں کیں۔ اس نے شادی بیاہ کے ذریعے نظام حیدرآباد کے خاندان کو اپنے خاندان کے قریب لانے کی کوشش کی مگر اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی اور نظام نے جو اپنے آپ کو موروثی حکمراں اور شرافت و نجابت کے لحاظ سے برتر اور سلطان حیدر علی کو غاصبِ سلطنت[۱] اور حسب نسب کے لحاظ سے کمتر سمجھتا تھا حیدر علی کی یہ مخلصانہ تجویز ٹھکرا دی۔ افسوس کہ یہ خود غرض لوگ سلطان حیدر علی کے قلب کی تڑپ کو محسوس ہی نہ کر سکے۔ ایک روایت کے مطابق سلطان نے ایران[۲] کے

---

۱ تاریخ ہند صہ ۲۶۸ مولفہ مسٹر تھامپسن

۲ تاریخ سلطنت خداداد میسور صہ ۱۵۵ مولفہ محمود بنگلوری

بادشاہ کو بھی خط لکھ کر ہندوستان کے حالات سے آگاہ کیا تھا اور اس کی امداد حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔

بہر حال جہاں تک سلطان حیدر علی کی ذاتی کامیابی کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ اس نے اپنی زندگی کے آخری لمحے تک تمام اسلام دشمن طاقتوں کا نہایت پامردی اور تدبر سے مقابلہ کیا اور اس سیلاب کو آگے بڑھنے سے روکے رکھا۔ اس نے ۱۷۶۷ء میں بیک وقت نظام حیدر آباد، نواب ارکاٹ محمد علی والا جاہ، مرہٹوں اور انگریزوں سے پنجہ آزمائی کی اور مخالفوں کے علاقے روندتا اور انہیں شکست پر شکست دیتا مدراس تک پہنچ گیا۔ اس جنگ میں مرہٹوں کے چیدہ چیدہ جرنیلوں کے علاوہ کرنل اسمتھ، کرنل اوڈ، میجر فطر، کرنل لینگ اور کپتان نکسن جیسے آزمودہ کار جرنیل شریک تھے۔ یہ جنگ دو سال جاری رہی اور حیدر علی کی طوفانی یلغار اور پیہم فتوحات نے پہلے مرہٹوں اور پھر نظام کو خوفزدہ کر دیا اور ان کی فوجیں حیدر علی سے صلح کرکے اپنے اپنے علاقوں کو واپس چلی گئیں۔ جب حیدر علی نے مدراس پر حملہ کیا تو انگریزوں کے حوصلے بھی پست ہو گئے اور انہوں نے سلطان کے سامنے سپر ڈال دی۔

۱۷۸۰ء میں پھر انگریزوں اور سلطان کے درمیان جنگ شروع ہو گئی مگر اس بار بھی حیدر علی اور اس کے نامور فرزند سلطان ٹیپو نے انگریزوں کے عزائم کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ سلطانی فوجوں نے کرنل بیلی اور کرنل بریتھویٹ کی فوجوں کو نہایت ذلت ناک شکست دی۔ کرنل بیلی اور ڈیوڈ بیرڈ جیسے آزمودہ کار انگریز جرنیل سلطانی فوجوں کے ہاتھوں اسیر ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ سلطان نے مرہٹوں کا استیصال بھی جاری رکھا۔ مادھو راؤ پیشوا اور ترمک راؤ سے اس کی جنگیں تاریخ کے یادگار معرکے ہیں جن میں حیدر علی نے قلیل فوج کے ذریعے محض اپنی شجاعت، عزم و حوصلہ اور تدبر سے مرہٹوں کی ٹڈی دل فوج کو تہس نہس کر دیا اور ۱۷۸۲ء میں جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو دکن میں ایک مضبوط اسلامی سلطنت قائم ہو چکی تھی جس کا رقبہ اسّی ہزار مربع میل سے بھی زیادہ تھا اور جو ہندوستان میں اس عہد کی سب سے بڑی اور طاقتور اسلامی سلطنت تھی۔ اگر ملک کے دوسرے حکمران اس سے تعاون و اتحاد پر آمادہ ہو جاتے تو برصغیر خوں ریزی و بربادی اور دو سو سالہ غلامی سے محفوظ ہو جاتا جس کے اثرات آج تک موجود ہیں۔[1]

سلطان ٹیپو کی جد و جہد

حیدر علی کے انتقال کے بعد اس کے اولوالعزم اور بہادر فرزند سلطان ٹیپو نے اپنے والدِ گرامی

---

[1] تاریخ سلطنت خداداد میسور صد ۱۵۶

کے مشن کو جاری رکھا۔ سلطان ٹیپو غیور اور شجاع ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت فاضل اور غیر معمولی انتظامی صلاحیتوں کا بھی مالک تھا۔ وہ جذبۂ اسلامی سے سرشار اور وطن دشمن طاقتوں کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اگر اس میں مردم شناسی کے جوہر کی کمی نہ ہوتی تو شاید وہ انگریزوں کو ہندوستان سے بے دخل کرنے اور مرہٹوں کی طاقت کو مکمل طور پر ختم کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس کے بعد جاٹوں اور سکھوں کو زیر کرنا چنداں دشوار نہ ہوتا۔ اس کے دربار میں سازشوں کا جال بچھا رہا اور وہ اس سے بے خبر رہا۔ اس نے جن لوگوں کو اپنے دست و بازو کی حیثیت سے منتخب کیا وہی اس کی ناکامی کا سبب بنے۔ اس لحاظ سے اس کا نامور باپ اس سے کہیں اونچا تھا۔ بہرحال وہ اس ایک خامی کے باوجود برصغیر کے ان معدودے چند جاں بازوں اور سرفروشوں میں سے تھا جنہوں نے اپنی زندگی اسلام کی بقا اور اتحادِ اسلامی کے فروغ کے لئے وقف کر دی تھی۔ وہ برصغیر میں ایک آزاد اور مضبوط اسلامی حکومت کے قیام کا خواہاں تھا۔ اس نے نظام دکن کو متعدد پیغامات بھیجے اور خطوط ارسال کئے جن میں اسلامی اخوت کا واسطہ دے کر اس سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ سلطان کی مخالفت ترک کر دے۔ اس نے نظام کو یہ تجویز بھی پیش کی کہ دونوں خاندانوں کی بیٹیاں اور بیٹے ایک دوسرے سے بیاہ دیئے جائیں اس طرح ہم ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے مگر ہندوستان سے اسلامی اقتدار کے خاتمے کا وقت قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا اس لئے نظام نے اس کی کسی تجویز کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔

سلطان نے ہندوستان کے مسلمان والیانِ ریاست سے مایوس ہو کر بیرونی اسلامی ممالک کی طرف رجوع کیا اور افغانستان، ایران اور ترکیہ کے فرماں رواؤں کو ہندوستان کے مسلمانوں کی حالتِ زار سے مطلع کرنے کے بعد ان سے امداد کی درخواست کی۔ مگر ان کوششوں کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ اور آزادیٔ وطن کی یہ جنگ سلطان کو تنہا ہی لڑنی پڑی۔ اس نے انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے لئے فرانسیسی فوجوں کی امداد بھی حاصل کی۔ سلطان حیدر علی کی وفات کے وقت انگریزوں سے جنگ جاری تھی۔ مراسم تخت نشینی ادا کرنے کے بعد سلطان ٹیپو نے جنگ کو اور تیز کر دیا اور دو ہزار فرانسیسی فوج کو انگریزوں سے مقابلے کے لئے روانہ کر دیا اس کے بعد خود بھی انگریزی مقبوضات کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ حیدر نگر کوڑیال بندر اور پالیٹن گھاٹ میں انگریزوں سے شدید جنگیں ہوئیں جن میں کرنل کیمبل، جنرل میتھیوز اور کرنل لانگ جیسے انگریز جرنیلوں نے حصہ لیا۔ مگر سلطان ٹیپو نے ہر معرکے میں انگریزی فوجوں کو شکست دی اور بہت سے انگریز افسروں اور سپاہیوں کو قید کر لیا۔ یہ دیکھ کر انگریزوں نے سلطان کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا مگر اس صلح سے انگریزوں کو سخت نقصان ہوا اور سلطان ٹیپو کی شجاعت اور

عسکری قابلیت کی دھاک سارے ہندوستان بلکہ یورپ تک بیٹھ گئی۔

مرہٹوں اور نظام سے معرکے

اس جنگ کے اختتام کے چند روز بعد ہی نظام اور مرہٹوں نے انگریزوں کے خفیہ اشارے سے سلطان کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ سلطان کو اطمینان کا سانس لینے اور اپنی سلطنت کو مضبوط کرنے کا موقع نہ ملے۔ ادھر سلطان کی اس فتح نے خود نظام اور مرہٹوں کو بھی تشویش میں مبتلا کر دیا تھا اور انہیں نظر آ رہا تھا کہ اگر سلطان ٹیپو کو تھوڑی سی مہلت اور مل گئی تو وہ ان دونوں کو ختم کر دے گا۔ چنانچہ ۱۱۹۹ھ میں مرہٹوں اور نظام کی متحدہ فوج نے میسور پر حملہ کر دیا۔ شاہنور میں دونوں فوجوں کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ مرہٹوں اور نظام کی متحدہ فوجوں کو شکست فاش ہوئی۔ مرہٹے توپ خانہ اور بہت سا اسلحہ جنگ چھوڑ کر میدان سے فرار ہوگئے۔ اور ان کے نامی گرامی سردار کام آئے۔ اس کامیابی کے بعد سلطان نے اپنی فوجوں کو نظام اور مرہٹوں کے علاقوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ سلطان کی فوج کا ایک دستہ مرہٹوں کے کیمپ میں داخل ہو گیا۔ اس اچانک حملے کا یہ اثر ہوا کہ مشہور مرہٹہ راجہ ہولکر اپنی عورتوں اور بچوں تک کو کیمپ میں چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ آخر مرہٹوں نے صلح کی درخواست کی اور سلطان ٹیپو نے عالی ظرفی سے کام لے کر ان کی درخواست قبول کر لی۔ اس طرح مرہٹوں اور نظام دونوں کو اپنی شکست کے محضر نامے پر خود دستخط کرنا پڑے۔

انگریزوں سے جنگیں

سلطان ٹیپو کی اس فتح نے انگریزوں کو بے حد خوفزدہ کر دیا۔ سلطان کی طاقت سے انہیں اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ چنانچہ انگریزوں نے نظام اور مرہٹوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا کہ ٹیپو سلطان کی طاقت ختم کر کے اس کی سلطنت تینوں آپس میں تقسیم کر لیں[1]۔ ۱۷۸۶ء میں جب لارڈ کارنوالس ہندوستان کا گورنر جنرل ہو کر آیا تو اس نے سلطان ٹیپو سے فیصلہ کن جنگ لڑنے اور جنوبی ہند کی اس اصلاحی سلطنت کو تباہ و برباد کرنے کا ایک جامع منصوبہ تیار کیا اور ٹراونکور پر سلطان ٹیپو کے حملے کو بہانہ بنا کر نظام اور مرہٹوں کے اشتراک سے میسور پر حملہ کر دیا۔ فروری ۱۷۹۱ء میں اتحادی فوجیں بنگلور پر حملہ آور ہوئیں۔ مگر سلطان کے بعض سرداروں کی غداری کی وجہ سے اسے شکست ہوئی۔ اسے اپنا نصف علاقہ اتحادیوں کے حوالے کرنا پڑا۔ تین کروڑ روپیہ بطور تاوان جنگ اس پر عاید کیا گیا جس میں

---

[1] تاریخ ہند صہ ۱۸۷ مولفہ مسٹر شنکلیر۔

سے نصف روپیہ تو اسی وقت ادا کر دیا گیا اور نصف رقم کے لئے سلطان نے اپنے دو بیٹوں کو یرغمال کے طور پر لارڈ کارنوالس کے سپرد کر دیا۔ اس ساری کارروائی کے بعد انگریزوں نے سلطان سے علاقہ کورگ کا مطالبہ کیا۔ چونکہ وہ اپنے دونوں بیٹوں کو انگریزوں کے حوالے کر چکا تھا اس لئے لارڈ کارنوالس کو یقین تھا کہ سلطان بیٹوں کی خاطر اس علاقے کے لئے جنگ نہیں کرے گا چنانچہ سلطان کو کورگ سے بھی دست بردار ہونا پڑا[۱]۔ اس جنگ میں سلطان کے امرائے دربار خصوصاً میر غلام علی لنگڑا نے نہایت شرمناک کردار ادا کیا اور بکثرت ہندو سرداروں اور ہندو قلعہ داروں نے سلطان ٹیپو سے غداری کی انہوں نے انگریزوں سے سازش کر کے ان کی پیش قدمی کی خبر کو سلطان سے پوشیدہ رکھا۔ یہ سازش اتنی گہری تھی اور اس قدر احتیاط سے تیار کی گئی تھی کہ سلطان کو انگریزوں کے حملے کی خبر اس وقت تک نہ ہوئی جب تک کہ ان کی فوجیں بنگلور تک نہ پہنچ گئیں۔

سلطان ٹیپو کی شہادت

سلطان نہایت اولوالعزم آدمی تھا اور مصائب میں حوصلہ ہارنا اسے آتا ہی نہ تھا باوجودیکہ اس کا نصف ملک اس کے قبضے سے نکل گیا تھا مگر اس کی ہمت پست نہیں ہوئی بلکہ اس نے سلطنت کا اندرونی نظم ونسق درست کرنے اور اسلامی ممالک سے امداد حاصل کر کے انگریزوں سے ایک فیصلہ کن جنگ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ ادھر ۱۷۹۸ء میں مشہور انگریز مدبر لارڈ ولزلی ہندوستان کا گورنر جنرل ہو کر آیا جسے فرانسیسیوں اور مسلمانوں دونوں سے نفرت تھی۔ چونکہ فرانسیسی سلطان ٹیپو کی حمایت کر رہے تھے اور سلطان کی شجاعت اور طاقت کا شہرہ بھی یورپ تک پہنچ چکا تھا اس لئے اس نے ہندوستان آتے ہی سلطان کی طاقت کا خاتمہ کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس نے نظام اور مرہٹوں سے سلطان کے خلاف خفیہ معاہدہ کیا اور اس کے دربار سے قلعوں تک سازش کا جال بچھا دیا۔ ۲۲ فروری ۱۷۹۹ء کو انگریزوں نظام اور مرہٹوں کی متحدہ فوجوں نے سلطان ٹیپو کی حدودِ سلطنت پر حملہ کر دیا مگر سلطان کے مشیروں اور امرائے سلطنت میر صادق، پورنیہ، غلام علی لنگڑا، میر معین الدین، میر قاسم اور میر فخرالدین نے آخر وقت تک سلطان کو انگریزوں کی پیش قدمی سے بے خبر رکھا جب دارالسلطنت سرنگاپٹم سے متحدہ فوجیں تین دن کی مسافت پر رہ گئیں تو سلطان کو اطلاع ہوئی۔ سلطان بجلی کی سی سرعت سے مقابلے پر پہنچا اور انگریزی فوجوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ اسی دوران میں دوسری جانب سے متحدہ فوجوں نے سرنگاپٹم

---

[۱] ایمپائر ان ایشیا صفحہ ۱۷۱ مولفہ ٹارنس

پر حملہ کر دیا۔ مجبوراً سلطان دار السلطنت کو بچانے کے لئے واپس آیا۔ مگر یہاں بھی اس کے امرائے دربار اور سرداران فوج نے غداری کی اور میر قاسم نے فصیل کے کمزور حصے[1] پر گولہ باری کر کے اس میں شگاف ڈال دیا۔ یہ دیکھ کر سلطان خود اس شگاف پر آکھڑا ہوا اور یہیں مٹھی بھر جاں نثاروں کے ساتھ دشمن کی ٹڈی دل فوجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ۴؍ مئی ۱۷۹۹ء کو شہید ہو گیا۔ اِنّا لِلّٰہ و اِنّا الیہ راجعون۔ اس طرح جنوبی ہند بلکہ سارے ہندوستان سے انگریزوں اور مرہٹوں کے سب سے طاقتور مسلمان حریف کا خاتمہ ہو گیا۔ جنگِ پلاسی اور جنگِ بکسر کے بعد یہ تیسری جنگ تھی جس نے ہندوستان خصوصاً مسلمانانِ ہند کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور انگریزوں کے قدم نہایت مضبوطی سے جم گئے۔

حافظ رحمت خاں

سلطان ٹیپو کی شہادت سے قبل ایک اور سانحہ پیش آیا جس نے شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی قوت کو بہت ضعف پہنچایا۔ نواب نجیب الدولہ کے انتقال کے بعد اس علاقے کی صورتِ حال نہایت خراب ہو گئی تھی۔ نواب اودھ شجاع الدولہ کی خود غرضی اور فتنہ پردازی نے بھی مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ روہیلکھنڈ کا حکمران حافظ رحمت خاں جس کی فوجیں پانی پت کی جنگ میں نجیب الدولہ اور احمد شاہ ابدالی کی معیت میں نہایت مردانگی کے ساتھ مرہٹوں سے برسرِ آزما ہوئی تھیں اب شجاع الدولہ، مرہٹوں اور انگریزوں کی حریصانہ نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ شمالی ہند میں اب یہی ایک ایسا مسلمان حکمران رہ گیا تھا جو دینی حمیت سے سرشار، نہایت اولوالعزم، بڑا بہادر اور ایک بڑی ریاست کا سربراہ تھا۔ انگریز اور مرہٹے دونوں اسے اپنے عزائم کی راہ میں سب سے بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔ ادھر شجاع الدولہ کی ہر ممکن کوشش یہی تھی کہ حافظ رحمت خاں کا خاتمہ کر کے روہیلکھنڈ کی اس سب سے بڑی اسلامی ریاست پر قبضہ کر لے۔ اس مقصد کے لئے اس نے انگریزوں اور مرہٹوں سے ساز باز کرنے میں کوئی باک محسوس نہ کی۔ اور ۱۷۷۴ء میں ان متحدہ فوجوں نے حافظ رحمت خاں پر حملہ کر دیا۔ ضلع شاہجہان کے قصبہ میراں[2] پور کٹرہ میں دونوں فوجوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ اگرچہ حافظ رحمت خاں کی فوج متحدہ فوج سے تعداد اور سامانِ حرب میں بہت کم تھی مگر حافظ صاحب نے بڑی مردانگی سے مقابلہ کیا اور عین میدانِ جنگ میں توپ کا گولہ لگنے سے شہادت پائی۔ اس طرح انگریزوں اور مرہٹوں کا ایک بہادر اور مضبوط حریف ایک نامور تنہا مسلمان

---

[1] ٹیپو سلطان مولفہ جنرل بیڈورز

[2] حیاتِ حافظ رحمت خاں مولفہ سید الطاف علی بریلوی

حکمران کی سازش کے نتیجے میں ان کے راستے سے ہٹ گیا۔ ایک اور اسلامی ریاست کا چراغ گل ہوگیا جس کا سربراہ ذہنی لحاظ سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتا تھا۔

سید احمد شہیدؒ کا جہادِ آزادی

انگریزوں اور مرہٹوں کے بعد اب مسلمانانِ ہند کو سب سے زیادہ نقصان سکھوں سے پہنچ رہا تھا۔ نواب عبد الصمد خاں، میر معین الملک اور احمد شاہ ابدالی نے ان پر پے در پے حملے کئے اور کاری ضربیں لگا کر ان کی طاقت کو کمزور کر دیا۔ یہ درست ہے کہ اب ان کے میرٹھ اور دلی پر قبضے کے منصوبے خاک میں مل گئے تھے مگر مرکز کی کمزوری اور پنجاب کے مقامی مسلمان سرداروں کی نا اتفاقی نے ماحول کو سکھوں کے لئے سازگار بنا دیا۔ ادھر افغانستان میں اندرونی خلفشار پیدا ہوگیا اور پنجاب کے جن علاقوں پر افغانوں کا تسلط تھا وہاں کے حاکموں کو معقول کمک نہ مل سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سکھوں نے پھر سر اٹھایا اور اب کے وہ مسلوں یعنی جتھوں کی شکل میں نمودار ہوئے۔ اس طرح پنجاب کے مختلف علاقوں پر سکھوں کی بارہ مختلف مسلیں قابض ہوگئیں جن کے ہاتھوں پنجاب کے عوام خصوصاً مسلمانوں کو ناقابلِ بیان مظالم برداشت کرنے پڑے۔ بیشتر علاقوں میں باجماعت نمازیں موقوف ہوگئیں، مساجد سنسان، مقبرے ویران اور آبادیوں میں ہُو کا سماں نظر آنے لگا۔ شریف مسلمان کمیّن بنا دیئے گئے، نچلے طبقے کے مسلمانوں کی بہو بیٹیاں جس طرح رسوا کی گئیں اس کی نظیر چشمِ فلک نے کم ہی دیکھی ہوگی۔ ان مسلوں کے سردار نہایت درجے کے جاہل، سفاک اور انتظامی صلاحیتوں سے قطعاً عاری تھے ان کی آپس میں بھی جنگیں ہوتی رہتی تھیں اور ان جنگوں میں بھی مفتوحہ علاقے کے مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ آخر سکھوں کی ایک مثل سکر چکیا کے سردار رنجیت سنگھ نے افغانستان کے حکمران شاہ زماں کی ایک خدمت سرانجام دے کر اس سے خوشنودی کا پروانہ اور لاہور کی حکومت حاصل کرلی۔ نواں کوٹ کے ایک مسلمان رئیس محکم دین[1] نے رنجیت سنگھ کی امداد کی اور وہ ۱۷۹۹ء میں لاہور پر قابض ہوگیا۔ رنجیت سنگھ بلاشبہ ایک اولوالعزم اور بیدار مغز حکمران تھا۔ اس نے سکھوں کو متحد کرکے ایک وسیع حکومت قائم کرلی اور پشاور سے کشمیر اور ملتان کی سرحدوں تک اس کی حکومت کا دائرہ وسیع ہوگیا لیکن ظلم و ستم اور لوٹ مار میں وہ کسی سکھ سردار سے کم نہ تھا۔ اب تک مسلمانوں پر جو مظالم غیر منظم طریقے سے ہو رہے تھے، رنجیت سنگھ نے بقول مولانا غلام رسول مہر انہیں منظم شکل دے دی۔ اس کے ہاتھوں پنجاب کے مسلمان بلبلا رہے تھے اور صوبہ سرحد تک مسلمانوں میں ایک حشر برپا تھا۔

---

[1] تاریخ پنجاب صفحہ ۱۴۰ مولفہ رائے بہادر کنہیا لال

حضرت سید احمد شہیدؒ کی اصلاحی تحریک

یہ تھے وہ حالات جنہوں نے رائے بریلی کے ایک سید زادے کو بے قرار کر دیا۔ وہ پنجاب و سرحد کے مسلمانوں کی امداد کے لئے اٹھا اور سخت نامساعد حالات کے باوجود معجزانہ طور پر پشاور کے مطلع پر نمودار ہو گیا۔ اس مردِ مومن کا نام سید احمد تھا جو ہماری ملی تاریخ میں سید احمد شہیدؒ کے معروف و محترم نام سے مشہور ہے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی طرح اللہ تعالیٰ کے ان برگزیدہ بندوں میں سے تھے جنہیں وہ اپنی خاص حکمتوں کے تحت دنیا میں مامور فرماتا ہے۔ بلاشبہ وہ اپنی صدی کے مجدد تھے انہوں نے احیائے دین کی اسی تحریک کو زندہ کیا جسے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے جاری فرمایا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی طرح ان کی تحریک کے بھی دو حصے تھے۔ اول مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی اصلاح۔ دوم ان کی مادی ترقی۔ روحانی و اخلاقی اصلاح کے تحت انہوں نے مسلمانوں کے سامنے سب سے پہلے اسلام کی اصل تصویر پیش کی اور ان غلط عقائد اور قبیح رسوم کی نشاندہی کی جو صدہا سال سے غیر مسلموں کے ساتھ رہنے سہنے سے مسلمانوں نے اختیار کر لی تھیں۔ شرک اور بدعات کے خلاف ان کا جہاد بجائے خود اتنا بڑا کارنامہ ہے جو انہیں مجدد کے مقام پر فائز سمجھتا ہے۔ ان کی کوشش سے ہزاروں مسلمان جو نام کے مسلمان تھے کام کے مسلمان بن گئے۔ بہتوں نے منشیات اور فسق و فجور سے توبہ کر لی اور بد رسومات ترک کر کے مومنین کی صف میں شامل ہو گئے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی طرح حضرت سید احمدؒ نے بھی بیعت لی اور اس طرح ایک ایسی جماعت تیار کی جو خود بھی پاکیزہ زندگی بسر کرتی تھی اور دوسروں کو بھی پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتی تھی۔ خوش قسمتی سے حضرت سید احمد شہید کو ایک ایسا مرید باصفا مل گیا جس نے ان کی تحریک کو آگے بڑھانے اور اسے مقبول بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ خاندان ولی اللہ کے چشم و چراغ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ تھے جو علم و فضل کے زیور سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر ہنٹر کے بقول اپنے زمانے کے بہت بڑے جرنیل بھی تھے۔ انہوں نے حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے دونوں حصوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں آخر وقت تک اپنے مرشد کا ساتھ دیا۔

عسکری تحریک

جیسا کہ قبل ازیں عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت سید احمد شہید کے دو مقاصد تھے۔ مقصدِ اول یعنی مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح میں جب کسی قدر کامیابی حاصل ہو گئی اور نیک نفس اور پاکیزہ کردار مسلمانوں کی ایک جماعت تیار ہو گئی تو آپ نے اس جماعت کو مقصد دوم کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ یعنی مسلمانوں کو غیر مسلموں کی غلامی سے نجات دلانا خصوصاً سکھوں کے جبر و استبداد کا خاتمہ۔ آپ نے ملک کے

مختلف حصوں میں اپنے داعی بھیج کر مسلمانوں کو سکھوں کے خلاف جہاد میں شریک ہونے کی دعوت دی۔
چنانچہ آپ کے مبلغوں کی کوشش سے ایسے جانباز آپ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئے جنھوں نے اپنی جانیں
اسلام کی سربلندی اور مظلوم مسلمانوں کو ظالموں کے پنجے سے نجات دلانے کے لئے وقف کر دیں۔

ضروری انتظامات کے بعد سید صاحب ۱۷ر جنوری ۱۸۲۶ء کو اپنے وطن رائے بریلی سے روانہ ہوئے۔
اور وہاں سے گوالیار، ٹونک، اجمیر، جودھپور، میرپور، ٹنڈو الہ یار، حیدرآباد، شکارپور اور کوئٹہ ہوتے
ہوئے افغانستان میں داخل ہوئے اور وہاں سے قندھار اور غزنی ہوتے ہوئے نومبر ۱۸۲۶ء میں پشاور
پہنچ گئے[1] جس وقت آپ رائے بریلی سے روانہ ہوئے تو آپ کے ساتھ پانچ سو مجاہدین کی مختصر سی جماعت
تھی لیکن چارسدہ پہنچ کر یہ تعداد ڈیڑھ ہزار ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ہزار مجاہدین رائے بریلی سے
پشاور تک کے طویل سفر میں آپ کے ساتھ شامل ہوئے تھے۔

پشاور پر سید صاحب کا غلبہ

چارسدہ پہنچنے کے بعد سید صاحب نے شمال مغربی صوبہ سرحد کا دورہ کیا اور افغانوں کے قصبات و
قریات تک دعوتِ جہاد پہنچائی۔ اس دعوت کا افغانوں پر خاطر خواہ اثر ہوا اور سیکڑوں پٹھان آپ
کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے۔ اسی دوران میں ہندوستان سے مجاہدین کے قافلے زرِ نقد اور سامانِ جنگ لے
کر آپ کے پاس پہنچنے لگے۔ ان مجاہدین میں متعدد بنگالی، پنجابی اور سندھی سرفروش بھی تھے۔ سید صاحب کی
بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر سکھ خائف ہوگئے اور آپ کا راستہ روکنے کے لئے میدان میں آگئے۔ اکوڑہ،
خٹک، حضرو اور شیدو مضافاتِ نوشہرہ میں سکھوں سے سید صاحب کی متعدد جنگیں ہوئیں جن میں ایک
(شیدو) کے سوائے باقی سب میں مجاہدین کو کامیابی ہوئی اور سکھوں کو زبردست جانی نقصان اٹھانا پڑا۔
رفتہ رفتہ سابق صوبہ سرحد کا بہت بڑا علاقہ جس میں پشاور بھی شامل تھا سید صاحب کے زیرِ نگیں آگیا۔
اس علاقے میں آپ کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ سید صاحب شمال مغربی صوبہ سرحد میں چار سال[2] سے کچھ زیادہ
عرصے تک مقیم رہے اور افغانوں کے اخلاق و عادات اور ان کی معاشرتی و روحانی اصلاح میں مصروف رہے
آپ کی کوشش سے عرصہ دراز کے بعد یہاں اسلامی قوانین کا نفاذ عمل میں آیا۔ فسق و فجور کا خاتمہ ہوا اور
یہ علاقہ ایک نئے رنگ میں رنگ گیا۔

---

[1] سید احمد شہید ص ۳۳۹ مولفہ مولانا غلام رسول مہر
[2] سیرت سید احمد شہید ص ۲۶۳ مولفہ سید ابوالحسن علی ندوی

سردارانِ پشاور کی سازشیں

سید صاحب کے تسلط سے جہاں شمال مغربی صوبہ سرحد کے مسلمانوں کی حالت میں دینی لحاظ سے تغیر پیدا ہو گیا وہاں غریب مسلمان بھی خانوں کے ظلم و ستم سے نجات پا گئے۔ اب کسی کو کمزور پر دست درازی کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ لیکن اس سے سردارانِ پشاور اور بعض دیگر علاقوں کے افغان سردار گھبرا گئے کیونکہ اس طرح امیر و غریب، چھوٹے اور بڑے سب ایک سطح پر آ گئے تھے اور یہ مساوات ان سرداروں کے مزاج کے خلاف تھی جو سالہا سال سے نفس پرستی اور کبر و نخوت کے سرکش گھوڑے پر سوار تھے۔ یہ لوگ آزاد اور معصیت کی زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ سید صاحب نے ان پر جو پابندیاں عائد کر دی تھیں وہ ان کے خوگر نہ تھے۔ ادھر سکھ بھی سید صاحب کی طاقت سے خائف تھے اور اپنے ایجنٹوں کے ذریعے افغان عوام میں سید صاحب کے خلاف بے چینی اور بد دلی پھیلانے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ ان کے خلاف سازشیں شروع ہو گئیں۔ ان سازشوں میں ملاؤں نے بھی سرگرم حصہ لیا جن کی مذہبی دوکانیں سید صاحب کے آنے سے بند ہو گئی تھیں۔ سردارانِ پشاور کے ساتھ مل کر ان ملاؤں نے عوام الناس کو سید صاحب کے خلاف بھڑکایا اور اس عہد کے سب سے بڑے مومن بلکہ امیر المومنین کے خلاف کفر کے فتوے دینے سے بھی اجتناب نہ کیا۔ عجیب بات ہے کہ سکھوں کو جو اس وقت پنجاب میں سب سے بڑی طاقت تھے سید صاحب کی ہیبت کی وجہ سے پشاور پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ مگر خود پشاور اور سرحد کے بعض سرداروں اور ملاؤں نے ان کے خلاف ایسی ریشہ دوانیاں کیں کہ انہیں یہ علاقہ خالی کرنا پڑا بلکہ مسلمانوں نے مسلمانوں کا خون بہایا اور بہت سے مجاہدین کی قیمتی جانیں تلف ہو گئیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر سید صاحب پشاور سے روانہ ہو گئے اور مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے اپریل ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ پہنچے جو ضلع ہزارہ کا نہایت محفوظ مقام ہے۔[1]

سید صاحب کی شہادت

آپ کا منصوبہ یہ تھا کہ بالاکوٹ کو مرکز بنا کر کشمیر میں جہاد کیا جائے جہاں سکھوں نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ کشمیر اور ہزارہ کی فتح کے بعد پھر پنجاب کا رخ کیا جائے اور مسلمانوں کو سکھوں کے ظلم و ستم سے نجات دلا کر ان علاقوں میں اسلامی حکومت قائم کی جائے۔ مگر افسوس کہ غداروں اور سازشیوں نے یہاں بھی آپ کا منصوبہ کامیاب نہ ہونے دیا۔ ابتدا میں بالاکوٹ کے لوگوں خصوصاً وہاں کے افغان سرداروں نے آپ کی مہمان نوازی اور پذیرائی میں بہت اخلاص کا مظاہرہ کیا مگر جب انہوں

---

[1] سید احمد شہید صہ ۳۲۶ مولفہ مولانا غلام رسول مہر

نے دیکھا کہ سید صاحب اسلامی قوانین نافذ کر رہے ہیں اور ان کے افعال کی باز پرس کر رہے ہیں جس سے ان کی آزادی پابندی میں بدل رہی ہے تو وہ سید صاحب کے مخالف ہو گئے۔ ادھر سکھوں اور سرداران پشاور کی سازش سے علما کا ایک فتویٰ بالاکوٹ اور نواحی علاقوں میں تقسیم کیا گیا جس میں سید صاحب اور ان کے رفقا کو کافر قرار دیا گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سید صاحب کی مخالفت شروع ہو گئی اور یہاں کے خوانین ان کی امداد سے دست کش ہو کر بالائی پہاڑوں پر چلے گئے۔ ادھر سکھوں کو جب سید صاحب کی پشاور سے روانگی اور بالاکوٹ میں آمد کا علم ہوا تو ان کا ایک بہت بڑا لشکر شیر سنگھ کی قیادت میں بالاکوٹ کے قریب آ پہنچا۔ اگر اس علاقے کے بعض لوگ غداری اور سکھوں کی رہنمائی نہ کرتے تو یہ لشکر بالاکوٹ کے دشوار گزار پہاڑی راستوں سے گذر کر نیچے نہیں اتر سکتا تھا۔ اگرچہ دشمن کی طاقت سید صاحب کی جماعت سے کم از کم دس گنا زیادہ تھی اور بعض لوگوں نے سید صاحب کو مشورہ بھی دیا کہ سکھوں سے کھلے میدان میں لڑنے کی بجائے محفوظ جگہ پر جنگ کرنی چاہیئے مگر قضا و قدر کے فیصلوں کو کون بدل سکتا ہے۔ سید صاحب نے دشمن کے سامنے سے فرار ہونا گوارا نہ کیا اور کھلے میدان میں نبرد آزما ہو گئے۔

اس میں شبہ نہیں کہ سید صاحب اور آپ کے رفقا نے حیرت انگیز شجاعت سے جنگ کی جس کا سکھ جرنیلوں نے بھی اعتراف کیا۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید نے جو سید صاحب کے امیر لشکر یا سپہ سالار تھے مردانگی کا بے نظیر نمونہ دکھایا لیکن آخر سید صاحب نے مع شاہ اسماعیل دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہادت پائی۔ ان کے ساتھ بکثرت مجاہدین بھی شہید ہو گئے جن میں ہندوستانیوں، پنجابیوں اور سندھیوں کے علاوہ وفادار افغانوں کی ایک جماعت بھی شامل تھی اس طرح ۱۸۳۱ء کو یہ تحریک اپنوں کی غداری اور بے وفائی کے ہاتھوں ختم ہو گئی اور سید صاحب جن لوگوں کی رستگاری کے لئے اپنا عیش و آرام اور گھر بار چھوڑ کر اور اس زمانے میں ہزاروں میل کا دشوار گزار اور تکلیف دہ سفر کر کے آئے تھے انہوں نے ہی سید صاحب سے آنکھیں پھیر لیں۔ ہمارے خیال میں جنگِ پلاسی اور ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد یہ تیسرا بڑا حادثہ، سانحہ یا المیہ تھا جو ہندوستان کے مسلمانوں کو پیش آیا اور جس کے نتیجے میں اس سرزمین پر احیائے اسلام کی آخری کوشش بھی ناکام ہو گئی۔

برِصغیر پر انگریزوں کا مکمل تسلط

سراج الدولہ، سلطان حیدر علی، سلطان ٹیپو، نواب نجیب الدولہ، نواب رحمت خاں اور سید احمد شہیدؒ غرض وہ تمام لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے تھے جو احیائے دین کے لئے جد و جہد کر رہے تھے۔ اب میدان میں کوئی ایسی شخصیت باقی نہ رہی تھی جو مسلمانوں کو غیر ملکی استعمار کے مقابلے میں صف آرا

کرتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کے عزائم نے آخری کروٹ لی اور انہوں نے سب سڈی ایری سسٹم کے ذریعے ایک ایک کرکے تمام آزاد ریاستوں کو ختم کر دیا۔ اب بنگال، بہار، اڑلیسہ، مدراس، بمبئی، اودھ، روہیلکھنڈ اور سارا جنوبی ہند مکمل طور پر انگریزوں کے زیر اقتدار آچکا تھا صرف پنجاب اور سندھ باقی رہ گئے تھے۔
سندھ اس وقت تک آزاد سلطنت تھی جس پر تالپور خاندان کے امراء کی حکومت تھی۔ مگر انگریزوں کو اس آزاد اسلامی حکومت کا وجود کب گوارا ہو سکتا تھا چنانچہ انہوں نے ایک معمولی سے واقعے کو بہانہ بنا کر فروری ۱۸۴۳ء میں امیرانِ سندھ سے جنگ چھیڑ دی[1] امیروں کو شکست ہوئی اور سندھ بھی انگریزی حکومت میں شامل کر لیا گیا۔

اب قابلِ ذکر علاقہ صرف پنجاب کا رہ گیا تھا جو ابھی تک انگریزوں کی سلطنت سے باہر تھا۔ مگر رنجیت سنگھ کی وفات نے انگریزوں کے لئے یہ راستہ بھی صاف کر دیا۔ سکھ سرداروں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی جس سے فائدہ اٹھا کر ۱۱ر دسمبر ۱۸۴۵ء پھر جنوری ۱۸۴۹ء اور آخر میں فروری ۱۸۴۹ء میں لاہور، جلیانوالہ اور گجرات کے مقام پر انگریزوں نے سکھوں سے نبرد آزمائی کی اور انہیں سخت جانی و مالی نقصان پہنچا کر پنجاب پر بھی مکمل طور پر قبضہ کر لیا۔ گجرات کے قریب سکھوں کو ایسی سخت شکست ہوئی کہ وہ اپنا توپ خانہ اور دوسرا ساز و سامانِ جنگ تک چھوڑ کر بھاگ گئے[2]۔ دلیپ سنگھ کو معزول کرکے انگلستان بھیج دیا گیا۔ اس کی ذاتی جاگیر، زیورات، طلائی برتن حتیٰ کہ ریشمی اور کامدار پارچات بھی انگریزوں نے اپنے قبضے میں لے لئے[3]۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت

پنجاب پر انگریزوں کے قبضے کے بعد سارا ہندوستان ان کے زیر نگیں آ گیا اور اب کوئی شخصیت ایسی باقی نہ رہی جو ان کے اقتدار کو چیلنج کرتی اس لئے ان میں تکبر اور اہل ہند کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ ہندوستانی سپاہیوں کی بھی وہ عزت نہ کی جاتی تھی جس کے وہ مستحق تھے حالانکہ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے بنگال سے پشاور اور ہمالیہ کی ترائی سے راس کماری تک کا ہزاروں میل علاقہ اپنی تلوار سے فتح کرکے انگریزوں کو دیا تھا مگر اس کے صلے میں انہیں گالیاں دی جاتی تھیں اور ان سے سخت

---

[1] اوکس بیس صفحہ ۶۸۵
[2] تاریخِ پنجاب صفحہ ۴۳۱ مولفہ رائے بہادر کنہیا لال
[3] کین جلد دوم صفحہ ۲۰۱

بدسلوکی کی جاتی تھی۔ جب ان کی ان جاں کاہ خدمات کی قدر نہ ہوئی تو وہ فطرتاً انگریزوں سے دل برداشتہ ہو گئے۔ انہوں نے دور دراز علاقوں میں جانے کے لئے بھتہ میں اضافے کا مطالبہ کیا مگر ان کا یہ مطالبہ بھی نہایت سختی سے رد کر دیا گیا۔ غرض انگریزوں کے وسیع اقتدار ان کی ناانصافیوں اور غیر دانش مندانہ حملات نے صورت حال کو اس درجہ خراب کر دیا کہ ۱۸۵۷ء میں وہ ہنگامہ رونما ہوا جس نے انگریزی حکومت کی بنیادیں ہلا ڈالیں۔ اس ہنگامے کے اسباب تو اسی وقت جمع ہونے لگے تھے جب کلائو نے ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں نواب سراج الدولہ پر بلاوجہ اور جارحانہ حملہ کر کے اسے شکست دی اور بنگالے میں انگریزی سلطنت کی بنیاد رکھ دی لیکن اس وقت اس کا ردِ عمل ظاہر نہ ہوا اور ایک سو سال تک یہ مواد پلتا رہا۔ بعد کے واقعات نے اس کی شدت میں اور اضافہ کر دیا۔ انگریزوں نے جن حکمرانوں کی ریاستوں پر قبضہ کر لیا تھا وہ اور ان کے جانشین سب سے زیادہ دل برداشتہ تھے۔ ان علاقوں کے عوام میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو انگریزوں کے اقتدار کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ صرف یہی نہیں کہ انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کر کے اہل ہند کو سیاسی لحاظ سے غلام بنا لیا تھا بلکہ انہوں نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ اعتقادی حرکت کی کہ اپنے مذہب کا جوا بھی ان کے کندھے پر رکھنا چاہا۔ پادریوں نے علی الاعلان ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذاہب پر اعتراض کرنے شروع کئے اور خصوصاً مسلمانوں کے اکابر پر تابڑ توڑ حملے کئے۔ پولیس کو حکم دیا گیا کہ وہ ایسے اجتماعات میں پادریوں کے ہمراہ رہے جن میں عیسائیت کی تبلیغ اور ہندوستانیوں کے مذہب کی تنقیص کی جاتی تھی۔ بعض انگریز حکام نے اپنے ہندوستانی ماتحتوں کو حکماً اپنے بنگلوں پر بلایا اور پادریوں کے لیکچر سننے پر مجبور کیا جن میں اہل ہند کی سخت دل آزاری کی جاتی تھی۔ ۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں کچھ ہندوستانی لڑکوں کو ان کی کس مپرسی اور بے چارگی سے فائدہ اٹھا کر عیسائی بنا لیا گیا۔ اس طرح تمام مغربی و شمالی علاقوں کے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ انگریز ہر مفلس و محتاج کو اپنے مذہب میں لے آئیں گے۔

سرسید احمد خاں کے بقول اس ہنگامے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انگریزوں نے حکومت کے معاملات میں ہندوستانیوں کو شریک نہیں کیا بلکہ اس سے آقا بن کر حکومت کرتے رہے۔ اس سے عوام اور حکومت میں نفرت اور بُعد پیدا ہونے لگا۔ اس کے علاوہ اس کا ایک سبب معاشی بدحالی بھی تھا۔ ریاستوں کی ضبطی سے ہزاروں افراد جو ان ریاستوں کے حکمرانوں سے وابستہ تھے بے روزگار ہو گئے۔ تجارت پر انگریزوں کے قبضے کی وجہ سے بھی ملکی منڈیوں اور ملکی صنعتوں پر نہایت خراب اثر پڑا اور ہزاروں خاندان روٹیوں کو محتاج ہو گئے۔ اس کے علاوہ جنگ و جدل اور کشت و خوں ریزی کی وجہ سے گاؤں کے گاؤں اور شہر

کے شہر ویران ہو گئے۔ ہزاروں افراد جن میں بڑے بڑے شرفا بھی شامل تھے۔ در بدر خاک چھاننے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس صورتِ حال سے ملک کا اقتصادی ڈھانچہ تباہ ہو گیا اور لوگوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت پیدا ہونے لگی۔

۱۸۵۶ء میں اودھ کے حکمران واجد علی شاہ کو معزول کر کے انگریزوں نے اس ریاست پر بھی قبضہ کر لیا۔ یہ بغاوت سے ایک سال قبل کا واقعہ ہے اور اگر اسے بغاوت کے فوری اسباب میں سے ایک بڑا سبب قرار دیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ انگریزوں کی فوج میں اس علاقے کے ہندوستانی سپاہیوں کی خاصی بڑی تعداد تھی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے وطن پر بھی غلامی کے تاریک بادل امنڈ آئے ہیں اور ان کے بادشاہ کو انگریزوں نے نظر بند کر دیا ہے تو قدرتاً انہیں اس واقعے کا رنج ہوا۔ اور وہ دل ہی دل میں انگریزوں سے نفرت کرنے لگے۔ اس سے قبل ہندوستان کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر سے وائسرائے ہند لارڈ کیننگ نے اس "حکم" کی تعمیل کرائی کہ بادشاہ کا خطاب اور قلعہ پر تصرف صرف ان کی زندگی تک ہے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے کو شہزادہ اور ولی عہد ضرور کہا جائے گا اور وظیفہ بھی دیا جائے گا مگر وہ بادشاہ نہیں کہلائیں گے نہ انہیں قلعے میں رہنے کی اجازت ہو گی بلکہ اس میں انگریزی فوج متعین کر دی جائے گی۔[1]

اس "حکم نامے" کا بہادر شاہ ظفر، شہزادوں اور دہلی کے لوگوں پر نہایت خراب ردعمل ہوا اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اب اس برائے نام بادشاہت کا بھی خاتمہ ہو رہا ہے اس طرح ان میں انگریزوں کے خلاف سخت نفرت پیدا ہو گئی۔

اس ہنگامے کی آخری اور فوری وجہ وہ کارتوس تھے جو ہندوستانی سپاہیوں کو دیئے گئے تھے اور جنہیں استعمال کرنے سے پہلے ان پر چربی لگائی ہوتی تھی اس کے بعد ان کا سرا دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا۔ ہندوؤں کا خیال تھا کہ اس میں گائے کی چربی شامل ہے اور مسلمان سمجھتے تھے کہ سور کی۔ اس طرح ہمارے مذہب کو خراب کیا جا رہا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ جب ان ہندوستانی سپاہیوں نے ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا تو ان پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا کر دس سال قید مشقت کی سزا دی گئی اور فوج کی پریڈ کرا کر سب کے سامنے انکار کرنے والوں کی وردیاں اتار کر ہتھکڑیاں لگائی گئیں اور انہیں جیل کو روانہ کر دیا گیا۔[2]

---

[1] مارشش مین صد ۴۹۱ [2] مارشش مین صد ۴۹۲

واقعاتِ بغاوت

ظاہر ہے کہ ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ یہ ذلت آمیز سلوک ایسا نہ تھا جسے خاموشی سے برداشت کر لیا جاتا۔ یہ ۹ مئی کا واقعہ ہے۔ دوسرے دن یعنی ۱۰ مئی کو اتوار تھا جب شام کو انگریز عبادت کرنے کی غرض سے گرجا چلے گئے تو سپاہی اور ان کے ہندوستانی افسر ہتھیار لے کر بیرکوں سے نکل آئے اور جیل کے دروازے کھول کر قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اس کے بعد ان مشتعل ہندوستانی سپاہیوں نے اپنے انگریز افسروں کے بنگلوں کا رخ کیا اور انہیں لوٹ کر نذرِ آتش کر دیا۔ انگریزی فوج کے دستے سے ان کی جھڑپ ہوئی اور اس میں بہت سے انگریز مارے گئے۔ یہ ہندوستان میں اس بغاوت کا نقطۂ آغاز تھا جس کے اسباب خود انگریز گزشتہ ایک سو سال سے پیدا کر رہے تھے۔ اس کے بعد باغی فوجیں دہلی کی طرف روانہ ہو گئیں اور لال قلعہ پہنچ کر مغلوں کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر سے درخواست کی کہ ان کی سرپرستی فرمائی جائے۔ پہلے تو بادشاہ نے انکار کیا اور ان سے کہا "میرے پاس تنخواہ دینے کے لئے خزانہ ہے نہ ملک جہاں سے روپیہ حاصل ہو، نہ فوج ہے جس سے تمہاری مدد کروں۔ میں تو نام کا بادشاہ ہوں۔ بہتر ہے کہ تم لوگ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"[1] مگر جب سپاہیوں اور ان کے ہندوستانی افسروں نے بادشاہ سے کہا کہ ہم نہ آپ سے روپیہ مانگتے ہیں نہ فوجی امداد۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ ہماری سرپرستی قبول فرمالیں اور تختِ سلطنت پر رونق افروز ہو جائیں۔ آپ کے اقبال سے ہم سب کچھ حاصل کر لیں گے تو بہادر شاہ نے ان کی درخواست قبول کر لی اور ان کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا۔ دہلی میں جتنے انگریز تھے ان میں سے بہت سے قتل کر دیئے گئے اور شہر پر باغیوں کا قبضہ ہو گیا۔

جب میرٹھ کی بغاوت اور دہلی پر باغیوں کے قبضے کی خبر ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں پہنچی تو وہاں بھی بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے لکھنؤ، کانپور، بریلی، بجنور، شاہجہان پور، الٰہ آباد، علی گڑھ، آگرہ، جھانسی، گوالیار اور کالپی وغیرہ میں ہندوستانی فوجوں نے ہتھیار سنبھال لئے۔ اور اپنے انگریز افسروں کو قتل کر کے ان شہروں پر قبضہ کر لیا۔ شروع شروع میں ہر جگہ باغیوں کو کامیابی ہوئی۔ مگر جب پانچ ماہ کے بعد ستمبر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے سکھ فوج کی امداد سے دہلی پر قبضہ کر لیا تو بغاوت کی اس تحریک کو سخت دھچکا لگا۔ گو اس کے بعد بھی لکھنؤ، کانپور، شاہجہان پور، گوالیار، جھانسی اور کالپی وغیرہ میں انگریزوں سے باغی فوجوں کے نہایت خوں ریز مقابلے ہوئے اور بعض مقامات پر

---

[1] داستانِ غدر مولفہ ظہیر دہلوی

باغی فوجوں نے اس بے جگری اور عسکری قابلیت سے جنگ کی کہ خود انگریز حیرت زدہ رہ گئے اور انہیں سخت شکست ہوئی۔ مگر چونکہ بغاوت کے اصل مرکز یعنی دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا اور جس بادشاہ (بہادر شاہ ظفر) کے نام پر یہ جنگ لڑی جا رہی تھی وہ انگریزوں کا قیدی بن چکا تھا اس لئے یہ جنگ زیادہ عرصے جاری نہ رہ سکی اور نہ اس میں باغیوں کو کامیابی حاصل ہو سکی۔ رفتہ رفتہ انگریزی فوجوں نے ایک ایک شہر پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ گو ان میں سے بعض شہروں میں باغیوں نے نہایت پامردی سے مقابلہ کیا۔ گوالیار، جھانسی اور کالپی باغیوں کے آخری گڑھ تھے جب یہ بھی فتح ہو گئے تو بغاوت کا شعلہ سرد پڑ گیا۔

فاتحین کا انتقام

سرسید احمد خاں اور ان کے ہم خیال بزرگوں کا اندازہ درست ثابت ہوا اور بغاوت ایک سال جاری رہنے کے بعد ناکامی پر منتج ہوئی۔ اس بغاوت کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کا جو حشر ہوا اس کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انگریزوں نے باغیوں کے ساتھ ساتھ بے گناہ لوگوں سے بھی ایسا خوفناک اور ظالمانہ انتقام لیا کہ چنگیز اور ہلاکو کے مظالم بھی بے حقیقت نظر آنے لگے۔ سب سے پہلے اہلِ دہلی کی شامت آئی۔ انگریزوں کا شہر پر قبضہ ہوتے ہی اہلِ شہر خصوصاً مسلمانوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ شریف زادیاں جن کے دوپٹے کا پلو بھی کسی نے نہ دیکھا تھا کھلے منہ عزت و آبرو کے ڈر سے بھاگ رہی تھیں۔ بیمار اور بوڑھے جن سے قدم اٹھانا مشکل تھا گھسٹ گھسٹ کر شہر سے نکل رہے تھے۔ اس عالم میں پشتوں سے جمع کیا ہوا گھر کا اثاثہ تو کجا کپڑے اور زیور بھی لے جانا مشکل تھا۔ بے شمار لوگ شہر سے بھاگتے ہوئے انگریزی فوجوں کی سفاکی کا نشانہ بنے۔ جو اس دار و گیر سے بچے انہیں اجڈ دیہاتیوں نے لوٹ مار کا نشانہ بنایا۔ جو لوگ شدید بیماری، ضعف، بڑھاپے یا وطن کی محبت کی وجہ سے شہر نہ چھوڑ سکے انہیں اس جرم بے گناہی میں قتل کر دیا گیا۔ ان مقتولوں میں سب سے زیادہ بلکہ ننانوے فیصد مسلمان تھے جو سکھ فوجی جس گلی کوچے میں کسی مسلمان کو وجیہہ یا تنومند دیکھتے اسے اپنا شکار بنا کر دل کو ٹھنڈا کرتے۔ ان کے ہاتھ سے بہت سے معزز خاندانی مسلمان جو بدقسمتی سے شہر میں رہ گئے تھے مارے گئے۔ وہ بوڑھے باپوں کے سامنے جوان بیٹیوں کو مارتے اور باپ کو کہتے کہ چلا جائے۔[1] انگریز فوجی افسر اسیروں سے پوچھتے کہ ہندو ہو یا مسلمان؟ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان بتاتا

---

[1] عروج سلطنتِ انگلشیہ ص۱۲۷ مؤلفہ مولانا ذکاء اللہ۔

اسے گولی مار کر ختم کر دیا جاتا یا پھانسی پر لٹکا دیا جاتا۔ مسلمانوں کو برہنہ کر کے زمین پر لٹایا گیا ان کی مشکیں کسی گئیں اور پھر انہیں سر سے پاؤں تک گرم تانبے سے داغ دیا گیا۔ سکھوں اور انگریز فوجیوں نے مسلمان قیدیوں کو زندہ آگ میں جلا دیا اور ان کے تڑپنے اور جلنے کا تماشہ دیکھتے رہے۔ زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں جلایا گیا۔ بعض کو مجبور کیا گیا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کریں۔ سیکڑوں مسلمانوں کو ایک چھوٹے سے برج میں ٹھونس دیا گیا اور جب انہیں قتل کرنے کے لئے باہر نکالا گیا تو ان میں سے ۴۵ آدمی گرمی کی شدت اور دم گھٹنے کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر چکے تھے۔ بہت سے لوگوں کو اس جرم میں پھانسی دے دی گئی کہ انگریزی فوجوں کے مارچ کے وقت ان کے چہرے دوسری طرف کیوں تھے۔ ان پھانسی پانے والوں میں عوام الناس بھی تھے۔ اہل علم و فضل بھی تھے۔ سردار اور رئیس بھی تھے۔ شہزادے بھی تھے۔ "دلی کے پاس جتنے شہزادے ملے پکڑے گئے۔ ان کی تعداد انتیس بیان کی جاتی ہے۔ ان میں بوڑھے، لنگڑے، بیمار سب کے سب پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔ حتیٰ کہ میرزا محمود شاہ اکبر شاہ بادشاہ کا پوتا وجع المفاصل میں مبتلا تھا اس کی لاش پھانسی پر گولا لاٹھی بنی ہوئی لٹکتی رہی"[1]

انگریزی فوج کے رسوائے زمانہ افسر ہڈسن نے بادشاہ کے تین بیٹوں کو کپڑے اتروا کر اپنے ہاتھ سے گولی کا نشانہ بنایا[2] اور ان کی لاشیں کوتوالی کے سامنے ڈال دی گئیں جہاں ان کی بوٹیاں گدھ اور کتے نوچتے رہے۔ ہزاروں مسلمان اور شریف خاندان کی عورتیں عصمت دری کے ڈر اور کوچہ گردی کی رسوائی سے بچنے کے لئے کنوؤں میں گر کر مر گئیں۔ فوج کے افسروں اور سپاہیوں کو لوٹ کھسوٹ کی کھلی چھٹی دے دی گئی۔ انہوں نے کوئی گھر نہ چھوڑا جس کا صفایا نہ کیا ہو۔ مکانوں کے صحن اور دیواریں کھود کھود کر دفینے نکال لئے۔ قیمتی سامانوں کے ساتھ ساتھ چھتوں کی کڑیاں، تختے اور کیواڑ تک اتار کر لے گئے۔ الفنسٹن کے بقول اس لوٹ کھسوٹ کی کارروائی نے نادر شاہ کے کارنامے بھی بھلا دیئے۔ مساجد ویران ہو گئیں ان کے قیمتی پتھر نکال لئے گئے۔ بعض سرے سے منہدم کر دی گئیں۔ شاہی مسجد کو اصطبل بنا دیا گیا۔ سکھ فوجی اس میں گھوڑے باندھتے۔ شراب پیتے اور سور ذبح کر کے پکاتے اور انگریزوں کے ساتھ ان کے کتے مسجد کے صحن میں پھرتے رہتے۔

یہ صرف ایک شہر دہلی کی تباہی اور مسلمانوں کی بربادی کی نامکمل تصویر ہے ورنہ اس شہر اور مسلمانوں

---

۱ عروج سلطنت انگلشیہ صہ ۲۰۸

۲ قیصر التواریخ صہ ۴۵۳

پر جو قیامت گزر گئی اس کی تفصیلات کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ باقی شہروں اور ان کے ساکنوں پر کیا بیتی ہو گی۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ اس بغاوت میں ہندوستانی فوجوں نے اخلاقی پابندی کی۔ بلاشبہ انہوں نے بھی بعض شرمناک حرکتیں کیں اور بہت سی انگریز عورتوں اور ان کے معصوم بچوں کو نہایت سفاکی سے قتل کیا۔ نانا صاحب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انگریزوں کو پناہ دینے کے باوجود اس وقت قتل کرا دیا جب وہ کشتیوں میں بیٹھ کر دریا پار اتر رہے تھے۔ یقیناً کوئی منصف مزاج اور شریف آدمی ان قبیح اور ظالمانہ افعال کی تائید نہیں کر سکتا۔ مگر ایک یا چند افراد کی مجنونانہ اور ظالمانہ حرکات کا انتقام بے گناہ لوگوں اور شہری آبادی سے لینا اخلاق کے کون سے ضابطے کے تحت جائز ہے اور پھر انتقام بھی ایسا ہولناک جس نے خود منصف مزاج انگریزوں کو بھی لرزہ براندام کر دیا۔ سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے والوں میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے بلکہ باغیوں کی اکثریت ہندو سپاہیوں پر مشتمل تھی مگر انتقام کا نشانہ اکثر و بیشتر مسلمانوں کو بنایا گیا۔ اسی اندیشے کے پیش نظر سرسید اور ان کے ہم خیال لوگوں نے کوشش کی تھی کہ مسلمان اس بغاوت میں شریک نہ ہوں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کی زد مسلمانوں پر پڑے گی۔

سرسیدؒ کی تحریک

۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ دار و گیر کے بعد ہندوستان پر ایک سناٹا چھا گیا۔ سیاسی لحاظ سے سارے ملک پر جمود طاری ہو گیا۔ خوف، دہشت اور مایوسی نے مسلمانانِ ہند کو خاص طور پر غیر منظم، شکست خوردہ اور غیر فعال افراد کا ایک منتشر گروہ بنا دیا۔ ہندو اکثریت جو سیکڑوں سال سے مسلمانوں کی تباہی کی آرزو مند تھی میدان میں آ گئی۔ اس نے ان حالات سے بیش از بیش فائدہ اٹھایا۔ اس موقع پر ہندوؤں نے جو کردار ادا کیا اس کے دو پہلو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ہندوؤں کا کردار

اول انہوں نے نہایت ہوشیاری سے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی تمامتر ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی کیونکہ اس تحریک کے سربرآوردہ لوگوں میں اکثریت مسلمانوں کی تھی جیسے احمد اللہ شاہ مدراسی، جنرل بخت خاں، عظیم اللہ خاں، شہزادہ فیروز شاہ، مولوی لیاقت علی الہ آبادی، نواب خان بہادر خاں، حضرت محل، نواب محمود خاں اور نواب ممو خاں وغیرہ۔ سب سے بڑی بات یہ کہ بغاوت کا مرکزی کردار اور سربراہ (بہادر شاہ ظفر) مسلمان تھا اس لئے انگریزوں نے ہندوؤں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اور باغیوں کے مسلمان اکابر کی اکثریت پر نظر کر کے مسلمانوں ہی کو اس بغاوت کا ذمہ دار قرار دے دیا گو اس تحریک کے اکابر میں بہت سے ہندو بھی تھے جیسے دھوندو پنت عرف نانا صاحب، رانی جھانسی اور تانتیا ٹوپی وغیرہ۔ مگر چونکہ ان کی تعداد کم تھی اس لئے انگریزوں نے ہندو قوم کو بغاوت سے بری الذمہ قرار دے دیا۔ حالانکہ جہاں تک فوجی بغاوت کا تعلق ہے یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ اس میں واضح اکثریت ہندوؤں ہی کی تھی۔ پھر لوٹ مار، فتنہ و فساد اور قتل و غارت کے جس قدر واقعات پیش آئے ان کے ذمہ دار نناوے فیصد ہندو ہی تھے۔ دہلی، لکھنؤ، کانپور اور شمالی ہند کے متعدد علاقوں سے جو مسلمان اپنی جانیں اور عزت و آبرو بچا کر اور اپنی بچی کھچی پونجی لے کر شہروں سے نکلے انہیں راستوں میں لوٹنے، قتل کرنے اور بے آبرو کرنے والے یہی دیہاتی گوجر، جاٹ اور ہندو راجپوت تھے اسی طرح ان لوگوں نے بدنظمی و انتشار میں اضافہ کیا اور انگریزی فوجوں کے راستے میں نہایت مشکلات پیدا کیں۔ چاہیئے تو یہ

تھا کہ ان سرکشوں اور مفسدوں کو سزا دی جاتی مگر ہوا اس کے برعکس اور ان تمام باتوں کے باوجود ہندو بے گناہ قرار پائے اور مسلمان مجرم۔

انگریزوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا اور اُن سے جو ظالمانہ انتقام لیا گیا اس کی ایک وجہ ہندو اکابر کا وہ منظم پروپگنڈا تھا جس کے ذریعے انگریزوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ ان کے خلاف یہ سازش دہلی کے لال قلعہ میں تیار کی گئی تھی اور مسلمان امرا اور معزول شدہ مسلمان والیانِ ریاست اس میں شریک تھے۔ ہندوؤں نے انگریزوں پر یہ اثر ڈالنے کی کوشش کی کہ ہندو تو سیکڑوں سال سے مسلمانوں کے غلام چلے آرہے تھے انہیں انگریزوں کو ملک سے نکال کر پھر مسلمانوں کی غلامی قبول کرنے سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا تھا۔ ان کا فائدہ تو اسی میں تھا کہ مسلمان اقتدار سے محروم رہیں اور انگریز ہندوستان کے حاکم ہوں تاکہ وہ اپنے نئے حاکموں سے وہ حقوق حاصل کر سکیں جن سے وہ ابھی تک محروم تھے۔ ہندوؤں کی یہ دلیل بہ ظاہر نہایت وزنی تھی اس لئے انگریز اس سے متاثر ہو گئے۔

پھر اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ عیسائی آغازِ اسلام سے مسلمانوں کے دشمن تھے۔ اور مسلمانوں نے انہیں ہر محاذ پر عبرتناک شکستیں دی تھیں۔ صلاح الدین ایوبی کے زمانے کی صلیبی جنگوں میں انہیں مسلمانوں کے ہاتھوں جو زخم لگے تھے وہ انہوں نے فراموش نہیں کئے تھے۔ پادریوں اور متعدد عیسائی مورخوں نے مسلمانوں کے خلاف سال ہا سال نہایت مکروہ پروپگنڈا کیا اور انہیں ظالم، خونخوار، ڈاکو اور عیسائیت کے شدید دشمن کے روپ میں پیش کرکے عیسائیوں کے دلوں میں جن میں انگریز بھی شامل تھے مسلمانوں کے خلاف نفرت و عداوت کی آگ کو اور تیز کر دیا تھا۔

اس سلسلے میں ایک اور پہلو بھی قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ انگریزوں نے پنجاب کے سوائے باقی سارے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی۔ اس لئے ان کی کوشش یہ تھی کہ جہاں تک ہو سکے مسلمانوں کو ذلیل و خوار اور تباہ و برباد کیا جائے تاکہ وہ دوبارہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں وہ مسلمانوں کی جنگی سپرٹ، ان کے تصورِ جہاد اور ان کی فطری حریت پسندی سے بھی خائف تھے۔ ان سب امور نے مل کر انہیں مسلم آزاری پر آمادہ کر دیا اور انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں سے ایسا خوفناک انتقام لیا کہ چشمِ فلک نے اس کی نظیر کم ہی دیکھی ہوگی۔ بہر حال انگریزوں کو اس انتقام پر آمادہ کرنے میں ہندوؤں نے جو کردار ادا کیا اسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مسلمانوں کی پس ماندگی

اس موقعے پر ہندوؤں کے کردار کا جو دوسرا پہلو سامنے آیا وہ مسلمانوں کے حق میں اور بھی زیادہ

خطرناک تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو انگریزوں کا پوری طرح وفادار ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ہر موقعہ پر انگریزوں سے تعاون کیا۔ ان سے زیادہ سے زیادہ قریب ہوئے۔ ان کی زبان، ان کا لباس اور ان کی معاشرت غرض ہر چیز کو اپنا لیا۔ اس طرح انہوں نے انگریزوں کی چشم اعتبار میں بہت جلد جگہ حاصل کرلی۔ ادھر انگریز یہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے مسلمانوں کو اقتدار سے محروم کیا ہے اس لئے اندیشہ ہے کہ وہ حصولِ اقتدار کی دوبارہ کوشش نہ کریں۔ پس انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ مسلمانوں کو پس ماندہ رکھا جائے اور ہندوؤں کو آگے بڑھایا جائے۔ ہمیں اس حقیقت کا بلا تامل اعتراف کرلینا چاہیئے کہ اس موقع پر ہندوؤں نے مسلمانوں سے کہیں زیادہ فراست، دور اندیشی اور اپنی قومی ہمدردی کا ثبوت دیا۔ انہوں نے ہوا کا رخ پہچاننے میں قطعًا دیر نہ کی۔ ملک کی معیشت پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے انہوں نے تجارت کی طرف اپنی ساری توجہ مرکوز کردی۔ انہوں نے روپیہ کی قدر کی اور فضول رسموں میں اپنی دولت کو پانی کی طرح نہیں بہایا۔ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انگریزی تعلیم کا حصول انہوں نے اپنا نصب العین بنالیا۔ انگریزوں کے قائم کردہ تعلیمی اداروں سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے طور پر بھی بہت سے تعلیمی ادارے قائم کئے اور دیکھتے ہی دیکھتے تعلیمی میدان میں ہندو ہی ہندو نظر آنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگریاں لے کر تعلیمی اداروں سے نکلنے اور سرکاری مناصب پر فائز ہونے لگے۔ اس طرح ملک کا اقتصادی نظام، تعلیمی نظام اور تجارتی میدان غرض ہر شعبہ ان کے زیرِ تسلط آگیا۔

برعکس اس کے اس موقعے پر مسلمانوں نے فراست اور دور اندیشی کا کوئی اچھا نمونہ نہیں دکھایا۔ ان پر افسردگی، شکست خوردگی اور یاس و اندوہ کی جو کیفیت طاری ہوگئی تھی اس نے ان کے قوائے عمل کے ساتھ ساتھ ذہنوں کو بھی مفلوج کردیا اور وہ پس ماندگی کے اتھاہ غار میں گر گئے۔ انگریزوں کے مظالم اور ان کی مذہبی و معاشرتی معاشرت نے مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کے دل میں ان کے خلاف نفرت پیدا کردی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مغربی علوم اور انگریزی زبان سے بھی نفرت کرنے لگے۔ انگریزی کو "کرسٹانوں" کی زبان قرار دیا گیا اور اس کا پڑھنا کفر۔ تعلیم اور خصوصًا انگریزی تعلیم سے عدم دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت نہایت خراب ہوچکی تھی۔ ان کا سارا اقتصادی ڈھانچہ تباہ ہوچکا تھا۔ ان میں سے اکثر دو وقت کی روٹیوں کو محتاج ہوگئے تھے۔ ایسے عالم میں تعلیمی اخراجات برداشت کرنا ان کے لئے مشکل تھا اور حصولِ علم کے لئے جس پُرسکون ماحول اور آسودگی کی ضرورت ہوتی ہے وہ بہت سے علاقوں میں ناپید تھا۔

غرض ساری قوم جہالت اور اقتصادی بدحالی کا شکار تھی۔ جاگیردار اور متمول مسلمان اول تو تعداد میں نہایت کم تھے۔ پھر ان کی اخلاقی حالت بھی بے حد قابلِ رحم تھی۔ انہیں عیش و عشرت اور حکام کی کاسہ لیسی کے سوائے اور کسی چیز سے سروکار نہ تھا۔ قوم کے درد اور افرادِ قوم کی حالت کو بہتر بنانے کے شعور سے وہ قطعاً عاری تھے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اس غلامی اور اقتصادی بدحالی کے باوجود قوم کا بڑا حصہ جاہلانہ اور غیر اسلامی رسوم و رواج کی زنجیروں میں اسیر تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنے گھر کا اثاثہ بیچ کر اور مہاجنوں اور ساہوکاروں سے قرض لے کر بھی ان قبیح رسوم کو سرانجام دینے میں کوئی باک محسوس نہ کرتے تھے۔ اس طرح ان کی اخلاقی اور اقتصادی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ ان کے مکانات، حویلیاں، باغات اور زرعی زمینیں ہندوؤں کے قبضے میں جا رہی تھیں۔

سرسیّد کی مساعیٔ جمیلہ

ان روح فرسا حالات میں جب ساری قوم پر ادبار کے بادل چھائے ہوئے تھے اور قومی ہمدردی کے الفاظ گویا لغت سے خارج ہو چکے تھے کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو مسلمانوں کی زبوں حالی اور پس ماندگی پر خون کے آنسو رو رہے تھے۔ جن کی فکر کا محور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے سوائے اور کچھ نہ تھا۔ ان لوگوں میں سرسید احمد خاں کا نام سرفہرست ہے اور وہی اس گروہ کے سرخیل اور اس کارواں کے امیر قرار پائے۔ وہ نہایت زیرک انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں قلبِ دردمند کے ساتھ ساتھ علوئے فکر و نظر کی دولت سے بھی بہرہ یاب فرمایا تھا۔ دوربینی و دور اندیشی ان کی شخصیت کا سب سے تابناک جوہر تھا۔ انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ مسلمانوں کے زوال کے بہت سے مرحلے ان کی آنکھوں کے سامنے طے ہوئے تھے۔ بہت سے واقعات کے وہ عینی شاہد تھے۔ انگریزوں کے ساتھ تعلق نے انہیں اس قوم کی خامیوں اور خوبیوں دونوں سے باخبر کر دیا تھا۔ اپنی خداداد بصیرت کی بنا پر انہوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا موجودہ انتشار اور مرکزیت کا فقدان ان کی کسی جدوجہد کو کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ کو انہوں نے مسلمانوں کے حق میں نیک فال نہیں بلکہ شگونِ بد خیال کیا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ اگر مسلمان انگریزوں سے مخاصمت ترک کر کے ان سے تعاون کریں، ان کے علوم اور ان کی زبانیں سیکھیں اور ان کا اعتماد حاصل کر لیں تو اس زینے سے وہ ترقی کی معراج تک پہنچ سکتے ہیں اور ان کی عظمتِ رفتہ بحال ہو سکتی ہے۔ انہوں نے یہ نظریہ طویل غور و فکر اور ذاتی تجربہ و مشاہدہ کے بعد قائم کیا تھا اور اس حقیقت سے کون ذی شعور

اور منصف مزاج انکار کرسکتا ہے کہ اُس دور اور ان حالات میں صحیح راستہ اور درست طرزِ فکر وہی تھا جو سرسید نے اختیار کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۸۵۷ء میں بغاوت کا شعلہ بھڑک اٹھا اور اس کے ساتھ ساتھ بعض عاقبت نااندیش باغیوں نے انگریزوں کی عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا شروع کر دیا تو سرسید نے ان حرکات کی نہایت سختی سے مخالفت کی اور اپنے امکان بھر حالات کو درست کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کا نظریہ تھا کہ نہتے انگریزوں، ان کے معصوم بچوں اور کمزور عورتوں کو قتل کرنا نہ قرآن و حدیث کی رو سے جائز ہے اور نہ شجاعت کے نقطۂ نگاہ سے یہ فعل قابلِ تعریف قرار دیا جاسکتا ہے۔ بجنور میں جہاں وہ صدر امین تھے انہوں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر بیس انگریزوں اور ان کے اہل و عیال کی جانیں بچائیں۔ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد جب بجنور پر انگریزی فوجوں نے قبضہ کرلیا تو یہ سرسید ہی تھے جنہوں نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر ہزاروں مسلمانوں کو قتلِ عام اور پھانسی سے بچایا۔ نواب محسن الملک نے اپنے ایک خط میں سرسید کی ان ملی خدمات کا ان الفاظ میں اعتراف کیا تھا کہ "بجنور ہی ایک ایسا ضلع تھا جو سرسید احمد خاں کی بدولت غدر کے نتائج و عواقب سے محفوظ رہا[1]۔"

بے غرض خدمت

بغاوت کی ناکامی اور ملک پر انگریزوں کا پوری طرح تسلط ہو جانے کے بعد جب ان لوگوں کو انعامات اور جاگیریں دی جانے لگیں جنہوں نے انگریزوں کی حمایت و امداد کی تھی تو سرسید کو بھی ایک جاگیر پیش کی گئی۔ انہوں نے اپنے ایک لکچر میں جو ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے میں ۲۸ دسمبر ۱۸۸۹ء کو دیا تھا اس واقعے کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اس وفاداری کے عوض مسٹر شکسپیئر (کلکٹر و مجسٹریٹ ضلع بجنور) نے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور ایک لاکھ روپے سے زیادہ مالیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائیداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ میں نے اس کے لینے سے انکار کر دیا[2]۔"

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سرسید نے انگریزوں کی حمایت کسی ذاتی غرض اور ذاتی فائدے کے لئے نہیں کی تھی بلکہ انہوں نے جو کچھ کیا قومی نقطۂ نظر اور ملی مفاد کے پیشِ نظر کیا اور اپنی ان خدمات

---

[1] حیاتِ جاوید صفحہ ۵۴

[2] حیاتِ جاوید صفحہ ۵۶

کو عوام کی فلاح و ترقی کے لئے استعمال کیا جب وہ مراد آباد میں صدر الصدور ہو کر گئے تو اس ضلع میں باغی مسلمانوں کی ضبط شدہ جائیدادوں کی تحقیقات کے سلسلے میں جو کمیشن مقرر کیا گیا تھا اس کے ایک رکن وہ بھی تھے۔ مولانا حالی کا بیان ہے کہ "مراد آباد کے معتبر اشخاص سے سنا گیا ہے کہ سرسید کی شرکت کے سبب یہاں کے کمیشن نے غدر داریوں کی تحقیقات نہایت اعتدال و انصاف کے ساتھ کی اور صوبہ شمال مغرب میں ضبط شدہ جائدادیں جس قدر ضلع مراد آباد میں واگزاشت ہوئیں ایسی کسی ضلع میں نہیں ہوئیں[1]۔"

رسالہ اسباب بغاوتِ ہند

اس دوران میں جب مسلمان شک و شبہ کی نظر سے دیکھے جا رہے اور انہیں جانی و مالی دونوں لحاظ سے تباہ و برباد کیا جا رہا تھا سرسید نے ایک نہایت ہی جرأت مندانہ قدم اٹھایا اور ایک رسالہ تصنیف کیا جس کا عنوان تھا "کیا سبب ہوا ہندوستان کی سرکشی کا۔" یہ وہی رسالہ ہے جو بعد میں اسباب بغاوت ہند کے نام سے مشہور ہوا۔ اس رسالے میں انہوں نے نہایت واشگاف الفاظ میں بغاوت کی اصل ذمہ داری انگریزوں پر عاید کی۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے انگریزوں کو مخاطب کر کے انہیں بتایا کہ اگر تم لوگ ہوش گوش سے کام لیتے تو یہ لرزہ خیز حادثہ کبھی پیش نہ آتا۔ سرسید نے اپنے اس رسالے میں بغاوت کا اصل سبب یہ قرار دیا کہ "انگریزی گورنمنٹ نے رعایا کے حالات اور خیالات، عادات و اوضاع اور طبیعت اور طینت کے دریافت کرنے کی کبھی توجہ نہیں کی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ہماری رعیت پر دن کیسا گزرتا ہے اور رات کس مصیبت کی آتی ہے اور وہ دن بدن کس مصیبت میں پڑتے جاتے ہیں اور کیا کیا رنج روز بروز ان کے دل میں جمتے جاتے ہیں[2]۔"

سرسید نے انگریزوں پر نہایت شد و مد سے اعتراض کیا کہ انہوں نے ہندوستانیوں کو لیجس لیٹو کونسل میں شریک نہ کر کے اہل ملک کی بے چینی اور ناراضگی کا ایک ایسا سبب پیدا کیا جس نے اور بہت سے اسباب کو جنم دیا۔ انہوں نے انگریزی حکومت کی مذہبی پالیسی پر بھی کھل کر تنقید کی اور صاف صاف لکھا کہ حکمران طبقے نے ایسے طریقے اختیار کئے جن سے ہندوستانیوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت کی جا رہی ہے اور انہیں عیسائی بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اسی سلسلے میں سرسید نے

---

[1] حیاتِ جاوید ص ۵۶

[2] رسالہ اسبابِ بغاوت ہند

بعض واقعات کی طرف اشارے کئے اور بتایا کہ پادریوں کا مجمع عام میں کھڑے ہو کر ہندوستانیوں کے مذاہب پہ اعتراض کرنا اور ان کے مذاہب کے اکابر کی ہتک کرنا یہ ایک ایسا غیر دانشمندانہ فعل تھا جس نے اہل ہند کے دلوں کو سخت تکلیف پہنچائی اور گورنمنٹ سے ناراض کر دیا۔

ہندوستانیوں کی بے توقیری

سرسید نے اپنے اس رسالے میں انگریزوں کو مخاطب کر کے لکھا کہ تم نے اہل ہند کو ہمیشہ ذلیل اور بے توقیر سمجھا۔ بلاشبہ تمام رعایا ہندوستان کی شاکی ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے ان کو نہایت بے قدر اور بے وقر قرار دیا ہے ..... کیا یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ ایک اشراف اہل کار صاحب کے سامنے مثل پڑھ رہا ہے اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر باتیں کر رہا ہے کہ صاحب کی بد مزاجی اور سخت کلامی بلکہ دشنام دہی سے دل میں روتا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے افسوس روٹی اور کہیں نہیں ملتی اس نوکری سے تو گھاس کھودنی بہتر ہے[۱]۔"

مذکورہ رسالے کا ردعمل

ہم نہیں سمجھتے کہ اس دور میں جب کسی مسلمان کا انگریز کے خلاف زبان کھولنا موت کو دعوت دینا تھا غیر منقسم ہندوستان کے کسی ایک فرد نے بھی اس جرأت سے انگریزوں کے غلط طرزِ عمل پر تنقید کی ہو۔ بہ الفاظ دیگر سرسید نے یہ رسالہ لکھ کر بغاوت کی ساری ذمہ داری انگریزوں پر ڈال دی اور صرف مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ عام ہندوؤں کو بھی اس جرم سے بری قرار دے دیا۔ انہوں نے اس رسالے کی تقریباً پانچ صد کاپیاں انگلستان بھیجیں تاکہ برطانوی پارلیمنٹ کے ممبروں میں تقسیم کی جائیں۔ چنانچہ اس کا انگریزی ترجمہ انگلستان کے ذمہ دار لوگوں کی نظر سے گزرا اور اس کے نہایت خوشگوار نتائج نکلے سرسید ہی کے مطالبے سے متاثر ہو کر امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں اہل ہند کو بھی نشستیں دی گئیں۔ اسی رسالے کا اثر تھا کہ انگریزوں نے اپنی پالیسی میں متعدد تبدیلیاں کیں اور عیسائیت کی تبلیغ کے جابرانہ طریقے ختم کر دیئے گئے۔

مسلمانوں کی سماجی اصلاح

سرسید احمد خاں کا کارنامہ صرف اتنا ہی نہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے خطرناک نتائج کا شکار ہونے سے بچا لیا اور امکانی حد تک انہیں مزید جانی و مالی بربادی سے محفوظ رکھا۔ بلکہ ان کی قومی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کی ان خدمات کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک

۱۔ رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند

فرد نہیں، ایک ادارہ نہیں بلکہ کئی اداروں کا مجموعہ اور اپنی ذات میں ایک نہیں کئی تحریکوں کا منبع تھے۔ بلاشبہ وہ اپنے عہد کے بہت بڑے سیاسی و سماجی اور ادبی مصلح تھے جن کے احسانات کو برصغیر کے مسلمان کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ مسلمانوں کی سماجی اصلاح ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی معاشرتی پستی کو اپنی توجہ کا اولیں مرکز بنا کر انہیں غلط رسوم و رواج سے آزاد کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ اس کا پہلا شمارہ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو شائع ہوا۔ اس پرچے کے ذریعے انہوں نے قوم کو جھنجھوڑا اور ان بری رسموں کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلائی جو انہیں گھن کی طرح کھائے جا رہے تھے۔ اس موضوع پر انہوں نے خود بھی مضامین لکھے اور اپنے معاصرین اہل علم سے بھی لکھوائے۔ سرسید کی ان کوششوں کا نہایت اچھا نتیجہ نکلا اور بہت سے لوگوں نے سادگی کو اپنا شعار بنا لیا۔ سرسید نے دوسروں ہی کو سادگی اور کفایت شعاری کی تلقین پر اکتفا نہ کیا بلکہ خود بھی اس کا عملی نمونہ دکھایا۔

سرسید کی تعلیمی تحریک

سرسید کو اس حقیقت کا ادراک ہو گیا تھا کہ آنے والا زمانہ سائنس اور ٹکنالوجی کا ہو گا اور اس دور میں وہی قومیں آبرومندانہ زندگی گزار سکیں گی جو ان علوم سے پوری طرح آراستہ ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی سماجی ترقی کے بعد ان کی تعلیمی ترقی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تاکہ وہ ہندوؤں کے مقابلے میں جاہل نہ رہ جائیں جو بڑی سرعت سے علوم جدیدہ حاصل کر رہے تھے۔ انہوں نے مراد آباد، غازی پور اور پھر آخر میں علی گڑھ میں مسلمانوں کی تعلیم کے لئے مدارس قائم کئے، جن میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کو بھی داخلے کی سہولتیں دیں اور ان میں انگریزی، اردو اور فارسی کی تعلیم کا انتظام کیا۔ غازی پور میں انہوں نے سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی۔ ان کے اس اقدام کے نتیجے میں اردو زبان کا دامن علوم جدیدہ سے مالا مال ہونے لگا۔ اس سوسائٹی کا قیام ۱۸۶۳ء میں عمل میں آیا اور سرسید اس کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ علی گڑھ آ کر سرسید نے سائنٹیفک سوسائٹی کے زیر اہتمام ۱۸۶۶ء میں "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے نام سے ایک ہفتہ وار رسالہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں جاری کیا۔ اس اخبار کے ذریعے سرسید نے مسلمانوں کی سماجی اصلاح، تعلیمی ترقی اور سیاسی بیداری کا عظیم الشان کام لیا۔ سائنٹیفک سوسائٹی کے زیر اہتمام اس عہد کے اہل علم حضرات جو لیکچر دیتے تھے انہیں اس اخبار میں شائع کیا جاتا تھا۔ اس طرح اعلیٰ درجے کے علمی شہ پاروں اور ترقی پسندانہ خیالات سے مسلمان اس رسالے کے ذریعے روشناس ہوتے تھے اور ان کی فکر و نظر میں وسعت پیدا ہوتی تھی۔

سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ علی گڑھ کالج کا قیام ہے جو ان کی وفات کے بعد مسلم یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔ اس کالج کے قیام کے لئے انہوں نے انگلستان کا سفر کیا اور وہاں کے تعلیمی اداروں کا بہ نظرِ غائر جائزہ لے کر ۱۲، اکتوبر ۱۸۷۰ء کو ہندوستان واپس آئے۔ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں مسلمانوں کے اس عظیم مدرسۃ العلوم کا افتتاح ہوا۔ یکم جون ۱۸۷۵ء سے باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہو گیا۔[1]

سرسید کا نظریۂ تعلیم

تعلیمی اداروں کے قیام سے سرسید کا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ پڑھے لکھے مسلمانوں کی ایک کھیپ پیدا ہو جائے جو حکومت برطانیہ کی مشینری میں پرزوں کے طور پر کام کرنے لگے۔ تعلیم کے سلسلے میں ان کا ایک خاص اور قومی نظریہ تھا۔ "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" کی طرف سے ان کے جاری کردہ اشتہار کا ایک پیراان کے نظریۂ تعلیم کی وضاحت کرتا ہے " مسلمانوں کو اپنے علوم قدیمہ محفوظ رکھنے، علوم جدیدہ سے مستفید ہونے اور اپنی تمام ضرورتوں کے مطابق اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کے سوا اور کچھ چارہ نہیں کہ وہ آپ اپنی تعلیم کی فکر کریں[2]"

اپنے ایک اور رسالے میں انہوں نے حکومت پر نہایت سخت تنقید کرتے ہوئے کہا کہ "یہ بات گورنمنٹ پر لازمی ہو گئی ہے کہ وہ ہندوستانیوں کو اس قسم کی تعلیم دے کہ ان کو اپنے حقوق حاصل کرنے کی قدرت ہو جائے۔ جو عہدے انگریزوں کو ملتے ہیں وہ انہیں بھی ملیں۔ اگر گورنمنٹ ہندوستانیوں کو اس درجے تک تعلیم نہ دے گی تو اس نے اپنے اقرار کو پورا نہیں کیا اور ہندوستانیوں کے حق میں ناانصافی ہوئی[3]"

سرسید کی ان دونوں تحریروں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے پیشِ نظر مسلمانوں کی تعلیم کے نہایت بلند مقاصد تھے یعنی علوم دین کی حفاظت اور ان کی تعلیم و تدریس تاکہ مسلمان اسلام سے غافل نہ ہو جائیں۔ علوم جدیدہ کا حصول تاکہ ان کے ذریعے مسلمان اپنے دنیوی مقاصد حاصل کر سکیں۔ ایسی تعلیم جس سے مسلمانوں کو اپنے سیاسی حقوق کے حصول میں کامیابی ہو سکے۔

سرسید کا نظریۂ سیاست

سرسید نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام اہلِ ہند میں پہلے فرد ہیں جنہوں نے اس دور میں سیاسی لحاظ

۱ے حیات جاوید صفحہ ۱۲۸

۲ے مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۱۸۷ مؤلفہ سید طفیل احمد منگلوری۔

۳ے مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۲۴۷

سے اہل ہند کو انگریزوں کا ہم مرتبہ بنانے کی آواز بلند کی۔ جب کیا ہندو اور کیا مسلمان غرض ہر ملت کے لوگ سرکار برطانیہ کی غیر مشروط وفاداری کے سوائے اور کوئی بات ہی نہ کہتے تھے۔ سرسید نے سب سے پہلے یہ آواز اٹھائی کہ ہم محکوم ضرور ہیں مگر جب تک انتظامیہ میں بڑے سے بڑا عہدہ انگریزوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کو بھی نہ دیا جائے اس وقت تک امور حکومت بہ حسن وخوبی سر انجام نہیں پا سکتے۔ انہوں نے نہایت جرأت سے کام لیتے ہوئے حکومت سے کہا کہ "کوئی وقار اور کوئی عزت کسی قوم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ حکمران قوم کے ساتھ درجہ حاصل نہ کرے اور اپنے ملک کی حکومت میں حصہ نہ لے . . . . بلکہ جو گورنمنٹ اپنی رعایا کو اس قسم کے اعزاز سے محروم رکھے وہ بھی عزت کی نظر سے نہیں دیکھی جا سکتی۔ عزت تب ہی حاصل ہوگی جب ہمارے ملکی بھائی حکمران قوم کے ساتھ برابر کے عہدے رکھتے ہوں گے"[1]

لوکل باڈیز اور ضلع کونسلوں میں بھی ہندوستانیوں کی شرکت کے حق میں انہوں نے آواز بلند کی اس سے بھی آگے بڑھ کر انہوں نے اپنی سیاسی بصیرت کی بنا پر یہاں تک کہہ دیا تھا کہ "وہ دن آئے گا جب تم خود ہی قانون بناؤ گے اور خود ہی اس پر عمل کرو گے"[2] اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ان کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ سرسید کے ان ٹھوس اور انقلاب آفریں اقدامات کے پیش نظر یہ کہنا واقعات کے عین مطابق ہوگا کہ وہ غیر منقسم ہندوستان کے پہلے مسلمان رہنما تھے جنہوں نے مسلمانوں کو تعلیم یافتہ اور باشعور بنایا۔ انہیں اپنے سیاسی حقوق حاصل کر کے اپنی آزاد حکومت قائم کرنے کی تحریک کی بلکہ ایک آزاد اسلامی مملکت کا سنگ بنیاد رکھا۔ انہوں نے اردو زبان کے مقابلے میں ہندی کو دفتری زبان بنانے کی متعصبانہ تحریک کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور مسلمانوں کی قومی زبان کی حیثیت سے اردو کا مرتبہ متعین کرنے کی بھرپور کوشش کی تاکہ قوم کو تہذیبی لحاظ سے نقصان نہ پہنچنے پائے۔

سرسید کی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے اور مسلمانوں کی زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جس کی طرف انہوں نے توجہ نہ کی ہو۔ گو ان کے بعض اقدامات ایسے بھی تھے جنہیں مسلمانوں نے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا اور بلاشبہ ان کے بعض نظریات نظر ثانی کے محتاج تھے مگر اس میں بھی شبہ نہیں کہ

---

[1] سفر نامہ پنجاب ص۱۵۳ از سرسید احمد خاں

[2] مسلمانوں کا روشن مستقبل ص۲۴۱

ان کے تفکرات کسی بد دیانتی یا ذاتی غرض پہ مبنی نہ تھے۔ انہوں نے جو کچھ سوچا دیانت داری سے سوچا اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے سوچا۔ یہ الگ بات کہ اس غور و فکر میں ان سے بعض لغزشیں بھی ہوئیں مگر ان چند لغزشوں سے ان کے کارناموں اور ان کی عظمت پہ حرف نہیں آسکتا۔

دارالعلوم دیوبند

۱۸۵۷ء کی بغاوت میں جن مسلمان اکابر نے حصہ لیا ان میں حضرت حاجی امداد اللہ مکی رح اور آپ کے مرید خاص حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رح کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس بغاوت کی ناکامی کے بعد حضرت حاجی امداد اللہ ہجرت فرما کر حجاز چلے گئے اور اپنے شاگرد رشید حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رح کو ایک عظیم مشن پہ مامور فرما گئے۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت سے ان دونوں اہلِ نظر حضرات کو اس حقیقت کا ادراک ہو چکا تھا کہ انگریزوں کو اس ملک سے بذریعہ طاقت بے دخل کرنا موجودہ حالات میں ممکن نہیں۔ چنانچہ ان حضرات نے حالات کا گہری نظر سے جائزہ لیا۔ انہیں مسلمانوں کی جس متاعِ عزیز کو سب سے زیادہ خطرہ محسوس ہوا وہ تھی قوم کی دینی اقدار۔ چنانچہ ان بزرگوں نے مسلمانوں کے دینی افکار کو مغربی سیلاب سے بچانے، ان کی تہذیب و تمدن کے تحفظ اور ان کی مذہبی اقدار کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالا دینے کے لئے سہارنپور کے قصبہ دیوبند میں ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھنے کا فیصلہ کیا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رح نے اپنے چند رفقاء مولانا حاجی عابد حسین صاحب، مولانا ذوالفقار علی صاحب اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے تعاون و مشورت سے ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء کو مقامی مسجد کے کھلے صحن میں ایک چھوٹے سے مدرسے کا آغاز کیا تاکہ ایسے افراد کی ایک جماعت تیار کی جائے جو علوم دینیہ کی فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ آگے چل کر ملی جدوجہد میں بھرپور حصہ لے سکے۔ سال اول کے آخر میں اس چھوٹے سے مدرسے میں طلبہ کی تعداد ۷۸ تک پہنچ چکی تھی جن میں یوپی، پنجاب، کشمیر اور افغانستان تک کے طلبہ شامل تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند اپنے مقتدر بانی کی شہرت و عظمت اور غیر معمولی علم و فضل کی بدولت کتنی جلد دین دار مسلمانوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ رفتہ رفتہ برصغیر کے علاوہ برہما، ملایا، ایران، سیلون، ترکستان اور جنوبی افریقہ تک سے طلبائے علم اس دارالعلوم میں آکر داخل ہونے لگے اور پھر اس چھوٹے سے مدرسے نے بہت بڑے دارالعلوم کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس حقیقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اگر مدرسۃ العلوم

---

[1] تاریخ دیوبند ص۷۵ مؤلفہ سید محبوب رضوی

دیوبند قائم نہ ہوتا تو برصغیر کے مسلمانوں میں آج دین کا جو شعور موجود ہے اس کی کیفیت بہت مختلف ہوتی۔ سر سید احمد خاں نے علی گڑھ مسلم کالج قائم کرکے مسلمانوں کو جدید علوم سے آراستہ کرنے کی سعیٔ جمیل کی تاکہ ترقی کی دوڑ میں مسلمان غیروں سے پیچھے نہ رہ جائیں اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے دارالعلوم دیوبند قائم کرکے امکانی حد تک مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اور ذہن و فکر کو مغربی اثرات سے محفوظ رکھنے کا مقدس فریضہ سرانجام دیا۔

اس دارالعلوم نے بڑی بڑی شخصیتیں پیدا کیں جنہوں نے برصغیر میں اسلامی علوم کے چراغ روشن رکھے۔ ان قابلِ ذکر شخصیتوں میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عبدالحق (مفسر تفسیرِ حقانی) مولانا ابراہیم آروی، مولانا ماجد علی پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا سید انور شاہ کاشمیری، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا سید احمد محدث چاٹگام، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا قاری محمد طیب (موجودہ پرنسپل دارالعلوم دیوبند) مولانا احمد علی لاہوری، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا مفتی محمد حسن امرتسری، مولانا مظہر الدین ایڈیٹر "الامان" شمس العلما مولانا تاجور نجیب آبادی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا احتشام الحق تھانوی کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ وہ فرزندانِ دیوبند ہیں جنہوں نے نہ صرف ایک پوری نسل کی دینی تربیت کی بلکہ ان میں سے بہت سے حضرات نے مسلمانوں کی ملی جد و جہد میں عملی حصہ لیا اور تحریکِ پاکستان میں سوادِ اعظم کا ساتھ دے کر اس تحریک کو تقویت پہنچائی۔

بنگال کی اسلامی ادبی انجمن

سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے جو تحریک جاری کی اس نے ملک کے مختلف علاقوں کو متاثر کیا۔ ان کے خیالات کی باشعور مسلمانوں میں پذیرائی ہوئی۔ بعض لوگوں نے ان کی زندگی ہی میں ان کے نصب العین کو اپنایا اور اس کے حصول کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے سر سید کے خیالات کی اپنے طور پر اشاعت کی۔ انہوں نے مسلمانوں کی زبوں حالی کو شدت سے محسوس کیا اور انہیں پستی سے اٹھا کر بلندی پر فائز کرنے کی کوشش کی۔ ان لوگوں میں بنگال کے نواب عبداللطیف کا نام سرِفہرست ہے۔ نواب عبداللطیف فرید پور میں پیدا ہوئے اور کلکتہ کے مشہور مدرسہ میں تعلیم پائی۔ برصغیر کے دیگر علاقوں کی طرح بنگال کے بھی بہت سے مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے خلاف تھے مگر نواب عبداللطیف نے نہایت ذوق و شوق سے انگریزی تعلیم حاصل کی اور بنگال کے مسلمانوں کو بھی انگریزی پڑھنے کی تلقین کی۔ انہوں نے ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور

مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہ کر ۱۸۸۸ء میں ملازمت سے ریٹائر ہوئے اور اپنی باقی زندگی بنگال کے مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی فلاح وبہبود کے لئے وقف کر دی۔ ۱۸۵۷ء کے خونیں ہنگامے نے سرسید کی طرح نواب عبداللطیف کو بھی بے حد متاثر کیا اور انہوں نے بھی سرسید ہی کی طرح مسلمانوں کی ترقی کے لئے علوم جدیدہ کی تحصیل اور انگریزوں سے تعاون کو ضروری قرار دیا۔ انہوں نے "اسلامی ادبی انجمن" کے نام سے کلکتہ میں ایک ادارہ قائم کیا اور اپنی شبانہ روز کوشش سے بنگال کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس کا رکن بنایا۔ اس انجمن کے زیر اہتمام علمی اجلاس منعقد ہوتے تھے۔ جن میں تاریخ تہذیب، علم تاریخ کے فوائد، جہازرانی، تجارت کا آغاز اور ترقی اور علوم جدیدہ کی اہمیت جیسے عنوانوں پر مقالات پڑھے جاتے تھے۔ یہ بنگال کی پہلی اسلامی انجمن تھی جس کے اراکین مسلمانوں کو بیدار کرنے اور زمانے کے ساتھ چلنے کی تلقین کرتے تھے اس انجمن کی کوششوں اور اس کے اجلاسوں میں پڑھے جانے والے مقالات سے بنگال کے مسلمانوں میں اپنی پستی کا احساس پیدا ہؤا اور رفتہ رفتہ وہ بھی بنگالی ہندوؤں کی طرح انگریزی تعلیم، جدید خیالات اور قومی ترقی کے شعور سے بہرہ ور ہونے لگے۔ بنگال کے مسلمانوں کی بیداری اور قومی ترقی میں بلاشبہ نواب عبداللطیف کی تحریک کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔

انجمن حمایت اسلام

سرسید احمد خاں کی تحریک نے جن صوبوں کے مسلمانوں کو متاثر کیا ان میں صوبۂ پنجاب خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ جس عہد کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ مسلمانان پنجاب کے لئے نہایت نازک تھا۔ نصف صدی تک سکھوں کی ظالمانہ حکومت نے پنجاب کے مسلمانوں کو ہر لحاظ سے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ ان کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ وہ سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تعلیمی غرض ہر لحاظ سے پس ماندگی کا شکار تھے۔ سکھوں کی حکومت کے خاتمے کے بعد جب پنجاب پر انگریزوں کا تسلط قائم ہؤا تو اس علاقے کے مسلمانوں کو امن وسکون کا سانس لینا نصیب ہؤا اور انہیں سکھوں کے ہولناک اور انسانیت سوز مظالم سے نجات ملی۔ مگر ابھی ان کی سیاسی بیداری، فکری تربیت اور سماجی ترقی کی شدید ضرورت تھی اور یہ عظیم کارنامہ انجمن حمایت اسلام نے سرانجام دیا۔ بلاشبہ اس انجمن نے سابق پنجاب میں وہی کام کیا جو شمالی ہند میں سرسید احمد خاں اور ان کی تحریک نے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انجمن حمایت اسلام کا قیام سرسید احمد خاں ہی کی تحریک کا مرہون منت ہے۔ چنانچہ انجمن کی "مختصر تاریخ" کے مولف خواجہ محمد حیات (پبلسٹی اسسٹنٹ) نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں :-

"چودھویں صدی ہجری کا پہلا سال یعنی ۱۳۰۱ھ مسلمانان پنجاب کی تعلیمی ترقی کی تاریخ میں زریں

حروف سے لکھا جائے گا۔ کیونکہ اس سال شروع ماہ جمادی الاول مطابق مارچ ۱۸۸۴ء میں لاہور کے چند مسلمان جن کے دل قومی درد اور اسلامی جذبہ سے معمور تھے ایک جگہ اکٹھے ہوئے تاکہ عیسائی مشنریوں کی مخالفِ اسلام ریشہ دوانیوں اور نئی جاری شدہ آریہ سماج کی تازہ معاندانہ سرگرمیوں کی روک تھام کا انتظام کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی مسلمانانِ ہندوستان کے قائدِ اعظم جناب سر سید احمد خاں بہادر علیہ الرحمۃ کی اٹھائی ہوئی آواز پر کہ "قوم کی پستی کا علاج دینی تعلیم کے ساتھ مروجہ تعلیم کے اجرا میں مضمر ہے" غور کیا جائے۔ اس مجلسِ مشاورت کا نتیجہ ایک جماعت کی تشکیل ہوا جس کا نام انجمن حمایت اسلام لاہور رکھا گیا[1]۔"

اس انجمن کے قیام کا اعلان ۲۴ ستمبر ۱۸۸۴ء کو ایک جلسۂ عام میں کیا گیا جو مسجد بکن خاں اندرون موچی دروازہ لاہور میں منعقد ہوا تھا۔ جن اولین لوگوں نے اس انجمن کے قیام میں حصہ لیا ان میں منشی چراغ دین قاضی خلیفہ حمید الدین، خلیفہ عماد الدین، مولوی غلام اللہ قصوری، منشی پیر بخش، منشی عبد الرحیم خاں دہلوی سید احمد علی شاہ دہلوی، حاجی میر شمس الدین، میاں کریم بخش رئیس اعظم لاہور، میاں نظام الدین رئیس اعظم لاہور و آنریری مجسٹریٹ، منشی محمد کاظم، ڈاکٹر محمد الدین ناظر، خان بہادر شیخ خدا بخش، منشی نجم الدین، شمس العلما شمس الدین شائق، حافظ بہادر الدین، شیخ ایزد بخش، مولوی دوست محمد، میاں محمد چھوٹو، خان بہادر سید امیر شاہ، شیخ رحیم بخش، مولوی احمد دین وکیل اور مولوی عبد اللہ انجینیئر کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

انجمن نے اپنی تعلیمی کوششوں کا آغاز دو پرائمری اسکولوں سے کیا۔ اس مقصد کے لئے ابتدا میں جو سرمایہ فراہم ہوا وہ سات سو چون روپے پر مشتمل تھا۔ اس کے مستقل ممبروں کے لئے ۴ آنے ماہوار چندہ مقرر کیا گیا اور ڈھائی روپے ماہوار کرایہ پر ڈپٹی بازار کی حویلی سکندر خاں میں ایک مکان حاصل کر کے اس میں اس انجمن کا دفتر قائم کیا گیا۔ انجمن کے پہلے صدر قاضی خلیفہ حمید الدین، پہلے جنرل سیکرٹری مولوی غلام اللہ قصوری، پہلے اسسٹنٹ سیکرٹری منشی چراغ دین و منشی پیر بخش اور پہلے خزانچی منشی عبد الرحیم خاں دہلوی مقرر ہوئے۔

بانیانِ انجمن اور معاونینِ انجمن کی پرخلوص کوششوں سے انجمن حمایت اسلام روز بروز ترقی کرنے لگی اور رفتہ رفتہ اس کے پرائمری اسکولوں کی تعداد ۶۳ تک پہنچ گئی۔ یہ اسکول لاہور شہر کے مختلف علاقوں

---

[1] مختصر تواریخ انجمن حمایتِ اسلام لاہور ص۱ مؤلفہ خواجہ محمد حیات

کے علاوہ لاہور کی تحصیلوں چونیاں اور قصور میں بھی قائم کئے گئے۔ انہی میں سے ایک اسکول کو ترقی دے کر پہلے مڈل اور پھر ۱۸۸۹ء میں ہائی اسکول کا درجہ دے دیا گیا جو اسلامیہ ہائی اسکول شیرانوالہ گیٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ رفتہ رفتہ انجمن کی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ اس نے لاہور میں متعدد ہائی اسکول زنانہ بھی اور مردانہ بھی، متعدد ڈگری کالج طلبہ کے لئے بھی اور طالبات کے لئے بھی، طب اسلامی کی سرپرستی کے لئے طبیہ کالج اور قانون کی تعلیم کے لئے لا کالج قائم کئے۔ انجمن نے اپنی خدمات کے دائرے کو لاہور سے باہر گوجر خاں اور کراچی تک پھیلا دیا۔ گوجر خاں میں ایک ہائی اسکول انجمن حمایت اسلام کے زیر اہتمام قائم ہے۔ کراچی میں کاشانۂ اطفال کے نام سے سماجی بہبود کا ادارہ بھی انجمن ہی کی کوششوں سے قائم ہوا تھا مگر اب وہ ایک مقامی تنظیم کے زیر اہتمام جاری ہے۔ انجمن نے تعلیمی خدمات کے ساتھ ساتھ سماجی خدمات کا بھی نہایت عظیم الشان ریکارڈ قائم کیا اور اس کے زیر اہتمام یتیم بچوں، بچیوں اور بیوہ عورتوں کی فلاح کے لئے متعدد ادارے قائم ہیں جن میں اب تک ہزاروں یتیم اور بیوائیں تعلیم و تربیت اور پرورش پاکر معاشرے میں آبرومندانہ مقام حاصل کر چکی ہیں۔ انجمن کی درس گاہوں سے تعلیم پانے والوں کی فہرست نہایت طویل ہے اور ان میں بکثرت ایسے لوگ ہیں جنہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے اور مسلمانوں کی ہر ملی تحریک میں ہراول دستے کے طور پر کام کیا۔

انجمن حمایت اسلام صرف ایک تعلیمی و سماجی ادارہ ہی نہیں بلکہ یہ ایک تحریک کی حیثیت رکھتی ہے۔ انجمن کے سالانہ جلسوں کو ہماری ملی جدوجہد میں نہایت نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس کے پلیٹ فارم سے ہر عہد کی ممتاز شخصیتوں نے مسلمانوں سے خطاب کیا اور قومی و دینی مسائل میں ان کی رہنمائی کی۔ انجمن کے ان جلسوں کے ذریعے پنجاب کے مسلمانوں میں سیاسی و ملی بیداری پیدا ہوئی۔ سر فضل حسین، سر عبدالقادر، علامہ اقبال اور خلیفہ شجاع الدین جیسے اکابر اس انجمن کے صدر رہے۔ علامہ اقبال کی شہرت کا آغاز ہی انجمن کے پلیٹ فارم سے ہوا اور انہوں نے اپنی نہایت فکر انگیز اور معرکۃ الآرا نظمیں جیسے نالۂ یتیم، شکوہ، جواب شکوہ، شمع و شاعر، خضر راہ اور طلوع اسلام انجمن ہی کے پلیٹ فارم پر پڑھیں۔

انجمن نے اپنے تعلیمی و سماجی اور دینی مقاصد کی اشاعت اور اپنا پیغام عام مسلمانوں تک پہنچانے کے لئے "حمایت اسلام" کے نام سے ایک جریدہ کی اشاعت کا آغاز کیا۔ یہ رسالہ پہلے ماہانہ تھا مگر ۱۹۲۶ء میں اسے ہفت روزہ کر دیا گیا۔ اس وقت سے تا ایں دم یہ رسالہ نہایت باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ ملک کے بڑے بڑے شاعر، ادیب اور اخبار نویس اس کے شعبۂ ادارت سے وابستہ رہے۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری،

سعادت، حسن منٹو، رشید اختر ندوی، وقار انبالوی، نشتر جالندھری، ابو صالح اصلاحی، عبداللہ بٹ، مولانا صلاح الدین احمد اور بشیر محمد اختر نے مختلف اوقات میں اس کے فرائض ادارت سر انجام دیئے۔
ہفت روزہ "حمایت اسلام" نے اپنا دائرہ صرف انجمن کی ترجمانی تک محدود نہیں رکھا بلکہ اعلیٰ درجے کے علمی، ادبی، تاریخی اور اسلامی مضامین شائع کرکے اس نے اردو ادب کے سرمائے میں بیش از بیش اضافہ بھی کیا۔ اس جریدے نے تحریک پاکستان کا پیغام عام کرنے میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ قائد اعظم اور دوسرے مسلم اکابر کی تقریروں، پیغامات اور . . . مسلم لیگی اجتماعات کی خبروں اور ان پر تبصروں کے ذریعے اس نے مسلمانوں کو ان کی منزل کا تعین کرنے میں بھرپور امداد دی۔ اس طرح انجمن حمایت اسلام نے پنجاب کے مسلمانوں کی تعلیمی و سماجی خدمت کرنے کے علاوہ ان میں حرکت و عمل کی روح بھی پھونکی اور انہیں ایک ایسی جد و جہد کے لئے تیار کیا جس کا نقطۂ آخر برصغیر میں ایک آزاد اور اسلامی ریاست کا قیام تھا۔

آجکل مشہور سیاسی و سماجی رہنما میاں امیرالدین صاحب اس کے صدر، شفاء الملک حکیم محمد حسن صاحب قرشی، مولانا غلام مرشد اور شیخ محمد لطیف صاحب ایڈووکیٹ اس کے نائب صدر، شیخ مقبول احمد صاحب اور خان ذوالقرنین خاں صاحب اس کے جنرل سیکرٹری اور خواجہ غلام دستگیر صاحب اس کے فنانشل سیکرٹری ہیں۔ انجمن کا سالانہ بجٹ نصف کروڑ سے بھی زیادہ ہے جو قوم کے بچوں کی تعلیمی و سماجی بھلائی پر خرچ ہوتا ہے۔

کانگرس کا قیام

۱۸۵۷ء کی بغاوت جہاں ہندوستان کے بہت سے حصوں کے لئے تباہی کا باعث ہوئی وہاں اس کا ایک خوشگوار پہلو بھی سامنے آیا اور بلاشبہ اس پہلو کو منظرِ عام پر لانے کا عظیم الشان کارنامہ اسی بوڑھے مگر جواں ہمت انسان نے سرانجام دیا جس کا ذکر ہم اس کتاب میں بار بار کرنے پر مجبور ہیں۔ یعنی سر سید احمد خاں۔ انہوں نے رسالہ "اسباب بغاوتِ ہند" لکھ کر جن امور کی طرف انگریزوں کو متوجہ کیا ان سے برطانوی حکام متاثر ہوئے اور سرسید کی کوششوں سے ہندوستانیوں کی بہت سی شکایات کا ازالہ کیا گیا مگر اس سے ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا جو انتظامی ہونے کے علاوہ سیاسی بھی تھا۔ ہندوستانیوں کو حقوق دینے کے ساتھ ساتھ انگریزوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ امورِ حکومت میں دخیل ہونے اور انگریزی تعلیم سے بہرہ ور ہونے کے بعد اہلِ ہند میں سیاسی شعور پیدا ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دونوں قوموں (انگریزوں اور اہلِ ہند) میں تلخی منافرت بھی بڑھ رہی ہے۔ اسی دوران میں بعض ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے ایک بار پھر ہندوستانی عوام کو حکومت کے خلاف مشتعل کرنا شروع کر دیا۔ مثال کے طور پر وہ اخبار جو انگریزوں کی ملکیت تھے اہلِ ہند کی تہذیب و تمدن پر نہایت دلآزار تنقید کرتے تھے مگر برعکس اس کے ہندوستانی اخبارات پر ۱۸۷۸ء میں گورنر جنرل لارڈ لٹن نے نہایت سخت پابندیاں عاید کر دیں۔ ان سے باز پرس ہونے لگی اور ان پر جرمانے ہونے لگے۔ دوسری طرف انگریزوں کے اخباروں پر نہ صرف یہ کہ کوئی پابندی عاید نہیں کی گئی بلکہ انہیں کھلی چھٹی دے دی گئی کہ وہ جس طرح چاہیں ہندوستانیوں کے جذبات کو مجروح کریں۔ اسی دوران میں انگریز آباد کاروں اور ان کے ہندوستانی مزارعوں میں افسوس ناک کشمکش شروع ہو گئی۔ بہار اور بنگال میں وسیع قطعات اراضی پر انگریز آباد کاروں نے نیل کے کھیت اور چائے کے باغات لگائے تھے۔ یہ انگریز آباد کار ہندوستانی مزدوروں اور کاشت کاروں سے نہایت سخت کام لیتے تھے اور اکثر ان پر شدید مظالم بھی کرتے تھے۔ اس کے نتیجے میں بہت سے ہندوستانی مزدور اور کاشت کار ہلاک ہو گئے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جب ان کے مقدمات انگریز مجسٹریٹوں کی عدالتوں میں پیش ہوتے تو وہ بعض اوقات تو مجرموں کو بری کر دیتے اور کبھی معمولی

سزا پر اکتفا کرتے۔ اس پر متعدد ہنگامے ہوئے مگر انہیں سختی سے دبا دیا گیا۔ اسی زمانے میں لارڈ لٹن گورنر جنرل نے اسلحہ ایکٹ نافذ کر دیا جس کے تحت ہندوستانیوں کو اسلحہ رکھنے کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ اس طرح صورتِ حال نہایت نازک ہو گئی۔

اہلِ ہند کے خلاف سازش

یہ تھے وہ حالات جنہوں نے دانش ہند انگریزوں کو تشویش میں مبتلا کر دیا اور وہ ایسی تدابیر پر غور کرنے لگے۔ جن پر عمل کرنے سے ہندوستانیوں کی بے چینی کم ہو جائے۔ ان انگریزوں میں ایلن اکیٹیوین ہیوم کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ مسٹر ہیوم سول سروس کے ممتاز رکن تھے اور سیکریٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے تعلیم یافتہ افراد کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس بے چینی کو دور کرنے کا ایک جامع منصوبہ بنایا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے انگلستان جا کر برطانوی پارلیمنٹ کے اراکین سے بھی تبادلۂ خیالات کیا۔ واپسی پر مسٹر ہیوم نے کلکتہ یونیورسٹی کے گریجوایٹ افراد سے رابطہ قائم کیا اور پھر بمبئی، مدراس اور ملک کے دیگر تعلیم یافتہ افراد کو جن میں ننانوے فیصد ہندو تھے۔ جمع کر کے "انڈین نیشنل کانگرس" کے نام سے ایک جماعت قائم کی جس کا پہلا اجلاس[1] ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو بمبئی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت ایک بنگالی ڈبلو سی بنرجی نے کی۔ اس میں بہتر مندوب شریک ہوئے۔ جن میں سے ستر ہندو اور صرف دو مسلمان تھے۔ اس اجلاس کی کارروائی کا آغاز ملکۂ معظمہ کے شکریہ سے ہوا۔ صدر جلسہ مسٹر بنرجی نے اپنے خطبہ صدارت میں انگریزی حکومت کی خوبیاں بیان کیں اور اس کی برکات کا نہایت فراخ دلی سے اعتراف کیا۔ اعلان کیا گیا کہ ہم لوگ ملکۂ معظمہ کے وفادار ہیں اور آئندہ بھی وفادار رہیں گے۔ اجلاس برخاست کرتے وقت کانگرس کے انگریز بانی مسٹر ہیوم نے ملکہ وکٹوریہ کے لئے تین بار تالیاں بجوائیں اس طرح کانگرس کا یہ پہلا اور تاریخی اجلاس ختم ہوا۔ ۱۸۸۸ء اور ۱۸۸۹ء میں کانگرس کے جو اجلاس منعقد ہوئے ان کی صدارت دو انگریزوں جارج اینڈ ریویول اور ولیم ویڈر برن نے کی۔ جب تعلیم یافتہ ہندوؤں نے دیکھا کہ کانگرس کی سرپرستی انگریز کر رہے ہیں اور اسے حکومتِ وقت کا تعاون بھی حاصل ہے تو وہ جوق در جوق اس میں شامل ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے کانگرس ہندوؤں کی جماعت بن گئی۔

کانگرس کی ابتدائی بیس سالہ تاریخ شاہد ہے کہ اس جماعت نے اپنی ساری طاقت حکومت سے اظہارِ وفاداری کرنے اور اس کے قصیدے پڑھنے میں صرف کر دی، دراصل کانگرس کا قیام اہلِ ہند اور خصوصاً

---

[1] تواریخ کانگرس صفحہ ۲۸ مولفہ ڈاکٹر بی پٹا بھائی سیتا رامیہ

مسلمانوں کے خلاف ایک منظم سازش کے سوائے اور کچھ نہ تھا۔ جیساکہ قبل ازیں بتایا جا چکا ہے کہ اس کا بانی ایک انگریز تھا۔ انگریزوں نے اس کے جلسوں کی صدارت کی۔ حکومت کی اسے سرپرستی حاصل تھی اس کے پلیٹ فارم پر حکومتِ برطانیہ سے وفاداری کی قرار دادیں پاس ہوتی تھیں۔ اس طرح انگریزوں نے ایک ایسی جماعت قائم کر دی تھی جو ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد پر مشتمل تھی اور جس کا کام ایک طرف اہلِ ملک کو انگریزوں کی اطاعت گزاری کی مسلسل تلقین کرتے رہنا تھا اور دوسری طرف انگریزی حکومت کی پالیسیوں کے متعلق اپنے ردعمل کا اظہار کرنا تھا تاکہ حکومت کے بارے میں تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے خیالات کا اندازہ ہو سکے۔ انگریز دانشور اس حقیقت سے واقف تھے کہ ہر ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ ہی قوم کا مزاج بناتا ہے اس لئے جب اسے ہاتھ میں لے لیا جائے تو ساری قوم مٹھی میں آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز مدبروں نے ہندوستان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی مدد سے یہ تنظیم قائم کی اور انہیں حصولِ مقصد کے لئے اپنا آلۂ کار بنایا۔ کانگرس کی ایک شاخ لندن میں بھی قائم کی گئی، اس کے صدر صوبہ بمبئی کی سول سروس کے ایک انگریز پنشنر سر ولیم وڈیرن تھے۔ موصوف ۲۹ سال تک کانگرس کی خدمت کرتے رہے اور انتہا یہ ہے کہ انہیں ایک ہزار پاؤنڈ سالانہ کی رقم جو پنشن کے طور پر ملتی تھی وہ سب کی سب کانگرس کی تنظیم اور اس کی ترقی پر صرف کرتے تھے۔ ۱۸۸۹ء میں بمبئی کے اجلاس کی صدارت کرنے کے لئے وہ انگلستان سے تشریف لائے تھے۔[1]

کانگرس کا دوسرا وار مسلمانوں کے خلاف تھا۔ کانگرس کے انگریز بانی اور ان کے ہندو رفقائے کار اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ اس وقت تک ملک کی انگریزی خواں آبادی میں مسلمانوں کا تناسب نہ ہونے کے برابر تھا اور کانگرس میں وہی لوگ شریک کئے جاتے تھے جو انگریزی تعلیم یافتہ ہوتے تھے اس طرح اس جماعت کا حقیقی فائدہ انگریزوں کے بعد اگر کسی کو پہنچ سکتا تھا تو وہ ہندو تھے۔ چنانچہ ملک کی فلاح و بہبود کے لئے کانگرس کے اجلاسوں میں ایسی تجاویز پیش کی جاتی تھیں، جن سے مسلمانوں کی بجائے صرف ہندوؤں کا مفاد وابستہ ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ زیرک مسلمانوں نے کانگرس میں شمولیت کی مخالفت کی۔

سرسید اور کانگرس

سرسید احمد خاں پہلے مسلمان رہنما تھے جنہوں نے کانگرس کے خوفناک عزائم کا اپنی خداداد بصیرت سے اندازہ کر لیا تھا اور مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اس جماعت سے الگ رہیں۔ اپنی مختلف تحریروں میں تقریروں میں، نجی مجالس میں اور نجی خطوط میں انہوں نے بار بار مسلمانوں کو ہدایت کی کہ موجودہ حالات میں ان کا

---

[1] مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۲۳ مولفہ سید طفیل احمد منگلوری

اس تنظیم میں شمولیت اختیار کرنا سیاسی لحاظ سے ان کے لئے سخت نقصان کا باعث ہوگا۔ سرسید کی اس تنبیہہ کا مسلمانوں پر جو اثر ہوا وہ تو ظاہر ہی ہے۔ لیکن اس تنبیہہ سے ہندو ایک اور رنگ میں متاثر ہوئے۔ انہوں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنی روش میں تبدیلی پیدا کرلی اور اپنے مطلب کے مسلمانوں کو کانگرس میں شامل کرنے کی تحریک شروع کردی۔ ذیل میں ایک خط درج کیا جاتا ہے جس کے مطالعے سے ہندوؤں کے اندازِ فکر میں تبدیلی اور کانگرس میں مسلمانوں کی شمولیت کے متعلق سرسید احمد خاں کے نقطۂ نگاہ کا علم ہو جائے گا۔

۱۸۸۸ء کا واقعہ ہے کہ گجرات (پنجاب) کے ایک مسلمان رئیس اور آنریری مجسٹریٹ شیخ غلام حسین نے مسلمانانِ گجرات کی طرف سے سرسید کو ایک خط لکھا جس میں ان سے دریافت کیا گیا تھا کہ "ہمارے شہر کے ہندوؤں میں آج کل انڈین کانگرس کا بڑا زور ہے اور یہاں کے ہندو ہم مسلمانوں کو بھی کانگرس میں شامل ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔ آپ کا اس کے متعلق کیا خیال ہے؟"

اس کے جواب میں سرسید نے شیخ غلام حسین صاحب کو مندرجہ ذیل خط لکھا :-

"مکرمی شیخ صاحب! سلام مسنون۔ مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ گجرات کے مسلمان اب ہر معاملے میں میری رائے لینی ضروری خیال کرتے ہیں۔ میں خداوند تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ مسلمان مجھ پر اعتماد کرتے ہیں اور مجھے اس لائق جانتے ہیں کہ میں سیاسی طور پر ان کی رہنمائی کروں۔

ملک ہندوستان میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ کانگرس بھی انہی کی جماعت ہے اس جماعت کی کارگزاریوں کا فائدہ ان کو ہی پہنچتا ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس میں مسلمانوں کی شرکت سراسر زیاں اور نقصان دہ ہے۔ میں اپنی تقریر مطبوعہ ۲۸؍ دسمبر ۱۸۸۷ء کی ایک جلد انجمن اسلامیہ گجرات کی رہنمائی کے لئے ارسال کر رہا ہوں۔ میں نے کتاب کے صفحہ۹ پر ضروری نشان لگا دیا ہے۔ اس کے پڑھنے کے بعد میری رائے کی پوری وضاحت ہو جائے گی۔

علی گڑھ سید احمد"[1]

اسی زمانے میں سرسید احمد خاں کے متعلق مدراس کے مشہور انگریزی اخبار "ہندو" نے ایک مضمون شائع کیا جس میں لکھا کہ سرسید نے اپنی سیاسی پالیسی تبدیل کرلی ہے۔ اس کے جواب میں سرسید احمد خاں نے

---

[1] تاریخ آئینۂ گجرات مولفہ شیخ کرامت اللہ (گجرات) قلمی۔ اس خط کی نقل مجھے اپنے مخدوم جناب شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی کے ذریعے حاصل ہوئی۔ (مولف)

۲۲ ستمبر ۱۸۹۳ء کو الہ آباد کے مشہور انگریزی اخبار "پایونیر" کے ایڈیٹر کو ایک خط لکھا جس میں اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کانگرس کے متعلق بھی اظہار خیال کیا۔ ذیل میں ان کی اس تحریر کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے :۔

"چند سال ہوئے جبکہ انڈین نیشنل کانگرس نے اول اول شور و غل شروع کیا کہ میں نے اپنی پبلک اسپیچوں میں اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کو یہ صلاح دی کہ اس کانگرس کی خطرناک . . . . اور گمراہ کرنے والی اور دھوکا دینے والی تحریک سے بالکل الگ رہیں اور میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ باوجود اس کے کہ کانگرس کی رپورٹوں میں اپنے مسلمان ممبروں کو بہت کچھ بڑھایا جاتا ہے۔ لیکن اگر غور سے امتحان کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ایک بھی بڑا معزز شخص مسلمانوں میں سے اس میں شریک نہیں ہوا اور مسلمان امراء اور اشراف عموماً کانگرس کے غل و شور میں شریک نہیں ہوئے اور کانگرس معقول طور پر اپنے اس دعوے کو صحیح ثابت نہیں کر سکتی کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے خیالات اور آرائے اور خواہشوں اور امیدوں کو ظاہر کرتی ہے[1]۔"

گویا سرسید احمد خاں نے نہ صرف مسلمانوں کو کانگرس سے الگ رہنے کی تلقین کی بلکہ بعض کانگرسی رہنماؤں کے اس غلط دعوے کی بھی تردید کر دی کہ یہ ایک غیر مذہبی جماعت ہے۔ اس میں ہندو ہی نہیں مسلمان بھی شامل ہیں۔ انہوں نے صاف لکھ دیا کہ کانگرس مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کرتی۔ شاید ان کی روشن ضمیری نے ان کے پردۂ ذہن پر مستقبل کے واقعات منعکس کر دیئے تھے جب کانگرس یہ دعویٰ کرنے والی تھی کہ یہ ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت ہے اور اسے ہندوؤں کی طرح مسلمانوں کی نیابت کا بھی حق حاصل ہے۔

سرسید کے دور میں ان کے علاوہ تمام بڑے بڑے اور ذی اثر مسلمان بھی کانگرس کے خطرناک عزائم سے آگاہ ہو گئے تھے اور ان سب نے سرسید کی پیروی میں مسلمانوں کو کانگرس سے الگ رہنے کی تلقین کی تھی۔ ذیل میں اس عہد کے بعض مسلمان اکابر کی آرا جو انہوں نے اس فرقہ وارانہ جماعت کے بارے میں ظاہر کیں، درج کی جاتی ہیں۔

نواب محسن الملک اور کانگرس

سرسید کے معاصرین میں نواب محسن الملک بڑے پایے کے مسلمان رہنما گزرے ہیں جن کی ملی خدمات اور

---

[1] نیشنل کانگرس کی نسبت مسلمانوں کی رائے ص۵ (۱۸۹۳ء) مطبع اسلامیہ لاہور

اسلامی دردمندی کسی تعارف و تبصرہ کی محتاج نہیں۔ اس زمانے کے ایک اخبار "دکن بجٹ" نے ان کی نسبت یہ خبر شائع کی کہ وہ کانگرس میں شامل ہوگئے ہیں۔ یہ خبر پڑھ کر آنریبل حاجی محمد اسماعیل خاں صاحب ممبر لیجس لیٹو کونسل ممالک مغربی و شمالی و اودھ اور رئیس علی گڑھ نے اس کی تردید میں ایک نوٹ شائع کیا ذیل میں یہ تاریخی نوٹ درج کیا جاتا ہے :-

"دکن بجٹ اخبار نے اپنے اخبار مطبوعہ ۱۵ ر ستمبر میں یہ فقرہ چھاپا ہے کہ ہم نے حیدرآباد میں اسی مشتبہ ذریعہ سے سنا ہے کہ ہمارے سابق پولٹیکل اور فنانشل سیکرٹری نواب مہدی علی بھی کانگرس والا ہوگئے۔ گذشتہ زمانے میں کبھی کبھی وہ اس تحریک سے کھلے تھے۔ لیکن خیال کیا جاتا تھا کہ ان کی رائے اس مسئلے پر درست تھی کہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت ہندوؤں کے زیر حکومت نہیں ہو سکتی۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کیونکر کوئی دور اندیش ہند و گذشتہ زمانے کی تاریخ پر نظر ڈالنے کے بعد کبھی یہ امید کر سکتا ہے کہ مسلمان دیدہ و دانستہ نیشنل کانگرس کے اصول کو قبول کرلیں گے مسلمان انگریزوں کی حکومت کو قبول کرلیں کیونکہ انہوں نے فتح کیا ہے لیکن کیا بات ہے جو کہ ہندوؤں کی حکومت کو قبول کرلیں گے جبکہ ہندو سات سو برس تک مسلمانوں کے غلام رہے۔ کیا نیشنل کانگرس اس سوال کا صاف جواب دے سکتی ہے؟ کیا یہ کہنا ضروری ہے کہ یہ امر انگلش سنگینوں سے حاصل ہو سکتا ہے اور وہ یہ نہیں کریں گے۔"

"مگر ہم دکن بجٹ کو غیر مشتبہ ذریعے سے اطلاع دیتے ہیں کہ جو امر اس نے مشتبہ ذریعے سے سنا ہے کہ نواب مہدی علی بھی کانگرس والا ہوگئے ہیں محض غلط اور جھوٹ ہے۔ وہ علی گڑھ میں تشریف رکھتے ہیں اور جس طرح ہمیشہ سے ان کی رائے نیشنل کانگرس کے مخالف تھی اب بھی ان کی وہی رائے ہے۔ کوئی ذی عقل اشراف مسلمان نیشنل کانگرس کو پسند نہیں کر سکتا نہ اس میں شریک ہو سکتا ہے۔"[۱]

شمس العلما مولانا نذیر احمد اور کانگرس

عہد سرسید کے دوسرے قابل ذکر بزرگ شمس العلما مولانا ڈپٹی نذیر احمد تھے جو اپنے علم و فضل، اپنی ذاتی قابلیت، اپنی وسیع النظری اور اپنی ملی خدمات کے لحاظ سے بجا طور پر اردو ادب اور مسلمانانِ ہند کے

---

[۱] نیشنل کانگرس کی نسبت مسلمانوں کی رائے ص ۱۰۰ (۱۸۹۳ء)

محسن کہلانے کے مستحق ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے بھی کانگریس کی سرگرمیوں اور اس کے خطرناک عزائم کے پیش نظر مسلمانوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ کانگریس میں شامل نہ ہوں۔ انہوں نے تو صاف الفاظ میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ کانگریس سے تعاون کرنا قومی غیرت و حمیت کے خلاف ہے۔ ۱۵ اکتوبر ۱۸۸۸ء کو ٹاؤن ہال دہلی کے ایک عظیم الشان جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے جو لیکچر دیا تھا اس کے بعض اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :-

"چند اصحاب نے اصرار کیا (ہے) کہ نیشنل کانگریس کی نسبت میں اپنے خیالات علیٰ رؤس الاشہاد ظاہر کروں۔ انہوں نے یہ توقع بھی ظاہر کی کہ تمہارے خیالات معلوم ہونے سے مسلمانوں کو فائدہ ہوگا۔ مسلمانوں کے فائدہ کا نام سن کر میں نے نقضِ عادت کیا اور بے تامل آپ لوگوں میں آکھڑا ہوا۔۔۔۔ کانگریس کی شرکت ہم مسلمانوں کے حق میں مہلک ہے (چیرز) خرابی اور بڑی خرابی ہم مسلمانوں کی ہے کہ ہم مذہب رکھتے ہیں محکم، مضبوط، استوار، اصلہا ثابت و فرعہا فی السماءِ (چیرز) کہ انقلابِ دنیا کی آندھیاں اس کو جنبش بھی تو نہیں دے سکتیں۔ ہمارے پاس لٹریچر ہے جس نے ایک وقت تمام روئے زمین کو بلا مارا تھا (چیرز) وہ ہمارے دلوں کی تسلی ہے، ہماری جان کی توانائی، ہماری آنکھوں کا نور، ہماری روحوں کا سرور۔ ہمارے پاس علوم ہیں اگرچہ ان میں سے اکثر انگریزوں نے اپنی زبان میں ترجمہ کر لئے ہیں مگر آخر ہیں تو ہمارے۔ غرض ہماری عظمت کے نشان ماند پڑ گئے ہیں مگر مٹے نہیں (چیرز) میرا اقتضائے طبیعت یہ ہے اور یہ اقتضائے طبیعت (دلی یقین) مبنی ہے ساری عمر کے تجربہ پر کہ کارفرمائی جیسی ایک مسلمان کر سکتا ہے ہندوؤں سے نہیں ہو سکتی!! ہرگز نہیں ہو سکتی (چیرز) کارفرمائی کی شرطِ اعظم ہے خودداری، ذاتی تعزز، فورس آف کیرکٹر (نیک چال چلن) ہمت جرأت اور یہ حرارت مسلمانوں کے خون سے ابھی تک تو نکلی نہیں الغرض ہمارا کیس ایک اسپیشل کیس ہے۔ اس کی روئداد کسی طرح ہندوؤں کی روئداد سے نہیں ملتی۔ ہندو جب زور دیں گے گورنمنٹ اور انگریزی داتی پر! یہی جگہ ہماری یہاں پانی مرتے کی ہے (چیرز) پس ہم کو ہندوؤں کی رفاقت ضرور نقصان پہنچائے گی۔ نیشنل کانگریس کا انجام کچھ ہی کیوں نہ ہو ہماری حمیت تو گوارا نہیں کرتی کہ ہندوؤں کے طفیلی بن کر کوئی دنیوی مفاد حاصل کریں گو وہ مفاد کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔"[1]

---

[1] انڈین نیشنل کانگریس پر مولانا حافظ نذیر احمد خاں صاحب بہادر کا لیکچر صفحہ ۱ تا ۱۲ مطبوعہ نامی پریس کانپور

نواب وقار الملک اور کانگرس

عہدِ سرسید کی تیسری قابلِ ذکر شخصیت نواب وقار الملک کی ہے۔ نواب صاحب حیدر آباد دکن کے ریوینیو سیکرٹری، آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری، سرسید کے جانشین، علی گڑھ مسلم کالج کے منتظمِ اعلیٰ، اپنے عہد کے بہت بڑے مدبر، نہایت ذی علم پرہیزگار اور مسلمانانِ پاک و ہند کے عظیم رہنما تھے۔ انہوں نے ہندوستان اور خصوصاً مسلمانوں کی سیاست میں جو سرگرم حصہ لیا اس کی تفصیلیں آئندہ صفحات میں بیان کی جائے گی۔ نواب وقار الملک نے بھی اپنی تقریروں اور تحریروں میں کانگرس کے اغراض و مقاصد اور اس میں مسلمانوں کی شرکت کے نتائج پر اظہارِ خیال کیا اور مسلمانوں کو یہی مشورہ دیا کہ وہ اس جماعت میں شامل نہ ہوں۔ ان کے عہد میں کانگرس نے مسلمانوں کو اپنی طرف مائل کرنے کی تحریک کو تیز کر دیا تھا اور انہیں بعض عہدے بھی دینے شروع کر دیئے تھے تاکہ اس جماعت کی نمائندہ حیثیت مسلم ہو جائے اور مسلمانوں میں اس کے خلاف جو نفرت پائی جاتی ہے وہ دور ہو جائے۔ نواب وقار الملک نے کانگرس کی اس چال کو بھانپ لیا اور اپنے ایک مضمون میں اس طرف بھی اشارہ کیا۔ ذیل میں نواب صاحب کی اس تاریخی تقریر اور قیمتی مضمون کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

"جناب سرسید مرحوم و مغفور نے جن کی عاقبت اندیشی اور عاقلانہ پالیسی کے مسلمان ہمیشہ مشکور و ممنون ہیں نیشنل کانگرس کے بڑھتے ہوئے اثر سے متاثر ہو کر نہایت زور کے ساتھ اس بات کی کوشش کی کہ مسلمانوں کی بہتری اور ان کی حفاظت اسی میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو کانگرس میں شریک ہونے سے باز رکھیں اور یہ رائے اس قدر صائب تھی کہ گو جناب مرحوم آج ہم میں نہیں ہیں لیکن مسلمانوں کی عام رائے اس وقت تک وہی ہے۔[1]"

"نیشنل کانگرس بعض مسلمانوں کو اپنی پریسیڈنٹی کے عہدہ تک سے سرفراز فرماتی ہے۔ لیکن پھر کیا وہ مسلمان برگزار مسلمانوں کے کسی کام کے ہوتے ہیں۔ ہمارے وہ ایک دفتری کام کے بھی نہیں ہوتے۔ اس طرح اگر اپنی قوم کی اور حقوق کی قربانی کر کے کسی نے کوئی ممبری حاصل بھی کی تو ایسی ممبری انہیں کو مبارک رہے۔ قوم کو ان سے کوئی سروکار نہ ہو گا بلکہ ایسے ممبر قوم کے حق میں بعض اوقات سخت مضرت کا موجب ہوں گے کیونکہ جب وہ ظاہر میں مسلمانوں کے ناموں کے ساتھ کونسل میں نشست کریں اور ووٹ وہ دیں جو مسلمانوں کے قومی

---

[1] وقار حیات ص ۶۷۳ مولفہ محمد اکرام اللہ خاں ندوی شاہجہانپوری

حقوق کو پامال کرنے والا ہو تو ایسے ووٹوں سے مسلمانوں کو بہ نسبت خالص ہندو صاحبوں کے بہت زیادہ نقصان پہنچ جاوے گا[1]"

یہ اس دور کے چند مسلمان اکابر کی آراء ہیں جو یہ طور نمونہ درج کی گئی ہیں ورنہ کانگرس کے عزائم کے پیش نظر اس عہد کے اکثر و بیشتر قابل ذکر مسلمان نہ صرف کانگرس سے علیحدہ رہے بلکہ اپنے زیر اثر مسلمانوں کو بھی اس فرقہ وارانہ جماعت میں شامل ہونے سے روکتے رہے۔ اس میں شک نہیں کہ گنتی کے چند مسلمان ایسے بھی تھے جنھوں نے سرسید اور ان کے ہم خیال اصحاب کی آراء سے اتفاق نہیں کیا اور کانگرس کے پلیٹ فارم ہی کو اپنی سیاسی جد و جہد کا مرکز بنایا۔ مگر ان میں سے جن لوگوں کی زندگی نے وفا کی انھیں تلخ تجربات ہوئے۔ اور آخر کار ایک دن انہیں اس فرقہ پرست جماعت سے الگ ہونا پڑا۔ سرسید اور ان کے رفقا کی یہ کوششیں کہاں تک کامیاب ہوئیں؟ اس کا اندازہ زمانۂ مابعد کے ایک مشہور کانگرسی رہنما لالہ لاجپت رائے کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے:۔

"وہ دن کسی کو بھولے نہیں جب کانگرس میں کرائے کے مسلمان لائے جایا کرتے تھے محض یہ ثابت کرنے کے لئے کہ مسلمان بھی کانگرس میں شریک ہیں اور کانگرس صحیح معنوں میں نیشنل باڈی ہے[2]"

سوال یہ ہے کہ کیوں ایسے ذی شعور مسلمان اتنی تعداد میں کانگرس میں شامل نہیں ہوتے تھے جن کی کمی پوری کرنے کے لئے کرائے کے مسلمانوں کو کانگرس کے جلسوں میں لانا پڑتا تھا؟ اس کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ اس زمانے میں کانگرس نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے جن کی وجہ سے مسلمان ان تحریکوں سے بدظن ہوگئے تھے جن کی زمام کار ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ ان کی معاشی حالت اس قدر خراب ہو گئی تھی کہ وہ فاقہ کشی پر مجبور تھے، تعلیمی لحاظ سے وہ اکثریت کے صوبوں میں بھی نہایت پس ماندہ تھے۔ ہندو زمیندار ان پر طرح طرح کے مظالم کر رہے تھے ادھر کانگرس جسے انگریزوں نے اپنے مخصوص مفادات کے لئے قائم کیا تھا اب اعتدال پسند ہندوؤں کے تسلط سے آزاد ہو کر انتہا پسند ہندوؤں کے قبضے میں چلی گئی تھی اس لئے مسلمان ایسی کسی تنظیم میں شامل ہونا سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے اپنے حق میں مضر سمجھتے تھے جو حکومت سے ٹکر لے رہی ہو کیونکہ ابھی ان کی حالت اس قابل نہ ہوئی تھی کہ وہ بیک وقت ہندو اور

---

[1] وقار حیات ص ۶۸۴، ۶۸۵

[2] روزنامہ "تیج" دہلی ۲۴ نومبر ۱۹۲۶ء

انگریز دونوں کا مقابلہ کر سکیں۔ ذیل کی تصریحات سے اندازہ ہوگا کہ اس وقت مسلمان کن مصائب سے گزر رہے تھے۔

مسلمانوں کی معاشی حالت

صوبۂ اڑیسہ جو کبھی بنگال کا حصہ تھا اور جہاں مسلمانوں کا طوطی بولتا تھا۔ جہاں تجارت، صنعت اور امارت غرض ہر شعبے میں مسلمان چھائے ہوئے تھے قیام کانگرس کے قریبی زمانے میں اقتصادی لحاظ سے مسلمانوں کے لئے جہنم بنا ہوا تھا۔ اس عہد کے مسلمانوں نے اڑیسہ کے کمشنر کے نام ایک درخواست بھیجی تھی جسے سر ولیم ہنٹر نے اپنی مشہور کتاب میں درج کیا ہے۔ اس درخواست کے مطالعے سے اس عہد کے ہندی مسلمانوں کی حالتِ زار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس دردناک درخواست کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے:-

"مسلمانانِ اڑیسہ کو اتنا پیسا گیا ہے کہ اُن کے دوبارہ جی اٹھنے کا کوئی امکان نہیں رہا۔ ہم لوگ نسلاً شریف مگر پیشے کو دیکھتے ہوئے نادار ہیں۔ حکومت نے ہمیں اپنی سرپرستی سے محروم کر دیا ہے۔ ہم ان مچھلیوں کی طرح ہیں جنہیں پانی سے نکال کر خشکی پہ ڈال دیا گیا ہو۔ ہم مسلمانوں کی حالتِ زار حضور والا کے گوش گذار اس لئے کی جا رہی ہے کہ آپ ملکہ معظمہ کے نائب ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہندوستان کی تمام اقوام وملل کے ساتھ رنگ و نسل کا امتیاز کئے بغیر یکساں سلوک کیا جائے گا۔ ہمیں سرکاری ملازمتوں سے نکال دیا گیا ہے اور اب ہم نادار اور مایوس ہو کر اس حالت کو پہنچ گئے ہیں کہ اگر ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں اور سائبیریا کے ہولناک جنگلوں میں جلنے کو کہا جائے اور بیس روپے ماہوار بھی دے دیئے جائیں تو ہم یہ زحمت اٹھانے سے بھی انکار نہیں کریں گے بلکہ اس میں بھی خوشی محسوس کریں گے[۱]"

بنگال کے مسلمانوں کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا گیا جو اڑیسہ کے مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا گیا۔ بنگالی مسلمانوں کا زور توڑنے اور انہیں ذلیل وخوار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی اور نہایت منظم طریقے سے ہندوؤں کو آگے لایا گیا۔ چنانچہ

"سندربن کے کمشنر نے ایک سرکلر جاری کیا کہ سرکاری میں جو عہدے خالی ہوتے ہیں، اُن پر ہندوؤں کو مقرر کیا جائے۔ ان کے سوائے اور کسی کا تقرر عمل میں نہ لایا جائے۔" مسٹر ہنٹر

---

[۱] دی انڈین مسلمانز ص ۱۷۵ مولفہ ڈاکٹر ولیم ہنٹر

لکھتے ہیں کہ "مسلمانوں کی حالت اب اتنی خراب ہو گئی ہے کہ اگر ان میں وہ اہلیت موجود بھی ہو جو کسی سرکاری عہدے کے لئے ضروری ہے تو ایسی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں کہ یہ عہدے ان کے لئے شجرِ ممنوعہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی بے بسی قابلِ رحم ہے اور اعلیٰ سرکاری افسروں کی یہ حالت ہے کہ وہ مسلمانوں کے وجود تک کو تسلیم کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں[1]"۔

تعلیمی حالت

یہ دو صوبوں کے مسلمانوں کی اقتصادی حالت اور ملازمتوں سے بے دخل کئے جانے کا وہ نقشہ ہے جو کسی مسلمان نے نہیں بلکہ ایک غیر مسلم نے کھینچا ہے غیر مسلم بھی اس قوم کا فرد جو مسلمانوں کو غلام بنانے کے ساتھ ساتھ انہیں اقتصادی، تہذیبی اور تعلیمی اعتبار سے بھی پس ماندہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس دور کے مسلمانوں کی حالت کس قدر بے کسی دبے بسی کی ہو گی جسے دیکھ کر ایک انگریز بھی چیخ اٹھا۔ اقتصادی پہلو کے بعد مسلمانوں کا تعلیمی پہلو بھی نہایت کمزور تھا۔ سرکاری رپورٹوں اور ذاتی معلومات کے بعد سرسید کے قابل فرزند سید محمود نے اس دور کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا ایک جائزہ مرتب کیا تھا۔ اس کے مطابق اگرچہ سابق صوبہ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت تھی یعنی ۵۳ فیصد مگر ۱۸۰۳ء کی رپورٹ کے مطابق مسلمان طالب علم کل طلبا کا ۳۵ فیصد تھے[2] ایسا کیوں تھا۔ اس کا جواب حکومت مدراس کی ایک رپورٹ سے مل جاتا ہے۔ یہ رپورٹ ۱۸۷۳ء کی ہے اس میں اعتراف کیا گیا ہے کہ :۔

> "موجودہ تعلیم کا طریقہ اس طرح وضع کیا گیا ہے جو ہندوؤں کی ضروریات کو پورا کرتا ہے اور اس سے مسلمانوں کو اس قدر نقصان پہنچا ہے کہ درس گاہوں میں مسلمان طلبہ کی کمی حیرت کی بات نہیں، بلکہ اگر کوئی حیرت کی بات ہے تو وہ یہ کہ مدرسوں میں ان کا وجود برقرار کیسے ہے[3]؟"

برعکس اس کے ہندو حضرات انگریزوں کی دی ہوئی تعلیمی مراعات سے پورا فائدہ اٹھا رہے تھے بلکہ ان کے مخیر اور متمول اکابر اپنی قوم کی تعلیمی ترقی کے لئے ذاتی خرچ سے بھی تعلیمی ادارے قائم

---

[1] دی انڈین مسلمانز صفحہ ۱۵۵
[2] تاریخ التعلیم صفحہ ۱۵ مولفہ سید محمود
[3] تاریخ التعلیم صفحہ ۱۵۵

کر رہے تھے۔ بنارس کا ہندو کالج جو بعد میں ہندو یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا ۱۸۱۶ء میں قائم ہو چکا تھا اس کے بعد ۱۸۲۱ء میں بمقام پونا ہندو کالج قائم ہوا۔ ۱۸۳۰ء میں کلکتہ میں ہندو کالج کا قیام عمل میں آیا اور رفتہ رفتہ ہندو اسکولوں اور ہندو کالجوں کا سارے ملک میں جال بچھ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو روز بروز تعلیمی لحاظ سے ترقی کرتے گئے اور مسلمان روز بروز جہالت کے عمیق گڑھے میں گرتے چلے گئے اس کا ایک سبب وہی تھا جو ہندو اور انگریز کی سازش سے اس نظام تعلیم کی صورت میں رونما ہوا جو ہندوؤں کی تعلیمی ضروریات کو کمال خوش اسلوبی سے پورا کرتا تھا، مسلمانوں کے لئے سخت نقصان کا موجب تھا اور جس کا اعتراف حکومت مدراس کی رپورٹ میں کیا گیا ہے۔

ہندو زمینداروں کی مسلم آزاری

مسلمانوں کو اقتصادی اور تعلیمی طور پر پس ماندہ رکھنے کے لئے ہندوؤں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر جو سازش کی اس کا اجمالی خاکہ سطور بالا میں پیش کیا گیا ہے ورنہ اس کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ مگر افسوس کہ اسی ظلم پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ مسلمانوں کو ذلیل کرنے کے لئے ہندوؤں نے نہایت شرمناک حربے استعمال کئے چنانچہ ایک انگریز افسر مسٹر جیمس اوکینلی کا بیان ہے کہ ۱۸۳۸ء میں پورنا کے ایک ہندو زمیندار کشن رائے نے اپنے مسلمان کاشتکاروں پر ڈھائی روپے فی کس ایک محصول عائد کیا جسے وہ داڑھی ٹیکس کہتا تھا۔ چونکہ اپنے گاؤں میں اسے طاقت حاصل تھی اس لئے وہاں کے مسلمانوں سے تو وہ بلا مزاحمت یہ ٹیکس وصول کرتا رہا مگر جب اس کے گماشتے سرفراز پور نامی گاؤں میں داڑھی ٹیکس وصول کرنے گئے تو وہاں ان دنوں (حضرت) سید احمدؒ (شہید) کے ایک معتقد نثار علی عرف ٹیٹو میر اپنی جماعت کے ہمراہ موجود تھے۔ انہوں نے کشن رائے کے ان گماشتوں کو قید کر لیا۔ جب کشن رائے کو اس واقعے کی خبر ہوئی تو اس نے ہندوؤں کی ایک جمعیت جو تین سو افراد پر مشتمل تھی مقابلے کے لئے بھیجی۔ ٹیٹو میر سے ان لوگوں کی جنگ ہوئی جس میں مسلمانوں کا جانی نقصان کے علاوہ املاک کا بھی نقصان ہوا۔ ان کے مکان نذر آتش کر دیئے گئے اور ایک مسجد بھی جلا دی گئی[1]۔"

ایک طرف تو ہندو مسلمانوں کو ذلیل و خوار کرتے، ان کے عقائد کے ساتھ مذاق کرتے اور انہیں نیست و نابود کرنے کے لئے اپنے سارے ذرائع استعمال کر رہے تھے اور دوسری طرف ان پس ماندہ اور کمزور مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کو مشتعل کر رہے تھے تاکہ اگر ان میں کچھ جان باقی رہ گئی ہے

---

[1] کلکتہ ریویو جولائی ۱۸۷۰ء

تو وہ بھی ختم ہو جائے اور جو مسلمان اکابر ان کو پس ماندگی کے گڑھے نکال کر ایک آبرومند قوم بنانے میں کوشاں ہیں انہیں کامیابی حاصل نہ ہو۔ چنانچہ ایک انگریز افسر یعنی مسٹر جیمس اوکینلی رقمطراز ہیں کہ :

"ان حالات میں کہ مسلمان اخبارات اور بعض انگریز حکومت سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کو اس پستی سے نکال کر اس قابل بنایا جائے کہ وہ بھی امور مملکت میں حصہ لے سکیں تو ہندو اس اعلان کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں کہ مسلمانوں میں ایک خاص گروہ (اشارہ ہے ان لوگوں کی طرف جنہیں وہابی کے نام سے پکارا جاتا تھا) ایسے لوگوں کا موجود ہے جو حکومت کے وفادار نہیں اور ملک کے تمام مسلمانوں سے انہیں پوری ہمدردی ہے "ہندو پیٹریٹ" میں ۱۷ اگست ۱۸۷۱ء کو ایک مقالہ شائع کیا گیا (یہ مضمون ایک بنگالی ہندو اہل قلم کا ہے) جس کا لب لباب یہ ہے کہ اس روشن عہد حکومت میں جبکہ رعایا کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا جا رہا ہے مگر اس کے باوجود اس عہد کو ہم عاقلانہ نہیں کہہ سکتے (کیونکہ) وہابیوں کا ایک ایسا گروہ موجود ہے جس کا اثر ہندوستان کی تمام ریاستوں تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کی تنظیمی کیفیت وہی ہے جو عیسائیوں کے اس فرقے کی ہے جسے یعقوبی فرقہ کہا جاتا ہے۔ وہابی لوگ بہ ظاہر تو سرکاری عدالتوں میں محرر کے طور پر اپنے فرائض انجام دیتے ہیں، تجارتی کاروبار میں منہمک رہتے ہیں اور ملک کی معاشرتی زندگی میں گھل مل جاتے ہیں لیکن اپنے حقیقی مذہبی طور طریقوں کو فراموش نہیں کرتے۔ یہ لوگ نہایت خاموشی سے اپنے مقاصد کے حصول میں سرگرم کار رہتے ہیں ان میں اتحاد عمل کا جذبہ موجود ہے۔ ان کی کوشش یہ ہے کہ مسلمان اپنی زندگی میں وہ سادگی اختیار کریں جو آغاز اسلام میں پائی جاتی تھی۔ اس طرح یہ سیاسی برتری حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں سے سخت خطرہ ہے کہ زمانہ حال کی تہذیب کو اپنی درندگی سے تباہ نہ کر دیں[1]"

اس اقتباس کے مطالعہ کے بعد اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ہندو قوم مسلمانوں کو چکی کے دو پاٹوں میں ڈال کر پیس دینا چاہتی تھی۔ ایک طرف تو یہ لوگ انہیں خود ہر قسم کے ظلم وستم کا نشانہ بنا رہے تھے اور دوسری طرف انگریزوں کو ان کے خلاف بھڑکا رہے تھے

---

[1] کلکتہ ریویو ۱۸۷۱ء (جولائی)

تاکہ وہ مسلمانوں سے اور بدظن ہو کر ان پر زیادہ سے زیادہ تشدد کریں۔ اس طرح ہندوؤں کے لیے راستہ صاف ہو جائے اور کسی وقت مسلمان ان کے مدِ مقابل نہ بن سکیں۔ کیا ان حالات میں مسلمانوں کا ہندوؤں کی نیشنل کانگرس میں شامل ہونا اپنے قتل کے محضر نامے پر دستخط کرنے کے مترادف نہ تھا؟

کانگرس کے قیام کے بعد مسلم آزاری

کہا جا سکتا ہے کہ جو واقعات سطورِ بالا میں پیش کئے گئے ہیں ان کا تعلق اس عہد سے ہے جب انڈین نیشنل کانگرس کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا اور کانگرس قائم ہی اس لئے کی گئی تھی تاکہ ہندو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت کی بات تو یہی ہے کہ کانگرس کے قیام سے حالات میں کسی قسم کی بہتری پیدا نہیں ہوئی بلکہ ملک کی سیاسی فضا اور زیادہ خراب ہو گئی۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو کانگرس کو مسلمانوں کے لئے خواب آور دوا کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے تاکہ اس جماعت میں شامل ہو کر وہ سب کچھ بھول جائیں۔ ہندو ان پر مظالم کرتے رہیں اور وہ اس ڈر سے اس کے خلاف کوئی آواز بلند نہ کر سکیں کہ ان کو فرقہ واریت کا مجرم نہ ٹھہرایا جائے۔

کانگرس ۱۸۸۵ء میں قائم ہوئی اور اس واقعے کے آٹھ سال بعد یعنی ۱۸۹۳ء میں ہندوؤں نے ملک میں مسلم کشی کا بھیانک ڈرامہ شروع کر دیا۔ بمبئی اور اعظم گڑھ میں ہندو مسلم فسادات نے نہایت خونریز صورت اختیار کر لی۔ ستمبر ۱۸۹۳ء میں کانگرس کے مشہور رہنما مسٹر بال گنگا دھر تلک نے پونا میں گنپتی کا دس دن کا ایک میلہ جاری کیا جس کے جلوسوں میں انگریزوں اور مسلمانوں کے خلاف (اشتعال انگیز) گیت گائے جاتے تھے۔ اس میلے میں ہندوؤں نے ایک مسجد میں مسلمانوں پر حملہ بھی کیا[۱]۔ اس کے علاوہ اسی کانگرسی رہنما مسٹر تلک نے "انجمن انسدادِ ذبیحہ گاؤ" قائم کی اور گئو کشی کے خلاف سارے ملک میں وہ تحریک چلائی جس کے نتیجے میں ہزاروں ہزار مسلمان ذبح کر دیئے گئے۔

ہندو مہاسبھا

اس کے چند سال بعد یعنی ۱۹۰۷ء میں مہاراجہ دربھنگہ نے "آل انڈیا ہندو مہاسبھا" کے نام سے ہندوؤں کی ایک خالص مذہبی تنظیم قائم کی۔ اس کا دہلی میں بہت بڑا اجتماع ہوا۔ اس موقع پر ایک جلوس بھی نکالا گیا۔ مہاراجہ دربھنگہ نے اس کی قیادت کی۔ اس جلوس میں ایک لاکھ ہندو شریک ہوئے۔ قائد جلوس کے ہاتھوں میں ہندوؤں کی مقدس کتاب "وید" تھی جسے لے کر انہوں نے پا پیادہ سڑکوں پر گشت کیا

---

[۱] مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۲۷

ابتدا میں اس تحریک کا نام مہا منڈل تھا۔ یہ ہندوؤں کی مذہب کے نام پر پہلی کھلم کھلا منظم تحریک تھی جس کا مقصد ہندوؤں کی طاقت کا علی الاعلان مظاہرہ کرنا تھا۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ہندو مہا سبھا کانگرس سے الگ اور اس کی مخالف جماعت تھی۔ یقیناً یہ کانگرس سے ایک الگ اور مستقل جماعت تھی۔ مگر اسے کانگرس کا مخالف کہنا تاریخ سے ناواقفیت اور پرلے درجے کی نادانی ہے۔ زیادہ سے زیادہ محتاط الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو کام کانگرس اپنے نام سے اور کھلم کھلا نہیں کرسکتی تھی وہ ہندو مہا سبھا سر انجام دیتی تھی، اس لحاظ سے یہ جماعت کانگرس کا ضمنی اور اس کا چربہ تھی، اس کے قائدین میں اکثر و بیشتر کانگرسی رہنما شامل تھے اور اس کا مقصد ملک میں خالص ہندو راج قائم کرنا تھا۔ سری سی چٹرجی، لالہ لال چند، لالہ لاجپت رائے، پنڈت مدن موہن مالویہ، پنڈت موتی لال نہرو غرض تمام قابلِ ذکر کانگرسی رہنما اس کے معاون و مددگار تھے حتیٰ کہ مسٹر گاندھی جیسا شخص جو بہ ظاہر قائم عمر غیر فرقہ واریت کا درس دیتا رہا ہر دوار میں اس کی شاخ "بھارت ورشیہ ہندو مہا سبھا" کے اجلاس میں شریک ہوا۔ مشہور کانگرسی پنڈت مدن موہن مالویہ نے اس اجلاس کی صدارت کی[1]

یہ مالوی جی ایک زمانے میں بہ ظاہر کانگرس کے مخالف تھے مگر اس کے بعد کانگرس کے کھلم کھلا ہم نوا بن گئے اور ایک موقع پر اپنے نظریات کا یوں اعلان فرمایا کہ "ہمیں کانگرس میں ضرور شامل ہونا چاہیئے مگر رائے اپنی جماعت (ہندو جماعت) کی بہتری کو ملحوظ رکھ کر دینی چاہیئے"[2]

یہ مالوی صاحب جو مہا سبھا اور کانگرس دونوں سے وابستہ تھے۔ مسلمانوں کے متعلق کیا رائے رکھتے تھے؟ ذیل کے اقتباس سے جو انہی کی تقریر کا ایک حصہ ہے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

"میں یورپین اور مسلمانوں پر چماروں کو ترجیح دیتا ہوں۔ اگر مجھے کسی ایسے ملک میں جانے کا اتفاق ہو جہاں اچھوتوں اور مسلمانوں اور یورپینوں کے بغیر اور کوئی نہ ہو تو میں یورپینوں اور مسلمانوں کے ہاتھ کا پانی پینے کی بجائے چماروں اور اچھوتوں کا پانی پینا پسند کروں گا، کیونکہ اچھوت میرے دھرم بھائی ہیں[3]۔"

---

[1] روزنامہ "ملاپ" ۵ر اگست ۱۹۲۵ء
[2] روزنامہ "ملاپ" ۲۶ر اپریل ۱۹۲۷ء
[3] روزنامہ "ملاپ" ۱۹ر مارچ ۱۹۲۶ء

مسلمانوں کو چماروں سے بدتر سمجھنے والے انہی مالوی جی اور ان کے ہم مسلک کانگریسی ہندوؤں نے ہندوستان کی سیاسی فضا کو اس قدر خراب کر دیا کہ کسی مسلمان کا کانگریس میں ایک باعزت اور باحمیت رکن کی حیثیت سے شریک رہنا ناممکن ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مالوی جی اور تلک جیسے فرقہ پرست کانگریسیوں کی روش اور ان کے خطرناک عزائم دیکھ کر مسلمان رہنماؤں نے اپنی الگ تنظیم قائم کرنے کے متعلق غور و خوض کرنا شروع کر دیا۔

مسلمانانِ ہند کی پہلی سیاسی انجمن

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی معاملات میں حصہ لینے یا اپنی الگ سیاسی تنظیم قائم کرنے سے سب سے پہلے سرسید نے روکا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو اپنی ساری توجہ معاشرتی اصلاح اور علوم جدیدہ کے حصول پر صرف کرنی چاہیئے۔ جب قوم کا خاصا بڑا حصہ تعلیم یافتہ اور نئے خیالات سے روشناس ہو جائے تو مسلمانوں کو سیاسی میدان میں اترنا چاہیئے۔ مگر حالات اس تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے کہ سرسید کو بھی اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی اور انہوں نے مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کی طرف توجہ دینی شروع کر دی۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ۳۰ر دسمبر ۱۸۹۳ء کو سرسید کے دولت کدے پہ ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں اس عہد کے بہت سے قابل ذکر مسلم اکابر نے شرکت کی جیسے نواب محسن الملک، خان بہادر ڈپٹی برکت علی خاں، سید محمود، خان بہادر مولوی فرید الدین، خان بہادر مولوی زین العابدین، خان بہادر مرزا عابد علی بیگ، خان بہادر شمس العلما مولوی ذکاء اللہ، خان بہادر شیخ الٰہی بخش اور حاجی محمد اسماعیل خاں۔ اس اجلاس میں علی گڑھ مسلم کالج کے پرنسپل مسٹر بیک بھی شامل ہوئے اور بحث و تمحیص میں بھی حصہ لیا۔ اس بحث و تمحیص کا خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ حالات میں مسلمان نوجوانوں کو سیاست میں حصہ لینے سے روکنا مناسب نہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمان نوجوان کانگریس میں شریک نہ ہونے پائیں۔ انہیں ہر قسم کی ایجی ٹیشن سے بھی گریز کرنا چاہیئے بلکہ ایک منظم اور محتاط طریقے سے ملک کے سیاسی معاملات میں حصہ لینا چاہیئے۔ اگر اس مرحلے میں تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کی سیاسی رہنمائی نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ وہ غلط رہنماؤں کے ہاتھوں میں نہ کھیلنے لگیں۔ آخر "سرسید کی تحریک اور نواب محسن الملک کی تائید سے یہ ریزولیشن پاس ہوا کہ ایک ایسوسی ایشن "محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا" کے نام سے قائم کی جائے"[1]

چونکہ سرسید کے پیش نظر ہر وقت علی گڑھ مسلم کالج کی ترقی اور مسلمانوں کی تعلیمی برتری کے مقاصد

---

[1] وقارِ حیات صفحہ ۶۶۰، ۶۶۱

رہتے تھے اور وہ عمر کے ایک ایسے مرحلے میں تھے جب انسان کے قویٰ جواب دے دیتے ہیں اس کے علاوہ مختلف قسم کی پریشانیوں میں بھی مبتلا تھے اس لئے یہ انجمن کوئی عملی کام نہ کر سکی۔ البتہ ... سرسید کے انتقال کے بعد جب یوپی میں ہندی اردو کا مسئلہ پیدا ہوا اور ہندوؤں کی کوشش سے جنہیں کانگرس کی حمایت حاصل تھی عدالتوں میں ہندی زبان رائج ہو گئی تو مسلمان اکابر نے محسوس کر لیا کہ اب سیاسی معاملات سے مسلمانوں کا قطع تعلق رکھنا ان کے حق میں نہایت مضر ثابت ہوگا۔ چنانچہ پہلے مئی ۱۹۰۰ء میں علی گڑھ میں ایک جلسہ ہوا جس میں مسلمانوں نے عدالتوں میں ہندی زبان رائج کئے جانے کے خلاف سرکاری حکم پر کھل کر تنقید کی۔ اس کے دو ڈھائی ماہ بعد یعنی ۱۸، ۱۹ اگست ۱۹۰۰ء کو قیصر باغ لکھنؤ میں نواب محسن الملک کی زیر صدارت ایک احتجاجی جلسہ منعقد ہوا۔ نواب وقار الملک نے اس جلسے میں نہایت جوشیلی اور حوصلہ افزا تقریر کی جس کا اختتام ان الفاظ پر کیا کہ "مجھ کو امید ہے کہ ہماری کوششوں سے ملک کو اس دن کے دیکھنے کا موقع نہ ملے گا جب کہ اردو کا جنازہ سرکاری دفتروں سے اٹھایا جاتا ہو۔"[1]

یہ پبلک جلسہ دراصل مسلمانانِ ہند کی سیاسی زندگی کا آغاز تھا اور اس کا سہرا بلاشبہ نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، محمد حامد علی خاں بیرسٹر ایٹ لا، سید محمد شرف الدین بیرسٹر ایٹ لا اور "البشیر" اٹاوہ کے مدیر مولوی محمد بشیر الدین کے سر ہے جنہوں نے اس اجتماع کی روئداد نہایت عمدگی سے اپنے اخبار میں شائع کی اور مسلمانوں کو سیاسی حقوق کے حصول کی غرض سے منظم ہونے کی تلقین کی۔ "البشیر" کے علاوہ اس عہد کے اور بہت سے مسلم اخبارات نے بھی انگریزوں کی ہندو نوازی اور نیشنل کانگرس کے اسلام دشمن رویے کے پیش نظر مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی سیاسی تنظیم کی طرف متوجہ ہوں۔

سیاسی انجمن کا قیام

آخر حالات کا رخ دیکھ کر اور نیشنل کانگرس کی سرگرمیوں کا گہری نظر سے جائزہ لینے کے بعد ۲۱، ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۱ء کو لکھنؤ میں مسلم اکابر کا ایک اجلاس حامد علی خاں بیرسٹر کے دولت کدے پر منعقد ہوا۔ نواب وقار الملک کی تحریک پر سید محمد شرف الدین بیرسٹر ایٹ لا نے پہلے دن کے اجلاس کی صدارت کی۔ دوسرے دن کا اجلاس نواب وقار الملک کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ ان جلسوں میں جو قرار دادیں منظور ہوئیں، ان کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خلاصہ درج کر دیا جائے۔ "اس جلسے کی رائے یہ ہے کہ مسلمانانِ ہندوستان کو ایک ایسی آرگنائزیشن (تنظیم) قائم کرنی چاہیئے جو اپنے سوشل اور پولیٹیکل

---

[1] وقار حیات صہ ۶۶۴

معاملات اور ضروریات میں منفقہ طور پر کارروائی کر سکے۔ اس جلسے کی رائے یہ ہے کہ مقاصدِ متذکرہ بالا کو محفوظ رکھ کر کمیٹی کو دوسری قوموں کی نسبت معاندانہ برتاؤ سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ اس جلسے کی رائے میں محمد حامد علی خاں بیرسٹر ایٹ لا اور منشی احتشام الحق اور نواب وقار الملک بہادر نمائندوں کا ایک جلسۂ عام کسی مناسب وقت پر منعقد کریں۔ ہر ضلع میں عام اشتہار کے ذریعے سے ایک جلسہ منعقد کیا جائے، جس میں عام طور پر مسلمان پبلک کو شریک ہونے کا موقع دیا جائے۔ اشتہار میں بتا دینا چاہیئے کہ مسلمانانِ ضلع کی سوشل اصلاح اور پولیٹیکل حقوق کی حفاظت کی غرض سے جلسے میں نمائندے منتخب کئے جائیں گے اور جلسے میں مجارٹی سے ممبروں کا انتخاب کیا جائے جن کی تعداد کم از کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ بارہ ہو گی ان ممبروں سے ضلع کمیٹی بنائی جائے گی۔ شرائطِ انتخاب یہ ہوں گی کہ منتخب شدہ ممبر تعلیم یافتہ مسلمان ہو اور کم از کم پانچ سو روپے سالانہ کی آمدنی رکھتا ہو اور یہ کہ وہ سرکاری ملازم نہ ہو۔ ہر ایک صوبے میں ایک لوکل کمیٹی قائم کی جائے گی جس کے واسطے ہر ایک کمیٹی ضلع اپنے میں سے کم از کم ایک اور زیادہ سے زیادہ پانچ ممبر نامزد کرے گی۔ جب تک اور صوبوں کی طرف سے سنٹرل کمیٹی کے لئے ممبر نامزد نہ ہوں اور روپیہ کی مدد حاصل نہ ہو اس وقت تک صوبہ جات متحدہ (یوپی) کی لوکل کمیٹی جہاں تک کہ اس سے ہو سکے گا سنٹرل کمیٹی کے بھی فرائض انجام دے گی اور اس کا ہیڈ کوارٹر لکھنؤ میں رہے گا۔ ہر ایک صوبہ کمیٹی کو بحسب ضرورت چندہ وغیرہ کے ذریعے سے فنڈ فراہم کرنا ہوگا جس میں سے بقدرِ گنجائش ایک مناسب حصہ سنٹرل کمیٹی کو بھی دیا جایا کرے گا۔ اس کے بعد پریذیڈنٹ صاحب نے کہا کہ سب سے اہم کام یہ باقی ہے کہ کارروائی کے لئے کچھ چندہ اسی وقت ہونا چاہیئے چنانچہ چندہ کی فہرست کھولی گئی اور اس وقت صمامے کا چندہ لکھا گیا اور صدر انجمن کے شکریہ کے بعد اجلاس برخاست ہوا[1]۔"

ان قرار دادوں کے مطالعے سے مندرجہ ذیل امور کی وضاحت ہوتی ہے۔

(۱) سنہ ۱۹۰۰ء کے قریب مسلمانوں نے بخوبی محسوس کر لیا تھا کہ غیر مسلموں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے ان کے سماجی اور سیاسی حقوق کی حفاظت ناممکن ہے اس لئے انہیں اپنی علیحدہ اور مستقل تنظیم قائم کرنی چاہیئے۔

(۲) یہ تنظیم فرقہ وارانہ بنیاد پر قائم نہ ہو یعنی ملک کی دوسری قوموں کے ساتھ مخالفانہ طرزِ عمل اختیار نہ کیا جائے

(۳) اسے عوامی تحریک بنایا جائے اور ہر ضلع میں جلسے کر کے اس کے اغراض و مقاصد سے مسلمان عوام کو باخبر کیا جائے۔

---

[1] وقارِ حیات ص ۶۶۹ تا ۶۶۵

(۴) ہر ضلع میں انتخاب کے ذریعے اس کے نمائندے منتخب کیے جائیں اور پھر ضلعی شاخیں قائم کی جائیں۔

(۵) اس کا دائرہ وسیع کر کے ہر صوبہ میں اس تنظیم کا قیام عمل میں لایا جائے اور پھر ایک مرکزی ادارہ تشکیل دیا جائے جس میں ہر ضلع کے نمائندے شامل ہوں۔

(۶) اس مقصد کے لئے مسلمانوں کے تین مسلّمہ رہنماؤں کی ایک ایڈہاک کمیٹی قائم کی گئی۔

(۷) اس کی مالی ضروریات پوری کرنے کے لئے اسی اجلاس میں ایک فنڈ بھی قائم کر دیا گیا۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس دور کے مسلمان رہنماؤں کے ذہنوں میں کتنی وسعت تھی ان کا شعور کتنا بیدار تھا اور تنظیمی ڈھانچہ بنانے کی ان میں کس قدر صلاحیتیں موجود تھیں۔ ان سب باتوں پر مستزاد یہ کہ اگرچہ ہندوؤں نے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور انڈین نیشنل کانگرس، مہامنڈل "انجمن انسداد ذبیحہ گاؤ" اور "مہاجن منڈل" جیسی تنظیمیں قائم کر کے مسلمانوں کو تعلیمی سماجی، اقتصادی اور مذہبی لحاظ سے تباہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر جب مسلمانوں نے اپنی پولیٹیکل ایسوسی ایشن یا سیاسی انجمن قائم کی تو اس کے اغراض و مقاصد میں صاف صراحت کر دی کہ یہ انجمن دوسری قوموں کے ساتھ معاندانہ برتاؤ سے اجتناب کرے گی۔ اُس دور کے مسلمان رہنماؤں کی عالی ظرفی، رواداری اور عدم تعصب کا یہ ایک درخشندہ نمونہ ہے جس کی مثال برصغیر تو کیا ساری دنیا کی اقوام پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام

اگرچہ انگریزوں اور ہندوؤں دونوں کا طرز عمل مسلمانوں کے ساتھ نہایت معاندانہ تھا۔ انڈین نیشنل کانگرس نے ان کی راہ میں طرح طرح کے کانٹے بچھا دیئے تھے۔ مگر اس کے باوجود مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جو سیاسی معاملات میں کانگرس کے ساتھ تعاون کا حامی تھا بلکہ واضح الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ وہ کانگرس میں شامل ہو کر سیاسی حقوق حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس گروہ میں زیادہ تعداد تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تھی جنہیں سیاسی معاملات کا وہ تجربہ نہ تھا جو سن رسیدہ مسلمان رہنماؤں کو حاصل تھا۔ ان کے سامنے ۱۸۵۷ء کی قیامت صغریٰ بھی نہیں گزری تھی جس نے ایک طرف ہندوؤں کے خطرناک مگر پوشیدہ عزائم کو بے نقاب کر دیا تھا اور دوسری طرف مسلمانوں کو ہلاکت و بربادی کے غار میں دھکیل دیا تھا۔ اس وقت کانگرس کے سوائے ہندوستان میں کوئی منظم سیاسی جماعت بھی نہ تھی جس کے پلیٹ فارم کو مسلمان اپنے جوش و خروش کے اظہار کے لئے استعمال کرتے۔ لکھنؤ میں مسلمانوں کی "سیاسی انجمن" ضرور قائم ہو گئی تھی لیکن یہ ابھی ابتدائی مراحل میں تھی۔ اس کا دائرہ یوپی تک محدود تھا اور اس کے بانی احتیاط و اعتدال کے راستے پر چل رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ نوجوان نسل جس کے خون میں گرمی اور مزاج میں تیزی و طراری ہوتی ہے احتیاط و توازن کے راستے پر چلنے والوں کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نسل کے بعض افراد پر کانگرس کا ہنگامہ خیز جادو چل گیا تھا۔ شاید سن رسیدہ و جہاندیدہ مسلمان رہنماؤں کی کوششیں ناکام ہو جاتیں اور مسلمانوں کی اکثریت اپنی قسمت کانگرس سے وابستہ کر دیتی کہ بعض واقعات ایسے پیش آئے جنہوں نے کانگرس کا سحر توڑ دیا اور ان مسلمانوں کو اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا جو کانگرس سے بڑی امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔

تقسیم بنگال

ان واقعات میں سب سے ہنگامہ خیز واقعہ تقسیم بنگال کا تھا جس نے حکومت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں بلکہ سارا ملک آتش فشاں پہاڑ میں تبدیل ہو گیا۔ حالانکہ بات صرف اتنی سی تھی کہ بنگال کے کچھ ستم رسیدہ مسلمانوں کو ہندو زمینداروں، جاگیرداروں اور مہاجنوں کے تسلط سے نجات مل گئی تھی۔ یہ صوبہ صدیوں سے

اسلامی حکومت کے زیر اثر اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا۔ یہاں کی صنعت اور تجارت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ مسلمان امراء، رؤساء، زمینداروں اور صنعت کاروں کو بنگال میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ جن سے لاکھوں ہندوؤں اور مسلمانوں کی معاشی وابستہ تھی مگر نواب سراج الدولہ کی شکست کے ساتھ ہی بنگال کے مسلمانوں کی قسمت کا ستارا گردش میں آ گیا۔ رفتہ رفتہ انگریزوں نے میر جعفر اور اس کے جانشینوں کو برائے نام حکومت سے بھی محروم کر کے بنگال کا انتظام براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے بعد ہی بنگالی ہندوؤں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انگریزوں کا قرب حاصل کیا۔ ان کی وفاداری کو اپنا نصب العین بنایا۔ ان کی زبان نہایت ذوق و شوق سے پڑھی۔ ان کی خوشنودی حاصل کی اور سرکاری مناصب پر فائز ہو گئے۔ حتیٰ کہ بنگال پر انگریزوں کے پردے میں ہندو حکومت کرنے لگے اور مسلمان ہر شعبے میں پسماندگی کا شکار ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ بے روزگاری اور افلاس نے ان کی کمر توڑ دی۔ وہ وسیع پیمانے پر نقل مکانی پر مجبور کر دیئے گئے ان پر سیاسی مقدمات چلائے گئے۔ ہندو زمینداروں نے انہیں بے دخل کرنا شروع کر دیا ساہوکاروں اور مہاجنوں نے ان کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا اور یوں معلوم ہونے لگا جیسے اس صوبے سے مسلمانوں کی عزت و عظمت کا جنازہ اٹھ رہا ہے کہ اسی زمانے میں لارڈ کرزن ہندوستان کا وائسرائے ہو کر آیا۔ یہ عجیب دل و دماغ اور خصوصیات کا شخص تھا۔ سخت قسم کا انگریز ہونے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب و تمدن سے بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ آثارِ قدیمہ کا محکمہ اسی کے ذہن و فکر کی اختراع ہے۔ اس محکمے کے ذریعے ہندوستان کی قدیم تاریخی یادگاریں محفوظ ہو گئیں۔ ورنہ برصغیر کے چپہ چپہ پر پھیلی ہوئی وہ تاریخی عمارتیں جو ہندوستان کی مختلف اقوام و ملل کی تہذیب و تمدن اور مذہب کا نشان ہیں روئے زمین سے ہمیشہ کے لئے مٹ گئی ہوتیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لارڈ کرزن ہندوستان پر حکومت کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کے مسائل سے بھی ہمدردی رکھتا تھا۔ اس کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ انگریزوں کو ہندوستان کی تمام اقوام کے ساتھ یکساں سلوک کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اسے بنگال کے مسلمانوں کی حالت زار کا علم ہوا تو اس نے بنگال کے بعض مسلمان اکابر کے مشورے سے ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو اس صوبے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس طرح مشرقی بنگال میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی ہندوؤں کی بالادستی ختم ہونے لگی اور اس امر کے امکانات پیدا ہو گئے کہ مشرقی بنگال کے ستم رسیدہ اور تباہ حال مسلمان اپنے اقتصادی، تعلیمی اور سماجی حالات کو بہتر بنا لیں گے۔

تقسیم بنگال کے خلاف برہمی

اس صورتِ حال سے بنگال کے ہندوؤں کو کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ تھا اور اگر وہ مسلمانوں

کے معاملے میں مخلص ہوتے تو انہیں اس تقسیم پر لارڈ کرزن کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے تھا اور مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو ہدیۂ تبریک پیش کرنا چاہیئے تھا۔ مگر یہ تو جب ہوتا جب بنگال کے ہندو اپنے مسلمان ہم وطنوں کے بہی خواہ ہوتے۔ انہوں نے اس تقسیم کے خلاف سخت غم و غصہ کا اظہار کیا اور سارے ملک میں ایک طوفان برپا ہوگیا۔ انجمنیں قائم کی گئیں جن میں بنگالی ہندوؤں کو بم بنانے کی تربیت دی جانے لگی۔ انگریز افسروں پر قاتلانہ حملے کیے گئے ان پر بم پھینکے گئے۔ سارے بنگال میں جلسوں اور جلوسوں سے بدنظمی اور افراتفری پیدا کرنے کی منظم کوشش کی گئی۔ یہ تحریک صرف بنگال تک محدود نہ رہی بلکہ پنجاب اور دکن تک پھیل گئی اور سارے ہندوستان میں تقسیم بنگال کے خلاف تشدد آمیز مظاہرے شروع ہوگئے۔ سب سے زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ کانگرس نے اس تحریک کی قیادت کی اور گوکھلے جیسے رہنما بھی جن کی غیر فرقہ واریت کے آج تک چرچے ہیں اس تقسیم کے خلاف اپنا غصہ ضبط نہ کر سکے اور اسی سال یعنی ۱۹۰۵ء میں ان کی زیر صدارت کلکتہ میں انڈین نیشنل کانگرس کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا جس میں اس تقسیم کے خلاف قرارداد مذمت پاس کی گئی اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ تقسیم کا فیصلہ واپس لیا جائے۔ سودیشی کی تحریک اور برطانوی مال کے بائیکاٹ کا نعرہ اسی دور کی پیداوار ہے۔ کانگرس کی سرپرستی میں بنگالی ہندوؤں نے اعلان کیا کہ جب تک حکومت بنگال کی تقسیم کا فیصلہ واپس نہیں لے گی اس وقت تک ہندوستانی انگلستان کے کارخانوں کا تیار کردہ سامان استعمال نہیں کریں گے اور صرف ہندوستان کی بنی ہوئی اشیاء پر اکتفا کریں گے۔ چنانچہ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے ملک میں جابجا چھوٹے چھوٹے صنعتی مراکز قائم ہونے لگے۔ اس تحریک سے حکومت بہت گھبرائی کیونکہ اس کی کامیابی کی صورت میں انگریزوں کی تجارت کو سخت نقصان پہنچنے کا احتمال تھا مگر لارڈ کرزن نہایت مضبوط وائسرائے تھا اس لئے اس نے اس مخالفت کی قطعاً پروا نہ کی اور اسے سختی سے دبانے میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا۔

بنگالی ہندوؤں کے برعکس بنگالی مسلمان اس تقسیم سے نہایت خوش تھے۔ نواب سر سلیم اللہ خان آف ڈھاکہ، آنریبل سید نواب علی چوہدری اور بنگال کے سرکردہ مسلمانوں نے لارڈ کرزن کے اس فیصلے کو خوش آمدید کہا۔ وہ اس تحریک سے بالکل الگ رہے جو بنگالی ہندوؤں نے تقسیم کے خلاف جاری کی تھی۔ یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ بنگال کی تقسیم اس صوبے کے مسلمانوں کے حق میں نہایت مفید تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بنگال کے مسلمان بھی اس کی مخالفت کرتے۔ تقسیم بنگال کی مخالفت نہ کرنے کے "جرم" میں بعض مقامات پر بنگالی ہندوؤں نے مسلمانوں کو سخت مظالم کا نشانہ بنایا۔ آخر بنگال کے مسلمان بھی میدان میں آگئے اور بنگالی ہندو جس قدر شدت سے تقسیم بنگال کی منسوخی کا مطالبہ کرنے لگے بنگالی مسلمانوں نے اسی قدر شدت سے

اس تقسیم کو قائم رکھنے کا مطالبہ کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض مقامات پر نہایت خون ریز ہندو مسلم فسادات ہوئے۔

مسلم لیگ کا قیام

ہندوؤں کی یہ متعصبانہ روش دیکھ کر شملہ میں مسلم اکابر کا اجتماع ہوا جس میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ حق نیابت حاصل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ اجتماع اس لحاظ سے بھی نہایت بابرکت ثابت ہوا کہ یہاں مختلف صوبوں کے مسلمانوں کو جمع ہو کر اپنے اپنے صوبوں اور پھر سارے ملک کے مسلمانوں کے مسائل پر تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ اس اجتماع میں مسلمان رہنماؤں نے نزاکتِ حالات کو محسوس کر کے فیصلہ کیا کہ سیاسی معاملات سے لاتعلقی قوم کے حق میں نہایت مضرت رساں ثابت ہوگی۔ اس لئے ضروری ہے کہ مسلمانانِ ہند کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے ملک گیر بنیادوں پر ان کی سیاسی تنظیم قائم کی جائے۔ شملہ کے اجتماع کے تین ماہ بعد علی گڑھ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہونے والا تھا۔ چنانچہ نواب سلیم اللہ خاں آف ڈھاکہ اور آنریبل نواب سید نواب علی چوہدری نے ہز ہائی نس سر آغا خاں اور نواب وقار الملک کے مشورے سے فیصلہ کیا کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے موقع پر ہی قوم کی سیاسی تنظیم پر غور و خوض کرنے کے لئے ایک اجتماع منعقد کر لیا جائے۔ آخر ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس تاریخی اجلاس میں پیش کرنے کے لئے ایک جامع اسکیم کا خاکہ نواب سلیم اللہ خاں نے مرتب کیا۔ اس اجتماع میں عام مسلمانوں کے علاوہ نواب سلیم اللہ خاں، آنریبل سید نواب علی چوہدری، ہز ہائی نس سر آغا خاں، نواب وقار الملک، مولانا محمد علی جوہر، راجہ صاحب محمود آباد (سر علی محمد خاں) مولانا ظفر علی خاں، حکیم اجمل خاں اور جناب عزیز مرزا بھی شریک ہوئے۔ نواب سلیم اللہ خاں کی تحریک پر نواب وقار الملک اس جلسے کے صدر منتخب ہوئے۔ صدارتی تقریر کے بعد نواب سلیم اللہ خاں نے اجلاس سے خطاب کیا۔ اور پھر اپنی وہ جامع اسکیم پیش کی جو انہوں نے نہایت غور و خوض کے بعد مرتب کی تھی۔ دوسرے اجلاس میں اس اسکیم میں متعدد ترامیم پیش کی گئیں اور ان تجاویز کو مندرجہ صورت میں منظور کر لیا گیا۔

(۱) یہ جلسہ جس میں ہندوستان کے ہر حصے کے مسلمان بمقام ڈھاکہ شریک ہیں فیصلہ کرتا ہے کہ ایک پولیٹیکل ایسوسی ایشن بنام "آل انڈیا مسلم لیگ" حسب ذیل مقاصد کے لئے قائم ہونی چاہئیے۔

(۲) مسلمانانِ ہند کے دل میں برٹش گورنمنٹ کی نسبت وفادارانہ خیالات کو ترقی دینا اور گورنمنٹ کا کسی کارروائی کے متعلق ان میں جو غلط فہمی ہو اسے دور کرنا۔

(ب) مسلمانانِ ہند کے پولیٹیکل حقوق و فوائد کی نگہداشت اور ان کی ضروریات و خواہشوں کو مؤدبانہ

طریقے سے گورنمنٹ میں پیش کرنا۔

(ج) لیگ کے دیگر مقاصد کو نقصان پہنچائے بغیر مسلمانانِ ہند میں ایسے خیالات پیدا نہ ہونے دینا جو دوسرے فرقوں کی نسبت معاندانہ ہوں۔

(۲) اس جلسے کی رائے میں تقسیم بنگال مسلمانانِ بنگال کے لئے جو آبادی کا بڑا حصہ ہیں یقیناً مفید ہے اور اس قسم کی کارروائیوں کو جیسے ایجی ٹیشن یا بائیکاٹ سختی سے روکنا چاہیئے۔

اسی جلسے میں ایک کمیٹی مسلم لیگ کے قواعد و قوانین کا مسودہ تیار کرنے کے لئے بھی مقرر ہوئی۔ اور یہ طے پایا کہ آئندہ کسی مناسب موقع پر مسلمانانِ ہند کا ایک جلسہ طلب کر کے یہ قواعد پیش کئے جائیں[۱]

اس اجلاس میں ہز ہائی نس سر آغا خاں کو مسلم لیگ کا مستقل صدر اور نواب وقار الملک کو آنریری سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ اس موقع پر نواب وقار الملک نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا کہ :-

وقار الملک کا خطبۂ صدارت

"آج جس غرض سے کہ ہم لوگ یہاں جمع ہوئے ہیں وہ کوئی نئی ضرورت نہیں ہے۔ ہندوستان میں جس وقت سے کہ آل انڈیا نیشنل کانگرس کی بنیاد پڑی اس وقت سے وہ ضرورت بھی پیدا ہو گئی تھی یہاں تک کہ جناب سرسید مرحوم و مغفور نے جن کی عاقبت اندیشی اور عاقلانہ پالیسی کے مسلمان ہمیشہ مشکور و ممنون ہیں نیشنل کانگرس کے بڑھتے ہوئے اثر سے متاثر ہو کر نہایت زور کے ساتھ اس بات کی کوشش کی کہ مسلمانوں کی بہتری اور ان کی حفاظت اسی میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو کانگرس میں شریک ہونے سے باز رکھیں اور یہ رائے اس قدر صائب تھی کہ گو جناب مرحوم آج ہم میں نہیں ہیں لیکن مسلمانوں کی عام رائے اس وقت تک وہی ہے اور جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے ہم کو اس بات کی ضرورت زیادہ محسوس ہوتی جاتی ہے کہ مسلمان اپنے پولیٹیکل حقوق کی حفاظت میں پیش از پیش اہتمام کریں . . . مسلمان ہندوستان میں اپنی دوسری ہمسایہ قوموں سے ایک خمس کے قریب ہیں اور اس لئے یہ ایک بہت صاف مضمون ہے کہ اگر خدانخواستہ کسی وقت برٹش حکومت ہندوستان میں قائم نہ رہے تو اس وقت وہی قوم ملک پر حکمران ہو گی جو تعداد میں ہم سے چار حصہ زیادہ ہے اور اب صاحبو! ہر شخص کو چاہیئے کہ اپنے دل میں اس بات پر غور کرے کہ اس وقت ہماری کیا حالت ہو جاوے گی۔ اس وقت ہماری حالت یہ ہو گی کہ ہماری جان، ہمارا مال، ہماری آبرو اور ہمارا مذہب سب خطرے میں پڑ جائے گا[۲]"

---

[۱] وقارِ حیات ص ۶۷۷

[۲] وقارِ حیات ص ۶۷۳

یہ آل انڈیا مسلم لیگ کے پہلے اجلاس کے پہلے صدر کا تاریخی خطبۂ صدارت ہے اس کے مطالعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان رہنماؤں کے اندازِ فکر میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ ہندوؤں کے مظالم اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے نفرت انگیز طرزِ عمل نے باشعور مسلمانوں کو اپنی الگ تنظیم قائم کرنے اور سیاسی معاملات میں حصہ لینے پر آمادہ کر دیا تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام ہندوؤں کی اسی مسلم دشمن پالیسی کا نتیجہ تھا۔

مسلم لیگ کا اجلاس کراچی

دسمبر ۱۹۰۷ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس کراچی میں منعقد ہونا تھا۔ اسی اجلاس کے اختتام کے بعد اسی مقام پر مسلم لیگ کا پہلا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے لئے ۲۹، ۳۰ دسمبر ۱۹۰۷ء کی تاریخیں مقرر ہوئیں۔ بمبئی کے مشہور جج اور بزرگ رہنما سر آدم جی پیر بھائی صاحب سے صدارت کی درخواست کی گئی جو موصوف نے نہایت خوشی سے منظور کر لی۔ ۲۹ دسمبر کو آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ تاریخی اجلاس شروع ہوا۔ اس میں پریس کے نمائندوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس اجلاس کا اصل مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ کے پہلے اجلاس (۱۹۰۶ء منعقدہ ڈھاکہ) میں اس تنظیم کے لئے قواعد و قوانین کا مسودہ تیار کرنے کے لئے جو کمیٹی مقرر کی گئی تھی اس کی رپورٹ پر غور و خوض کرنے کے بعد اس کی منظوری دی جائے۔ چنانچہ اس مسودے پر دو روز تک بحث و تمحیص ہوتی رہی اور متعدد ترامیم کے بعد اسے منظور کر لیا گیا۔ اس طرح ڈھاکہ میں جس تنظیم کا آغاز ہوا تھا کراچی میں اس کی تکمیل ہو گئی۔

مسلم لیگ کا اجلاس علی گڑھ

اجلاسِ کراچی کے ڈھائی ماہ بعد آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک خصوصی اجلاس علی گڑھ میں خان بہادر محمد مزمل اللہ خاں کی کوٹھی پر منعقد ہوا۔ پنجاب کی ممتاز علمی و سیاسی شخصیت (جسٹس) شاہ دین ہمایوں (مرحوم) نے اس اجلاس کی صدارت کی۔ نواب وقار الملک نے اجلاسِ کراچی کی رپورٹ پیش کی۔ نئے ممبروں کا انتخاب ہوا اور نواب وقار الملک کی قومی خدمات کے متعلق ایک ریزولیشن پاس کیا گیا جس میں نواب صاحب کی ان کوششوں کو سراہا گیا جو انہوں نے قیامِ مسلم لیگ کے سلسلے میں سرانجام دیں۔ لیکن اس اجلاس کی اصل غرض و غایت کچھ اور تھی۔ قیام مسلم لیگ کے بعد صوبۂ پنجاب کے دو مسلم لیگی رہنماؤں سر شفیع اور سر میاں فضل حسین کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور دونوں نے دو مسلم لیگیں قائم کر لی تھیں ایک جدید تنظیم کے لئے اس قسم کا اختلاف نہایت نقصان دہ تھا اس لئے علی گڑھ

میں نواب وقار الملک اور ان کے بعض رفقا کی کوششوں سے سر فضل حسین اور سر شفیع کے اختلافات دور کرائے گئے اور پنجاب کی دونوں مسلم لیگوں کو ملا کر ایک کر دیا گیا۔

اس اجلاس کا ایک اور قابل ذکر واقعہ نواب وقار الملک کا استعفیٰ ہے۔ نواب صاحب علی گڑھ مسلم کالج کے آنریری سیکرٹری تھے اور آل انڈیا مسلم لیگ کے بھی سیکرٹری تھے اس لئے انہوں نے بیک وقت دو عہدوں کی ذمہ داریاں مسلسل نبھانے سے معذوری کا اظہار کیا اور سیکرٹری مسلم لیگ کے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد ان کا استعفیٰ منظور کر لیا گیا۔ سید وزیر حسن مسلم لیگ کے نئے سیکرٹری اور حاجی محمد موسیٰ خاں جوائنٹ سیکرٹری مقرر کئے گئے۔

مسلم لیگ کے اس اجلاس میں لیگ کے اندرونی معاملات اور تنظیمی امور کے علاوہ ملکی معاملات سے تعلق رکھنے والا ایک مسئلہ بھی زیر بحث آیا اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کر دیا جائے۔[1] ہمارے خیال میں مسلم لیگ کی ایک سالہ مختصر سی زندگی کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس طرح مسلمانوں کی اس جماعت نے حکومت اور برادران وطن دونوں پر ثابت کر دیا کہ مسلم لیگ اہل ملک کی فلاح و بہبود اور ان کے سیاسی حقوق کے تحفظ کو اپنے پروگرام کا جزو بنا چکی ہے اور وہ حکومت کے سامنے معقول مطالبات پیش کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں۔

مسلم لیگ کی سرگرمیاں ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۱ء تک

مسلم لیگ کا قیام ۱۹۰۶ء میں بمقام ڈھاکہ عمل میں آیا۔ ۱۹۰۷ء میں بمقام کراچی اس کی تنظیم مکمل ہوئی۔ ۱۹۰۸ء کے مارچ میں بمقام علی گڑھ اس کا ایک خصوصی اجلاس ہوا اور اس میں بعض انقلابی فیصلے کئے گئے۔ لیگ کے رہنماؤں نے اس جماعت کو عوام سے روشناس کرانے اور اسے زیادہ سے زیادہ عوامی بنانے کے لئے آغاز کار ہی میں ایک جامع پروگرام تیار کر لیا تھا جس کی ایک شق یہ بھی تھی کہ لیگ کے جلسے ہر صوبے کے بڑے بڑے شہروں میں منعقد کئے جایا کریں تاکہ یہ ملک گیر حیثیت اختیار کر لے۔ اور ہر صوبے کے لوگوں کو اس کے جلسوں میں شریک ہونے اور اس کی سرگرمیوں سے براہ راست آگاہ ہونے کا موقع مل سکے۔ چنانچہ اس کا دوسرا سالانہ اجلاس ہندوستان کے مردم خیز صوبہ پنجاب کے مشہور شہر امرتسر میں زیر صدارت سر امام علی دسمبر ۱۹۰۸ء میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ ہندو اکثریت کے ہاتھوں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ملازمتوں میں مسلمانوں کو

---

[1] مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۲۳۴

ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق حصہ دیا جائے۔ دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ کانگرس نے تقسیم بنگال کے خلاف جو ریزولیشن پاس کیا ہے حکومت اس سے متاثر نہ ہو اور بنگال کو بدستور دو حصوں میں منقسم رکھے۔ تیسرا مطالبہ یہ کیا گیا کہ پریوی کونسل میں مسلمانوں کو بھی نمائندگی دی جائے اور ایک ممبر ہندو اور ایک مسلمان مقرر کیا جائے۔ چوتھا مطالبہ یہ تھا کہ لوکل بورڈوں میں مذہبی بنیادوں پر نمائندگی کا جو اصول تسلیم کیا گیا ہے اس میں مزید توسیع کی جائے۔ اس کے علاوہ ٹرانسوال میں اہل ہند کی بہبودی کے متعلق بھی ایک قرارداد منظور کی گئی[1]

آل انڈیا مسلم لیگ کا تیسرا اجلاس ۱۹۱۰ء میں بمقام دہلی منعقد ہوا۔ ہز ہائی نس سر آغا خاں نے اس کی صدارت کی۔ اس اجلاس میں بھی مسلمانوں کے حقوق کا مسئلہ زیر غور آیا اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ ہر شعبہ میں مسلمانوں کو ان کے تناسب آبادی کے مطابق ملازمتیں دی جائیں۔ اس اجلاس میں ایک بار پھر ٹرانسوال میں اہل ہند کی امداد کے لئے قرارداد پاس کی گئی۔ اس اجلاس کا ایک قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ میجر سید حسین کی بجائے مولوی عزیز مرزا کو آل انڈیا مسلم لیگ کا سیکرٹری منتخب کیا گیا[2]

اسی سال یعنی ۱۹۱۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا مرکزی دفتر جو اب تک علی گڑھ میں قائم تھا وہاں سے لکھنؤ منتقل کر دیا گیا۔

اسی سال یعنی ۱۹۱۰ء کے آخر میں مسلم لیگ کا پانچواں اجلاس منعقد ہوا۔ اب کی بار اجلاس کے لئے صوبۂ متوسط کے مرکزی شہر ناگپور کو منتخب کیا گیا۔ لکھنؤ کے مشہور بیرسٹر سید نبی اللہ علیگ نے اجلاس کی صدارت کی۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ نے انگریزی حکومت کی نیاز مندانہ پالیسی کو خیر باد کہہ کر کچھ ایسے اقدامات کئے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ لیگ بدلتے ہوئے حالات پر پوری طرح نگاہ رکھتی تھی اور وہ مسلمانوں کے حقوق کے لئے پوری جرأت سے میدان میں آگئی تھی۔ چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ پہلا اجلاس تھا جس میں صدر جلسہ کی طرف سے حکومت کی جنگی پالیسی پر سخت نکتہ چینی کی گئی اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا سرحدی فوج کی تعداد میں کمی کی جائے اور جنگی اخراجات میں بھی تخفیف کی جائے تاکہ یہ روپیہ اہل ملک کی فلاح و بہبود پر صرف ہو سکے۔ اس اجلاس میں صدر جلسہ سید نبی اللہ نے سول سروس کے انگریز افسروں پر الزام لگایا کہ یہ لوگ ملک کی سیاسی فضا کو خراب کر رہے ہیں اور ہندوستان کے مختلف

---

[1] مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۳۳۵، ۳۳۴

[2] مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۳۳۵

فرقوں میں منافرت پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی اجلاس میں ہندو مسلم اتحاد کے متعلق بھی ایک قرار داد منظور کی گئی اور فیصلہ کیا گیا ہندو اور مسلمان رہنما ایک جگہ جمع ہو کر اپنے اختلافات دور کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ اس فیصلہ کے مطابق کانگرس کے اجلاس کے بعد جو ۱۹۱۱ء میں بمقام الہ آباد منعقد ہوا تھا۔ ہندو اور مسلمان رہنماؤں نے ایک جگہ جمع ہو کر دونوں قوموں کے اتحاد کے سلسلے میں گفتگو کی مگر ہندو لیڈروں پنڈت مدن موہن مالویہ اور بشن نرائن در نے بہت افسوس ناک رویہ اختیار کیا اور نہایت اشتعال انگیز تقریریں کیں اس لئے یہ کانفرنس ناکام ہو گئی۔

تقسیم بنگال کی منسوخی

دسمبر ۱۹۱۱ء میں شہنشاہ برطانیہ جارج پنجم ہندوستان آئے اور دہلی میں وہ تاریخی دربار منعقد ہوا جس کی ناخوشگوار یاد برسوں لوگوں کے ذہنوں سے محو نہ ہو سکی۔ اس دربار میں کلکتہ کی بجائے دہلی کو ہندوستان کا دارالسلطنت قرار دے کر اس قدیم اور مرکزی شہر کی حیثیت ضرور بحال کر دی گئی مگر دوسری طرف ایک ایسا شرمناک اور ظالمانہ اعلان بھی کیا گیا جس نے بنگال کے مسلمانوں کو ایک بار پھر ہندو کی غلامی کے قعر مذلت میں دھکیل دیا۔ اس اعلان کے مطابق بنگال کی تقسیم کا فیصلہ منسوخ کر دیا گیا اور دونوں حصوں کو متحد کر کے بنگالی ہندوؤں کی اجارہ داری از سر نو قائم کر دی گئی۔ اس اعلان سے نہ صرف بنگال بلکہ سارے ملک کے ہندوؤں کے گھروں میں خوشی کے چراغ روشن ہو گئے مگر مسلمانوں کے گھروں میں بنگال سے پشاور اور ہمالیہ کی ترائی سے راس کماری تک صفِ ماتم بچھ گئی۔ چنانچہ اس اعلان کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۴ مارچ ۱۹۱۲ء کو کلکتہ میں منعقد ہوا۔ نواب سلیم اللہ خاں نے اجلاس کی صدارت فرمائی۔

نواب سلیم اللہ خاں کے تاثرات

موصوف نے اپنے خطبۂ صدارت میں تقسیم بنگال کی تنسیخ کے موضوع پر جن خیالات کا اظہار کیا ان میں نہ صرف مسلم لیگ بلکہ مسلمانانِ ہند کے جذبات کی درست ترجمانی کی گئی تھی۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ:

> "ہمارے بد خواہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ تقسیم بنگالہ سے لازمی طور پر مشرقی بنگال کے مسلمانوں کے پامال شدہ حقوق نمایاں حیثیت اختیار کر لیں گے۔ اگرچہ ہمیں حصۂ رسدی سے کچھ بھی زیادہ نہیں ملا تھا۔ ہمارے مخالفوں کے احساسات کا کچھ وہی لوگ اندازہ لگا سکتے ہیں جنہیں مدت سے حقوق کا اجارہ حاصل ہو۔ خواہ اس کی اصل اور نوعیت کتنی ہی غیر منصفانہ کیوں نہ ہو اور پھر انہیں اس اجارہ سے دست بردار ہو کر دوسروں کو بھی حصہ

دینا پڑے۔ سو تقسیم کے خلاف ان کا ہنگامہ ایک فطری امر تھا۔ اس ہنگامہ میں انھوں نے متشددانہ رویہ اختیار کیا۔ اخبارات میں باغیانہ مضمون لکھے۔ پلیٹ فارم سے انقلاب انگیز صدائیں بلند کی گئیں اور غیر ذمہ دار اشتعال انگیزوں کا ایک گروہ صوبہ کے دورے پر نکلا تاکہ نوجوانوں کے متاثر قلوب میں باغیانہ خیالات کا زہر داخل کرے۔ برطانوی اموال کے خلاف بائیکاٹ کا حربہ استعمال کیا گیا اور اقتصادی تحریک سے بنگالیوں میں جہلا کو برطانیہ کے خلاف خوب بھڑکایا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک ایک انقلابی رو میں بہ گیا اور امن و امان معدوم ہو گیا۔ سیاسی قتل ہونے لگے۔ سیاسی ڈکیتیوں کا ارتکاب کیا گیا۔

نواب وقار الملک کے تاثرات

نواب وقار الملک اس دور کے سیاست دانوں میں نہایت اعتدال پسند اور متوازن فکر و نظر کے بزرگ تھے۔ وہ جذبات سے بہت کم مغلوب ہوتے تھے مگر تقسیم بنگال کے واقعے نے ان کے احساسات کو بھی بری طرح مجروح کیا۔ انھوں نے اس سانحے کو انگریزوں کی کم نظری، مسلمانوں کے ساتھ صریح ناانصافی اور ہندو اکثریت کی کھلی ہوئی فتح قرار دیا۔ انھوں نے اس موضوع پر ایک طویل مضمون سپرد قلم کیا جس کے بعض اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

"جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے یہ عام رائے سمجھنی چاہیے کہ یہ الحاق عام طور پر ناپسند کیا جاتا ہے اور بعد اس کے کہ وزرائے سلطنت نے یکے بعد دیگرے الحاق کے خلاف امیدیں دلائی تھیں، الحاق کا عمل میں آنا گورنمنٹ کی کمزوری اور آئندہ اس کے قول و فعل کی بے اعتباری کی ایک وجہ قرار دی جائے گی ..... یہ امر گورنمنٹ کے نزدیک اب بھی مسلم ہے کہ مشرقی صوبہ کی علیحدگی سے قبل وہاں کے کثیر التعداد مسلمانوں کی حالت غلامی کی سی ہو رہی تھی اور صوبہ کی علیحدگی کے بعد وہ غلامی کا طوق ان کی گردن سے نکلتا جا رہا تھا۔ آخر میں مشرقی بنگالہ کے مسلمانوں کے ساتھ ہم اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں جس ہمدردی سے کہ اس وقت کسی مسلمان کا دل بھی خالی نہ ہوگا۔"

"یہ تو مثل آفتاب نصف النہار کی طرح اب روشن ہے کہ ان اختلافات کے دیکھنے کے بعد جو اس وقت مشاہدے میں آئے ہیں، یہ مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ پر بھروسہ کرنا چاہیے لاحاصل مشورہ ہے۔ اب زمانہ اس قسم کے مشوروں کا نہیں رہا۔ خدا کے فضل و کرم کے بعد جس پر ہم کو بھروسہ کرنا چاہیے وہ ہماری قوت بازو ہے اور اس کی نظیر جو ہمارے

ابنائے وطن (ہندوؤں) نے پیش کی ہے ہمارے سامنے موجود ہے [۵]۔"

کیا نواب وقار الملک کے اس سخت انداز تنقید کے بعد اور حکومت کے متعلق اس درشت لب و لہجہ سے واقف ہو جانے کے باوجود بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ مسلم لیگ حکومت کی حاشیہ برداری اور انگریزوں کی خوشامد کرنے کے سوائے اس کا اور کوئی کام نہ تھا؟

راجہ صاحب محمود آباد کے تاثرات

اس عہد کے مسلمان رہنماؤں میں سر علی محمد خاں (راجہ محمود آباد) نہایت بیدار مغز اور ہمدرد ملت بزرگ تھے۔ وہ مسلم لیگ کے بانیوں میں سے تھے اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود سے نہایت گہری دلچسپی لیتے تھے۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان سن کر انہیں بھی نہایت قلق ہوا۔ یہ قلق اور غم و غصہ اتنا شدید تھا کہ وہ اس پر قابو نہ پا سکے۔ اور ۱۹۱۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے جو لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ انہوں نے اس قومی سانحے پر اپنے رنج و غم کا مندرجہ ذیل الفاظ میں اظہار کیا:

"اب تقسیم بنگال کے معاملے کو سامنے رکھیے۔ مشرقی بنگال میں ہمارے بھائیوں کو یقین دلایا گیا کہ تقسیم بنگال ایک طے شدہ امر ہے اور ان کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ تقسیم کی تحریک کو جاری رکھیں۔ ملک معظم کے نائب (وائسرائے) اور وزیر ہند لارڈ مارلے نے اعلان کیا تھا کہ تقسیم بنگال کا نفاذ لازمی امر ہے خواہ کتنے ہی خطرات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ اسلامی بنگال کو بار بار یقین دلایا گیا کہ اسے کلکتہ کے بنگالیوں (ہندوؤں) کے ماتحت نہیں رکھا جائے گا۔ مسلمان اشتعال کے باوجود برطانوی وعدوں پر اعتماد کرتے ہوئے امن سے بیٹھے رہے۔ لارڈ منٹو (وائسرائے ہند) نے اعلان کیا کہ برطانوی حکومت کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اس فیصلے کو بدل دے۔ ہندوستان کے کسی سیاسی رہنما کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس فیصلے کی تنسیخ بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہوا کیا؟ یہی کہ جونہی برطانوی مفاد کا تقاضہ یہ ہوا کہ اس فیصلے کو بدل دیا جائے تو ایک لمحہ کے لئے برطانیہ کو اپنے مواعید کا خیال نہ آیا اور مسلمانوں کی داستان وفا یک قلم فراموش کر دی گئی [۶]۔"

---

[۵] وقار حیات ص ۶۹۱ تا ۶۹۳

[۶] تاریخ مسلم لیگ ص ۵۶ مولفہ سید رئیس احمد جعفری ندوی

مسلم لیگی رہنماؤں کی بے باکی

ان اقتباسات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تقسیم بنگال کی تنسیخ مسلمانوں کے لئے کتنا بڑا حادثہ تھا اور یہ کہ اس دور کے مسلمان رہنماؤں نے اس تنسیخ کے خلاف کتنی قوت اور جرأت سے صدائے احتجاج بلند کی۔ ان احتجاج کرنے والوں میں آل انڈیا مسلم لیگ کے وہی بانی پیش پیش تھے جنہیں مخالفین عام طور پر سرکار پرست ہونے کا طعنہ دیتے تھے۔ ان تقریروں اور مضامین سے اس حقیقت کا بھی علم ہوتا ہے کہ مسلم لیگ کی ابتدا کانگرس ہی کی طرح حکومتِ برطانیہ کے ساتھ اظہارِ وفاداری سے ضرور ہوئی تھی مگر اس جماعت کے بانیوں نے اس وفاداری کو غیر مشروط نہیں رکھا بلکہ انہوں نے جب بھی دیکھا کہ حکومت کوئی ایسا قدم اٹھا رہی ہے جس سے مسلمانوں کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تو انہوں نے بے خوف ہو کر حکومت پر سرِ عام تنقید کی اور اس امر کی قطعاً پرواہ نہ کی کہ حکومت اس سے ناراض ہوتی ہے یا خوش اور یہ کہ خود انہیں ذاتی طور پر اس مخالفت سے کتنا نقصان پہنچ سکتا ہے! مسلم لیگ کی چھ سالہ تاریخ (۱۹۰۶ء تا ۱۹۱۲ء) اس حقیقت کی شاہد عادل ہے کہ مسئلہ سرکاری ملازمتوں میں تناسب کا ہو، میونسپلیٹوں یا ڈسٹرکٹ بورڈوں کے انتخابات کا ہو، وائسرائے کی کونسل میں نامزدگی کا ہو، پریوی کونسل کے اراکین کا تقرر ہو یا انتظامیہ سے عدلیہ کو الگ کرنے کا ہو ہر مسئلے پر مسلم لیگی رہنماؤں نے نہایت جرأت سے اظہارِ خیال کیا اور مسلمانوں کے مطالبات نہایت پُر اثر طریقے سے پیش کئے۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے انہوں نے مختلف شہروں میں مسلم لیگ کے اجلاس منعقد کئے اور لیگ کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں کے مطالبات پورے زور اور قوت سے حکومت تک پہنچائے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہندو کانگرس کے عزائم کو بے نقاب کرنے اور مسلمانوں کو اس جماعت میں شرکت سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش بھی کی اگر غور کیا جائے تو چھ سال کی قلیل مدت میں مسلم لیگ نے ترقی کے بہت سے مدارج نہایت سرعت سے طے کر لئے۔ گو یہ جماعت عوامی جماعت بہت بعد میں بنی لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کے پلیٹ فارم سے عوامی مطالبات پیش کرنے کا آغاز ابتدا ہی میں ہو گیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہندوؤں اور ان کی جماعت کانگرس کو اس حقیقت کا احساس ہو گیا کہ مسلمانوں کی ایک تنظیم قائم ہو چکی ہے جس نے مسلم مفادات کی حفاظت کو اپنا نصب العین بنا لیا ہے۔ مسلم لیگ کے اس چھ سالہ دورِ حیات کا یہ واقعہ بھی کچھ کم قابلِ ذکر نہیں کہ ہندوؤں کی مسلم دشمن روش کے باوجود مسلم لیگ نے کانگرس کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھایا اور کوشش کی کہ ہندو اور مسلمان رہنما ایک جگہ جمع ہو کر اپنے اختلافات دور کر لیں تاکہ فرقہ وارانہ تصادم کا خطرہ باقی نہ رہے اور دونوں قومیں متحدہ طور پر ملک کی ترقی اور اہلِ ملک کی فلاح و بہبود کے لئے مخلصانہ کوشش

کریں۔ مگر افسوس کہ مسلم لیگی رہنماؤں کی یہ کوششیں بارآور نہ ہوئیں اور بعض ہندو رہنماؤں نے اپنی معاندانہ تقریروں سے اتحاد و اتفاق کے اس خواب کو خوابِ پریشاں کر دیا۔

کانگریس اور انگریزوں کی مدح سرائی

جو لوگ مسلم لیگ کے آغاز اور اس کی ابتدائی تاریخ پر اس لحاظ سے اعتراض کرتے ہیں کہ یہ انگریزوں کی مدح سرائی سے عبارت ہے اور مسلم لیگ کو خان بہادروں، نوابوں اور سرکاری افراد کی جماعت قرار دیتے ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ باب ختم کرنے سے قبل ان اصحاب کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے کانگریس کی ابتدائی تاریخ کی ایک جھلک دکھا دی جائے تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ انڈین نیشنل کانگریس جو آزادی کی سب سے بڑی علمبردار سمجھی جاتی ہے ابتداء میں وہی رول ادا کرتی رہی ہے جس کا الزام مسلم لیگ پر عاید کیا جاتا ہے۔ اگر مسلم لیگ میں نواب، خان بہادر اور سرکاری افراد شامل تھے تو کانگریس کا دامن بھی اس سے پاک نہیں۔ چنانچہ ایک مشہور کانگرسی اور تاریخ کانگریس کے مصنف ڈاکٹر بی۔ پٹا بھائی سیتا رامیہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ:۔

"یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کانگریس کی پچاس سالہ زندگی کے پہلے پچیس سالوں میں تقریباً جس قدر بھی رہنما ہوئے وہ حکومت کے دشمن نہ تھے بلکہ حکومت انہیں بہت حد تک اپنا خیر اندیش اور وفادار سمجھتی تھی۔ ان میں سے اکثر اعلیٰ سرکاری عہدوں پر ممتاز تھے مثلاً مدراس کے مسٹر ایس سبرامنیا اور مسٹر وی کرشنا سوامی آئر جو کانگریس کی نیشنل کانگریس کمیٹی کے ماتحت مدراس میں پہلی کانفرنس کرنے کے ذمہ دار تھے۔ سر شنکرن نائر نے بھی ۱۸۹۷ء میں کانگریس کے اجلاس کی صدارت کی۔ مسٹر ٹی وی سیشا گیری آئر جو سب سے پہلے ۱۹۱۰ء کی کانگریس میں ظاہر ہوئے۔ مسٹر بی آر سندر رام آئر جو ۱۹۰۸ء میں مسٹر کرشنا سوامی آئر کے سب سے بڑے معاون تھے۔ ان تمام اصحاب میں سے چھ مدراس ہائی کورٹ کے جج اور ایک مدراس کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر اور دوسرے دہلی کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بنے۔۔۔ گویا کہ صرف مدراس ہی میں سے چھ جج اور چھ دیگر ایگزیکٹو کونسلوں کے ممبر اور کانگریس کے رہنما تھے۔ اسی ضمن میں سر آر جی بھنڈارکر اور مسٹر سی جمبلنگم کا نام بھی لیا جا سکتا ہے جو کانگرسی ہونے کے باوجود ۱۸۹۰ء میں بمبئی سول کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔"[1]

---

[1] تاریخ کانگریس صد ۱۰۸، ۱۰۷

ظاہر ہے کہ اس دور میں وائسرائے کی کونسل کا رکن یا ہائی کورٹ کا جج کسی ایسے شخص کو بنایا ہی نہیں جا سکتا تھا جو حکومت کا وفادار نہ ہو اور نہ کسی جج یا وائسرائے کی کونسل کے ممبر کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ کسی سیاسی پلیٹ فارم سے حکومت کی مخالفت کر سکے۔ بلکہ اس وقت کسی ہندوستانی جج یا کسی سرکاری عہدے دار کے متعلق کسی ایسی تحریک میں شامل ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا جو حکومت کے خلاف جاری کی گئی ہو۔ پس اس سے صاف طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ کانگرس اپنی زندگی کے ابتدائی پچیس سال میں حکومت برطانیہ کی وفادار اور خیر طلب تھی اور اس کے سائے پر انگریزوں کی مدح سرائی کے گیت گائے جاتے تھے۔ یہ ہمارا دعویٰ نہیں بلکہ خود کانگرسی رہنما اس کی تائید کرتے ہیں۔ چنانچہ مسٹر بی پٹابھائی سیتارامیہ نے اپنی کتاب میں مشہور ہندو رہنما مسٹر گاندھی کی ایک تقریر درج کی ہے جس کا ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

"میرے لئے یہ انتہائی خوشی کا مقام ہے کہ انجمن (کانگرس) کے قیام کا خیال سب سے پہلے ایک انگریز کے دماغ میں آیا تھا اور آج ہم مسٹر ہیوم کو کانگرس کے باپ اور جنم داتا کی حیثیت سے بخوبی جانتے ہیں۔ اس کی پرورش دو مشہور پارسی رہنماؤں کے ہاتھوں میں ہوئی[1]"

پھر کانگرس کے پہلے صدر مسٹر ڈبلیو سی بنرجی نے ایک موقع پر کانگرس کی پیدائش اور اس کے ابتدائی اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ:

"میرے خیال میں یہ بات بہت سے آدمیوں کے لئے ایک عجیب خبر کی حیثیت رکھے گی کہ انڈین نیشنل کانگرس جو اب تک کام کر رہی ہے دراصل ہندوستان کے شریف گورنر جنرل لارڈ ڈفرن کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مسٹر اے۔ او۔ ہیوم نے سوچا کہ اگر ہندوستان بھر کے سرکردہ مدبر اور سیاست داں سال بھر میں ایک مرتبہ ایک مقام پر اکٹھے ہو کر عام ملکی حالات پر دوستانہ تبادلہ خیالات کر سکیں تو یہ اقدام ملک کے لئے نہایت ہی مفید اور منفعت بخش ثابت ہوگا۔ ہم ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ سیاسیات کو اس میں کسی قسم کا دخل ہو[2]"

یہ دو اقتباس دو مشہور کانگرسی رہنماؤں کی تقریروں کے ہیں۔ ان میں سے ایک یعنی مسٹر گاندھی

---

[1] تاریخ کانگرس حصہ ۱ صفحہ ۳۲

[2] تاریخ کانگرس حصہ ۱ صفحہ ۲۳-۲۲

اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ کانگرس کا باپ اور جنم داتا ایک انگریز تھا اور سب سے پہلے اسی کے دماغ میں اس انجمن کے قیام کا خیال پیدا ہوا۔ دوسرے کانگرسی رہنما مسٹر بنرجی لوگوں کو یہ عجیب خبر سناتے ہیں کہ کانگرس ایک گورنر جنرل لارڈ ڈفرن کے ایما سے قائم ہوئی۔ اب اگر ہم ذیل میں کچھ ایسے اقتباسات پیش کریں جن سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ ابتدا میں کانگرسی رہنماؤں کا کام انگریزوں کی خوشامد کرنے کے سوائے اور کچھ نہ تھا تو یہ تعجب انگیز بات نہ ہوگی کیونکہ باپ کا کچھ نہ کچھ اثر اولاد میں آہی جاتا ہے۔ اب وہ شہ پارے ملاحظہ فرمائیے جو ۱۸۹۳ء سے لے کر ۱۹۱۱ء تک کانگرس کے مختلف صدر صاحبان نے اپنی صدارتی تقریروں میں ارشاد فرمائے۔

"ہندوستان میں انگریزی حکومت کی سب سے بڑی برکت ——— ہم اس کانسٹی ٹیوشن کے زیر سایہ خوشی اور اطمینان سے رہتے ہیں جس کا مدعا ہی آزادی اور جس کا مضبوط ترین ستون ٹالریشن یا رواداری ہے۔"

"اس سورج کی روشنی اور آسمان کے تلے انگریزوں سے زیادہ دیانت دار، منصف مزاج اور توانا کوئی قوم آباد نہیں ہے۔"

"ہندوستان کی تعلیم یافتہ جماعتیں انگلستان کی دشمن نہیں بلکہ دوست ہیں اور اس عظیم کام میں اس کے ساتھی ہیں جو اس کے سامنے موجود ہے۔"

"ہر شخص کا دل برطانوی تاج کی وفاداری اور عزت کی خوشی میں رقص کر رہا ہے۔ اور برطانوی سیاست کی انصاف پسندی سے لبریز ہے اور ہم بعض تاریک اور مایوس ایام میں بھی برطانوی انصاف کے عقیدے سے متزلزل نہیں ہوئے[1]۔"

ان میں سے پہلا اقتباس کانگرس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر دیال سنگھ مجیٹھیا کا اور آخری اقتباس صدر کانگرس مسٹر امبکا چرن کا ہے۔ ان اقتباسات کے بعد اس حقیقت میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ کانگرس کا آغاز انگریزوں کی خوشامد اور حکومت کی کاسہ لیسی سے ہوا تھا۔

---

[1] تاریخ کانگرس صد ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴

قائدِ اعظم مطلعِ سیاست پر

اتوار کا دن تھا۔ دسمبر کا مہینہ۔ ۲۵ر تاریخ۔ کراچی شہر —— اور ان چاروں میں نہایت گہرا تعلق تھا۔ اتوار مسیحیوں کا یومِ عبادت۔ دسمبر وہ مہینہ جس میں حضرت مسیحؑ ابن مریمؑ کی ولادت ہوئی۔ اور ۲۵ر دسمبر وہ تاریخ جب حضرت مسیحؑ نے جنم لیا۔ اسی دن، اسی مہینے اور اسی تاریخ کو ۱۸۷۶ء میں کراچی کے ایک مسلمان تاجر جناح پونجا بھائی کے گھر ایک بچہ پیدا ہوا۔ دبلا پتلا، پتلے پتلے اور لمبے لمبے ہاتھوں پیروں والا۔ یہی بچہ آگے چل کر مسیحی دنیا کے لئے ایک چیلنج اور مسلمانوں کے لئے مسیحا ثابت ہوا اور اسی کراچی میں جہاں اس نے جنم لیا تھا ایک آزاد مملکت مسلمانوں کے سپرد کر کے اسی شہر کی خاک میں ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو ابدی نیند سو گیا۔

ابتدائی تعلیم

والدین نے اس بچے کا نام محمد علی رکھا۔ جب اس کی عمر چھ سال کی ہو گئی تو ایک استاد گجراتی زبان پڑھانے کے لئے مقرر کیا گیا جو اس کے گھر آکر پڑھاتا تھا۔ ۹ سال کی عمر تک اس کی تعلیم گھر پر ہی ہوتی رہی۔ اس بچے کے خاندان کی ایک خاتون کا بیان ہے کہ محمد علی بچپن میں تعلیم کی طرف کم اور کھیل کود کی طرف زیادہ مائل تھے اور اپنے ساتھیوں میں سب سے اچھے کھلاڑی تسلیم کئے جاتے تھے۔ ان کے ہم جولی انہیں اپنا استاد مانتے تھے اور خود محمد علی بھی اپنے آپ کو اپنے ساتھیوں سے برتر خیال کرتے تھے۔ وہ بچپن ہی میں نہایت ذہین اور چاق چوبند تھے۔ نو سال کی عمر میں محمد علی کو پرائمری اسکول میں بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد سندھ مدرسۃ الاسلام میں داخل کر دیا گیا۔ انہوں نے چند ماہ انجمن اسلام بمبئی میں بھی تعلیم حاصل کی اس کے بعد پھر سندھ مدرسہ میں داخل ہو گئے۔ اسی زمانے میں انہیں گھوڑے کی سواری کا شوق پیدا ہوا اور وہ جلد ہی اچھے شہ سوار بن گئے۔ ان کی عمر پندرہ سال کی تھی کہ وہ چرچ مشنری سوسائٹی ہائی اسکول میں داخل کر دیئے گئے۔ اسی سال یعنی ۱۸۹۲ء میں اسماعیلی خوجوں کے ایک خاندان میں ایمی بائی نامی ایک لڑکی سے ان کی شادی کر دی گئی۔ اس وقت ان کی عمر سولہ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی۔

انگلستان کو روانگی

محمد علی جناح کے والد جناح پونجا بھائی کراچی کے ممتاز تاجر تھے اور چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا کسی لائق ہو کر اس وسیع کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔ لیکن محمد علی جناح کو کرکٹ اور گھڑسواری سے زیادہ دلچسپی تھی مگر عجیب بات یہ ہے کہ تعلیم کی طرف بہت کم توجہ دینے کے باوجود وہ کسی جماعت میں فیل نہیں ہوئے۔ یہ امر ان کی غیر معمولی ذہانت پر دلالت کرتا ہے۔ بہرحال ان کے والد ان کے بارے میں فکرمند رہتے تھے۔ انہی دنوں جناح پونجا کے ایک انگریز دوست فریڈرک لیہہ کرافٹ نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنے بیٹے کو قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان بھیج دیں۔ کچھ غور و خوض کے بعد انہوں نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور پھر ۱۸۹۲ء کی ایک خوشگوار صبح کو کراچی کی بندرگاہ سے وہ تاریخی جہاز انگلستان کی طرف روانہ ہو گیا جس میں سولہ سال کا وہ دبلا پتلا نوجوان محمد علی جناح سوار تھا جسے ایک دن کشتیٔ ملت کا ناخدا بننا تھا۔ لندن پہنچ کر انہوں نے قانون کی کئی درس گاہوں کے چکر لگائے۔ خود ان کا بیان ہے کہ ایک روز میں قانون کی مشہور درس گاہ "لنکن" پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے دروازے پر دنیا کے مشہور قانون دانوں کی ایک فہرست کندہ تھی جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسم گرامی بھی شامل تھا۔ میرے دل میں حضور کی بے حد عزت تھی اس لئے میں نے لنکن میں داخلہ لے لیا کیونکہ اس کے دروازے پر آنحضرت کا اسم گرامی دنیا کے عظیم قانون ساز کی حیثیت سے درج تھا۔

انگلستان کی زندگی

انگلستان محمد علی جناح کے لئے نیا ملک تھا۔ ایک نیا معاشرہ، نئی تہذیب، نئی قوم، نیا ماحول اور غیر مانوس بلکہ تکلیف دہ موسم مگر انہوں نے جلد ہی اس غیر مانوس ماحول سے مطابقت پیدا کر لی انہوں نے ۱۸۹۳ء میں لنکن میں داخلہ لیا اور دو سال کے قلیل عرصے میں قانون کا اعلیٰ امتحان پاس کر لیا۔ اس وقت ان کی عمر ۱۸ سال سے زیادہ نہ تھی۔ لنکن کے قواعد و ضوابط کے مطابق امتحان پاس کر لینے کے باوجود انہیں مزید دو سال وہاں قیام کرنا پڑا۔ لندن کے قیام کے دوران میں انہوں نے لہو و لعب حتیٰ کہ کھیل کود میں بھی کوئی دلچسپی نہ لی۔ ان کی توجہ کا سارا مرکز قانون کی تعلیم تھی یا برطانوی دارالعوام جہاں جا کر وہ بڑے انہماک اور توجہ سے برطانوی سیاست دانوں کی تقریریں سنا کرتے تھے۔ برطانیہ کے بہت سے آزاد خیال سیاسی لیڈروں سے محمد علی جناح کے تعلقات تھے۔ ان انگریز سیاست دانوں سے سیاسی امور پر ان کا اکثر تبادلۂ خیال ہوتا رہتا تھا۔ اس طرح ان کی سیاسی تربیت ہوتی رہی۔ ان کی

فکر و نظر میں بیس سال کی عمر کو پہنچنے سے قبل ہی پختگی پیدا ہو گئی۔ ان کے خیالات میں وسعت، وطن کی آزادی کا ولولہ اور سیاسی میدان میں اترنے کا جذبہ انگلستان کے دوران قیام ہی میں پیدا ہوا۔ جب انہوں نے انگلستان کی ایک آزاد قوم کی تعلیمی، معاشی اور سماجی حالت کا اپنی قوم کے حالات سے مقابلہ کیا جو ہندو اور انگریز کی دوہری غلامی میں جکڑی ہوئی تھی۔

انہی دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے محمد علی جناح کے سیاسی خیالات میں طوفان برپا کر دیا۔ یہ واقعہ مشہور سیاسی رہنما دادا بھائی نوروجی کے انتخاب سے تعلق رکھتا ہے جو لندن میں تجارت کے سلسلے میں مقیم تھے۔ انہوں نے ایک حلقے سے دارالعوام کا انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ لندن کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ ایک ہندوستانی دارالعوام کے رکن کی حیثیت سے انتخاب لڑنے کھڑا ہوا تھا۔ انگریزوں کو یہ بات نہایت ناگوار گزری اور برطانوی وزیر اعظم لارڈ سالسبری نے دادا بھائی نوروجی کو کالا آدمی[1] کہہ کر ہندوستانیوں کی تحقیر کی۔ اس واقعے کا محمد علی جناح پر نہایت گہرا اثر ہوا اور انہوں نے لندن میں مقیم ہندوستانی طلبا کے ساتھ مل کر دادا بھائی نوروجی کی حمایت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ آخر محمد علی جناح اور ہندوستانی طلبہ کی کوششیں بار آور ہوئیں اور دادا بھائی نوروجی کامیاب ہو گئے۔ یہ عملی سیاست میں محمد علی جناح کی پہلی شرکت تھی۔ دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے انگریزوں کے خلاف یہ سیاسی جنگ خود انگریزوں کے وطن میں لڑی۔ اس واقعے نے انہیں دادا بھائی نوروجی سے متعارف کرایا جو ہندوستان کے ایک بزرگ سیاست دان تھے۔ بعد میں محمد علی جناح کی سیاسی تربیت میں سب سے زیادہ حصہ دادا بھائی نوروجی نے لیا کیونکہ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ نوجوان غیر معمولی دل و دماغ، غیر معمولی ذہانت و فراست اور غیر معمولی عزم و حوصلہ کا انسان ہے۔

وطن کو واپسی

لندن میں چار سال گزار کر اور بیرسٹری کی ڈگری لے کر ۱۸۹۶ء میں محمد علی جناح وطن واپس آ گئے لیکن یہاں پہنچ کر انہیں ناخوشگوار حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی والدہ وفات پا چکی تھیں۔ شریک حیات بھی داغ مفارقت دے گئی تھیں۔ والد کا کاروبار خراب ہو گیا تھا۔ وکیل کی حیثیت سے ابھی ان کا کوئی مقام نہ تھا۔ اب ان کے لئے ایک ہی صورت تھی کہ حالات سے مصالحت کرنے کے لئے کسی فرم میں قانونی منیجر کی حیثیت سے ملازمت کر لیں۔ انہیں ملازمت کی پیش کش بھی ہوئی مگر انہوں نے یہ پیش کش رد کر دی کیونکہ حالات

---

[1] محمد علی جناح مصنف ہیکٹر بولائتھو

کے سامنے سپر انداز ہونا ان کی فطرت کے عین خلاف تھا اور یہ ہو بھی کیسے سکتا تھا کہ وہ شخص جسے اپنی آئندہ زندگی میں بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرنا تھا اور زمانے کے ساتھ چلنے کی بجائے زمانے کو اپنے ساتھ چلانا تھا وہ عملی زندگی کی پہلی ہی منزل میں حالات سے مصالحت کر لیتا۔ چنانچہ انہوں نے کراچی سے رخت سفر باندھا اور ۱۸۹۷ء میں بمبئی پہنچ گئے تاکہ ایک آزاد وکیل کی حیثیت سے وہ اپنی عملی زندگی کا آغاز کر سکیں جس کا وہ وطن روانہ ہونے سے قبل فیصلہ کر چکے تھے۔ مگر بمبئی میں بھی حوصلہ شکن حالات نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور کامل تین سال تک انہیں کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ لیکن بیکاری اور بے روزگاری کا یہ زمانہ جناح نے کف افسوس ملنے میں صرف نہیں کیا۔ خوش قسمتی سے مسٹر میکفرسن اس بیکار لیکن خوددار نوجوان پر مہربان ہو گئے۔ موصوف بمبئی کے قائم مقام ایڈووکیٹ جنرل تھے۔ بڑے قابل اور شریف انسان۔ اپنی قیمتی اور نایاب لائبریری کے دروازے انہوں نے جناح کے لئے کھول دیئے[۱]۔ جناح نے بیکاری کا وقت اس طرح کاٹا کہ پوری مستعدی اور انہماک کے ساتھ قانون و آئین کے مطالعے میں مصروف ہو گئے۔ مالی اعتبار سے یہ دور ان کی ناکامی کا دور تھا لیکن علمی اور ذہنی اعتبار سے یہ دور خوش بختی اور کامرانی کا دور تھا۔ بے شک جناح کو اس تین برس کی طویل مدت میں کوئی مقدمہ نہ ملا۔ لیکن بیکاری کے اس طویل زمانے میں اس نے اپنے ذہن اور دماغ کو جلا دی۔ وہ علم وہ تجربہ حاصل کر لیا جو کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے اور آگے چل کر اس علم اور اس تجربہ سے پورا پورا فائدہ بھی اٹھایا۔

آخر سن ۱۹۰۰ء میں ان کی قسمت نے یاوری کی اور وہ بمبئی کے پریذیڈنسی مجسٹریٹ کا عہدہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ عارضی ملازمت تھی مگر اس عرصے میں انہوں نے اپنے فرائض اس خوش اسلوبی، قابلیت، مستعدی اور دیانت داری سے سرانجام دیئے کہ جب ان کی مدت ملازمت ختم ہو گئی تو محکمہ قانون کے ممبر سر چارلس اولی وینیٹ نے انہیں ڈیڑھ ہزار روپے کی ایک ملازمت پیش کی مگر انہوں نے یہ کہہ کر یہ پیشکش مسترد کر دی کہ اتنی رقم تو میں ایک دن میں کمانا چاہتا ہوں۔ دراصل یہ ملازمت انہوں نے حالات کو سازگار بنانے اور اپنی معاشی پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے کی تھی۔ اس کا دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ وہ قانونی حلقوں میں متعارف ہو جائیں۔ چنانچہ انہیں اس مقصد میں پوری طرح کامیابی حاصل ہوئی اور ملازمت سے مستعفی ہوتے ہی لوگ اپنے مقدمات لے کر ان کے پاس آنے لگے۔ انہوں نے ایک نہایت آراستہ و پیراستہ دفتر قائم کیا اور وکالت کا آغاز کر دیا۔ زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ ان کی قانون دانی

---

[۱] حیات محمد علی جناح ص ۳۶، ۳۵ مولفہ سید رئیس احمد جعفری ندوی

کی دھوم مچ گئی اور ان کا شمار بمبئی کے چوٹی کے بیرسٹروں میں ہونے لگا۔ انہوں نے اپنے والد اور بھائی بہنوں کو کراچی سے بمبئی بلا لیا اور ان کی کفالت اپنے ذمہ لے لی۔

سیاسی زندگی کا آغاز

کہتے ہیں کہ انسان کے ذہن پر جو نقوش ابتداء میں ثبت ہوتے ہیں ان کے اثرات نہایت دیرپا ہوتے ہیں اور بعض لوگوں کی لوحِ ذہن سے وہ آخر تک محو نہیں ہوتے۔ محمد علی جناح بھی انسان تھے اور صاحبِ دل انسان اس لئے ان کے ذہن پر قیامِ انگلستان کے زمانے میں مشہور کانگرسی رہنما دادا بھائی نوروجی کی شخصیت کے جو نقوش ثبت ہوئے تھے ان کا اثر آخر تک قائم رہا۔ وہ دادا بھائی نوروجی سے نہایت گہری عقیدت رکھتے تھے۔ انہوں نے اس بزرگ سیاست داں سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ محمد علی جناح بہت کچھ تھے سب کچھ تھے مگر پہلے شرافتِ نفس کا پیکر تھے پھر کچھ اور۔ اس لئے وہ آخر تک ان کی عزت کرتے رہے اور انہی کے زیرِ اثر وہ کانگرس میں شریک ہوئے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ادھر ان کی وکالت کے کامیاب دور کا آغاز ہوا اور ادھر ان کی سیاسی زندگی کی ابتدا ہوئی۔ ۱۹۰۶ء تک وہ وکالت کے میدان میں شہرت حاصل کر چکے تھے اور ۱۹۰۶ء ہی میں کلکتہ کے مقام پر کانگرس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ دادا بھائی نوروجی اس اجلاس کے صدر منتخب ہوئے اور محمد علی جناح ان کے پرنسل سیکرٹری کی حیثیت سے اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ یہ ہندوستان میں محمد علی جناح کی پہلی سیاسی سرگرمی تھی۔ اس عہد تک ان کا ذہن ہندو مسلم مسئلہ کے متعلق ایک اور انداز سے سوچتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک ہندوستان کی یہ دو بڑی قومیں متحد نہیں ہوں گی اس وقت تک اہلِ ہند اپنے سیاسی حقوق حاصل نہیں کر سکیں گے اور یقیناً ان کے اس اندازِ فکر میں دادا بھائی نوروجی کی تربیت کو بڑا دخل تھا۔

سفیرِ اتحاد

محمد علی جناح دادا بھائی نوروجی کے علاوہ ہندوؤں کے شریف رہنما مسٹر گوکھلے سے بھی بہت متاثر تھے۔ ایک بار تو انہوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ میری خواہش ہے کہ میں مسلمانوں کا گوکھلے بن جاؤں اور گوکھلے نے محمد علی جناح کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا تھا کہ "مسٹر جناح بلا شبہ شمعِ آزادی کے پروانے ہیں۔ ان کی وسیع النظری اور فرقہ وارانہ جذبات سے بالا شخصیت اس قابل ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے سفیر ہوں۔" ان کے دل میں ایک اور ہندو رہنما مسٹر سریندر ناتھ بنرجی سے بھی گہری عقیدت تھی۔ وہ ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور سیاست میں انہیں اپنا پہلا استاد تسلیم کرتے تھے۔ چنانچہ اپنی ایک تقریر

میں انہوں نے کہا تھا کہ :-

"میں نے سیاست کا پہلا سبق سر سریندر ناتھ بینر جی کے قدموں میں بیٹھ کر پڑھا۔ میں نے ان کے ساتھ ایک پیرو کی طرح زندگی بسر کی ہے اور میں انہیں اپنا رہنما تسلیم کرتا ہوں۔ ہندوستان میں بے شمار لوگ ہیں جو میری طرح ان کا احترام کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مردِ عظیم سے جو سبق حاصل کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم متحد ہو کر ہی نجات حاصل کر سکتے ہیں۔[1]"

غیر مسلم رہنماؤں سے گہری عقیدت اور ان کے متعلق محبت آمیز الفاظ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محمد علی جناح کی فطرت متعصبانہ جذبات سے پاک تھی۔ وہ ہر اس شخص کی عزت کرتے تھے جو انسانیت کا خادم اور آزادیٔ وطن کا سچا علمبردار ہو۔ وہ فرقہ وارانہ نقطۂ نگاہ کی بجائے انسانیت کے نقطۂ نظر سے سوچتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۰۵ء کے اجلاس کانگرس میں شرکت کرنے کے بعد وہ اس جماعت سے وابستہ ہو گئے اور یہ وابستگی خاصی طویل ثابت ہوئی۔ انہوں نے اس جماعت کو اپنی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز اسی لئے بنایا کہ اس میں بعض ایسے لوگ بھی شامل تھے جو غیر مسلم ہونے کے باوجود شریف النفس، غیر متعصب اور اہلِ ہند کے حقیقی خیر خواہ تھے جن سے محمد علی جناح کو عقیدت تھی اور جو محمد علی جناح کو نہایت عزیز رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان لوگوں کے ذریعے وہ کانگرس کے فرقہ پرست اور متعصب عناصر کے خیالات کی اصلاح کر سکیں گے اور کانگرس کو غیر فرقہ وارانہ جماعت بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے "محمد علی جناح" نامی کتاب کے انگریز مصنف مسٹر ہیکٹر بولائیتھو نے ایک بات بڑے پتے کی کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "محمد علی جناح انگلستان جانے کی بجائے اگر علی گڑھ کالج میں تعلیم حاصل کرتے تو وہ ہندوؤں سے مسلمانوں کی علیحدگی کا نظریہ جلد قائم کر لیتے۔ مگر ان کی سیاسی بیداری کا عمل برطانوی دار العوام میں شروع ہوا۔ یہاں آزاد سیاست کے علمبردار گلیڈسٹن کے خیالات نے ان کے دل و دماغ کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا کانگرس میں ان کی شرکت انہی خیالات کا نتیجہ تھی۔ اگر انہوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی ہوتی تو وہ بھی مسلمان مدبروں کی اس جماعت میں شامل ہوتے جو اس درس گاہ سے ابتدا میں فارغ التحصیل ہو کر نکلے اور ممکن تھا کہ وہ نوجوانی کے زمانے ہی میں سر سید کی سیاسی پیش گوئی پر عمل کرتے لیکن انہوں نے انگلستان میں تربیت پائی جہاں کا سیاسی اندازِ فکر بہت مختلف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جناح سر سید کے سیاسی افکار

---

[1] قائدِ اعظم جناح — دی اسٹوری آف اے نیشن صفحہ ۶۲ مولفہ جی الانا

کے اثرات سے آزاد رہے اور انہوں نے یہ اثرات بہت عرصے کے بعد قبول کئے جب وہ بڑھاپے کے قریب پہنچ چکے تھے۔[۱]"

گویا محمد علی جناح کی کانگرس میں شمولیت کے متعدد اسباب تھے۔ اول غیر مسلم سیاست دانوں سے ان کی گہری عقیدت اور ان سے شاگردانہ تعلقات۔ دوم ان کی فطری غیر فرقہ واریت۔ سوم علی گڑھ کی بجائے ان کی انگلستان میں تعلیم جہاں سیاسی مسائل کو فرقہ وارانہ نقطۂ نظر کی بجائے وسیع اور آزادانہ نقطۂ نظر سے حل کیا جاتا تھا۔ بہر حال ان سب امور نے انہیں کانگرس سے قریب کر دیا اور اس جماعت کے پلیٹ فارم پر انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارا اور اپنی بہترین صلاحیتیں کانگرس کو پروان چڑھانے اور ہندو مسلم اتحاد کی کوشش میں صرف کر دیں۔

مسلم لیگ میں شمولیت

۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۱ء تک محمد علی جناح مکمل طور پر کانگرس سے وابستہ رہے اور انہوں نے کسی ایسی جماعت کی رکنیت قبول نہیں کی جو مذہبی بنیادوں پر قائم ہوئی تھی۔ مگر جب تقسیم بنگال کے خلاف ہندوؤں نے نہایت اشتعال انگیز مظاہرے کئے اور خود کانگرسی رہنماؤں نے ان مظاہروں کی حمایت کی تو محمد علی جناح کے خیالات میں پہلی بار تبدیلی پیدا ہوئی۔ کم و بیش چھ سال وہ تقسیم بنگال کے نتائج پر غور و خوض اور اس کے خلاف ہندوؤں کی ہنگامہ آرائی کا مشاہدہ کرتے رہے۔ اور جب ۱۹۱۱ء میں جارج پنجم نے تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان کیا اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے عام مسلمانوں اور ان کے اکابر کا ردِ عمل دیکھا تو انہیں مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم کی ضرورت کا احساس ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ انگلستان کے زمانۂ قیام میں جب مولانا محمد علی جوہر اور سید وزیر حسن سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ نے انہیں لیگ میں شمولیت کی دعوت دی تو انہوں نے اس کی رکنیت قبول کر لی اور بلاشبہ ان کی مسلم لیگ میں شمولیت اس جماعت میں نئی زندگی پیدا کرنے کا موجب ہوئی۔ لیکن مسلم لیگ میں شامل ہونے کے باوجود ان کی کانگرس سے وابستگی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ دراصل ان کی مسلم لیگ میں شمولیت کے کئی مقاصد تھے۔ وہ کئی سال تک ہندو ذہنیت اور بعض کانگرسی رہنماؤں کے فرقہ وارانہ طرزِ عمل کا مشاہدہ کر چکے تھے اور انہیں خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کانگرس کے ہاتھوں کہیں مسلمانوں کے سیاسی مفادات پامال نہ ہو جائیں اس لئے وہ چاہتے تھے کہ ملک میں ایک ایسی جماعت موجود ہو جو خالص مسلمانوں کی تنظیم ہو اور صرف مسلمانوں

---

[۱] محمد علی جناح ——— مصنفہ ہیکٹر بولائتھو

کے مفادات اور ان کے مسائل کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ کانگرس کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ میں شامل ہو کر دونوں جماعتوں بلکہ دونوں قوموں (ہندوؤں اور مسلمانوں) کو ایک دوسرے کے قریب لانا چاہتے تھے اور یہ اسی وقت ہو سکتا تھا جب ان کا دونوں جماعتوں سے تعلق ہوتا اور دونوں تنظیمیں ان کی آواز کو اپنی آواز قرار دیتیں۔ مسلم لیگ میں ان کی شمولیت کا تیسرا مقصد یہ تھا کہ وہ ایک ایسی مسلم جماعت کا قیام ضروری سمجھتے تھے اور اس سے اپنا تعلق قائم رکھنا چاہتے تھے جو آگے چل کر مسلمانوں کی ملک گیر تحریک کی صورت اختیار کر سکے۔ خصوصاً اس وقت جب کانگرس مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت کرنے میں ناکام ہو جائے۔
گو محمد علی جناح نے مسلم لیگ میں باقاعدہ شمولیت ۱۹۱۳ء میں اختیار کی مگر ان کی لیگ میں باقاعدہ شرکت سے قبل بھی مسلم لیگی رہنما انہیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کی سیاسی بصیرت کے پیش نظر مسلمانان ہند کے مسائل حل کرنے کے سلسلے میں ان کی رہنمائی ضروری سمجھتے تھے چنانچہ مسلم لیگ کے جو اجلاس ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۱ء میں منعقد ہوئے ان میں محمد علی جناح کو شرکت کی دعوت دی گئی پھر ۱۹۱۲ء میں مسلم لیگ کا جو اجلاس سر آغا خاں کی زیر صدارت منعقد ہوا اس میں بھی محمد علی جناح کو مدعو کیا گیا اور وہ اجلاس میں شریک بھی ہوئے، پھر ۱۹۱۳ء کے اجلاس میں بھی جو لکھنؤ میں منعقد ہوا انہوں نے شرکت کی اور انہی کی کوشش اور تجویز سے مسلم لیگ کا سیاسی نصب العین یہ قرار پایا کہ ایسے آئینی طریقے اختیار کئے جائیں جن سے تاج برطانیہ کے زیر سایہ اہل ہند کو حکومت خود اختیاری حاصل ہو جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے عوام کا تعاون حاصل کیا جائے اور ملکی انتظام کے ڈھانچے میں ضروری اور مناسب اصلاح کی جائے۔ محمد علی جناح ہی کی کوشش سے مسلم لیگ کے اس اجلاس میں ہندو مسلم اتحاد کے متعلق ایک قرارداد منظور کی گئی۔

ہندو مسلم اتحاد کی ایک جرأت مندانہ کوشش

مسلم لیگ میں شمولیت کے بعد ہی محمد علی جناح کی سیاسی زندگی میں تلاطم پیدا ہو گیا۔ انہیں احساس تھا کہ وہ بیک وقت ملک کی دو بڑی جماعتوں سے وابستہ ہیں۔ اس لحاظ سے ان پر دہری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ایک طرف مسلمانوں کی صحیح رہنمائی اور دوسری طرف کانگرس کو فرقہ وارانہ جماعت بننے سے روکنا۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت کو اس کی غیر ذمہ دارانہ اور سفاکانہ حرکات سے باز رکھنا اور تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے یہ فرائض نہایت قابلیت اور مستعدی سے ادا کئے۔ انہوں نے حتی المقدور کوشش کی کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے قریب آ جائیں تاکہ ہندوستان کی دونوں قومیں متحدہ طور پر انگریزوں سے

اپنے حقوق کے لئے جنگ کر سکیں۔ وہ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمگیر جنگ کی وجہ سے مسلم لیگ کا اجلاس منعقد نہ ہو سکا۔ ۱۹۱۵ء میں کانگرس کا سالانہ جلسہ بمبئی میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس موقع پر محمد علی جناح نے تحریک کی کہ مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ بھی انہی دنوں بمبئی میں منعقد کیا جائے تاکہ دونوں جماعتوں کے رہنما ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ تعاون کرنے کی راہیں تلاش کر سکیں۔ اس اجلاس کے انعقاد کی اصل وجہ یہ تھی کہ حکومت اہلِ ہند کو کچھ سیاسی حقوق دینا چاہتی تھی۔ محمد علی جناح کی کوشش یہ تھی کہ سیاسی حقوق یا اصلاحات کا اعلان ہونے سے قبل ہندو اور مسلمان چند نکات پر متفق ہو جائیں تاکہ حکومت کے سامنے اہلِ ہند متفقہ طور پر اپنا نقطۂ نگاہ پیش کر سکیں۔ چنانچہ انہوں نے اس مقصد کے لئے اہل الرائے اصحاب کا ایک اجلاس اپنے مکان پر طلب کیا اور اس میں یہ تجویز پیش کی جو متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔ لیکن اس تجویز کے منظور ہوتے ہی ہندو اور بعض سرکار پرست مسلمان گھبرا گئے۔ ان میں کچھ ایسے مسلمان بھی تھے جو خلوصِ دل سے یہ سمجھتے تھے کہ اگر کانگرس اور مسلم لیگ میں کوئی پائدار مفاہمت ہو گئی تو اس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا اور مسلم لیگ کانگرس کی حاشیہ بردار بن جائے گی۔ بہرحال ان ملے جلے جذبات کی ہنگامہ خیز فضا میں مسٹر مظہر الحق بیرسٹر ایٹ لا (پٹنہ) کی زیر صدارت ۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء کو یہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی ایک قابلِ ذکر خصوصیت یہ تھی کہ اس میں محمد علی جناح کی کوشش سے بعض قابلِ ذکر غیر مسلم رہنما بھی شریک ہوئے، جیسے پنڈت مدن موہن مالوی، سر سریندر ناتھ بنرجی، مسٹر گاندھی، مسز سروجنی نائیڈو، لارڈ سنہا، سر ڈنشا واچا اور مسٹر بی جی ہارنی مین۔ مگر جس کا اندیشہ تھا وہی ہوا۔ بعض مسلمانوں مثلاً انجمن ضیاء الاسلام کے سیکرٹری مولوی عبد الرؤف پٹھان عبد الصمد خاں، سر حاجی سلیمان قاسم مٹھا اور سردار سلیمان نے جو جلسہ گاہ میں پہلے سے موجود تھے ہنگامہ آرائی شروع کر دی اور مسلمانوں کے جلسے میں ہندو رہنماؤں کی موجودگی پر سخت احتجاج کیا۔ مسلمانوں کا ایک گروہ اسٹیج کی طرف لپکا اور بعض لوگوں نے سخت غیظ و غضب کی حالت میں چیخنا شروع کر دیا کہ یہ سب کانگرسی ہیں اور مسلم لیگ کے وقار کو خاک میں ملا رہے ہیں۔ یہ کانگرس کے اشاروں پر چل رہے ہیں۔ آخر ہنگامہ اتنا بڑھا کہ صدر جلسہ کو جلسہ برخاست کرنا پڑا۔

مگر یہ جلسہ محمد علی جناح کے ایما پر منعقد ہوا تھا جنہیں شکست کھانا آتا ہی نہ تھا اور پروگرام کو نامکمل چھوڑنا ان کی فطرت کے قطعی خلاف تھا۔ چنانچہ ان کی تجویز پر یہ برخاست شدہ اجلاس تاج محل ہوٹل میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں محمد علی جناح نے تقریر کی اور اپنی تجویز پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"ہندوستان کے آئین میں نئی تبدیلی ہونے والی ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہندوستان کی

دونوں سیاسی جماعتیں مسلم لیگ اور کانگریس کوئی ایسی اسکیم تیار کریں جس میں مسلمانوں کی ضروریات و تحفظ کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہو پھر رپورٹ حکومت کی خدمت میں پیش کی جائے یہی متحدہ ہندوستان کے مطالبات ہیں[۱]"

مولوی فضل الحق اور مولانا ابو الکلام آزاد نے محمد علی جناح کی اس تجویز کی تائید کی۔ اس تجویز پر عمل درآمد کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں ہر صوبے سے مسلمان نمائندے شریک کئے گئے مثلاً راجہ صاحب محمود آباد (سر علی محمد خاں) سر رضا علی، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، سر وزیر حسن، سر شفیع، سر فضل حسین، مولانا ظفر علی خاں، مولوی فضل الحق، مولانا ابو الکلام آزاد، سر آغا خاں، سر ابراہیم رحمت اللہ، سیٹھ یعقوب حسن، سر علی امام، مسٹر مظہر الحق، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی جوہر اور محمد علی جناح[۲]

اس طرح حکومت اور سرکار پرست مسلمانوں کی کوششیں ناکام ہو گئیں اور نحیف و نزار محمد علی جناح نے اپنی بے مثال جرأت سے گوناگوں خطرات کے باوجود یہ جلسہ پہلے کھلے میدان میں منعقد کرایا اور جب اس میں ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہنگامہ آرائی کی گئی تو اس کی کارروائی تاج محل ہوٹل میں مکمل کی گئی۔ مسٹر اے رؤف اس پہلے دن کے اجلاس کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء کو تیسرے پہر جس جذبہ اور جوش و خروش کا منظر نگاہوں سے گذرا ایسے مناظر کے نمونے تاریخ میں شاذ ہی نظر آئیں گے۔ تالیوں کی پُر زور گونج اور نعرہ ہائے خروش میں ممتاز کانگریسی رہنما اپنی نشستوں سے اٹھے اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کو گلے لگا لیا[۳]"

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہندو مسلم مسئلے کے متعلق محمد علی جناح کا نقطۂ نظر ایک عرصے تک کیا تھا اور وہ کس خلوص سے کوشش کر رہے تھے کہ ہندوستان کی یہ دونوں بڑی قومیں اپنے اختلافات دور کر کے ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو جائیں۔

میثاقِ لکھنؤ

میثاقِ لکھنؤ برصغیر کی سیاسی تاریخ کا نہایت اہم باب ہے۔ خصوصاً مسلمانانِ ہند کے سیاسی سفر

ف۱ تاریخِ مسلم لیگ صفحہ ۲۰۷، مولفہ سید رئیس احمد جعفری ندوی

ف۲ تاریخِ مسلم لیگ صفحہ ۲۰۷

ف۳ میٹ ٹو مسٹر جناح صفحہ ۵۴ مصنفہ اے، رؤف

میں اسے ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے بلکہ اسے ایک تاریخی موڑ کہنا زیادہ درست ہے۔ جہاں سے مسلمانوں نے اپنی منزل کا تعین کیا اور بلاشبہ اس کارنامہ کا سہرا بھی اسی مردِ آہن اور صاحبِ فکر و تدبر کے سر بندھتا ہے جس کا نام محمد علی جناح تھا۔ بمبئی میں مسلم لیگ اور کانگرس کے اجلاسوں میں ہندو مسلم اتحاد کی جو کوششیں کی گئی تھیں ان کے نتیجے میں برعظیم کی سیاسی فضا نہایت خوشگوار ہوگئی تھی اور کانگرس کا متعصب اور فرقہ عنصر شکست کھاکر دب گیا تھا۔ محمد علی جناح کا لگایا ہوا درخت بار آور ہونے لگا تھا۔ اگلے سال ۳۱ دسمبر ۱۹۱۶ء کو لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک اور اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت محمد علی جناح نے کی۔ اس اجلاس میں وہ اسکیم منظور کرلی گئی جسے "میثاق لکھنؤ" کہتے ہیں۔ اس کے بعد لکھنؤ ہی میں ۲۶ دسمبر ۱۹۱۶ء کو مسٹر امبیکا چرن مزمدار کی زیرِ صدارت کانگرس کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں محمد علی جناح کی اس اسکیم کی توثیق کردی گئی جسے مسلم لیگ منظور کر چکی تھی۔ ذیل میں اس اسکیم یعنی میثاقِ لکھنؤ کے اہم نکات درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) ہر بڑے صوبے کی مجلسِ آئین ساز کے ارکان و اعضا کی تعداد ۱۰۰ سے ۱۲۵ تک ہونی چاہیئے چھوٹے صوبوں میں یہ تعداد ۵۰ سے ۷۵ تک محدود رہنی چاہیئے۔ ہر صورت میں ۴/۵ تعداد ارکان بہت وسیع رائے دہندگان کے اصول پر منتخب ہوگی۔ مسلمانوں کے تحفظِ حقوق کے سلسلے میں یہ اصول ملحوظ رہے کہ ان کی نشستیں محفوظ کردی جائیں جن کا اصول یہ ہو۔

پنجاب میں مسلمانوں کو ۵۰ فیصد نشستیں دی جائیں، بنگال میں ۴۰ فیصد۔ بہار میں ۲۵ فیصد۔ سی پی میں ۱۵ فیصد، مدراس میں ۱۵ فیصد اور بمبئی میں ۳۳ فیصد نشستیں مسلمانوں کے لئے محفوظ کردی جائیں۔

اگر کسی اقلیت کے پہلے منتخب ارکان کسی تجویز کی اپنے ملی مفاد و داعیاتِ قومی کے پیشِ نظر مخالفت کریں تو اس تجویز کو پیش نہیں کیا جائے گا۔ صوبہ جاتی مجالسِ آئین ساز کے صدر منتخب ہوں گے۔ یہ مجالس اپنی ذمہ داری پر قرض لینے اور محصولات میں تغیر و تبدل کی مجاز ہوں گی۔ میزانیہ مجلس منظور کرے گی، نیز مجلس آئین کی تمام تجاویز اگزیکٹو (حکام و عمال) کے لئے واجب التعمیل ہوں گی۔

(۲) کسی صوبہ کا گورنر یا لفٹننٹ گورنر سویلین نہیں ہوگا۔ اس کی مجلس مشورہ میں نصف ارکان ہندوستانی ہونے چاہیئیں جو مجلسِ آئین ساز کے منتخب ممبروں میں سے ہوں گے۔ ان کی میعادِ عہدہ پانچ سال ہوگی۔

(۳) مرکزی مجلسِ آئین ساز ۱۵۰ ارکان پر مشتمل ہوگی جس کے ارکان و اعضا کا انتخاب صوبائی مجالسِ آئین ساز کے ممبر کریں گے۔ اس کا صدر بھی منتخب ہوگا (نہ کہ نامزد) اس میں وہ مسائل پیش ہوا کریں

گے جن کا تعلق تمام ہندوستان سے ہوگا۔

(۴) گورنر جنرل کی مجلسِ وزرا میں نصف ارکان ہندوستانی ہوں گے۔ حتی الامکان سول سروس کے ارکان کا کابینہ کے عہدوں پر تقرر نہیں کیا جائے گا۔

(۵) وزیرِ ہند اور انڈیا کونسل کی اصلاح لے

اس اسکیم کا ایک سرسری جائزہ لینے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مسلمان نقصان میں رہے کیونکہ پنجاب اور بنگال میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی ان کی نشستیں کم ہوگئیں۔ پنجاب میں وہ غیر مسلموں کے مساوی کر دیئے گئے اور بنگال میں ۴۰ فیصد نشستیں دے کر ان کی واضح اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس دور کے بعض مسلمانوں نے جو محمد علی جناح کے مخالف تھے اس اسکیم پر یہی اعتراض کیا اور بعد کے زمانے میں بھی مخالفین نے اسی اعتراض کو دہرایا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتراض کم فہمی کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ بنگال اور پنجاب میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی ان کی کچھ نشستیں کم ضرور ہوگئیں مگر اس کے ساتھ ساتھ جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں تھے وہاں ان کو ان کے تناسب سے زیادہ نشستیں مل گئیں اس طرح ان صوبوں کے ایوانوں میں ان کی حقیر آواز موثر ہوگئی۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ کانگرس نے مسلمانوں کا جداگانہ حقِ نیابت تسلیم کر لیا اور یہی محمد علی جناح کی سب سے بڑی فتح تھی، اسی اصول پر مسلمانوں کی آئندہ سیاست کا قصرِ عالیشان تعمیر کیا گیا اور یہی اصول مسلمانوں کی آئندہ کامیابی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

لے تاریخ مسلم لیگ ص ۷۵، ۷۶ مولفہ سید رئیس احمد جعفری ندوی

برِصغیر کی سیاست کا ہنگامہ خیز دَور

۱۹۱۶ء کے بعد ہندوستان کی تاریخ ایک نئے دور میں داخل ہوتی ہے۔ مسلمانوں کا جداگانہ حقِ نیابت تسلیم کئے جانے کے علاوہ اس دور میں بعض ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے برصغیر کی سیاست پر عموماً اور مسلمانانِ ہند پر خصوصاً نہایت گہرے اثرات ڈالے۔ اسی دور میں مطلعِ سیاست پر بعض ایسی سیاسی شخصیتیں ابھریں جن میں سے کچھ پہلے صرف خواص سے آشنا تھے اور بعض بالکل نئی تھیں۔ یہی دور ہے جب پہلی جنگِ عظیم انگریزوں کی کامیابی پر ختم ہوئی اور بجائے اس کے کہ اس جنگ میں انگریزوں کی امداد کرنے پر اہلِ ہند کو کچھ مراعات دی جاتیں اُلٹی اُن کی شہری آزادیوں پر ضربِ کاری لگائی گئی۔ اسی دور میں کانگرس پوری طرح بے نقاب ہوئی۔ اسی دور میں ہندو مسلم اتحاد کا خواب خود کانگرسی رہنماؤں اور فرقہ پرست ہندو جماعتوں کے ہاتھوں خوابِ پریشاں بن گیا۔ اسی دور میں قائدِاعظم ایک جری دل اور انگریز دشمن رہنما کی حیثیت سے خواص کے علاوہ عوام سے بھی روشناس ہوئے۔ اسی دور میں ان کے عوامی رہنما بننے کے لئے فضا سازگار ہوئی۔

ہوم رول لیگ اور قائدِاعظم

اس عہد کا سب سے پہلا اور بڑا واقعہ ہوم رول لیگ کا قیام ہے۔ اس کی بانی ایک انگریز خاتون مسز اینی بیسنٹ تھیں جو انگریزی زبان کی مایہ ناز انشا پرداز اور شعلہ بیان خطیب ہونے کے علاوہ برصغیر کی سیاست پر نہایت گہری نظر رکھتی تھیں۔ انہیں اہلِ ہند کے سیاسی حقوق سے گہری ہمدردی تھی اور انگریزوں نے ہندوستان میں جس قسم کا طرزِ حکومت جاری کیا تھا وہ اسے اہلِ ہند کے حق میں نہایت مضرت رساں سمجھتی تھیں۔ انہیں الٰہیات سے بھی نہایت درجہ شغف تھا۔ ہندوستان کی مشہور تنظیم "تھیا سوفیکل سوسائٹی" کی رہنما کی حیثیت سے انہیں ملک میں ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ ۱۹۱۵ء کے بعد انہوں نے ملک گیر دورے کئے اور تعلیم یافتہ طبقے کو اپنی ذہانت و قابلیت سے متاثر کیا۔ انہوں نے "نیو انڈیا" کے نام سے ایک روزانہ اخبار جاری کیا جس نے بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی۔ یکم ستمبر ۱۹۱۶ء کو مسز اینی بیسنٹ نے "ہوم رول لیگ" کے نام سے اپنی سیاسی جماعت کے قیام کا اعلان کیا۔ انہوں نے

اس انجمن کا صدر ہائی کورٹ کے ایک سابق جج سر امنی آرز کو بنایا۔ رفتہ رفتہ اس کی شاخیں ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں قائم ہوگئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں طلبا، وکیل، اساتذہ، ڈاکٹر اور اخبار نویس ہوم رول لیگ میں شامل ہوگئے۔ ہوم رول لیگ کا نصب العین یہ تھا کہ اہلِ ہند کو بلا تاخیر حکومتِ خود اختیاری کی مراعات دی جائیں تاکہ وہ ملک کے نظم و نسق میں برابر کے شریک ہوسکیں۔

انہی دنوں ہندوستان کے مشہور فرقہ پرست مسٹر تلک نے بھی ایک "ہوم رول لیگ" قائم کی۔ مگر ان کی متعصبانہ روش اور تنگ نظری کی وجہ سے یہ لیگ بری طرح ناکام ہوئی۔ البتہ مسز اینی بیسنٹ کی لیگ اس قدر مقبول ہوئی اور اس نے اتنی طاقت حاصل کرلی کہ حکومت کو اس سے خطرہ پیدا ہوگیا۔ آخر وائسرائے ہند لارڈ چیمسفورڈ کے ایما پر گورنر مدراس نے جون ۱۹۱۷ء میں مسز اینی بیسنٹ کو مع ان کے دو ساتھیوں ڈاکٹر جی ایس اروندیل اور بی پی واڈیا کے گرفتار کرکے نظر بند کردیا۔

قائد اعظم ابھی تک ہوم رول لیگ میں شامل نہیں ہوئے تھے مگر جب حکومت نے اس جماعت پر سختی شروع کردی اور اس کے رہنما گرفتار کرلئے گئے تو قائد اعظم نے اس نازک موقع پر ایسی جاندار تحریک کو فنا کے گھاٹ اترتے دیکھنا گوارا نہ کیا اور حکومت کے اس اقدام کو ایک چیلنج سمجھتے ہوئے اسے نہایت مردانگی سے قبول کرلیا۔ وہ نہ صرف ہوم رول لیگ میں شامل ہوگئے بلکہ بمبئی ہوم رول لیگ کے صدر بھی منتخب کرلئے گئے۔ ہوم رول لیگ میں شامل ہونے کے بعد قائد اعظم نے اس تحریک کو نیا عزم اور نیا ولولہ عطا کیا۔ انہی دنوں بمبئی میں لیگ کا ایک جلسہ طلب کیا گیا۔ اس کی صدارت ہوم رول لیگ حلقہ بمبئی کے صدر قائد اعظم محمد علی جناح نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں حکومت کی روش پر سخت تنقید کی۔ عوام کو حوصلہ دیا اور لوگوں کے دلوں میں آگ لگادی۔ مسز اینی بیسنٹ کی نظر بندی کے ساتھ ہی ملک میں شورش برپا ہوگئی۔ ہوم رول لیگ کی شاخیں تقریباً ہر بڑے شہر میں قائم تھیں اس لئے ان شاخوں کے زیرِ انتظام سارے ملک میں مسز اینی بیسنٹ کی گرفتاری کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا جس نے بعض جگہ حکومت اور عوام کے درمیان تصادم کی شکل اختیار کرلی۔

قومی فوج

یہ اس زمانے کی بات ہے جب پہلی جنگِ عظیم پوری شدت سے جاری تھی۔ انگریزی فوجیں جرمنی کی افواج کے سامنے بعض جگہ بے بس ہورہی تھیں، اس موقع پر برطانوی حکومت کی ہر ممکن کوشش یہی تھی کہ ہندوستان کے عوام اور اربابِ دولت اس کی زیادہ سے زیادہ امداد کریں۔ اس مقصد کے لئے وائسرائے نے ایک وار کونسل قائم کی اور گورنروں کی زیرِ نگرانی صوبائی وار کونسلیں قائم کی گئیں۔

ان کونسلوں کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کے ذریعے عوامی تعاون حاصل کیا جائے اور لوگوں کو فوج میں بھرتی ہونے کی ترغیب دی جائے۔ قائداعظم اس مرحلے پر حکومت کے لئے پریشانی کا باعث نہیں بننا چاہتے تھے اور بلاشبہ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ حکومت کی امداد کی جائے مگر وہ غیر مشروط امداد کے قائل نہ تھے۔ اس معاملے میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ حکومت ایک قومی فوج قائم کرے۔ اور اختتام جنگ کے بعد اہل ہند کو حکومت خود اختیاری عطا کرے لیکن حکومت اس طرف نہیں آتی تھی وہ صرف ہندوستانیوں سے غیر مشروط امداد کی طالب تھی۔ اسے ایسے سپاہی درکار تھے جو چند روپے ماہانہ لے کر اپنی جانیں حکومت کے ہاتھ بیچ دیں۔ میدان جنگ میں جاکر دشمن پر گولیاں برسائیں۔ جو میدان جنگ میں مارے جائیں ان کی لاشیں گدھ نوچ نوچ کر کھا جائیں اور جو واپس آئیں وہ پھر غلامی کی زندگی گذاریں۔ فتح یاب ہندوستانی سپاہی ہوں اور فتح و ظفر کے ثمرات سے انگریز لطف اندوز ہوں۔ نقطۂ نظر کا یہی اختلاف تھا جو قائداعظم اور ہندوستان کے دو جابر حکمرانوں کے درمیان تصادم کا موجب ہوا۔ پہلا تصادم وائسرائے ہند سے اور دوسرا گورنر بمبئی سے۔ بلاشبہ دونوں موقعوں پر انہوں نے غیر معمولی جرأت اور حق گوئی کا مظاہرہ کیا۔ چنانچہ ۳۰ اپریل ۱۹۱۸ء کو دہلی میں وار کونسل کا اجلاس ہوا جس کی صدارت وائسرائے کر رہے تھے۔ قائداعظم نے ایک تجویز پیش کرنی چاہی جس میں عوام کی طرف سے حکومت کی امداد کرنے کا یقین دلایا گیا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اس امر پر بھی زور دیا گیا تھا کہ ملک میں دستوری اصلاحات کا نفاذ بھی عمل میں لایا جائے لیکن وائسرائے نے اس تجویز کو ناپسند کیا اور اسے پیش کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ مگر قائداعظم نے نہایت جرأت سے کام لے کر وائسرائے کی رولنگ پر سخت تنقید کی۔ حالانکہ اس وقت ہندوستان کے بیشتر سیاسی رہنما جیسے مسٹر گاندھی، مہاراجہ جام نگر اور مدن موہن داس حکومت کی غیر مشروط امداد کرنے کے حامی تھے۔

قائداعظم اور گاندھی میں فرق

گاندھی جی نے تو اپنے ایک انگریز دوست کے ہاتھ وائسرائے کی خدمت میں ایک خط بھیج کر اپنی وفاداری اور غیر مشروط تعاون کا یقین بھی دلا دیا تھا چنانچہ انہوں نے لکھا کہ :-

"میں اپنے ملک والوں کو آگاہ کروں گا کہ وہ اپنے بڑھتے ہوئے قدم پیچھے ہٹا لیں۔ میں کانگریس کے تمام ریزولیشنوں کو واپس لے لینے کا مشورہ دوں گا اور دوران جنگ میں ہوم رول یا ذمہ دار حکومت کا نام بھی نہ لوں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ مادر ہند کا ہر تندرست بیٹا ایمپائر کی حرمت پر کٹ مرنے کے لئے میدان میں آجائے اور

اس نازک وقت میں اس کی مدد کرنے"[1]

یہ تو مسٹر گاندھی کا طرزِ فکر تھا جس میں قومی حمیت کا نام و نشان نہ تھا۔ عزتِ نفس کا شائبہ تک نہ تھا مگر برعکس اس کے قائدِ اعظم نے پہلے وائسرائے کے سامنے اور پھر بمبئی کے جابر گورنر لارڈ ولنگڈن کے سامنے جس جرأت مندی سے برطانوی حکومت کی امداد کے بارے میں اپنا موقف پیش کیا اس سے ان کی بے خوفی، حریتِ فکر اور عزتِ نفس تینوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے ۱۰ رجون ۱۹۱۸ء کو بمبئی وار کونسل کے اجلاس میں جو گورنر ولنگڈن کی زیرِ صدارت منعقد ہو رہی تھی اپنی تقریر میں نہ صرف اپنا موقف نہایت جرأت مندی سے پیش کیا بلکہ لارڈ ولنگڈن نے ہوم رول لیگ کے رہنماؤں کے متعلق جو نازیبا الفاظ کہے تھے ان پر بھی سخت تنقید کی۔ انہوں نے کہا کہ:

"مرحلہ کتنا ہی نازک ہو لیکن ہر ہندوستانی اس پر متفق ہے کہ ہندوستان کو سیاسی ترقی کرنی چاہیئے لیکن قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں اپنی اس قلبی اذیت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ ہز ایکسی لنسی ہوم رول لیگ کے رہنماؤں کے اخلاص اور صداقت کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مجھے اس طرزِ کلام اور طرزِ عمل پر بہت افسوس ہے اور ہز ایکسی لنسی کے پورے احترام کے باوجود میں نہایت شدت کے ساتھ اپنا احتجاج اس طرزِ عمل کے خلاف ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔ ہم اپنے ملک کے دفاع کے لئے چین چاہتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ حکومت "سپاہیوں" کی بھرتی چاہتی ہے اور ہم "نیشنل آرمی" کا قیام چاہتے ہیں۔ یہی فرق ہے ہم دونوں میں۔ جرمن خطرہ سپاہی نہیں دور کر سکتے "نیشنل آرمی دور کر سکتی ہے"۔

مسٹر جناح نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا:

"مہاراجہ جام نگر نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ "ہمیں سودا نہیں کرنا چاہیئے"۔ پھر مسٹر من موہن داس رام جی نے کہا تھا "ہمیں وہ سب کچھ کر گذرنا چاہیئے جو حکومت کی حمایت و اعانت میں اس وقت ہم کر سکتے ہیں۔ اس کا پھل بھی ہمیں ملے گا اور جو ہم چاہتے ہیں ہمیں حاصل ہو جائے گا ——— میں پوچھنا چاہتا ہوں کیا یہ سودا نہیں ہے؟ دہلی کی وار کونسل میں ہم نے ایک تجویز منظور کی تھی کہ ہندوستانیوں کو کنگ کمیشن دیا جائے۔ فوجی کالج عام کر دیئے جائیں۔ فوج کی ہندوستانیت میں اضافہ کر دیا جائے۔ لیکن اب

---

[1] حیاتِ محمد علی جناح صہ ۱۱۳

تک اس سلسلے میں کچھ نہیں ہوا، حالانکہ دو ماہ کی مدت گذر چکی ہے ——— ہم اس وقت تک حکومت کی کوئی مدد نہیں کر سکتے" جب تک ہم پر بھروسہ نہ کیا جائے ہمیں شریک کار نہ سمجھا جائے۔"

لارڈ ولنگڈن ——— "معزز کو دہلی یا شملہ جا کر یہ شکایت کرنی چاہیئے کیونکہ میں ان معاملات کو رو براہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتا ہوں۔"

مسٹر جناح ——— "اگر اس صوبہ کی حکومت ہمارا تعاون حاصل کرنا چاہتی ہے اور چاہتی ہے کہ ہم اس کے لئے کام کریں تو اسے ہم پر بھروسہ کرنا ہی چاہیئے۔ میں اس طرز کار سے ہرگز متفق نہیں ہوں جو حکومت نے حصول تعاون کے لئے اپنی تجویز کے سلسلے میں اختیار کر رکھا ہے۔"

لارڈ ولنگڈن ——— "آپ صدر کی رولنگ پر بحث نہیں کر سکتے۔"

مسٹر جناح ——— "میں صرف یہ کہتا ہوں کہ ہم آپ کی تجویز کی تائید نہیں کر سکتے۔ میری ایک ترمیم ہے لیکن جناب صدر (لارڈ ولنگڈن) اسے پیش کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ یہ ایک ایسا فیصلہ اور حکم ہے جو دستور و آئین کی دنیا میں بالکل انوکھا اور نرالا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ ہز اکسی لنسی ہم پر بھروسہ کریں گے۔ ہمارے اخلاص اور صداقت پر شبہ کرنا ہوم رول لیگ کی توہین ہے اور میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔"[1]

قائداعظم کی تقریر کا یہ طویل اقتباس اور بمبئی کے جابر گورنر لارڈ ولنگڈن سے ان کا جرأت مندانہ مکالمہ اس لئے درج کیا گیا ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اس دور میں جب عام طور پر بڑے بڑے سیاسی رہنما اور خصوصاً کانگرسی عناصر حکومت سے اپنی نیاز مندی کا اظہار کر رہے تھے اس وقت قائداعظم دنیا کی اس سب سے بڑی طاقت سے یکہ و تنہا برسرپیکار تھے۔ وہ کسی بند کمرے میں نہیں بلکہ سر مجلس اور ایک تندخو گورنر کے منہ پر اسے کھری کھری سنا رہے تھے۔ غیر ملکی استعمار کو للکار رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے سیاست دانوں کو بے خوفی اور لہجے کی تندی عطا کرنے والے قائداعظم ہی تھے۔ انہوں نے ہی اس روایت کی بنا ڈالی کہ سیاست میں مکر و فریب اور عقبی حملہ کی بجائے صاف گوئی و جرأت مندی

---

[1] حیات محمد علی جناح ص ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷

سے کام لینا اور سامنے سے حملہ کرنا چاہیئے۔ حقیقی اور آبرومندانہ کامیابی اسی طرح حاصل ہوتی ہے۔

رولٹ ایکٹ

جنگِ عظیم ختم ہونے والی تھی۔ انگریز کامیاب ہو رہے تھے۔ ناکامی جرمنی کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ اس جنگ میں مادرِ ہند کے ہزاروں فرزند کام آئے۔ ہزاروں زندگی بھر کے لئے معذور ہو گئے۔ ملک کے بڑے بڑے جاگیرداروں، راجاؤں، نوابوں اور سیٹھوں نے کروڑوں روپیہ دے کر حکومت کی امداد کی۔ مگر جب برطانیہ جیت گیا تو بجائے اس کے کہ اہلِ ہند کو ان کے تعاون کا صلہ دیا جاتا انہیں رولٹ ایکٹ دیا گیا۔ رولٹ ایکٹ کیا تھا؟ اہلِ ہند کی شہری آزادیوں پر حملہ۔ خاتمۂ جنگ سے قبل ہی حکومت نے ہائی کورٹ کے ایک جج سر سڈنی رولٹ کی زیرِ نگرانی ایک کمیشن قائم کیا تاکہ سیاسی حقوق و مراعات طلب کرنے والوں اور ان مقاصد کے لئے احتجاج و مظاہرہ کرنے والوں کو قانونی شکنجے میں کس کر انہیں ایسی سزائیں دی جائیں کہ یہ "سرکش" اور "سرپھرے" دوبارہ اس قسم کی جرأت نہ کریں۔ اس کمیشن نے سیاسی جرائم کی نہایت ظالمانہ سزائیں تجویز کیں۔ نتیجہ یہ ہوا سارے ملک میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ احتجاجی جلسے ہوئے جلوس نکالے گئے اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ ان تجاویز کو قانونی شکل نہ دے مگر ان احتجاجات کے باوجود یہ سفارشات امپیریل کونسل میں منظوری کی غرض سے پیش کر دی گئیں۔ اس موقع پر قائدِ اعظم نے امپیریل کونسل کے ممبر کی حیثیت سے ایک جرأت مندانہ تقریر کی جس نے ایوانِ حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ "سیاسی سازشوں کے معاملے کو رولٹ کمیشن نے اس رنگ میں پیش کیا ہے جیسے کہ اچانک کچھ ایسے قبائل ملک میں داخل ہو گئے ہیں جن کا کام ارتکابِ جرم ہے اور اب ان کا قلع قمع کرنے اور انہیں ختم کرنے کے لئے قانون بنانا لازمی ہو گیا ہے۔ لیکن کسی مرض کا علاج یہ نہیں کہ قانون بنا دیا جائے۔ آپ کو اپنی روش اور طرزِ عمل میں تبدیلی پیدا کرنی چاہیئے۔ سیاسی جرائم کا خود بخود خاتمہ ہو جائے گا۔ اس کمیشن نے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ ایسی ہیں کہ کوئی حکومت جو مہذب ہونے کی مدعی ہو انہیں قبول کرنا تو دور انہیں تصور میں بھی نہیں لا سکتی۔"

وائسرائے کی کونسل سے قائدِ اعظم کا استعفیٰ

قائدِ اعظم کی اس سرزنش کا حکومت پر قطعاً اثر نہ ہوا اور اس نے رولٹ کمیشن کی سفارشات کو قانون کی حیثیت سے منظور کر لیا۔ یہی سفارشات رولٹ ایکٹ کے نام سے مشہور ہوئیں۔ ان کا منظور ہونا تھا کہ سارے ملک میں آگ لگ گئی۔ مخالفانہ مظاہرے ہوئے، ہڑتالیں کی گئیں، جلسے ہوئے، احتجاجی

قرار دادیں منظور کی گئیں۔ پولیس نے عوام پر ڈنڈے برسائے، گولیوں کی بارش کی اور جیل خانے قیدیوں سے بھر گئے۔ اس واقعہ کا قائد اعظم پر نہایت سخت ردعمل ہوا اور انہوں نے بہ طور احتجاج وائسرائے کی کونسل سے استعفیٰ دے دیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اس تاریخی استعفیٰ کا ترجمہ یہاں درج کر دیا جائے۔

" جناب والا! رولٹ بل کی منظوری اور وائسرائے کی حیثیت سے اس پر آپ کی تصدیق سے عوامی خواہشات کی خلاف ورزی ہوئی ہے اور حکومت پر عوام کو جو اعتماد تھا اسے سخت ٹھیس لگی ہے۔ علاوہ ازیں اس سے امپیریل مجلس قانون ساز کے قیام کی اصلیت بھی بے نقاب ہو گئی ہے اور سب جان گئے ہیں کہ بہ ظاہر اسے اختیارات تو قانون وضع کرنے کے حاصل ہیں مگر اس کی حیثیت غیر ملکی حکومت کے آلۂ کار کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ رولٹ ایکٹ کے بارے میں اس کونسل کے غیر سرکاری ممبروں کی متفقہ آراء اور عوامی احساسات کی قطعاً پرواہ نہیں کی گئی۔ عدل و انصاف کے تقاضوں اور عوام کے دستوری حقوق کو ایک سخت مزاج انتظامیہ نے پیروں تلے روند ڈالا ہے اور یہ ایسے موقع پر کیا گیا ہے جبکہ اسٹیٹ کو کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں۔ اس نوکر شاہی کو عوامی جذبات کا کوئی خیال نہیں کیونکہ وہ عوام کے سامنے جوابدہ نہیں ہے اس لئے میں اس قانون کی منظوری اور اس کے طریقۂ کار کے خلاف بہ طور احتجاج امپیریل لیجیس لیٹو کونسل سے مستعفی ہوتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں اس کونسل میں میرا شامل رہنا میرے ملک کے عوام کے لئے نہایت غیر مفید ہے ۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ امن و امان کی فضا میں اس قسم کے قوانین منظور کرنے والی حکومت کو مہذب حکومت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ میں امید کرتا ہوں کہ اب بھی آپ مسٹر مانٹیگو وزیر امور ہند کو اس کالے قانون کی منظوری نہ دینے کا مشورہ دیں گے۔ آپ کا مخلص ایم اے جناح"[1]

اس کے بعد رولٹ ایکٹ کے خلاف ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو سارے ملک میں یوم احتجاج منایا گیا۔ اسی زمانے میں مسٹر موہن داس کرم چند گاندھی جو جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے حقوق کے لئے بڑی پامردی سے جنگ کرتے رہے تھے اور ۱۹۱۴ء میں ہندوستان واپس آ گئے تھے مطلع سیاست پر

---

[1] قائد اعظم جناح ـــــ دی اسٹوری آف اے نیشن ص ۱۲۵ مولفہ جی الانا

ایک عوامی رہنما کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ انہوں نے بھی رولٹ ایکٹ کے خلاف ہنگاموں میں حصہ لیا بلکہ یہ ملک گیر احتجاج انہی کی تجویز پر کیا گیا اور وہ بمبئی سے پنجاب روانہ ہو گئے۔ مگر قبل اس کے کہ وہ پنجاب میں داخل ہوتے انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد تحریک اور زیادہ تشدد کا رنگ اختیار کر گئی۔ انگریز افسروں کو قتل کیا جانے لگا۔ لوٹ مار اور آتش زدگی کی وارداتیں شروع ہو گئیں اور امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا وہ خونیں حادثہ پیش آیا جس نے سارے ملک کو آگ کے شعلوں میں تبدیل کر دیا۔" امرتسر کے علاوہ لاہور میں بھی مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ شہری آبادی کو وحشیانہ اور ناقابل ذکر سزائیں دی گئیں جیسے پیٹ کے بل زمین پر رینگنا۔ ان اقدامات کے نتیجے میں عوام میں سخت اشتعال پیدا ہو گیا[۱]"

اس طرح قائد اعظم کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہو گئی کہ "اگر تم نے رولٹ ایکٹ کو قانونی شکل دے دی تو سارے ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ لگ جائے گی۔"

تحریکِ خلافت و ترکِ موالات

جنگ عظیم اول میں ترکوں نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا۔ جرمنی کی شکست کے بعد اتحادیوں نے ترکوں کو اس "سرکشی" کی سزا دینے کا فیصلہ کیا یعنی ترکیہ پر بھرپور حملہ کر کے اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دینا اور پھر اس کے حصے بخرے کر کے آپس میں تقسیم کر لینا۔ مسلمانوں کے لئے خلافت کے مسئلے کی ہمیشہ روحانی حیثیت رہی ہے اور وہ خلیفہ کو اپنا دینی و دنیوی پیشوا سمجھتے رہے ہیں۔ گو جس عہد کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں خلافت کا تقدس ختم ہو چکا تھا اور خلیفہ مسلمانوں اور وہ بھی ترکیہ کے مسلمانوں کا محض سیاسی سربراہ تھا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ خود ترکیہ کے بہت سے عوام اس کی سیاسی سربراہی کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ لیکن برصغیر کے مسلمانوں کے دل میں یقیناً اس کا احترام تھا اور ترکیہ پر حملہ کرنا مسلمانوں کے مرکز اور ان کے روحانی سربراہ پر حملہ کرنے کے مترادف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب جرمنی کی شکست کے بعد انگریزوں اور ان کے اتحادیوں نے ترکیہ پر حملہ کیا تو برصغیر کے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اس مسئلے کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جب انگریزوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنی امداد کی تحریک کی تو ان سے وعدہ کیا کہ مسلمانوں کے مقامات مقدسہ کی بے حرمتی نہیں کی جائے گی اور نہ ترکیہ پر دست درازی کی جائے گی۔ مگر فتح کے نشے میں سرشار ہو کر انگریزوں نے اس وعدہ کو پس پشت ڈال دیا اور ترکیہ کو تباہ و برباد کرنے پر تل گئے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے فلسطین میں یہودیوں کو آباد کرنے کا بھی ایک منصوبہ بنایا تاکہ عربوں کے

---

[۱] ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ صفحہ ۱۵ جلد ۱ مولفہ ڈاکٹر آئی ایچ قریشی

تب ہی پھر گھوپ کر ان کی طاقت پر ایک کاری ضرب لگائی جائے۔

مسٹر گاندھی اور خلافت کمیٹی

ظاہر ہے کہ برصغیر کے غیور اور اسلامی ہمدردی کے جذبے سے سرشار مسلمان ان حالات میں کیسے خاموش رہ سکتے تھے چنانچہ انہوں نے خلافت کمیٹی کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی اس تنظیم کے روح رواں تھے۔ اس تحریک کا مقصد برصغیر کے مسلمانوں کو خلافت کے مسئلے پر بیدار کرنا اور انہیں منظم کرنا تھا تاکہ انگریزوں پر دباؤ ڈال کر انہیں ترکیہ کے حصے بخرے کرنے سے روکا جائے۔ یہ خالص مسلمانوں کی تحریک تھی اس کا ہندوؤں سے کوئی تعلق نہ تھا نہ اس مسئلے سے ان کے مذہبی جذبات وابستہ تھے۔ مگر لوگ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ اس تحریک کے آغاز ہی میں ہندوؤں اور فرقہ پرست کانگرس کے مشہور لیڈر مسٹر گاندھی میدان میں آگئے اور انہوں نے خلافت کے حق میں مسلمانوں کی طرف سے تائیدی بیانات دینا شروع کر دیئے۔ مسٹر گاندھی کے ان بیانات کا سادہ لوح مسلمانوں پر نہایت گہرا اثر ہوا۔ یہ بڑا نازک وقت تھا اور مسلمانانِ ہند جذبات کی رو میں بہہ رہے تھے۔ اس وقت وہ ہر اس شخص کو گلے لگانے کے لئے تیار تھے جو خلافت کے مسئلے پر ان کی تائید و ہمنوائی کرے۔ مسٹر گاندھی نہایت ذہین اور نفسیاتِ انسانی کے بہت بڑے ماہر تھے۔ انہیں اس مسئلے کی نزاکت اور مسلمانوں کے جذبات کا احساس تھا۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے مسئلہ خلافت کو صرف مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ سارے اہلِ ہند کا مسئلہ قرار دے دیا۔ مولانا محمد علی جوہر بھی اپنی تمامتر ذہانت و فراست اور علم و فضل کے باوجود بنیادی طور پر جذباتی انسان تھے اور ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیئے کہ وہ مسٹر گاندھی کی چال کو نہ سمجھ سکے اور خلافت جیسی اسلامی تحریک کی باگ ڈور ایک کٹر ہندو رہنما کے ہاتھ میں دے دی۔ مسٹر گاندھی نے کمال ہوشیاری سے کانگرس کے پلیٹ فارم سے خلافت کے حق میں قرارداد پاس کرائی اور مسلمانوں کی پرزور حمایت کا اعلان کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ دہلی میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ہندوستان کے ممتاز ہندو اور مسلمان رہنما شریک ہوئے اور مسٹر گاندھی کی کوشش سے ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں انگریزوں سے تعاون نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مگر دوسری طرف امرتسر میں مسلم لیگ اور کانگرس کے علیحدہ علیحدہ اجلاس منعقد ہوئے۔ ان میں سے مسلم لیگ نے تو انگریزوں سے تعاون نہ کرنے کی قرارداد کی تائید و تصدیق کر دی مگر کانگرس نے جس کے اجلاس میں مسٹر گاندھی بہ نفسِ نفیس موجود تھے ایک قرارداد منظور کی جس میں انگریزوں سے تعاون کرنے پر زور دیا گیا تھا۔

اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کو انگریزوں سے تعاون نہ کرنے پر آمادہ کر کے انہیں حکومت

سے لڑوا دیا جائے اور ہندو انگریزوں سے تعاون کرکے ان سے زیادہ سے زیادہ سیاسی و معاشی فوائد حاصل کرتے رہیں۔ ہمارے خیال میں، اس طرح مسٹر گاندھی اور کانگرس نے برصغیر کے مسلمانوں کے خلاف ایک خطرناک سازش کی۔ افسوس کہ اس زمانے کے مسلم رہنماؤں میں قائداعظم کے سوائے اس سازش اور اس کے نتائج و عواقب کو اور کوئی نہ سمجھ سکا اور وہ اس تحریک سے بالکل الگ ہو گئے۔ امکانی حد تک انہوں نے مسلمانوں کو اس تحریک میں شامل ہونے سے روکنے کی کوشش بھی کی مگر اس جذباتی دور میں ان کی آواز کون سنتا۔ اب مسٹر گاندھی خلافت کمیٹی کے کرتا دھرتا بن گئے۔ اس تحریک میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد اور بہت سے دوسرے اکابر کی انہیں تائید و حمایت حاصل تھی اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انہی مسلمان رہنماؤں اور تحریک خلافت نے مسٹر گاندھی کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے اور عارضی طور پر انہیں سارے ملک کا قائد بنا دیا۔ اس تحریک کا ایک نقصان یہ ہوا کہ مسلم لیگ سے مسلمانوں کا تعلق منقطع ہوگیا کیونکہ لیگ نے عدم تعاون کی تحریک ضرور منظور کر لی تھی مگر قائداعظم کی انگلستان سے واپسی کے بعد ان کے اثر و رسوخ کے تحت اس جماعت نے تحریک عدم تعاون میں مسلمانوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس تحریک کا مقصد برصغیر کے مسلمانوں کی بربادی کے سوائے اور کچھ نہ تھا اور قائداعظم اور مسلم لیگ تحریک عدم تعاون کا ساتھ دے کر قوم کی بربادی میں حصہ لینے کے لئے تیار نہ تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی ہمدردیاں وقتی طور پر مسلم لیگ سے ختم ہوگئیں۔ مسٹر گاندھی کو زبردست فتح نصیب ہوئی اور وہ مسلم لیگ جو ۱۹۰۶ء سے مسلمانوں کے حقوق کے لئے جدوجہد کر رہی تھی جو خالص مسلمانوں کی تنظیم تھی مسٹر گاندھی کی اس گہری حکمت عملی کی بدولت مسلمانوں کی ہمدردی سے محروم ہوگئی۔ اس کے ساتھ ساتھ مسٹر گاندھی کو انہی اصلاحی تحریکوں کی بدولت نہ صرف ملک گیر بلکہ عالم گیر شہرت حاصل ہوگئی۔ گویا انہوں نے مسلمانوں کی لاشوں پر اپنا قصرِ عظمت و شہرت تعمیر کیا اور علی برادران نے انہیں مسلمانوں کی آنکھوں کا تارا بنا دیا۔ مگر انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا؟ اس کی تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔

ہندو آباد، مسلمان برباد

مسٹر گاندھی اور ان کے ہم خیال ہندوؤں نے جو سازش کی تھی وہ رنگ لائی۔ ان کے ایما پر خلافت کمیٹی نے فیصلہ کر دیا کہ ولایتی مال کا بائیکاٹ کیا جائے۔ مسلمان سرکاری ملازمتیں ترک کر دیں۔ مسلمان طالب علم حکومت کے تعلیمی اداروں سے اور ان تعلیمی اداروں سے جنہیں حکومت امداد دیتی ہے قطع تعلق کر لیں۔ وکیل عدالتوں کا مقاطعہ کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی روز میں ہزاروں مسلمان طالب علموں نے گورنمنٹ

کالجوں سے علیحدگی اختیار کرلی حتیٰ کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ویران ہوگئی۔ سیکڑوں مسلمان وکیل، بیرسٹر، اور مجسٹریٹ عدالتوں سے الگ ہو گئے۔ اس کے بعد ہجرت کی تحریک شروع ہوئی اور سادہ لوح مسلمان علما نے جن کی اکثریت الفاظ کے ظاہری معنی پہ نظر رکھتی ہے اور روح سے بے خبر رہتی ہے فتویٰ دے دیا کہ مسلمانوں کو ہندوستان سے ہجرت کر جانی چاہیئے۔ اس طرح کم و بیش تیس ہزار ہندوستانی مسلمان اپنی جائدادیں اور اثاث البیت تک فروخت کر کے ہجرت کا "مقدس فریضہ" ادا کرنے کے لئے افغانستان روانہ ہو گئے۔ ہندو جو ایسے مواقع کے منتظر رہتے تھے فوراً آگے بڑھے اور انہوں نے مسلمانوں کی جائیدادیں اور گھریلو استعمال کی اشیاء کوڑیوں کے مول خرید لیں جن مسلمانوں نے سرکاری ملازمتوں سے استعفے دیئے تھے ہندوؤں نے ان کی ملازمتوں پہ قبضہ کر لیا۔

ادھر جو مسلمان افغانستان گئے تھے انہیں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ تو سفر اور دشوار گذار راستوں کی صعوبتیں برداشت نہ کر کے موت کا شکار ہوئے۔ جو افتاں وخیزاں افغانستان کی سرحد پر پہنچے انہیں افغانی حکومت نے ملک میں داخل ہونے سے روک دیا۔ کیونکہ اول تو افغانستان اور حکومت برطانیہ میں معاہدے تھے اور حکومت افغانستان اپنی حلیف حکومت (برطانیہ) سے ہجرت کرنے والوں کو پناہ دے کر حکومت برطانیہ سے تعلقات خراب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ دوسرے اس مسئلے کا اقتصادی پہلو بھی تھا اور تیس ہزار افراد کی خوراک، قیام اور روزگار کا مسئلہ حل کرنا افغانستان جیسے پس ماندہ اور چھوٹے سے ملک کے بس کا کام نہ تھا۔ غرض ان اسباب نے ہجرت کی تحریک کو ناکام بنا دیا اور یہ خستہ حال مسلمان خانماں برباد ہو کر پھر اپنے وطن واپس آ گئے۔ مگر یہاں کیا رکھا تھا۔ مایوسی — ناکامی — اور حسرت کے سوائے۔ ان مصیبت زدہ افراد کو دوبارہ آباد ہونے اور انہیں روزگار حاصل کرنے میں کتنی دشواریاں پیش آئی ہوں گی آج ان کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری طرف ہندو تھے کہ ان کی تعلیمی سرگرمیاں پورے شباب پہ تھیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی ویران ہو رہی تھی اور ہندو یونیورسٹی بنارس پہ بہار آئی ہوئی تھی۔ پرنس آف ویلز ہندوستان آ رہے تھے اور ہندو یونیورسٹی ان کے خیر مقدم کی تیاریاں کر رہی تھی۔ اس طرح برطانوی شہزادے کو باور کرایا جا رہا تھا کہ تحریک خلافت اور تحریک ترکِ تعاون در اصل مسلمانوں نے جاری کی ہیں۔ ہندو تو حکومت سے پوری طرح تعاون کر رہے ہیں۔ تعلیمی میدان کے علاوہ سرکاری ملازمتوں، عدالتوں اور کاروبار غرض ہر شعبے میں ہندو پوری سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے۔ گویا جس پہلو سے دیکھا جائے تحریک خلافت اور تحریک ترکِ موالات نے برصغیر کے مسلمانوں کو سخت نقصان اور ہندوؤں کو بے حد فائدہ پہنچایا۔ سب

سے زیادہ ندامت برصغیر کے مسلمانوں کو اس وقت اٹھانی پڑی جب خود ترکوں نے نام نہاد خلیفہ کو معزول کرکے خلافت کا خاتمہ کر دیا۔

قائد اعظم اور ترکِ موالات

ان دونوں تحریکوں کے دوران قائد اعظم سیاست سے بالکل الگ رہے کیونکہ انہیں اس حقیقت کا ادراک ہو گیا تھا کہ اس ہنگامہ آرائی سے مسلمانوں کو نقصان کے سوائے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ تحریکیں ہندو کانگرس نے اپنے مفاد کے لئے شروع کی ہیں۔ انہوں نے امکانی حد تک کوشش بھی کی کہ مسلمان ان تحریکوں سے الگ رہیں مگر یہ جذبات اور جوش کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں ہوش کی بات کون سنتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ قائد اعظم کی ہر کوشش رائیگاں گئی۔ ان تحریکوں کے متعلق قائد اعظم کی کیا رائے تھی؟ اس کا اندازہ اس تقریر سے ہوتا ہے جو انہوں نے مشہور کانگرسی رہنما مسٹر کرشن گوپال گوکھلے کی برسی کے موقع پر بمبئی میں کی تھی۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ:

"اس میں شک نہیں کہ حالات نہایت خطرناک صورت اختیار کر چکے ہیں۔ بڑی دشواریاں پیدا ہو چکی ہیں۔ ایک طرف حکومت نے اپنے ظالمانہ رویے سے قومی وقار کو مجروح کیا ہے ہر سمجھ دار شخص جس میں تھوڑا سا بھی سیاسی شعور ہے حکومت کی اس روش کی مذمت کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ جنگ عظیم میں ہندوستانیوں نے اپنے اموال حکومت کی نذر کئے۔ اپنا خون پانی کی طرح بہایا۔ مگر خاتمہ جنگ پر انہیں انعام کیا ملا؟ رولٹ ایکٹ —— دوسری طرف میں یہ کہنے سے رُک نہیں سکتا کہ مسٹر گاندھی نے جن کی میرے دل میں عزت ہے ایسا طرزِ عمل اختیار کیا ہے جو قوم کو گمراہ کر رہا ہے۔

(نہیں نہیں کی آوازیں)

قائد اعظم: مجھے معلوم ہے کہ آپ یہی کہیں گے لیکن میں آپ سے متفق نہیں۔ اگر مسٹر گاندھی کا یہ پروگرام قوم کو صحیح سمت میں لے جاتا تو سب سے پہلے میں اُن کا ہمنوا ہوتا .... مگر یہ پروگرام تو قوم کو راہِ راست پر لے جانے کی بجائے تباہی کے گڑھے کی طرف لے جا رہا ہے۔[1]"

اس تحریک (ترکِ تعاون) کے دوران کانگرس نے ہندوستانیوں سے اپیل کی تھی کہ وہ ولایتی مال

---

[1] بمبئی کرانیکل ۲۱ فروری ۱۹۲۱ء

کا مقاطعہ کریں مگر خود ہندو کانگریس اس پروگرام پر عامل نہ تھے۔ اس کا اصل مقصد تو مسلمان تاجروں کو نقصان پہنچانا تھا۔ چنانچہ قائداعظم نے اپنی اسی تقریر میں مسٹر گاندھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "کانگریس کے بائیس ہزار مندوبین میں سے کتنے مندوب ایسے ہیں جنہوں نے ولایتی مال کا مقاطعہ کیا ہے؟"

مولانا محمد علی جوہر کے خیالات

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر ہماری ملی آزادی کی تاریخ میں ناقابل فراموش شخصیت کے حامل تھے۔ انہوں نے ہندو مسلم اتحاد اور برصغیر کی آزادی کے لئے بلاشبہ اپنی جان تک قربان کر دی۔ وہ ایک زمانے میں مسلمانانِ ہند کے بے تاج کے بادشاہ تھے اور پشاور سے کلکتہ تک ان کا طوطی بولتا تھا۔ مسلمان ان کی آواز پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی عمر عزیز کا بہت بڑا حصہ قید و بند کی صعوبتیں اٹھاتے ہوئے گزار دیا۔ کانگریس پہلے بھی موجود تھی مگر اسے عروج اسی وقت نصیب ہوا جب مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی اس میں شامل ہوئے۔ ان کے زیر اثر بے شمار مسلمان بھی کانگریس میں شریک ہو گئے۔ انہوں نے مسٹر گاندھی کو "باپو" تک بنا دیا اور ان کی قیادت کا جوا اپنے کندھے پر رکھ لیا صرف اس لئے کہ شاید اس طرح ہندوستان آزادی کی منزل سے ہمکنار ہو جائے۔ مگر تحریکِ خلافت و تحریک ترک موالات میں اور پھر اس کے بعد انہیں جو تلخ تجربات ہوئے ان کے پیشِ نظر وہ مسٹر گاندھی اور کانگریس دونوں سے بدظن ہو گئے۔ چنانچہ ۲۵ دسمبر ۱۹۲۷ء کو پشاور کے جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ مسٹر گاندھی کی سیاست اور کانگریس کی روش کو سمجھنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ مولانا نے فرمایا:۔

> "کانگریس کو انڈین نیشنل کانگریس فی الحقیقت مسلمانوں نے بنایا ہے۔ اس سے پہلے وہ عافیت پسندوں کی تفریح گاہ تھی۔ مگر جس دن سے محمد علی، شوکت علی اس میں شریک ہوئے اسی دن سے اس میں جان پڑ گئی۔ چنانچہ کلکتہ میں لالہ لاجپت رائے کی مخالفت کے باوجود کانگریس نے ترکِ موالات کو اپنا شعار بنایا اور یہ حقیقت ہمیں ہمیشہ فخر کے ساتھ یاد رہے گی کہ سب سے جلیل القدر ہندو رہنما مہاتما گاندھی ہمیشہ خلافت کے سرمائے سے دورہ کرتا رہا۔ ہماری قید کے بعد بھی مہاتما جی کے دورہ کے مصارف خلافت کے سرمایہ سے کئے حتیٰ کہ کانگریس کے لئے ایک کروڑ روپے جمع کرنے کے لئے آپ کے دوروں کے مصارف بھی مجلسِ خلافت نے ادا کئے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کانگریس کی روحِ رواں تحریکِ خلافت اور مجلسِ خلافت تھی۔"[1]

---

[1] حیاتِ محمد علی جناح صفحہ ۱۰۵، ۱۰۴

غرض یہ کہ مسٹر گاندھی مسلمانوں کے روپیہ سے اپنی اور اپنی جماعت کی عزت و شہرت میں اضافہ کرتے رہے۔ ان کی جاینی قربان گاہ پر جبینٹ چڑھا کر کانگرس کی جڑیں مضبوط کرتے رہے۔ مسلمان اور ان کی جماعت مسلم لیگ کمزور ہوتی رہی۔ مسلمانوں میں انتشار و افتراق پیدا ہوتا رہا۔ خلافت کی تحریک ناکام ہو گئی۔ مسلمان برباد ہو گئے۔ ہندو آباد ہو گئے ــــــ مگر اس ٹھوکر سے مسلمانوں کی آنکھیں ضرور کھل گئیں اور ان میں ملی حریت پسندی کا سویا ہوا جذبہ ضرور بیدار ہو گیا۔ انہیں اس حقیقت کا احساس ضرور ہونے لگا کہ ملک میں آبرومندانہ زندگی گذارنے کے لئے انہیں کوئی اور راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔ بس یہی حاصل تھا تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کا۔

شدھی، سنگھٹن، سائمن کمیشن

عین اس وقت جب مسلمان رہنما کانگرسی لیڈروں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے تھے اور اس اتحاد کی خاطر اپنے بعض جائز حقوق سے بھی دست بردار ہونے کو تیار ہو گئے تھے ہاں ـــــ عین اسی وقت ہندو کیمپ سے مسلمانوں پر حملے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ ہندو مہاسبھا جو کانگرس کا ضمیمہ تھی مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کو مشتعل و منظم کر رہی تھی اور کانگرس در پردہ ہندو مہاسبھا کی امداد کر رہی تھی۔ دراصل یہ ایک منظم سازش تھی جس کے تحت ایک طرف مسلمانوں کو اتحاد کی دعوت دے کر ان کے فوجی جوش کو دھیما کیا جا رہا تھا اور ان کے عسکری جذبے کو سلایا جا رہا تھا تاکہ وہ ہندوؤں کی طرف سے بے فکر ہو جائیں اور دوسری طرف ہندو مہاسبھا کی پیٹھ ٹھونکی جا رہی تھی اور اسے مسلمانوں کے قتلِ عام پر اکسایا جا رہا تھا چنانچہ وہ لاوا جو بہت دنوں سے پک رہا تھا ۱۹۱۶ء میں پھٹ گیا اور بہار کے مقام پر آرہ میں مسلح ہندوؤں نے مٹھی بھر مسلمانوں پر بغیر کسی اشتعال کے اچانک حملہ کر دیا۔ اس موقع پر سفاکی کے جو مظاہرے کئے گئے ان کی نظیر کم ہی ملے گی۔ مسلمانوں کے مکان نذرِ آتش کر دیئے گئے ان کو بے دریغ قتل کیا گیا۔ ان کی دوکانیں اور اموال لوٹ لئے گئے۔ کمسن بچوں کو ہلاک کیا گیا حتیٰ کہ بہت سے مسلمانوں کو اس حالت میں چارپائیوں سے باندھ کر ہلاک کر دیا گیا کہ وہ غریب گہری نیند سو رہے تھے۔ ابھی آرہ کے قیامت خیز حادثے پر زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ کٹار پور میں ہندو ذہنیت ایک بار پھر عیاں ہو کر سامنے آئی اور یہاں مردوں کے ساتھ ساتھ مسلمان عورتوں کو بھی معاف نہ کیا گیا اور انہیں قتلِ عام کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔

شدھی اور سنگھٹن

تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات کی ناکامی، پنجاب کے مارشل لا اور کانگرسی رہنماؤں کی گرفتاری نے برصغیر کی فضا پر مرگ آسا سکوت طاری کر دیا تھا۔ کانگرس کی ناکامی نے ہندوؤں کے دلوں سے اس کا وقار زائل کر دیا تھا۔ مسٹر گاندھی کی گرفتاری کی وجہ سے ہندو قیادت کی مسند خالی پڑی تھی۔ سیاسی میدان سے قابلِ ذکر کانگرسی رہنما ہٹ گئے تھے۔ کچھ جیلوں میں تھے اور باقی گوشۂ عافیت میں پناہ گزیں ہو چکے تھے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر ہندو مہاسبھا میدان میں آ گئی۔ مشہور ہندو رہنما پنڈت مدن موہن مالویہ نے ہندو مہاسبھا کو نئے سرے

سے منظم کیا۔ لالہ لاجپت رائے اور سوامی شردھانند نے ہندو دماغوں میں یہ خیال جاگزیں کیا کہ بھارت ورش کی حقیقی مالک آریہ جاتی ہے ہندو قومیت کے تخیل کو فروغ دیا گیا اور پھر اسے جامۂ عمل پہنانے کے لئے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں جاری گئیں۔ شدھی کی تحریک کا مقصد یہ تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کو ہندو بنا کر ہندو اکثریت میں ضم کر لیا جائے تاکہ ہندوستان میں صرف ایک قوم باقی رہ جائے اور فرقہ وارانہ مسئلے کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔ اس طرح ہندو بلے خوف و خطر انگریزوں سے ملک چھوڑنے کا مطالبہ کر سکیں اور جب وہ ہندوستان چھوڑ کر جائیں تو ہندو بلا شرکت غیرے اس سرزمین کے مالک ہو جائیں اور یہاں رام راج قائم ہو جائے۔

سنگھٹن کی تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مختلف الخیال ہندوؤں کے درمیان اتحاد پیدا کیا جائے انہیں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کیا جائے اور سارے ملک پر قبضہ کر لینے کے پروگرام کو عملی جامہ پہنایا جائے اس کے لئے ضروری تھا کہ عسکری تنظیم بھی قائم کی جائے۔ چنانچہ ہندو والنٹیرز بھرتی کئے گئے۔ تمام بڑے بڑے شہروں کی ہندو آبادیوں میں اکھاڑے قائم کئے گئے جہاں ہندو نوجوان صبح صبح ورزش کرتے اور داؤ پیچ سیکھتے۔

سوامی شردھانند

برصغیر کی فضا کو سب سے زیادہ خراب کرنے کا باعث شدھی کی تحریک ہوئی۔ اس کا بانی پنجاب کا ایک ہندو منشی رام تھا ایک زمانے میں یہ پنجاب پولیس میں تھانیدار تھا۔ پھر اس نے وکالت شروع کر دی۔ اس کے بعد ترکِ دنیا کر کے گیان دھیان کی زندگی بسر کرنے لگا اور گورو کل ہردوار میں ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گیا یہاں اسے سوامی شردھانند کا خطاب ملا۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے اپنا ہیڈ کوارٹر دہلی میں منتقل کر لیا جب رولٹ ایکٹ کے خلاف ایجی ٹیشن شروع ہوا تو ایک دن دہلی کے مسلمان اسے اپنے کندھوں پر اٹھا کر جامع مسجد میں لے گئے اور اس نے جامع مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی[1] انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اس کے بعد سوامی شردھانند تحریکِ عدم تعاون کے سلسلے میں گرفتار ہو گیا۔ جیل سے رہائی کے بعد اس نے ان مسلمانوں کو جو اسے اپنے کندھوں پہ اٹھا کر دہلی کی شاہی مسجد میں لے گئے تھے یہ صلہ دیا کہ ان کے دین و ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کا منصوبہ بنایا اور اپنی تحریک کا آغاز نواح آگرہ کے مسلمان راجپوتوں کو ہندو بنانے سے کیا۔ یہ لوگ جو ملکانہ کہلاتے تھے مردم شماری کے رجسٹروں میں مسلمان شمار ہوتے تھے مگر ان میں سے بعض کے نام بھی ہندوانہ تھے اور رسوم و رواج تو اکثریت کے وہی تھے جو ہندوؤں کے ہوتے ہیں۔ چونکہ ان لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کرنا آسان تھا اس لئے شردھانند نے اپنی مہم کا آغاز ملکانہ سے کیا۔ کچھ لوگ اس کی کوشش

---

[1] مارشل لا سے مارشل لا تک ص ۴۸ مؤلفہ سید نور احمد

سے ہندو دھرم میں داخل بھی ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی سارے ملک میں شدھی کی اس تحریک کے خلاف سخت غم و غصہ اور بے چینی پیدا ہو گئی اور مسلمانوں کی تبلیغی جماعتیں حرکت میں آ گئیں مسلمان مبلغ ملکانہ پہنچنے لگے اور بڑی سرگرم کوششوں کے بعد مرتد ہو جانے والے مسلمانوں کو دوبارہ دائرہ اسلام میں شامل ہونے میں کامیاب ہوئے۔ شردھانند اور اس کے ساتھیوں کو اس تحریک سے حصولِ مقصد میں تو کوئی کامیابی نہ ہوئی البتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی خلیج ضرور وسیع ہو گئی۔ انتہا تو یہ ہے کہ جب دہلی کے ایک غیرت مند مسلمان غازی عبدالرشید نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخیاں کرنے کی پاداش میں سوامی شردھانند کو موت کے گھاٹ اتار دیا تو آنجہانی پنڈت جواہر لال جو ایک زمانے میں آل انڈیا کانگرس کے صدر بھی رہے۔ دریدہ دہن شردھانند کی موت پر اپنے جذبات ضبط نہ کر سکے اور ان الفاظ میں انہیں خراج تحسین ادا کیا "سوامی شردھانند کا دراز قد، گیروے لباس میں ملبوس، باوقار جسم، ضعیفی کے باوجود سینہ تان کر چلنا، آنکھوں سے چنگاریوں کی بارش اور لوگوں کی لغزشوں پر اطلاع پا کر پیشانی پر شکنیں آ جانا ــــ ان کی یہ تصویر میری آنکھوں کے سامنے رہتی ہے اور دل میں گھر کر چکی ہے"[1]

پنڈت نہرو کے علاوہ کانگرس کے اور بہت سے ہندو رہنماؤں مثلاً مسٹر گاندھی اور سری نواس آئینگر نے بھی سوامی شردھانند کی موت پر نہایت گہرے جذباتِ غم و اندوہ کا اظہار کیا اور اس کی یادگار قائم کرنے کی تجاویز کی پُر زور حمایت کی بلکہ بعض نے تو اپنی جیبِ خاص سے اس یادگار فنڈ میں عطیات بھی دیئے اس سے کانگرسی رہنماؤں کی فرقہ وارانہ ذہنیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ملک گیر فرقہ وارانہ فسادات

ہندوستان کی سیاسی فضا کو خراب کرنے میں سوامی شردھانند کے بعد جس شخص کا سب سے زیادہ حصہ تھا وہ مشہور مہاسبھائی لیڈر پنڈت مدن موہن مالویہ تھے۔ اس شخص نے "انجمن انسدادِ گئوکشی" کی بنیاد رکھ کر ہندوستان کی فضا میں ایسا آتش گیر بم پھینکا تھا جس کے شعلے آخر تک سرد نہ ہو سکے اور آج تک بھڑک رہے ہیں۔ ان نئے ملک گیر فسادات کا آغاز ۱۹۲۵ء میں ہوا اور دہلی، کلکتہ، الہ آباد اور بعض دوسرے شہروں میں ہندوؤں کے منظم گروہوں نے جو مہلک ہتھیاروں سے لیس تھے مسلمانوں کی آبادیوں پر حملے شروع کر دیئے۔ اس مسلم کشی سے اور تو اور ریاست حیدر آباد بھی محفوظ نہ رہی جہاں کا حکمران مسلمان تھا اور جہاں مسلمان اقتدار میں تھے۔ اس سلسلے میں ریاست کے مقام ہامون آباد کے فسادات خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں جہاں عید قربان

---

[1] میری کہانی حصہ اول صہ ۲۷۲ مصنفہ پنڈت جواہر لال نہرو۔

کے موقع پر مہاسبھائی غنڈوں نے مسلمانوں کے محلوں کو آتش زنی اور قتل و غارت کا نشانہ بنایا۔ ان ملک گیر فسادات میں سیکڑوں افراد خاک و خون میں تڑپ کر ٹھنڈے ہو گئے جن کی اکثریت مسلمان تھی اور مسلمانوں کی کروڑوں روپے کی املاک غارت ہو گئی۔ یہ داستان ۱۹۲۶ء میں کلکتہ میں پھر دہرائی گئی اور عین نماز باجماعت کے وقت ہندوؤں نے مسجد کے سامنے سے باجہ بجاتے ہوئے ایک جلوس گزارا۔ مسلمانوں کے اعتراض کرنے پر ہندوؤں نے نمازیوں پر حملہ کر دیا۔ فساد اتنا شدید تھا کہ پولیس نے گولی چلائی۔ یہ فسادات ڈیڑھ ماہ تک جاری رہے۔ ہزاروں افراد زخمی ہو گئے اور سو سے زیادہ ہلاک ہوئے۔ فسادات کی آگ بڑھتی گئی اور ۱۹۲۹ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ کلکتہ کے علاوہ دہلی، بمبئی، لاہور، ملتان، ناگپور اور بریلی غرض صوبہ جات یوپی، سی پی، بہار اور پنجاب کے متعدد شہروں میں مہاسبھا اور آریہ سماج نے مسلمانوں کے خرمن حیات کو خاکستر کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ سوامی شردھانند، لالہ لاجپت رائے اور مدن موہن مالویہ نے ان فسادات کو ہوا دینے اور ہندوؤں کو مشتعل کرنے میں سرگرم حصہ لیا۔ حیرت تو اس امر پر ہے کہ کانگرسی لیڈروں خاص طور پر مسٹر گاندھی نے یہ جانتے ہوئے کہ فسادات کی اصل بانی ہندو تنظیمیں ہیں، مسلمانوں کو بھی مطعون کرنا شروع کر دیا۔

جناب حسن ریاض پروفیسر کراچی یونیورسٹی نے اپنی کتاب "پاکستان ناگزیر تھا" میں ان فسادات پر بڑے موثر پیرائے میں روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :۔

ڈاکٹر امبیدکر کا تبصرہ

"ڈاکٹر امبیدکر نے ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۰ء تک کے بلووں کا اپنی کتاب موسومہ "پاکستان" میں مفصل ذکر کیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی تھی۔ ان کا قول یہ ہے کہ صوبہ بمبئی میں فروری ۱۹۲۹ء سے اپریل ۱۹۳۸ء تک مسلسل ۲۱۰ روز ہنگامے ہوتے رہے۔ ان میں ۵۶۰ آدمی قتل ہوئے اور ۴۵۰۰ زخمی۔ مارچ ۱۹۳۱ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کانپور کا ہنگامہ ہوا جس میں کم سے کم ۵۰۰ آدمی قتل ہوئے۔

یہ ہندو مسلم فسادات کیوں ہوتے تھے؟ کیا ان کا واقعی کوئی سبب تھا؟ جو اسباب آنکھوں سے نظر آتے تھے وہ یہ تھے کہ ٹھیک جب مغرب کی نماز ہو رہی ہے تو قریب کے مندر میں گھنٹے اور گھنٹیاں بجیں اور گانا شروع ہوا۔ یہ ہندوؤں کی آرتی تھی۔ اس کا کوئی وقت معین نہ تھا۔ مغرب کی اذان سے پہلے بھی ہو سکتی تھی اور بعد میں بھی۔ مگر مسلمانوں کو مشتعل کرنے کے لئے کسی مسجد کے متصل مندر میں اسی وقت کی جاتی تھی جب نماز ہو رہی ہو اور مسلمان (قدرتاً) اس پر لڑنے لگتے۔ ہندوؤں کے مذہبی اور غیر مذہبی جلوس نکلتے ہی رہتے ہیں۔ مسجدوں کے

سامنے اور نماز کے اوقات میں یہ جلوس رک کر کھڑے ہو جاتے اور بڑے اہتمام سے باجا بجتا اور شور و شغب ہوتا۔ مسلمان مسجد سے نکل کر ان کو ٹوکتے تھے اور ہنگامہ ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ گائے کی قربانی پر، محرم کے جلوس پر، رام لیلا کے جلوس پر، اذان پر ــــــ جب لڑنا ہی ہو تو اس کے لئے ہزار بہانے۔

کوہاٹ کا فساد ان معنی میں سب سے زیادہ سخت تھا کہ اس پر مولانا شوکت علی اور مسٹر گاندھی کے درمیان کشیدگی واقع ہو گئی اور اسی وقت سے ہندو اخبارات نے علی برادران کے خلاف دریدہ دہنی اختیار کی۔ کوہاٹ کے ہنگامے کے بعد حالات کی تحقیق اور وہاں امن و اطمینان پیدا کرنے کے لئے کانگرس نے ایک وفد بھیجا جو مولانا شوکت علی اور مسٹر گاندھی پر مشتمل تھا۔ گورنمنٹ نے وفد کو کوہاٹ جانے کی اجازت نہ دی۔ وفد نے راولپنڈی میں قیام کیا، وہیں اپنا کام شروع کر دیا اور کوہاٹ کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو طلب کیا کہ اپنے بیانات دیں۔ ہندوؤں کی پوری جماعت آئی۔ مسلمان صرف دو آسکے۔ جب رپورٹ شائع ہوئی تو معلوم ہوا کہ مسٹر گاندھی نے مسلمانوں کو قصور وار ٹھہرایا۔ مولانا شوکت علی نے مسلمانوں کے ذمے یہ الزام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔"[1]

انہی سنگین حالات و واقعات کو دیکھ کر آخر کار قائد اعظم جیسے مسلمان رہنما کو جو ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کہلاتے تھے یہ کہنا پڑا کہ اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ ملک میں فرقہ وارانہ مسئلہ موجود ہے اور اسے صرف جذباتی باتوں اور قیل و قال سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نہ اس مسئلہ کا حل نیشنلزم ہے اور نہ مشترکہ انتخاب۔

رنگیلا رسول کا ناشر

اسی دوران میں لاہور کے ایک آریہ سماجی پروفیسر نے "رنگیلا رسول" کے نام سے ایک نہایت ناپاک کتاب لکھی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس پر نہایت رکیک اور سوقیانہ حملے کئے گئے تھے۔ مصنف شریر اور خبیث الفطرت ہونے کے علاوہ بزدل بھی تھا۔ اس لئے اس نے کتاب پر اپنا نام درج نہیں کیا اور اس کے ناشر راج پال کے نام سے یہ کتاب شائع ہوئی۔ اس ناپاک کتاب کے خلاف مسلمانوں نے احتجاج کیا راج پال پر مقدمہ چلا۔ ابتدائی عدالتوں میں اسے سزا ہوئی مگر ہائی کورٹ میں جسٹس دلیپ سنگھ نے اسے بری کر دیا۔ لاہور کے ایک غیرت مند مسلمان علم الدین کو اس واقعہ کا نہایت رنج ہوا اور اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر راج پال کا کام تمام کر دیا۔ مسلمانوں نے علم الدین کا مقدمہ لڑا اور خوب لڑا۔ انصاف کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اس واقعہ کی ذمہ داری اس شخص پر عائد کی جاتی جو علم الدین کو مشتعل کرنے کا باعث ہوا۔ مگر ہوا یہ کہ علم الدین کو سزائے موت دی گئی۔ اس واقعے نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ ہندو مسلمانوں کو آزار پہنچانے کا تہیہ کر چکے ہیں اور ان کی زندگی کے ہر پہلو پر بھرپور حملہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔

---

[1] "پاکستان ناگزیر تھا" صفحہ ۱۵۰ تا صفحہ ۱۵۲ مولفہ سید حسن ریاض، استاد شعبۂ صحافت کراچی یونیورسٹی

سائمن کمیشن

ابھی ملک گیر ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ جاری تھا کہ وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ نے ہندوستان کو بعض سیاسی مراعات دینے کے لئے ایک شاہی کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا۔ نومبر ۱۹۲۷ء میں کمیشن کے اراکین کے ناموں اور ان کے دائرہ کار کا بھی اعلان کر دیا گیا۔ سر جان سائمن اس کمیشن کے سربراہ مقرر کئے گئے اور اس کے ممبروں میں کسی ایک ہندوستانی کو بھی شامل نہ کیا گیا۔ اس سے قبل جب وائسرائے ہند لارڈ ارون کی حکومت نے اس کمیشن کی منظوری کا اعلان کیا تو وائسرائے کی کونسل کے واحد رکن سر محمد حبیب اللہ نے نہایت جرأت اور قومی حمیت سے کام لے کر اس کمیشن کی ہیئت ترکیبی پر سخت اعتراض کیا اور اس میں کسی ہندوستانی کو شامل نہ کرنے کے خلاف پرزور احتجاج کیا۔ اس احتجاج میں سر محمد حبیب اللہ تنہا نہ تھے بلکہ ہندوستان کے تمام قابل ذکر سیاسی رہنماؤں مثلاً قائد اعظم، سر تیج بہادر سپرو، لالہ لاجپت رائے، سر عبدالرحیم، سر چمن لال سیتل واد، سر علی امام، سر سوامی آئر، ایچ پی موڈی اور سر پرسوتم داس ٹھاکر وغیرہم نے بھی ایسے کمیشن کی پر زور مخالفت کی جس میں کسی ایک ہندوستانی کو بھی نمائندگی نہیں دی گئی تھی۔ کمیشن کی آمد سے کئی ماہ قبل ہندوستانی لیڈروں کی کوشش سے جن میں قائد اعظم کا نام سر فہرست ہے اس کے خلاف اہل ہند کی رائے عامہ بیدار ہو چکی تھی۔ اس سلسلے میں ۱۹ نومبر ۱۹۲۷ء کو قائد اعظم نے اس کمیشن کے خلاف بمبئی میں ایک جلسۂ عام طلب کیا۔ اس جلسے کی صدارت سر ڈنشا پیٹیٹ نے کی۔ سائمن کمیشن کے خلاف یہ پہلا جلسۂ عام تھا۔ قائد اعظم نے اس جلسے سے خطاب کرتے ہوئے مندرجہ ذیل قرارداد پیش کی جو متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔

"اہالیان بمبئی کا یہ عوامی جلسہ اس کمیشن کے خلاف نہایت پر زور احتجاج کرتا ہے جس کے تقرر کا حال ہی میں اعلان کیا گیا ہے۔ اس کمیشن کو اہل ہند ہرگز قبول نہیں کر سکتے جس میں ملک کے متوقع آئین کی ترتیب و تشکیل میں ہندوستانی عوام کی شرکت و مساویانہ نیابت کے حق کو پامال کر دیا گیا ہے۔ یہ عوامی جلسہ اس امر کا بھی اعلان کرتا ہے کہ بہ حالات موجودہ ہندوستان کے لوگ اس کمیشن کی سفارشات قبول کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔"[1]

ادھر تو قائد اعظم اور ان کی قیادت میں ہندوستان کے سیاسی لیڈر سائمن کمیشن کی ہیئت ترکیبی کے خلاف بیانات دے رہے تھے اور اہل ہند سے اپیل کر رہے تھے کہ وہ اس کمیشن کا مقاطعہ کریں۔ مگر دوسری طرف حکومت اس امر کی کوشش کر رہی تھی کہ ہندوستان کے سیاست دانوں میں سے ایسے افراد مل جائیں جو اس کمیشن سے تعاون کریں تاکہ اس کی مرتب کی ہوئی سفارشات کو آئینی حیثیت دی جا سکے۔ حکومت کو اپنے مقاصد میں کامیابی ہوئی اور اسے بنگال اور پنجاب سے ایسے افراد مل گئے جو سائمن کمیشن سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو گئے لیکن ملک کے سیاست دانوں اور عوام کی اکثریت اس کمیشن کے خلاف ہی رہی۔

---

[1] قائد اعظم جناح — دی اسٹوری آف اے نیشن صفحہ ۱۹۴

سائمن کمیشن کا استقبال

چنانچہ ۳ فروری ۱۹۲۸ء کو شاہی کمیشن کے یہ ناخواندہ مہمان بمبئی پہنچے ساحل سمندر سے ان کی قیام گاہ (گورنمنٹ ہاؤس) تک کھڑے ہوئے ہزاروں افراد نے سیاہ جھنڈیاں لہرا لہرا کر ان کا استقبال کیا "سائمن واپس جاؤ" کا نعرہ ہر شخص کی زبان پر تھا۔ شہر میں مکمل ہڑتال کی گئی۔ بعض مقامات پر پولیس اور مظاہرین میں نہایت سخت جھڑپیں بھی ہوئیں۔ اس کے بعد مدراس، دہلی، لاہور، لکھنؤ، پٹنہ، کلکتہ غرض جہاں بھی سائمن کمیشن گیا ہندوؤں اور مسلمانوں نے متحد ہو کر کمیشن کے خلاف اپنی نفرت اور غم و غصہ کا اظہار کیا۔ ان ہنگاموں میں بہت سے ہندوستانی ہلاک ہو گئے اور زخمیوں کی تو کوئی تعداد ہی نہیں۔ ان زخمیوں میں پنڈت جواہر لال نہرو، ولبھ بھائی پٹیل اور لالہ لاجپت رائے بھی شامل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ لاجپت رائے چند روز کے بعد اپنی زخموں کی وجہ سے انتقال کر گئے۔

قائد اعظم کے چودہ نکات

جب حکومت نے ہندوستانیوں کو سیاسی مراعات دینے کا اعلان کیا اور اس سلسلے میں ایک کمیشن ہندوستان بھیجنے کی تجویز ہوئی (جو بعد میں سائمن کمیشن کے نام سے ہندوستان میں وارد ہوا) تو مسلمان رہنماؤں نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک جگہ جمع ہو کر ایسی تجاویز مرتب کریں جو ہندوؤں کے لئے بھی قابل قبول ہوں اور حکومت کے سامنے بھی مسلمانوں کے متفقہ مطالبات کی صورت میں پیش کی جا سکیں۔ قائد اعظم اور مولانا محمد علی جوہر نے اس اجتماع کو کامیاب بنانے اور ان تجاویز کو مسلمان عوام کے دل کی آواز بنانے میں غیر معمولی جد و جہد کی۔ یہ ۱۹۲۷ء کی بات ہے، ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کا بجٹ سیشن ہو رہا تھا۔ قائد اعظم اس سیشن میں شرکت کرنے کے لئے دہلی میں مقیم تھے۔ یہیں انہوں نے ہندوستان کے مسلم رہنماؤں کو تار دے کر بلایا اور ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو ہر مکتبۂ فکر کے مسلمان سیاست دانوں کی ایک کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں قائد اعظم کے علاوہ مولانا محمد علی جوہر، سر شفیع، ڈاکٹر انصاری، مفتی کفایت اللہ، راجہ صاحب محمود آباد اور سر علی امام بھی شامل تھے۔ اس کانفرنس میں قائد اعظم نے مولانا محمد علی جوہر کے مشورے سے اپنی مندرجہ ذیل چودہ نکاتی تجاویز پیش کیں :-

(۱) ہندوستان کا آئندہ دستور وفاقی طرز کا ہوگا (۲) ہر صوبہ کامل طور پر خود مختار ہوگا اور ہر صوبے کو سیاسی اصلاحات دی جائیں گی (۳) مجالس قانون ساز کو اس طرح تشکیل دیا جائے گا کہ ہر صوبہ میں اقلیت کو موثر نیابت مل سکے اور کسی صوبے کی اکثریت کو اقلیت یا مساوی حیثیت میں تبدیل نہ کیا جا سکے (۴) مرکزی مجلس آئین ساز میں مسلمانوں کی نیابت کا تناسب کم سے کم تہائی ہو (۵) ہر فرقہ کو جداگانہ نیابت کا حق حاصل ہوگا البتہ اگر کوئی فرقہ از خود چاہے تو یہ حق چھوڑ سکتا ہے (۶) صوبوں میں آئندہ کوئی ایسی سکیم عمل میں نہیں لائی جائے گی جس کے نتیجے میں صوبۂ سرحد، صوبۂ پنجاب اور صوبۂ بنگال کی مسلم اکثریتیں متاثر ہوں (۷) ہر قوم و ملت کو اپنے مذہب، رسوم و

رواج، تنظیم و اجتماع، عبادات اور ضمیر کی آزادی حاصل ہوگی۔ (۸) مجالسِ قانون ساز کو ایسا کوئی قانون، تحریک یا تجویز منظور کرنے کا اختیار نہ ہوگا جسے کسی قوم کے ممبروں کی ۳/۴ اکثریت اپنے قومی مفادات کے حق میں مضر قرار دے (۹) سندھ کو غیر مشروط طور پر بمبئی سے الگ کر کے ایک نئے صوبے کی حیثیت دی جائے (۱۰) صوبہ سرحد اور بلوچستان میں دوسرے صوبوں کی طرح تمام اصلاحات نافذ کی جائیں (۱۱) سرکاری ملازمتوں اور انتظامیہ کے ذمہ دار مناصب پر غیر مسلموں کی طرح مسلمانوں کو بھی ان کی اہلیت کے مطابق فائز کیا جائے (۱۲) اسلامی تہذیب و تمدن کی ترقی و تحفظ، مسلمانوں کی تعلیم، رسم الخط زبان اور پرسنل لا نیز اسلامی اداروں کی ترقی کے لئے حکومت اور دیگر شعبوں کی طرف سے دی جانے والی امداد سے استفادہ کرنے کے لئے آئین میں دفعات شامل کی جائیں (۱۳) کسی صوبے میں کوئی ایسی وزارت تشکیل نہ دی جائے جس میں ۱/۳ تعداد مسلمان وزیروں کی نہ ہو (۱۴) ملک کے سارے صوبوں اور ریاستوں کی منظوری کے بغیر آئین میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔

مسلم سیاست دانوں کی کش مکش

یہ ایسے نکات تھے جن سے ہندوؤں کو کسی قسم کے نقصان کا احتمال نہ تھا بلکہ مخلوط انتخاب پر آمادگی ظاہر کر کے وہ اپنے بہت بڑے حق سے دستبردار ہو گئے تھے مگر اس قربانی کے باوجود ہندوؤں نے قائد اعظم کی یہ تجاویز رد کر دیں سوائے مخلوط انتخاب کے۔ ہندوؤں کی اس روش سے متاثر ہو کر مولانا محمد علی جوہرؔ جیسے ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار نے بھی اپنے اخبار ہمدرد میں ایک پر زور مقالہ لکھا جس کے یہ الفاظ نہایت حقیقت افروز ہیں کہ "ہندو اکثریت ہر جگہ مسلمانوں کو اقلیت میں رکھنا چاہتی ہے خود کہیں بھی اقلیت میں رہنا نہیں چاہتی"[۱] ادھر ان تجاویز پر خود مسلمان رہنماؤں میں کش مکش پیدا ہو گئی اور اگرچہ دہلی کے اجلاس میں یہ تجاویز متفقہ طور پر منظور کی گئی تھیں مگر سر شفیع نے لاہور پہنچ کر ان کی مخالفت میں بیان دے دیا۔ سر فضل حسین اور علامہ اقبال کو بھی انہوں نے اپنا ہم نوا بنا لیا[۲]۔ اس طرح مسلمان رہنما دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ قائد اعظم اور مولانا جوہرؔ کا اور دوسرا سر شفیع اور علامہ اقبالؔ کا۔ سر شفیع کا گروہ مخلوط انتخابات کو مسلمانوں کے حق میں مضرت رساں قرار دیتا تھا مگر قائد اعظم کے نزدیک سندھ کی بمبئی سے علیحدگی تسلیم کر لینے اور سرحد و بلوچستان میں سیاسی اصلاحات کے نفاذ سے ان پس ماندہ صوبوں کے مسلمانوں کو جو سیاسی و معاشی فائدہ پہنچتا وہ مخلوط انتخاب کا اصول تسلیم کر لینے کے مفروضہ نقصان سے کہیں بہتر تھا۔

قائد اعظم کی تصریحات

جب مسلمان سیاست دانوں میں چودہ نکات پر اختلاف نے شدت اختیار کر لی تو قائد اعظم نے ۲۰ر مئی ۱۹۲۷ء کو ایک بیان جاری کیا جس میں انہوں نے ان نکات کی صراحت کرتے ہوئے کہا کہ "مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرنے اور انہیں آپس میں لڑانے کے لئے دانستہ غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس امر کی توضیح ہو جائے کہ مسلمان مخلوط انتخاب کا اصول اور نشستوں کے تحفظ کی تجویز اسی صورت میں منظور کریں گے جب قرار داد دہلی (چودہ نکات) کی تمام شقوں کو ہندو قبول کر لیں" قائد اعظم کے اس بیان کے بعد ہی مولانا محمد علی جوہرؔ نے ان کی حمایت میں ملک بھر دورے کئے اور اپنی شعلہ بیانی اور موثر طرز استدلال سے تعلیم یافتہ طبقے اور عوام دونوں کو ان تجاویز کا ہمنوا بنا لیا۔ اس طرح میدان قائد اعظم کے ہاتھ رہا۔

نہرو رپورٹ

قائدِ اعظم اور مولانا محمد علی جوہر کی کوششوں سے "چودہ نکات" کے نام سے جو تجاویز دہلی کے اجلاس میں منظور کی گئی تھیں ان کے تسلی بخش نتائج اسی صورت میں نکل سکتے تھے جب مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی ان تجاویز کو قبول کر لیتے۔ کانگریس ہندوؤں کی سب سے بڑی اور نمائندہ جماعت تھی اس لئے قائدِ اعظم نے اس جماعت کے رہنماؤں سے رجوع کیا۔ گو کانگریس کا مہاسبھائی عنصر چودہ نکات کے سخت خلاف تھا۔ مگر اس زمانے میں صدر کانگریس سری نواس آئنگر جیسے رہنما تھے۔ جو ہندوؤں میں مقابلۃً غیر متعصب تھے۔ ان کی کوششوں سے ۱۵ مئی ۱۹۲۷ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ بمبئی میں قائدِ اعظم کے چودہ نکات کو تسلیم کر لیا۔ مگر جب یہ تجاویز دسمبر ۱۹۲۷ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سالانہ اجلاس منعقدہ مدارس میں پیش ہوئیں تو مسٹر گاندھی کے اشارے پر کانگریسی ممبروں نے ان کی سخت مخالفت کی اور یہ فیصلہ کیا کہ ایک آل پارٹیز کانفرنس طلب کی جائے۔ اس میں قائدِ اعظم کے چودہ نکات اور دوسری تمام تجاویز پیش کی جائیں، ان کی روشنی میں کوئی جامع لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں قائدِ اعظم کے چودہ نکات آل انڈیا کانگریس نے مسترد کر دیئے۔

مئی ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا جس میں کم و بیش ستر (۷۰) پارٹیوں کو مدعو کیا گیا ظاہر ہے کہ ستر پارٹیوں کے نمائندے جن میں اکثریت کانگریسیوں، مہاسبھائیوں اور سکھوں کی تھی قائدِ اعظم کے چودہ نکات پر کیسے متفق ہو سکتے تھے۔ پھر ان میں ایسے مسلمان رہنما بھی تھے جنھیں سر شفیع اور سر فضل حسین کے اشارے پر اس کانفرنس میں بھیجا گیا تھا اور جو قائدِ اعظم کے چودہ نکات کے سخت مخالف تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کانفرنس نے ان تجاویز کو قبول نہ کیا اور پنڈت موتی لال نہرو کی زیرِ قیادت ایک کمیٹی قائم کر دی گئی یہی کمیٹی بعد میں نہرو کمیٹی اور اس کی مرتب کردہ رپورٹ نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کمیٹی نے قائدِ اعظم کے چودہ نکات میں سے ان تمام نکات کو رد کر دیا جن سے برِ صغیر کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کا تحفظ ہو سکتا تھا۔ نہرو رپورٹ دراصل مسلمانوں کے سیاسی مفاد پر ایک بھرپور وار کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے واضعین نے جن میں بدقسمتی سے کچھ مسلمان بھی شامل تھے نہایت تنگ نظری کا ثبوت دیا۔ مسلمانوں کو تو صرف اس لئے

اس کمیشن میں شامل کیا گیا تھا کہ اس کی نمائندہ حیثیت میں شک وشبہ باقی نہ رہے ورنہ اس پر مہاسبھائی اور
کانگریسی ہندو چھائے ہوئے تھے۔ انہی کی اکثریت اور بہت بڑی اکثریت تھی۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں اور
خصوصاً قائداعظم کے چودہ نکات میں سے اس سب سے بڑے نکتہ کی سختی سے مخالفت کی کہ سندھ کو جداگانہ
حیثیت دی جائے۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ ہندوستان میں بحیثیت مجموعی اکثریت میں ہونے کے باوجود
ہندو بنگال، پنجاب، سرحد اور سندھ میں مسلمانوں سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ اس لیے اگر وہ کچھ حقوق کا مطالبہ
کرتے ہیں تو (مسلمانوں کی طرف سے) ان کی مخالفت نہیں ہونی چاہیے۔ یہ شق دراصل اس لیے شامل کی
گئی تھی کہ سندھ کو بمبئی سے الگ کرنے اور صوبہ سرحد میں مسلمانوں کی طرف سے اصلاحات کے مطالبے
پر ہندوؤں کے احتجاج کو درست ثابت کیا جا سکے۔ قائداعظم کے چودہ نکات میں مرکزی اسمبلی میں مسلمان
ممبروں کی تعداد ۳۳ فی صد مقرر کی گئی تھی۔ نہرو رپورٹ میں اس مطالبے کی بھی مخالفت کی گئی اور تجویز کیا گیا
کہ برصغیر میں مسلمانوں کی آبادی چوتھائی سے بھی کم ہے اس لیے انھیں ان کی آبادی کے تناسب سے
زیادہ نمائندگی کا حق نہیں...... دیا جا سکتا۔ یہ دلیل دے کر نہرو رپورٹ کے واضعین نے مرکزی اسمبلی
میں مسلمانوں کی نمائندگی کی حد ۳۳ فی صد کی بجائے ۲۵ فی صد مقرر کر دی۔ اس کمیشن میں خلافت کمیٹی کی طرف
سے جناب محمد شعیب بھی شامل تھے۔ انھوں نے ان تجاویز سے اتفاق کرنے سے انکار کر دیا اور نہرو رپورٹ
پر دستخط نہیں کیے۔ یہ دیکھ کر کمیٹی کے صدر پنڈت موتی لال نہرو نے جناب شعیب کو کمیٹی سے الگ کر دیا
اور تصدق احمد خاں شروانی اور چودھری خلیق الزماں کو نامزد کر دیا۔

علی برادران کی رائے

اگست ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ مولانا محمد علی جوہر ان دنوں
بیمار تھے اور علاج کی غرض سے یورپ گئے ہوئے تھے۔ قائداعظم بھی ملک سے باہر تھے۔ مگر مولانا شوکت علی
نے ان دونوں حضرات کی کمی پوری کر دی۔ چنانچہ جب آل پارٹیز کانفرنس میں نہرو رپورٹ پیش ہوئی تو انھوں
نے اس پر نہایت سخت تنقید کی اور اعلان کیا کہ چونکہ اس رپورٹ میں مسلمانوں کے تمام مطالبات کو
نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے منظور نہیں کر سکتے۔ مولانا نے کہا کہ نہرو رپورٹ میں پنجاب اور بنگال
میں مسلمانوں کو اقلیت بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کا مسئلہ بھی نظرانداز کر دیا گیا ہے اور
مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو $\frac{1}{3}$ نشستیں دینے سے بھی پہلو تہی کی گئی ہے۔

یورپ سے واپس آکر مولانا محمد علی جوہر نے ہر ممکن کوشش کی کہ کانگریس نہرو رپورٹ پر نظرثانی کر کے اس
میں مسلمانوں کے جائز مطالبات شامل کرے، مگر انھیں کامیابی نہ ہوئی آخر کار وہ نہ صرف نہرو رپورٹ کے مخالفین

میں شامل ہو گئے بلکہ انھوں نے ہمیشہ کے لئے کانگرس سے قطع تعلق کر لیا۔ اس رپورٹ پر انھوں نے جو جامع تبصرہ فرمایا تھا وہ جہاں مولانا کی حسِ مزاح اور سیاسی بصیرت دونوں کا آئینہ دار ہے، وہاں کانگرس کی ذہنیت اور اس کے عزائم کی بھی نہایت خوب صورتی سے عکاسی کرتا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ "کمپنی کی حکومت کے زمانے میں منادی والا آواز لگایا کرتا تھا کہ خلق خدا کی، ملک ملکہ کا، حکم کمپنی بہادر کا"۔ اب نہرو رپورٹ کے نفاذ کے بعد منادی والا یوں پکارا کرے گا کہ خلق خدا کی، ملک انگریز کا، حکم مہا سبھا بہادر کا۔"

آل پارٹیز مسلم کانفرنس

۲۶ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو قائدِ اعظم یورپ سے واپس آگئے۔ کچھ عرصے تک تو انھوں نے نہرو رپورٹ کے بارے میں سکوت اختیار کیا۔ شاید وہ اس کے مختلف پہلوؤں پر غور و خوض کرنے کے علاوہ ہندوستان کے سیاست دانوں کے خیالات اور اس رپورٹ کے بارے میں مسلم لیڈروں کے ردِ عمل کا جائزہ لے رہے تھے۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۲۸ء کو کلکتہ میں آل پارٹیز کنونشن منعقد کرنے کا اعلان کیا گیا۔ قائدِ اعظم کو بھی اس اجتماع میں مدعو کیا گیا۔ مگر انھوں نے اس وقت یہ کہہ کر اس اجلاس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا کہ جب تک مسلم لیگ کے اجلاس میں اس رپورٹ پر غور و خوض نہ ہو جائے میرا اس کنونشن میں شرکت کرنا لاحاصل ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ دہلی میں منعقد کرنے کا اعلان کیا تاکہ نہرو رپورٹ پر کوئی آخری فیصلہ کرنے کے بعد آل پارٹیز کنونشن میں شرکت کی جائے۔

اس سے قبل سر شفیع اور قائدِ اعظم کے اختلافات نے نازک صورت اختیار کر لی تھی اور دو مسلم لیگیں قائم ہو چکی تھیں۔ ایک شفیع مسلم لیگ جس کے صدر سر محمد شفیع تھے۔ دوسری جناح مسلم لیگ جس کے صدر قائدِ اعظم تھے۔ قائدِ اعظم کی طرف سے مسلم لیگ کے سالانہ جلسے کے انعقاد کا اعلان ہوتے ہی سر شفیع نے شفیع مسلم لیگ کی بجائے آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے نام سے ایک تنظیم کے قیام کا اعلان کیا اور اس کے زیرِ اہتمام ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ سر فضل حسین اور ان کے گروہ نے ان کی پُر زور حمایت کی۔ یو۔ پی کے تعلقہ داروں کے ایک گروہ کو بھی آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی تائید پر آمادہ کر لیا گیا۔ نواب چھتاری اور ڈاکٹر ضیاء الدین اس گروپ کی قیادت کر رہے تھے۔ سر آغا خاں جو ان دنوں یورپ میں تھے اس کانفرنس کی صدارت کے لئے مدعو کیا گیا۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء کو آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا دہلی میں اجلاس ہوا۔ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا حسرت موہانی نے بھی اس اجلاس میں شرکت کی۔ جمعیۃ العلماء کے اکابر بھی شریک ہوئے۔ اس اجتماع میں تھوڑے سے رد و بدل کے بعد وہی تجاویز منظور کی گئیں جو قائدِ اعظم نے چودہ نکات کے نام سے پیش کی تھیں۔ اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سر شفیع اور ان کے

ہم نوا حضرات کی اس کانفرنس سے مسلم مفادات کو کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ تقویت ہی پہنچی اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ قائدِ اعظم غیر معمولی سیاسی بصیرت کے حامل رہنما تھے کہ ان کے مخالفین بھی بہ ہزار کوشش اس دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے تھے جو وہ متعین کر دیتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کانفرنس سے ایک نقصان یہ ضرور ہوا کہ قائدِ اعظم کے مخالفوں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ وہ ملک کے سارے مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کرتے ہیں، بلکہ تھوڑے سے مسلمان ان کے ساتھ ہیں۔ شفیع لیگ اور آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا وجود کانگرس اور مہاسبھا کے اس دعویٰ کا ثبوت تھا۔

نہرو رپورٹ پر علامہ اقبال کا تبصرہ

نہرو رپورٹ کی اشاعت برصغیر میں ایک نئے ہنگامے کا موجب ثابت ہوئی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس رپورٹ کو بحیثیت مجموعی پذیرائی نصیب نہ ہو سکی۔ خود ہندوؤں میں ایک ایسا گروہ موجود تھا جو اسے اپنی قوم کے لئے مضرت رساں سمجھتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نہرو کمیٹی کے بعض مسلمان ممبروں کے دباؤ میں آ کر اور کچھ مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے نہرو رپورٹ میں بعض ایسے مطالبات بھی شامل کر لئے گئے تھے جن سے مسلمانوں کی قدرے اشک شوئی ہو جاتی تھی۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہ رپورٹ مسلمانوں کے لئے نقصان دہ تھی۔ مگر متعصب ہندوؤں کو مسلمانوں کے لئے یہ برائے نام رعایت بھی منظور نہ تھی۔ چنانچہ مہاسبھائی ہندوؤں نے اس رپورٹ کی کھل کر مخالفت کی۔ اُدھر مسلمانوں میں دو گروہ ہو گئے ایک گروہ اُسے قطعی طور پر مسترد کر رہا تھا۔ اور دوسرا اس میں مناسب ردوبدل کے بعد اسے قبول کرنے پر آمادہ تھا۔ اس گروہ میں قائدِ اعظم اور علامہ اقبال کے نام سرِ فہرست ہیں۔ چنانچہ جب یہ رپورٹ شائع ہوئی تو اگست ۱۹۲۸ء میں علامہ اقبال نے جو اس وقت شفیع مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے اس رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "رپورٹ مرتب کرنے والے حضرات نے اپنے دلائل میں فرض کر لیا ہے کہ پنجاب اور بنگال کی مختلف اقوام اپنی اپنی قوم کے نمائندوں کے حق میں رائے دیں گی اس قیاس کی بنا پر پنجاب کے مسلمانوں کو یقین دلایا گیا ہے کہ کونسل میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی۔ اگر ایسا ہی ہے تو جداگانہ طریق انتخاب کو کیوں منظور نہیں کیا جاتا۔ یا کم از کم نشستوں کی تخصیص کیوں نہیں کی جاتی۔ اصل امرِ متنقلہ کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے پہلا مسئلہ بالغوں کی رائے دہی کے متعلق ہے۔ ۲۰ سال کے مسلمان بالغوں کی تعداد تمام بالغ مردوں کے مقابلے میں ۵۴ فی صدی ہے حالانکہ کل آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کا تناسب ۵۶ فی صدی ہے۔ اس دو فی صدی خسارہ سے ہندوؤں اور سکھوں کے تناسب آبادی میں ۲ فی صدی کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ کل آبادی کے لحاظ سے

ان دونوں قوموں کو ۲۴ فیصدی نیابت کے حقوق حاصل ہونے چاہئیں لیکن اس طریق انتخاب سے انہیں ۴۴ فیصدی نیابت ملتی ہے۔ گویا بلوغت کی حد ۲۰ سال مقرر کر دینے سے پنجاب کے مسلمانوں کو ۲ فی صدی کا نقصان اور ہندوؤں اور سکھوں کو ۲ فیصدی کا فائدہ ہوتا ہے۔

۲۔ مسلمان نابالغہ عورتوں کو تمام صوبہ کی بالغہ خواتین میں ۵۵ فی صدی کی نسبت حاصل ہے۔ لیکن وہ مقابلۃً غیر تعلیم یافتہ اور بے حد قدامت پسند ہیں۔ اس لئے عرصہ دراز تک ان کا پولنگ اسٹیشن پر ووٹ دینے کے لئے جانا محال ہے۔ غیر مسلم خواتین مقابلۃً زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ اس لئے وہ زیادہ تعداد میں رائے دینے جائیں گی۔ اس سے مسلمانوں کی نشستوں کی تعداد کو نقصان پہنچے گا۔

۳۔ ایک لاکھ کی آبادی کی طرف سے ایک نمائندہ مقرر کرنے سے پنجاب میں حلقہ جات انتخاب کی بھی از سر نو تقسیم کرنی پڑے گی۔ اس سے بھی مسلمانوں کی نیابت کو نقصان پہنچے گا اور اکثریت سے اقلیت میں تبدیل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ نہرو کمیٹی کے خیال میں مسلمانوں کو ۷۴ نشستیں مل جائیں گی لیکن اگر لاکھ کے پیچھے ایک نمائندے کی تجویز قائم رہے تو پنجاب کی دو کروڑ چھ لاکھ کی آبادی سے ۲۰۰ ارکان کا انتخاب لازمی ہوگا۔ ان کے لئے اسی قدر حلقے بھی تجویز کئے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ حلقہ انتخاب کی زیادتی سے ان حلقوں میں کمی واقع ہو جائے گی جن میں مسلمان امیدواروں کے کھڑے ہونے کی توقع ہے۔

۴۔ نہرو رپورٹ میں سندھ کی علیحدگی تسلیم ضرور کی گئی ہے مگر وہ مشروط ہے۔ برما کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس لئے میرے خیال میں اس قسم کی کوئی قید نہیں لگانی چاہیئے۔

۵۔ حقوق شہریت کے متعلق میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملکی انتظام اعلیٰ ترین دماغوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے۔ لیکن ہندوستان کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے میری رائے ہے کہ قابلیت کا معیار مقرر کر دیا جائے تاکہ ہر ایک قوم کو انتظام ملک میں کافی حصہ مل سکے۔ فرقہ وارانہ رقابت اور دشمنی کے تمام ممکنی مواقع کو رفع کرنے کے لئے اس کی ضرورت ہے۔

آخر میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ملک کی جماعتیں اس رپورٹ کی طرف پوری توجہ دیں اور بجائے فرقہ وارانہ تنازعات میں اپنا وقت ضائع کرنے کے دستور اساسی سے متعلق کسی مستحسن سمجھوتے پر پہنچیں اسی پر ملک کی موجودہ نجات اور آئندہ عظمت کا انحصار ہے۔[1]

---

[1] ہفت روزہ حمایت اسلام لاہور ۲۳ اگست ۱۹۲۸ء ص ۸۰۷

ڈاکٹر شفاعت احمد خاں کی رائے

مشہور مسلمان رہنما اور صوبہ یوپی کی مجلس دستور ساز کے رکن ڈاکٹر شفاعت احمد خاں نے نہرو رپورٹ پر نہایت سخت تنقید کی اور اسے مسلمانوں کے لیے بہت نقصان دہ قرار دیا۔

انہوں نے اس رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے ایسوسی ایٹڈ پریس کو حسب ذیل بیان دیا:۔

"میں دیانت کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ نہرو کمیٹی کی سفارشات سے جو توقعات وابستہ کی گئی تھیں وہ کمیٹی مذکور کی رپورٹ سے بُری طرح پامال ہو گئی ہیں۔ تمام رپورٹ میں دستوری اصولوں اور قانون سازی کی مصطلحات کی تکمیل سے متعلق غیر مطمئن کن اور ناکافی بیانات کے علاوہ جن پر ان زعمائے خیال کے ارکان نے سب سے زیادہ زور دیا ہے ایک فقرہ بھی ایسا نہیں جس میں مختلف ہندوستانی حلقوں اور مختلف مفادات سے بحث کی گئی ہو اور جو کسی بھی ذمہ دار جماعت یا ذمہ دار اشخاص کے لئے قابلِ تسلیم ہو۔ مسلمانوں کو جداگانہ حلقہ ہائے انتخابات اور جداگانہ نیابت سے محروم کیا گیا ہے اور صیغہ جات تعلیم تنظیم ونسق اور اقلیتوں کے مفاد کے تحفظ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ کمیٹی نے دانستہ ان امور کو چھوڑ دیا ہے اور اپنی تمام تر توجہ صرف خود اختیاری حکومت کی خوبیوں پر مرکوز کر دی ہے۔ یہ رپورٹ ان ہی دستوری غلاموں کے قابل ہے جو اپنی سکیم میں منطقی صحت اور خیالی تکمیل سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی زیادہ کہ ان کو ان مسائل مہمہ سے ناواقفیت ہے جن سے ملک میں ہلچل اور ابتری پھیلی ہوئی ہے۔ نہرو کمیٹی کی رپورٹ میرے لئے قطعاً ناقابلِ تسلیم ہے اور میں صوبہ جاتِ متحدہ کے تمام مسلمانوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس سے بالکل محترز رہیں۔ میں نے اس سے زیادہ مہمل، ناقابلِ عمل، غیر مناسب اور مجہول دستاویز شاید ہی دیکھی ہو۔ کمیٹی کی یہ رپورٹ سائمن کمیشن کے ساتھ اشتراکِ عمل کی سب سے بڑی دلیل ہے۔"[1]

قائدِ اعظم اور نہرو رپورٹ

نہرو رپورٹ مرتب ضرور ہو گئی تھی، اور مخالفین کے ساتھ ساتھ اس کے کچھ موافقین بھی تھے۔ بلکہ شاید موافقین زیادہ تھے لیکن ابھی اسے کسی متفقہ سیاسی دستاویز کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی۔

---

[1] ہفت روزہ حمایتِ اسلام لاہور بابت ۲۳ اگست ۱۹۲۸ء ص ۸

تھی اس لئے ضروری تھا کہ ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتیں متفقہ طور پر اس کی توثیق کریں۔ چنانچہ جیسا کہ قبل ازیں عرض کیا جا چکا ہے اس مقصد کے لئے دسمبر ۱۹۲۸ء میں ہندوستان کی تمام قابل ذکر سیاسی جماعتوں کا کلکتہ میں ایک اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا مسلم لیگ، کانگرس اور خلافت کمیٹی سب کو پہلے اپنے الگ الگ اجلاسوں میں نہرو رپورٹ پر غور و خوض کرنا تھا اور پھر آل پارٹیز کنونشن میں یہ رپورٹ زیر بحث آنی تھی۔ کنونشن سے پہلے جب مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا تو مولانا شوکت علی نے صدارت کے لئے مولانا محمد علی جوہر کا نام پیش کیا۔ مگر قائد اعظم نے مولانا محمد علی کی بجائے راجہ صاحب محمود آباد (سر علی محمد خاں) کا نام تجویز کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مولانا محمد علی جوہر نہرو رپورٹ کے مخالف بلکہ سخت ترین مخالف تھے اور راجہ محمود آباد اسکے حامی تھے۔ قائد اعظم نہیں چاہتے تھے کہ نہرو رپورٹ کے ایک شدید مخالف رہنما کو مسلم لیگ کے اجلاس کا صدر منتخب کیا جائے۔ کیونکہ اس کی صدارت میں جو بھی کارروائی ہوگی اس سے کانگرسی رہنما بدک جائیں گے۔ قائد اعظم اس وقت تک ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے اور چاہتے تھے کہ یہ دونوں قومیں مل کر کوئی ایسا فارمولا تیار کرلیں جو ہندوستان کو آزادی کی منزل کے قریب لے آئے اس لئے انھوں نے ہر وہ رکاوٹ دور کرنے کی کوشش کی جو ہندو مسلم اتحاد میں مانع ہو سکتی تھی یہی وجہ ہے کہ انھوں نے نہرو رپورٹ کے ایک حامی کو مسلم لیگ کے اجلاس کا صدر منتخب کرایا تاکہ کانگرس اور مسلم لیگ میں اختلافات کی خلیج کو کم سے کم کیا جا سکے اور اسی لئے وہ اپنے چودہ نکات میں سے بعض نکات سے دستبردار تک ہونے کو آمادہ ہو گئے کہ شاید اسی طرح ہندو اور مسلمان متحدہ طور پر اپنی تجاویز سائمن کمیشن کو پیش کر سکیں۔

مسلم لیگ کا اجلاس راجہ صاحب محمود آباد کی زیر صدارت شروع ہوا اور صدر جلسہ نے اپیل کی کہ نہرو رپورٹ منظور کر لی جائے اور حکومت سے درجہ نو آبادیات کا مطالبہ کیا جائے۔ انھوں نے فرمایا کہ جب تک دونوں قومیں تنگ نظری کے حصار سے باہر نہیں نکلیں گی اس وقت تک فرقہ دارانہ اختلافات کا مسئلہ حل نہیں ہو سکے گا۔ راجہ صاحب نے مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی نشستوں کے تعین، مسلم اکثریت کے صوبوں میں تناسب آبادی کے لحاظ سے نمائندگی اور اسی قسم کے دوسرے معاملات کے متعلق یہ رائے ظاہر فرمائی کہ ان امور کو باہمی گفت و شنید سے حل کیا جا سکتا ہے۔ خطبۂ صدارت کے بعد مسٹر چھاگلا نے اجلاس سے خطاب کیا۔ سب سے پہلے انھوں نے آل پارٹیز کنونشن میں حصہ لینے کے لئے مسلم لیگی وفد کے اراکین کے ناموں کا اعلان کیا۔ یہ وفد ۲۳ افراد پر مشتمل تھا جن کے نام یہ ہیں۔

(۱) راجہ صاحب محمود آباد (۲) قائد اعظم محمد علی جناح (۳) ڈاکٹر سیف الدین کچلو (۴) مسٹر ایم سی چھاگلا

(۵) ڈاکٹر سید محمود (۶) مولانا ظفر علی خاں (۷) نواب زادہ لیاقت علی خاں (۸) چودھری خلیق الزماں (۹) مسٹر عبداللہ بریلوی (۱۰) ملک برکت علی (۱۱) مولوی عبدالحمید (۱۲) مولوی حبیب الرحمٰن (۱۳) مسٹر حسام الدین (۱۴) مولوی محمد اکرم خاں (۱۵) سیٹھ یعقوب حسن (۱۶) غازی عبدالرحمٰن (۱۷) مسٹر تصدق احمد خاں شیروانی (۱۸) مسٹر منظور علی (۱۹) شاہ محمد زبیر (۲۰) مسٹر عبدالکریم (۲۱) مسٹر محمد اسلم (۲۲) مسٹر ایم عزیز الحق (۲۳) مسٹر فیض نور علی۔

مسٹر چھاگلا اور نہرو رپورٹ

اس کے بعد مسٹر چھاگلا نے نہرو رپورٹ پر اظہارِ خیال کرنے کے علاوہ مسلم لیگی وفد کو اس کی ذمہ داریاں یاد دلاتے ہوئے کہا کہ :-

"ہمارے وفد کو چاہیئے کہ نہرو رپورٹ کے نکات پر کافی احتیاط سے غور و خوض کرے اور یہ سوچ لے کہ گذشتہ سال (دسمبر ۱۹۲۷ء) میں ہم نے جو مطالبات (قائدِ اعظم کے چودہ نکات) پیش کیے تھے وہ اس میں شامل کیے گئے ہیں یا نہیں؟ نیز نہرو رپورٹ نے جو ترمیمات شامل کرنے کا فیصلہ کیا ہے وہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے سود مند ہیں یا نہیں؟ اور یہ کہ نہرو رپورٹ میں کہاں تک مسلمانوں کے حقوق کا خیال رکھا گیا ہے؟ نہرو رپورٹ نے پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کے لیے نشستیں مقرر نہیں کی ہیں۔ لہٰذا وفد کا یہ فرض ہے کہ اپنے اس خیال سے (کنونشن میں شریک ہندو بھائیوں کو) آگاہ کرے کہ آیا یہ مسلمانوں کے لیے سود مند ہے یا مضرت رساں ہے" [1]

قائدِ اعظم آل پارٹیز کنونشن میں

آخر ۲۲ دسمبر ۱۹۲۸ء کو کلکتہ میں آل پارٹیز کنونشن شروع ہوا۔ خلافت کمیٹی نے اس کنونشن میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ البتہ مولانا محمد علی جوہر اپنی ذاتی حیثیت سے اس میں شریک ہوئے۔ انہوں نے نہرو رپورٹ کی دھجیاں اڑا دیں۔ اور اس رپورٹ پر سب سے بڑا اعتراض کیا کہ اس میں آزادی کامل کی بجائے ہندوستان کو درجہ نوآبادیات دینے کی سفارش کی گئی ہے۔ مگر مولانا کی اس قدر شدید مخالفت کی گئی کہ وہ اپنی تقریر جاری نہ رکھ سکے اور کنونشن سے واک آؤٹ کر گئے۔ اس کے بعد پنجاب سے ملک برکت علی تقریر کرنے کے لیے اٹھے اور انھوں نے کنونشن سے مطالبہ کیا کہ اس اجتماع کو قائدِ اعظم کے چودہ نکات

---

[1] تاریخ مسلم لیگ صفحہ ۱۷۸ مؤلفہ سید رئیس احمد جعفری ندوی۔

نہرو رپورٹ میں شامل کر لینے چاہئیں۔ ان کی تقریر نہایت موثر اور مدلل تھی۔ ملک برکت علی کے بعد قائداعظم نے کنونشن سے خطاب کیا۔ انہوں نے سب سے پہلے نہرو رپورٹ کی اس خامی کی طرف اشارہ کیا جس کے تحت فرقہ وارانہ مسئلہ کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ سارے ملک کے لیے یہ نہایت نازک دور ہے۔ ان حالات میں بہت ضروری ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کر لیا جائے۔ اقلیتوں کے حقوق کا مناسب انتظام کئے بغیر کوئی ملک نمائندہ ادارے قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اکثریت کے مظالم کی وجہ سے اقلیت کو ہر وقت اپنے مفادات کی طرف سے خطرہ رہتا ہے اس لئے میں کنونشن سے اپیل کرتا ہوں کہ میں نے نہرو رپورٹ میں جو ترمیم و اضافہ کیا ہے اسے قبول کر لیا جائے۔ اس کے بعد قائداعظم نے اپنی تجاویز پیش کیں۔ نہرو رپورٹ میں مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے لئے ۲۵ فیصد نشستیں مقرر کی گئی تھیں۔ قائداعظم نے فرمایا کہ یہ تعداد بڑھا کر ۳۳ فیصد کر دی جائے۔ انہوں نے کہا کہ اس معاملے میں ہمارے تناسب آبادی کے علاوہ کچھ اور امور بھی مدنظر رکھے جائیں جن کی اہمیت اور صحت و درستی میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔

"نہرو رپورٹ کی شق (۱۳) الف میں سارے اختیارات صوبوں کی بجائے مرکز کو تفویض کر دینے کی سفارش کی گئی تھی۔ قائداعظم نے اس شق پر اظہار خیال کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ آئندہ دستور وفاقی طرز کا ہونا چاہیئے جس میں صوبوں کو بھی اختیارات دیئے جائیں۔ نہرو رپورٹ کی شق (۱۳) الف کو منسوخ کر دیا جائے کیونکہ یہ نہایت مضرت رساں ہے۔ سندھ اور شمال مغربی علاقوں کی علیحدگی کے بارے میں نہرو رپورٹ میں جو دفعہ شامل کی گئی تھی اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا کہ ہم نہرو رپورٹ کے واضعین کی اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتے کہ جب تک عام انتخابات کے بعد دستور نہ بن جائے اس وقت تک اس مسئلے کو زیر بحث نہ لایا جائے۔ انہوں نے مسلم حقوق پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ ایسے اہم امور کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ مسائل قیامت تک زیب طاقِ نسیاں بنے رہیں گے۔"[1]

قائداعظم کی اس تقریر کا منصف مزاج حاضرین پر نہایت گہرا اثر ہوا اور کانگرس کے مشہور رہنما سر تیج بہادر سپرو نے جو نہرو کمیٹی کے ممبر بھی تھے کھڑے ہو کر کنونشن سے اپیل کی کہ مسٹر جناح کی تجاویز مان لی جائیں۔ انہوں نے فرمایا:۔

---

[1] قائداعظم جناح — دی اسٹوری آف اے نیشن صفحہ ۲۰۶

قائداعظم کی تجاویز اور سر سپرو

"ہم یہاں صرف ایک تمنا لے کر آئے ہیں کہ جس طرح ہو آپس میں سمجھوتہ ہو جائے۔ اگر آپ اعداد و شمار کا تجزیہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ نامزد ممبران سمیت مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کا تناسب ۲۷ فیصدی ہے اور مسٹر جناح ۳۳ فیصدی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ میں نہ جناب صدر کا غیر وفادار ہوں، نہ نہرو رپورٹ کا۔ لیکن میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ اس مرحلے پر ہمیں مفاہمت سے اعراض نہیں کرنا چاہیئے۔ میں اپنی ہر دلعزیزی کو خطرہ میں ڈال کر بھی یہ کہوں گا کہ ہر قیمت پر ہمیں سمجھوتہ کر لینا چاہیئے۔ یہی اس کانفرنس کا مقصد ہے۔

حضرات اسے یاد رکھیئے کہ صرف آپ کے ہم وطن ہی نہیں ساری دنیا کی نگاہیں آپ پر جمی ہوئی ہیں۔ اگر اس پنڈال سے آپ ناکام اٹھے تو یہ ملک کے لئے بڑا نقصان دہ حادثہ ہو گا اور اس کی تلافی ایک عرصۂ دراز تک نہ ہو سکے گی۔ میری رائے تو یہ ہے کہ مسٹر جناح کا مطالبہ کتنا ہی غیر مدلل اور غیر منطقی کیوں نہ ہو مگر مفاہمت کی خاطر اسے مان لینا چاہیئے۔

آوازیں ——— نہیں نہیں!

سپرو ——— میں کہتا ہوں کہ اگر جناح ایک ضدی بچہ کا رول ادا کر رہا ہے، ایک خود سر بچے کی طرح ٹھمک رہا ہے تو میں یہی کہوں گا کہ دے دو اسے جو کچھ مانگتا ہے، اور معاملہ ختم کرو۔ عملی سیاستدان ہونے کی حیثیت سے ہماری فہم و فراست کا تقاضا یہی ہے کہ ہم ریاضی کے اعداد و شمار کے چکر میں نہ پڑیں اور خوش اسلوبی کے ساتھ جس طرح بھی ہو سکے معاملہ طے کر لیں۔"

سر سپرو کی اس تقریر پر سب سے زیادہ برافروختہ مسٹر جیکر ہوئے اور انہوں نے کھڑے ہو کر قائداعظم کے مطالبات کو نہ صرف غلط اور ناجائز قرار دیا بلکہ ان کی نمائندہ حیثیت کو بھی چیلنج کر دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ :-

"مجھے امید ہے کہ سر سپرو کی مغالطہ آمیز تقریر سے متاثر ہو کر آپ مسٹر جناح کے مطالبہ پر غور نہیں کریں گے۔ جو مسلم قوم کی ایک چھوٹی سی اقلیت کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے انہوں نے پیش کیا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھیئے کہ جناح صاحب مسلمانوں کی نمائندگی کرتے بھی

سکتے ہیں یا نہیں ؟ ہمارے ساتھ مولانا ابوالکلام، آزاد، ڈاکٹر انصاری، سر علی امام راجہ صاحب محمود آباد اور ڈاکٹر کچلو جیسے محب وطن مسلمان موجود ہیں۔ یہ سب حضرات نہرو رپورٹ سے بالکلیہ متفق ہیں۔ خود مسلم لیگ کے بہت سے ممبر نہرو رپورٹ کے حامی ہیں۔ اب اگر مسٹر جناح کسی کی نمائندگی کرتے ہیں تو صرف چند لوگوں کی۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ مسٹر جناح کا مطالبہ مسلم قوم کا مطالبہ نہیں ہے۔ ایک بڑی تعداد مسلمانوں کی سر شفیع کے ساتھ ہے جو مخلوط انتخاب کے مخالف ہیں۔ ایک دوسرا بڑا طبقہ مسلمانوں کا مسٹر فضل ابراہیم رحمتہ اللہ کے ساتھ ہے جو دہلی میں ایک مسلم کانفرنس زیرِ صدارت آغاخان) کر رہے ہیں۔ مسٹر جناح کا مطالبہ نہ مسلم قوم کا مطالبہ ہے نہ مسلم اکثریت کا۔"[1]

قائدِ اعظم کی فیصلہ کن تقریر

مسٹر جیکر نے قائدِ اعظم کے متعلق جو غیر ذمہ دارانہ باتیں کہی تھیں اور جس قسم کا لب و لہجہ اختیار کیا تھا اس نے قائدِ اعظم کو مجبور کر دیا کہ اس تقریر کا مسکت جواب دیا جائے، چنانچہ وہ کھڑے ہوئے اور ایک ایسی تقریر کی جو ان کی سیاسی بصیرت اور خود اعتمادی کی نہ صرف ترجمانی کر رہی تھی بلکہ نہایت فیصلہ کن بھی تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ :-

"میرے بارے میں میرے دوست مسٹر جیکر نے جو انداز اختیار کیا ہے، میں ویسا انداز اختیار نہیں کر سکتا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں الٹی میٹم دیا ہے۔" سر تیج بہادر سپرو کے خیالات کا ذکر کرتے ہوئے قائدِ اعظم نے فرمایا کہ :-

"میں جانتا ہوں کہ سر تیج بہادر سپرو نے کس جذبہ سے اظہارِ خیال کیا ہے اور دیگر مقررین نے کیسا طفلانہ انداز اختیار کیا ہے۔ مسٹر جیکر اور دیگر حضرات کو میری اس رائے سے اتفاق کرنا ہی پڑے گا کہ آزادی کی جدوجہد میں شریک ہر ملک اور جمہوری حکومت کی خواہش مند ہر قوم کو اقلیتوں کے مسائل سے دوچار ہونا ہی پڑتا ہے اور جب تک اقلیتوں کو اس امر کا یقین نہ ہو کہ انہیں حکومت اور اس کے آئین کی رو سے بطورِ ایک وحدت کے اپنے مفادات کا تحفظ حاصل ہوگا۔ اس وقت تک وہ کبھی ایسے آئین کی حمایت نہیں کر سکتیں قطع نظر اس سے کہ وہ آئین کیسا ہی قابلِ نمونہ اور کہنے کو کتنا ہی مکمل

---

[1] تاریخ مسلم لیگ صفحہ ۱۷۹،۱۸۰،۱۸۱ مولفہ سید رئیس احمد جعفری ندوی

کیوں نہ ہو۔ اس سوال کا جواب کہ کون سا دستور کامیاب ثابت ہوگا یہی ہے کہ وہ دستور جس میں اقلیتوں کے حقوق محفوظ ہوں۔ ورنہ کوئی بھی دستور دیرپا اور کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوگا کہ ملک انقلاب اور خانہ جنگی میں مبتلا ہو جائے ــــــ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کو مسلم انڈیا کے اشتراک کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اکثریت کی خاطر اقلیتیں کسی قسم کی قربانی نہیں دے سکتیں۔ میں اپنی ترامیم کی منظوری پر اس لئے زور نہیں دے رہا کہ میں ایک ضدی بچہ ہوں یا ایسا بچہ ہوں جو بگڑ گیا ہو۔ میں نے جس بنیاد پر یہ مطالبات پیش کئے ہیں وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے یہی سب سے بہتر اور حصول انصاف کا طریقہ ہے۔ ہم سب مادر وطن کے فرزند ہیں۔ اگر ہم ان معاملات پر متفق نہیں ہو سکتے تو ہمیں اختلافات ہی پر متفق ہو جانے دیجئے۔ مگر ہمیں ایک دوسرے سے اس طرح الگ ہونا چاہیئے جیسے دو دوست ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں"[1]

افسوس کہ قائد اعظم کی اس مدلل و موثر تقریر کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا اور آل پارٹیز کنونشن نے جس پر کانگریس اور مہا سبھا چھائی ہوئی تھی۔ قائد اعظم کا ایک مطالبہ یا ایک ترمیم بھی منظور نہ کی۔ بلکہ نہرو رپورٹ کو من وعن قبول کر لیا۔ اس کنونشن میں مسٹر جیکر اور پنڈت موتی لال نہرو سے بھی زیادہ سرگرمی مسٹر گاندھی نے دکھائی۔ انہوں نے نہرو رپورٹ منظور کرانے اور قائد اعظم کی ترامیم رد کرانے میں سب سے نمایاں حصہ لیا۔ یہی نہیں بلکہ مسٹر گاندھی نے حکومت کو دھمکی دی کہ اگر یہ متحدہ دستور ایک سال کے اندر اندر منظور نہ کیا گیا تو کانگریس سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دے گی۔ اور حکومت کا سارا نظام درہم برہم کر دیا جائے۔ قائد اعظم اس کنونشن سے بہ ظاہر ناکام اٹھ گئے۔ لیکن ہمارے خیال میں ان کی یہی ناکامی آئندہ کی کامیابیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور انہوں نے اپنی تمام تر توجہ ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ سے ہٹا کر مسلمانان ہند کی تنظیم پر مرکوز کر دی۔ اس موقع پر انہوں نے جو الفاظ کہے تھے وہ الہامی نوعیت کے تھے اور ان کی صداقت بعد کے واقعات نے ثابت کر دی۔ کلکتہ کنونشن میں اپنی ترامیم کے رد ہو جانے کے بعد انہوں نے فرمایا کہ "آج ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا ایک دوسرے سے اس طرح جدا ہو گئے کہ پھر کبھی متحد نہیں ہو سکیں گے"۔

اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کا کارنامہ کانگریس اور ہندو مہا سبھا نے سرانجام دیا۔ جس کی قیادت پنڈت موتی لال نہرو، مسٹر گاندھی اور مدن موہن مالویہ

---

[1] قائد اعظم جناح - دی اسٹوری آف اے نیشن ص ۲۰۸

جیسے لیڈروں کے ہاتھ میں تھی۔

مسلم لیگ نے نہرو رپورٹ رد کردی

اب تک قائداعظم اور ان کی مسلم لیگ نہرو رپورٹ کے مقابلے میں محتاط رویہ اختیار کرنے کے حق میں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو ایک موقع مل رہا ہے۔ انہیں اپنے اختلافات دور کرکے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اس لئے وہ جلد بازی سے کام لینا نہیں چاہتے تھے اور ہر ممکن کوشش کر رہے تھے کہ مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔ مگر جب کلکتہ کے آل پارٹیز کنونشن میں ان کی ساری کوششیں ناکام ہوگئیں تو ۳۰ مارچ ۱۹۲۹ء کو انہوں نے روشن تھلیٹر دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس طلب کیا۔ قائداعظم نے اسی اجلاس کی صدارت کی۔ جلسہ میں متفقہ طور پر یہ قرارداد منظور کی گئی کہ :-

"ہندو مہاسبھا نے اعلان کردیا ہے کہ اگر نہرو رپورٹ کے فرقہ وارانہ فیصلے سے ذرا سی بھی روگردانی کی گئی تو وہ رپورٹ کی حمایت سے دستبردار ہو جائے گی۔ سکھ لیگ نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا ہے۔ غیر برہمن اور اچھوت بھی اس کے مخالف ہیں۔ چونکہ پنڈت نہرو نے مسلم لیگ کے مطالبات تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے لہٰذا مسلم لیگ بھی نہرو رپورٹ منظور کرنے سے قاصر ہے۔"

اس قرارداد میں یہ اعلان بھی کیا گیا کہ جب تک قائداعظم کے چودہ نکات منظور نہیں کئے جائیں گے اسوقت تک مسلمانوں کے لئے کوئی دستور حکومت قابل قبول نہ ہوگا۔ اس قرارداد سے اتفاق کرنے والوں میں مولانا ابوالکلام آزاد، مفتی کفایت اللہ، مسٹر آصف علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور مسٹر تصدق احمد خاں شیروانی بھی شامل تھے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بعد کو یہ سب مسلم لیگ اور قائداعظم سے باغی ہوکر کانگرس کے ترنگے کے نیچے جا کھڑے ہوئے۔

مسٹر گاندھی کی سول نافرمانی

مسلمانوں کی بدقسمتی سے ان میں کچھ ایسے لوگ بھی موجود تھے جن کا سیاسی فہم قطعی ناقص تھا۔ ہم ان کی دیانت پر شبہ نہیں کرتے مگر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے اپنی قوم کے مفادات کو نظرانداز کردیا۔ انہیں طویل عرصے تک کانگرس سے وابستہ رہنے کا موقع ملا۔ اس دوران میں انہیں نہایت تلخ تجربات ہوئے۔ انہوں نے کانگرس کی مسلم کش حکمت عملی کا بھی مشاہدہ کیا۔ مگر پھر بھی اس فرقہ پرست جماعت کے دامن سے وابستہ رہے، حالانکہ قائداعظم، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خان جیسے کتنے مسلمان رہنما کانگرس کی مسلم کش حکمت عملی سے دل برداشتہ ہوکر کانگرس سے غیر مشروط تعاون ختم کرچکے تھے۔ کچھ ان کانگرس نواز مسلمان سیاست دانوں کے تعاون اور کچھ اپنی مقبولیت کی بناء پر کانگرس نے نہرو رپورٹ کے مسئلے پر حکومت سے ٹکر لینے کا فیصلہ کرلیا۔ مسٹر گاندھی نے ایک سال تک انتظار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ کانگرس کی طرف سے

سول نافرمانی کی جو دھمکی دی گئی ہے حکومت اس سے مرعوب ہو جائے گی اور نہرو رپورٹ منظور کر لے گی۔ مگر جب ایوانِ حکومت میں اس رپورٹ کی پذیرائی نہ ہوئی اور حکومت پر مسٹر گاندھی اور کانگرس کی دھمکیوں کا کوئی اثر نہ ہوا تو دسمبر ۱۹۲۹ء کے اجلاس لاہور میں پنڈت موتی لال کے فرزند پنڈت جواہر لال نے جو کارزار سیاست میں اپنے باپ کے جانشین بن چکے تھے اعلان کر دیا کہ چونکہ حکومت نے نہرو رپورٹ منظور نہیں کی اور الٹی میٹم کی مدت ختم ہو چکی ہے اس لئے اب کانگرس سول نافرمانی کا آغاز کرے گی اور اب درجہ نوآبادیات کی بجائے آزادی کامل ہمارا نصب العین ہو گا۔ مارچ ۱۹۳۰ء میں مسٹر گاندھی نے بمبئی کے ایک مقام ڈانڈی سے تحریک سول نافرمانی کا آغاز کیا۔ اس زمانے میں نمک بنانے پر پابندی تھی مسٹر گاندھی بمبئی سے پیدل روانہ ہوئے۔ راستہ میں ہزاروں افراد ان کے ساتھ ملتے گئے اور ڈانڈی پہنچ کر انہوں نے نمک بنانا شروع کر دیا۔ ایک ہفتہ تک وہ نمک بناتے رہے اور حکومت یہ تماشہ دیکھتی رہی۔ آخر ایک ماہ کے بعد انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ چونکہ یہ خالص ہندو تحریک تھی اور اس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ حکومت کو خوفزدہ کر کے نہرو رپورٹ منظور کرنے پر آمادہ کیا جائے جس کے نتیجہ میں ہندوستان پر ہندو راج قائم ہو جائے۔ اس لئے برصغیر کی تاریخ میں شاید پہلی بار مسلمانوں نے من حیث القوم کانگرس کا ساتھ نہیں دیا اور چند ہی ماہ بعد یہ تحریک بری طرح ناکام ہو گئی۔ ہندوستان کے تمام بڑے بڑے مسلمان رہنما نہ صرف خود اس تحریک سے الگ رہے بلکہ انہوں نے عام مسلمانوں کو بھی اس میں حصہ لینے سے روکا۔

مولانا شوکت علی اور سول نافرمانی

چنانچہ مولانا شوکت علی جو کسی زمانے میں کانگرس کی روح و رواں اور اس کا بہت بڑا ستون تھے اس تحریک کو مسلمانوں کے حق میں نہایت مضر سمجھتے تھے۔ اس زمانے میں صوبہ سرحد کے ایک مسلمان یوسفی صاحب کے نام مولانا شوکت علی مرحوم کا ایک خط اخبارات میں شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے مسٹر گاندھی کی ذہنیت اور ان کی سیتہ گرہ کی بڑی عمدگی سے نقاب کشائی کی تھی۔ اس خط کا ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"میں نے اپنی ذاتی رائے کا مہاتما گاندھی کی سیتہ گرہ کے بارے میں اظہار کر دیا ہے اور مسلمان اس کو پسند کرتے ہیں۔ جب مہاتما جی مسلمانوں کی قوم سے بے اعتنائی کر رہے ہیں، ہماری بات تک سننا قبول نہیں کرتے۔ مسلمانوں کو ذلیل سمجھتے ہیں اور اس طرح ہمیں الو بنا کر اپنا کام نکلوانے کی فکر میں ہیں تو ہم کیونکر ان کے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں۔ مکمل آزادی کا ڈھونگ صرف اس لئے کھڑا کیا گیا ہے کہ انگریزوں کو مرعوب کر کے ان کی مدد سے مسلمانوں کے گلے میں نہرو رپورٹ ٹھونس دیں۔ ہم ایسے حالات میں ان کے فعل میں شرکت نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی (مسلمان) بھائی ان حالات کے باوجود (مسٹر گاندھی) کے پیچھے ہوئے تو ہم مجبور ہیں کہ اس تکلیف دہ نظارے کو دیکھیں اور خاموش رہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر انصاری، چوہدری خلیق الزماں اور مسٹر شیروانی وغیرہ کی طرح یہ بھی جلد سمجھ جائیں گے۔"[1]

---

[1] ہفت روزہ حمایت اسلام لاہور صفحہ ۱ بابت ۳ اپریل ۱۹۳۰ء

مولانا شوکت علی کے اس خط سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح ظاہر ہو جاتی ہے کہ مسٹر گاندھی اور کانگرس مسلمانوں کو فریب دے رہے تھے۔ نہرو رپورٹ کی منظوری اور سول نافرمانی کی تحریک برصغیر کے مسلمانوں کے ساتھ صریح غداری تھی اور مسلمان رہنماؤں کی اکثریت پر کانگرس اور مسٹر گاندھی کا فریب کھل چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قائد اعظم، مولانا محمد علی جوہر۔ مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان۔ مولانا حسرت موہانی۔ چوہدری خلیق الزماں اور شعیب قریشی بہت سے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ کانگرس سے الگ ہو گئے۔ چنانچہ محمد علی جوہر نے جن کی سیاسی زندگی کا بیشتر بڑا حصہ کانگرس کی خدمت میں گزرا جنہوں نے مسٹر گاندھی کو ہندو اور مسلمانوں دونوں کا لیڈر بنا کر عزت و مقبولیت کی معراج پر پہنچایا۔ جن کی شرکت سے کانگرس کو مسلمانوں میں حیرت انگیز مقبولیت حاصل ہوئی ـــــ ہاں انہی مولانا جوہر کو ہندو رپورٹ اور کانگرس کی مسلم آزار پالیسی سے دل برداشتہ ہو کر کہنا پڑا کہ :۔

مولانا محمد علی جوہر اور سول نافرمانی

"سول نافرمانی کے متعلق مسلمانوں کے رویہ کی وضاحت جمعیت خلافت کی مجلس عاملہ کے بیان سے بخوبی ہو تی ہے اور اگر صرف یہی دیکھا جائے کہ مسلمانوں نے من حیث القوم اس تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی ہے تو ان کا رویہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے کسی مسلمان رہنما نے اپنے مسلمان بھائیوں کو گاندھی جی کے ساتھ شامل ہونے کو نہیں کہا چند افراد جنہوں نے کسی قدر اقتدار حاصل کر لیا ہے ان کے ساتھ ہیں لیکن وہ وہی ہیں جو صرف اپنی بڑائی کے لئے بیتاب ہیں ـــــ جمعیت خلافت کے بیان میں ہم نے لکھا ہے کہ مسئلہ ہندو مسلم کا حل کرنا کس قدر ضروری ہے ـــــ بغیر اس کے مسلمان اس مہم (مسٹر گاندھی کی سول نافرمانی) میں ہرگز شامل نہیں ہوں گے ـــــ بظاہر یہ قمار بازی کا ایک کھیل ہے جو گاندھی جی اور حکومت کھیل رہے ہیں اور بظاہر دونوں کوشش کر رہے ہیں کہ اپنا بہترین داؤ لگا دیں۔ گاندھی مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنے سے انکار کرتے ہیں اور حکومت اپنے تشدد سے اس موقع کو ضائع کر رہی ہے۔[1]

مولانا محمد علی جوہر کی رائے بالکل درست ثابت ہوئی۔ سول نافرمانی کی تحریک واقعی قمار بازی کا ایک کھیل تھا۔ اس کھیل میں مسلمانوں نے من حیث القوم حصہ نہیں لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کانگرس بازی ہار گئی۔ تمام بڑے بڑے کانگرسی لیڈر گرفتار کر لئے گئے۔ حکومت نے اس تحریک کو نہایت سختی سے کچل دیا۔ بات جہاں تھی وہیں رہی۔ نہ نہرو رپورٹ منظور ہوئی اور نہ آزادی کامل کے مطالبے کو پذیرائی نصیب ہوئی۔

---

[1] ہفت روزہ حمایت اسلام لاہور صفحہ ۴ بابت ۳ / اپریل ۱۹۳۰ء

دونوں مسلم لیگوں کا اتحاد

قائد اعظم کے چودہ نکات کی نامنظوری کانگرس کے اجلاس میں نہرو رپورٹ کی منظوری اور مسٹر گاندھی کی سول نافرمانی کی تحریک نے حساس اور باحمیت مسلمان رہنماؤں کی آنکھیں کھول دیں اور انہوں نے محسوس کر لیا کہ وہ تاریخ کے ایک نازک موڑ پر کھڑے ہیں جہاں ذراسی غفلت ساری قوم کو تباہی کے عمیق غار میں گرادے گی۔ چنانچہ قائد اعظم کی کوششوں سے شفیع لیگ اور جناح لیگ کو متحد کرنے کا انقلابی قدم اٹھایا گیا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے آل انڈیا مسلم لیگ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ یہ ایسی صورت حال تھی جو مسلم لیگ کی تنظیم اور برصغیر کے مسلمانوں کے اتحاد کے لئے سخت نقصان کا موجب تھی۔ ملت کا درد رکھنے والے باشعور لوگ مسلم لیگ کے اس افتراق پر سخت رنجیدہ تھے مگر کچھ طرفین کے نقطہ ہائے نگاہ کا اختلاف اور کچھ غیروں کی ریشہ دوانیاں لیگ کے دونوں دھڑوں کو ایک دوسرے سے ملنے میں رکاوٹ بن رہی تھیں۔ آخر قائد اعظم نے اپنے وقار کی پروا نہ کرتے ہوئے شفیع مسلم لیگ کے اراکین کو دہلی میں مدعو کیا جہاں مسلم لیگ کے اجلاس میں لیگ کی دونوں شاخوں کے اتحاد کا اعلان کر دیا گیا۔ لیگ کا باضابطہ اجلاس ہونے سے قبل جناح لیگ اور شفیع لیگ کے رہنماؤں نے باہم تبادلۂ خیال کیا اور یہ فیصلہ ہوا کہ قائد اعظم آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء کی منظور شدہ تجاویز منظور کر لیں۔ یہ تجاویز سر شفیع اور ان کے ہم نوا حضرات نے مسلم کانفرنس میں پاس کرائی تھی اور ان میں کم و بیش وہی مطالبات شامل کئے گئے تھے جو قائد اعظم چودہ نکات کے نام سے دسمبر ۱۹۲۸ء میں منظور کئے گئے تھے۔ چنانچہ قائد اعظم نے سر شفیع کا یہ مطالبہ منظور کر لیا۔ اس کے بعد ۲۸ فروری ۱۹۳۰ء کی سہ پہر کو آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس قائد اعظم کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ اس میں ہندوستان کے ہر صوبے سے بہت بڑی تعداد میں مسلمان اکابر شریک ہوئے۔ یہ اجلاس دراصل مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کی طرف ایک اہم اور تعمیری قدم تھا۔

قائد اعظم کے کرسی صدارت پر بیٹھتے ہی اعلان کیا گیا کہ دونوں مسلم لیگیں پھر متحد ہو گئی ہیں۔ سر شفیع نے اس اعلان کی تائید کی اور اس کے بعد قائد اعظم اور سر شفیع اسٹیج پر ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے۔ یہ منظر بڑا روح پرور اور رقت انگیز تھا۔ ہر طرف تالیوں کی گونج سنائی دے رہی تھی اور دو بچھڑے ہوئے رفیق اور مسلم مفادات کے نگہبان ایک دوسرے کے گلے لگے کھڑے تھے۔

گول میز کانفرنس

سائمن کمیشن کے ہندوستان سے واپس جانے کے بعد ملک کے حالات کا جو نقشہ تھا وہ گذشتہ صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے۔ مسلم لیگ اور ہندوستان کے منصف مزاج رہنما چاہتے تھے کہ حکومت سے کوئی آبرومندانہ معاہدہ ہو جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم مسئلہ کا بھی کوئی مناسب حل نکل آئے مگر کانگرس اور مہا سبھا نے ان کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ ادھر کانگرس اور حکومت کے مابین تصادم شروع ہو گیا۔ مسلمان گو اس تصادم میں کانگرس کے ساتھ شریک نہیں ہوئے۔ مگر انہیں خاص طور پر قائداعظم مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال کو ان حالات پر تشویش ضرور تھی اور وہ چاہتے تھے کہ ہندو اور انگریز دونوں حالات کی نزاکت کا احساس کریں۔ چنانچہ اسی جذبہ کے تحت قائداعظم نے انگلستان کے اس وقت کے وزیراعظم مسٹر ریمزے میکڈونلڈ کے نام ۱۹ رجون ۱۹۲۹ء کو ایک خط لکھا جس میں انہیں تحریر کیا کہ سائمن کمیشن کی رپورٹ پر کوئی فیصلہ کرنے سے قبل مسلمانوں کے مطالبات اور ان کے موقف پر ٹھنڈے دل سے غور کر لیا جائے۔ قائداعظم نے اپنے اس خط میں سائمن کمیشن کی ہیئت ترکیبی پر بھی اعتراض کیا اور لکھا کہ اس کے ارکان میں ہندوستانیوں کی عدم شرکت اور اس کے کاموں میں شروع سے آخر تک ہندوستان کے نمائندہ رہنماؤں کے عدم تعاون سے اس کی رپورٹ نہایت غیر موثر اور بیکار ہو کر رہ گئی ہے۔

اس سلسلے میں قائداعظم نے وزیراعظم میکڈونلڈ کو اپنی تجویز پیش کرتے ہوئے لکھا کہ حکومت اس رپورٹ کو منظور کرنے سے قبل ہندوستان کے نمائندوں کو لندن میں مدعو کرے جو سر جوڑ کر بیٹھیں اور ایسا حل تلاش کریں جو ہندوستان کے عوام کے لئے قابل قبول ہو سکے اگر وزیراعظم اس قسم کا دعوت نامہ بھیجیں تو مجھے یقین ہے کہ اسے ہندوستان کے سیاسی رہنما منظور کر لیں گے۔

قائداعظم کے اس خط کا برطانوی وزیراعظم پر نہایت اچھا اثر ہوا اور ہندوستان کے وائسرائے لارڈ اروِن نے اعلان کیا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کو درجۂ نوآبادیات کے حقوق دینا چاہتی ہے۔ اس اعلان میں یہ خوشخبری بھی سنائی گئی کہ عنقریب برطانوی ہند اور ہندوستانی ریاستوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد کی جائے گی۔ جن سے گفتگو کے بعد اس مسئلے کا قابلِ قبول حل نکالنے کی کوشش کی جائے گی۔

قائداعظم نے وائسرائے کے اس بیان کا خیر مقدم کیا اور اس سلسلے میں ایک بیان بھی جاری کیا جس پر ایم آر جیکر چمن لال سیتلی واس اور مسز سروجنی نائیڈو کے بھی دستخط تھے۔

ادھر تو قائداعظم ہندوستان کو آزادی کی منزل کی طرف لے جانے میں کوشاں تھے اور ادھر مسٹر گاندھی ملک کو تباہی، فرقہ وارانہ منافرت اور اپنی ہٹ دھرمی کی آگ میں جھونک رہے تھے۔ چنانچہ دلی میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا جس میں کانگرسی رہنماؤں نے گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے یہ شرط لگادی کہ اس کانفرنس میں جن نمائندوں کو مدعو کیا جائے ان کی اکثریت کانگرسی نمائندوں پر مشتمل ہو۔ دوسرے یہ کہ گول میز کانفرنس کے انعقاد سے قبل حکومت اعلان کر دے کہ وہ ہندوستان کو درجۂ نو آبادیات دے گی۔ حالانکہ وائسرائے پہلے ہی اعلان کر چکے تھے کہ حکومت نے ہندوستان کو درجۂ نو آبادیات دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس صورت میں کانگرس کی طرف سے اس شرط کا مقصد سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونا چاہتی تھی اور دنیا کو یہ دکھانا چاہتی تھی کہ ہندوستان کو درجۂ نو آبادیات دلانے کا کارنامہ کانگرس نے سر انجام دیا ہے۔ چونکہ کانفرنس میں شرکت کے لئے پیشگی شرائط حکومت برطانیہ کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتی تھیں اس لئے گمان غالب یہی تھا کہ حکومت یہ شرط رد کر دیتی۔ اس طرح کانفرنس خود بخود ناکام ہو جاتی اور کانگرس چاہتی بھی یہی تھی۔ غرض یہ کہ حکومت نے کانگرس کے غیر معقول مطالبات کے پیش نظر اسے نظر انداز کر کے باقی جماعتوں کے رہنماؤں کے نام دعوت نامے جاری کر دیئے۔

گول میز کانفرنس کے شرکاء

ان نمائندوں میں چار قسم کے لوگ شامل تھے۔ اول ہندوستانی ریاستوں کے مسلم نمائندے۔ دوم ہندوستانی ریاستوں کے غیر مسلم نمائندے۔ سوم برطانوی ہند کے مسلم نمائندے۔ چہارم برطانوی ہند کے غیر مسلم نمائندے۔

ہندوستانی ریاستوں کے جن غیر مسلم نمائندوں کو مدعو کیا گیا ان میں ہز ہائی نس مہاراجہ الور، مہاراجہ بڑودہ، مہاراجہ بیکانیر، مہاراجہ نامجھ، مہاراجہ کشمیر، مہاراجہ نواں نگر، مہاراجہ پٹیالہ، مہاراجہ ریوا، راجہ سنگلی، مسٹر پربھاشنکر پتنی، سر منو بھائی مہتہ اور کرنل این بکسر شامل تھے۔

ہندوستانی ریاستوں کے جن مسلم نمائندوں کو مدعو کیا گیا ان میں ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال، سردار صاحبزادہ سلطان احمد خان، نواب سر اکبر حیدری اور دیوان سر مرزا اسماعیل شامل تھے۔ برطانوی ہند کے جن مسلم نمائندوں کو مدعو کیا گیا ان میں ہز ہائی نس سر آغا خاں، مسٹر محمد علی جناح (بمبئی)، مولانا محمد علی جوہر (یوپی)، سر شفیع (پنجاب)، نواب سر عبدالقیوم خان (سرحد)، سر شاہنواز خاں (سندھ)، سر غلام مرتضیٰ خاں بھٹو (سندھ)، مسٹر فضل الحق (بنگال)، مسٹر اے ایچ غزنوی (بنگال)، خان بہادر ہدایت حسین (یوپی)، نواب صاحب چھتاری (یوپی)، بیگم شاہنواز (پنجاب)، کپتان راجہ شیر محمد خان، ڈومیلی پنجاب، سر سید سلطان احمد (بہار)، چوہدری محمد ظفر اللہ خان (پنجاب) شامل تھے۔

برطانوی ہند کے جن غیر مسلم نمایندوں کو مدعو کیا گیا ان میں سر سی پی راماسوامی آئر۔ ڈاکٹر بی۔ آر۔ آر ایمبدکر۔ مسٹر یو ہا پا، سری پت چندر رادھر بروا۔ مسٹر جے این باسو، سر ہربرٹ کار، دیوان چمن لال، سی وی چنتامنی، مہاراج اھیراج دربھنگہ، مسٹر او۔ ڈی گلینول۔ مسٹر ایم ایم اودن چانگ، کرنل گڈنی۔ مسٹر ایم آر جیکر نہ، سر کاؤس جی، جہانگیر جی، مسٹر ٹی۔ امی گون جونز، رائے بہادر سر پاٹیٹا کلی، آنریبل سر پی سترا۔ ڈاکٹر جی سی نو بنجے۔ دیوان بہادر کے لے راماسوامی مدلیار، دیوان بہادر راجہ نریندر ناتھ، مسٹر نریندر ناتھ لا، راؤ بہادر رائے ٹی بلیر سریان، راجہ کرشنا چندر راکف پر لاکی مہیدی، سر لے پی پیٹرو، دیوان بہادر رام چندر راؤ، سردار سپنوران سنگھ، سر تیج بہادر سپرو، رائٹ آنریبل سری نراس شاستری، سر چمن لال ستیلواد، سر فیروز شاہ سیٹھنا، راؤ بہادر شری نراس۔ مسز سبرائن دبیگم وزیر اعلیٰ مدراس، آنریبل مسٹر ایس ڈی تنبے۔ مسٹر یواونگ بھتن، سردار صاحب سردار اجل سنگھ اور مسٹر سی وڈ شامل تھے۔

گول میز کانفرنس اور قائداعظم

۱۲ر نومبر ۱۹۳۰ء کو دارالامراء کی رائل گیلری میں شہنشاہ برطانیہ نے اس گول میز کانفرنس کا افتتاح کیا۔ انگلستان کے وزیر اعظم ریمزے میکڈونلڈ کانفرنس کے چیئرمین منتخب کئے گئے۔ اس کے بعد رسمی تقریریں ہوئیں۔ اور ۲۰ر نومبر سے کانفرنس کے باقاعدہ اجلاس شروع ہوئے۔ ان اجلاسوں میں قائداعظم نے مسلم قوم کا نقطۂ نظر جس بے خوفی، جرأت اور قابلیت سے پیش کیا۔ اس پر خود برطانوی مدبرین اور برطانوی اخبارات نے انہیں خراج تحسین ادا کیا۔ قائداعظم نے اپنی تقریر میں حکومت برطانیہ کی وعدہ خلافیوں اور وعدوں پر سخت تنقید کی اور برطانوی وزیر اعظم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا آپ اس وقت تک کوئی آئین مرتب کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک اس میں اہل ہند کے حقوق اور مفادات کی کافی حفاظت کا انتظام نہ کیا گیا ہو۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ کو سب سے پہلے ہندوستان کی اقلیتوں کے مسئلے پر غور و خوض کرنا ہوگا اور آپ کا بنایا ہوا کوئی ایسا دستور اقلیتوں کے لئے قابل قبول نہ ہوگا جس میں ان کا تعاون حاصل نہ کیا گیا ہو۔ مسلمانوں کے کچھ مطالبات ہیں اور وہ اپنے حقوق طلب کرتے ہیں۔

۱۵ر جنوری ۱۹۳۱ء کو وفاقی حکومت پر غور کرنے کے لئے کمیٹی نے بحث کا آغاز کیا۔ اس موقع پر قائداعظم نے نہ صرف مسلمانوں کے مطالبات پیش کئے بلکہ جملہ اہل ہند کے حقوق کی وکالت کرتے ہوئے گورنر جنرل کے ان اختیارات پر سخت تنقید کی جن کے تحت اسے قانون بنانے کا اختیار دیا جارہا ہے۔ قائداعظم نے فرمایا کہ گورنر جنرل کو یہ اختیار صرف حالت جنگ یا بدامنی کے زمانے میں تو دیا جا سکتا ہے۔ عام حالات میں یہ اختیار مجلس قانون ساز کے منتخب ممبروں کے پاس رہنا چاہیئے۔ اسی طرح مالی معاملات

میں گورنر جنرل کی مداخلت کی دفعہ پر بھی قائداعظم نے سخت اعتراض کیا اور فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ہم پر اعتماد نہیں کرتے اور ہمیں شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ہندوؤں کا طرزِ عمل

ادھر قائداعظم اور سر آغا خاں شب و روز اس کوشش میں مصروف تھے کہ کسی طرح ہندوستان کے سیاسی مسائل کا حل نکل آئے اور یہ کانفرنس ناکام نہ ہو، مگر ادھر ہندو جن میں اکثریت مہاسبھائی ارکان کی تھی، اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے اور ہندو مسلم مسئلے کی طرف آنے کا نام نہ لیتے تھے۔ ان کے ذہن میں ایک ہی تخیل تھا کہ مسلمانوں کے مطالبات نظر انداز کر دیئے جائیں اور حکومت ایک ایسے دستور پر رضامند ہو جائے جس کے نفاذ کے بعد ہندوستان پر ہندوؤں کی بالادستی قائم ہو جائے۔ کانفرنس کو ناکامی سے بچانے کے لیے قائداعظم، سر آغا خان، اور مولانا محمد علی جوہر مسلمانوں اور خصوصاً مسلم لیگ کے بنیادی مطالبات یعنی جداگانہ انتخاب سے بھی دست بردار ہونے پر بھی رضامند ہو گئے اور تناسب آبادی کی بنیاد پر نمائندگی پر بھی رضامندی ظاہر کر دی۔ مگر اس قربانی کے باوجود بھی ہندو اراکین نے مصالحانہ اسپرٹ اور رواداری جذبہ کا مظاہرہ نہ کیا۔ چنانچہ بمبئی کے ایک کانگریسی اخبار کے نامہ نگار مقیم لندن نے گول میز کانفرنس پر تبصرہ کرتے ہوئے جو خبر نامہ اپنے اخبار کو بھیجا تھا وہ ہندو نمائندوں کی روش کی نہایت عمدہ عکاسی کرتا ہے۔ نامہ نگار نے لکھا تھا:۔

"مسلم نمائندے مخلوط طریق انتخاب قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ وہ آبادی کے تناسب کے اعتبار سے نمائندگی کا اصول بھی مان رہے ہیں مگر ان کی طرف سے صرف ایک شرط پیش کی جا رہی ہے۔ کہ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک مستقل صوبہ بنا دیا جائے اور علاقہ سرحد میں دوسرے صوبوں کے مساوی اصلاحات نافذ کر دی جائیں۔ ان کے علاوہ وہ اپنے باقی مطالبات پر زور نہیں دے رہے ہیں۔ انہوں نے مسٹر جناح اور سر آغا خاں کی تحریک پر درجۂ نوآبادیات پر بھی اتفاق کر لیا ہے۔ البتہ مہاسبھائی نمائندوں کا رویہ نہایت معاندانہ ہے۔ باقی ہندو نمائندے مصالحت پر آمادہ ہیں۔ مگر مسٹر جیکر (جو کانگرس اور مہاسبھا دونوں کی نمائندگی کرتے تھے) کی روش نے فضا کو خراب کر دیا ہے اور نمائندوں میں اتفاق نہیں ہو رہا۔"[1]

اس طرح ہندو مہاسبھا کی تنگ نظری اور متعصبانہ طرزِ عمل کی وجہ سے ہندوستانی نمائندے حکومت برطانیہ کے سامنے کوئی مکمل لائحہ عمل پیش نہ کر سکے اور ۱۹ر جنوری ۱۹۳۱ء کو پہلی گول میز کانفرنس ناکامی پر ختم ہو گئی۔

---

[1] بمبئی کرانیکل (بمبئی) ۱۵ر نومبر ۱۹۳۰ء

دوسری گول میز کانفرنس

پہلی گول میز کانفرنس کے اختتام کا اعلان کرتے ہوئے کانفرنس کے چیئرمین مسٹر ریمزے میکڈونلڈ نے اپنی تقریر میں اس توقع کا اظہار کیا کہ ہندوستانی مندوب اس کام کو آگے بڑھانے کی کوشش جاری رکھیں گے جو کانفرنس اب تک انجام دے چکی ہے۔ انہوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ ایسا لائحہ عمل تیار کرنے کی کوشش جاری رکھنی چاہیئے جو مسلمانوں، سکھوں، پست ذاتوں اور دوسری اقلیتوں کے لئے بھی قابلِ قبول ہو اور اس میں ان کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہو۔ چنانچہ کانفرنس کے بعض مندوبین خصوصاً قائدِ اعظم، سر آغا خاں، سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر شاستری نے کوشش کی کہ ہندو اور مسلمان کسی ایسے فارمولے پر متحد ہو جائیں جس سے ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا حل نکل آئے اور اقلیتیں بھی مطمئن ہو جائیں۔ قائدِ اعظم وفاقی طرزِ حکومت کے مخالف تھے مگر ہندوستان کے وسیع تر مفاد کے پیشِ نظر سر آغا خاں کی تحریک و تلقین پر وہ اس کے حامی بن گئے۔ اور سر آغا خاں کا بیان ہے کہ اس کے بعد جتنی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان سب میں قائدِ اعظم نے مسلم مندوبین کے ساتھ ہمیشہ تعاون کیا۔ [1]

مسٹر گاندھی کی روش

اس دوران میں مسٹر گاندھی اور حکومت کے درمیان سمجھوتہ ہو گیا جو اروِن پیکٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے بعد حکومت نے دوسری گول میز کانفرنس کا اعلان کیا اور اس میں کانگریسی نمائندوں کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ مسٹر گاندھی کے لندن پہنچنے کے بعد سیاسی سرگرمیوں میں اضافہ ہو گیا۔ مگر ان کے لندن آنے سے سیاسی مسائل حل ہونے کی بجائے اور الجھ گئے اور انہوں نے وہی طرزِ عمل اختیار کیا جو ایک کٹر سے کٹر مہاسبھائی اختیار کر سکتا تھا۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کو ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں اقلیتوں کا مسئلہ زیرِ بحث آیا۔ اس کانفرنس کا حال بیان کرتے ہوئے سر آغا خاں لکھتے ہیں کہ :۔

"اس گفت و شنید کا کوئی فائدہ نہ ہوا کیونکہ گاندھی جی نے ابتدا ہی میں یہ تجویز پیش کی کہ اقلیتوں کے متعلق فی الحال کانفرنس ملتوی کر دی جائے کیونکہ میں آغا خاں اور مسٹر جناح سے تبادلۂ خیال میں مصروف ہوں۔ یہ تبادلۂ خیال میری (آغا خاں کی) قیام گاہ پر جاری رہا۔ میں بطور میزبان ان اجلاسوں کی صدارت کرتا۔ ایک طرف مسٹر جناح اور سر شفیع بیٹھے ہوتے اور دوسری طرف گاندھی جی۔ اکثر و بیشتر مسٹر جناح ہی تقریر کرتے۔ کانگریس کی ایک ہی ضد تھی۔ یعنی ایک قومی

---

[1] دی میموائرز آف آغا خان ص ۲۱۸

نظریہ جو ہمارے خیال میں تاریخی طور سے کوئی وزن نہیں رکھتا تھا۔" [1]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسٹر گاندھی نے گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے بعد سب سے زیادہ جس امر کی کوشش کی وہ یہ تھا کہ اقلیتوں کا مسئلہ زیر بحث آنے ہی نہ پائے۔ ان کا خیال تھا کہ "اس مسئلے پر اس وقت گفتگو ہو جب ہندوستان کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ ہو جائے" مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ اب گاندھی جی نے فرمایا کہ اگر فرقہ وارانہ مسئلہ زیر بحث لانا ہی ہے تو ڈاکٹر انصاری کو دہلی سے لندن بلواؤں۔ میں بغیر ان کے مشورے کے کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ مضحکہ خیز تجویز ظاہر ہے کہ قطعاً ناممکن العمل تھی۔ اب گاندھی جی نے فرمایا کہ کانگرس ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ پہلے اسے مانو پھر باب سخن وا کروں گا۔ اسے نہ حکومت مان سکتی تھی نہ دوسری سیاسی جماعتیں۔ لہٰذا گاندھی جی نے فرمایا پھر میرا یہاں ٹھہرنا بیکار ہے اور ہندوستان واپس آنے کی تیاریاں کرنے لگے۔

فرقہ وارانہ مسئلہ کو جس قدر ٹالنے کی کوشش کی گئی، اتنا ہی وہ سخت و سنگین بنتا چلا گیا۔ آخر میں گاندھی جی نے ایک شرط مسلمانوں کے سامنے پیش کی کہ وہ اپنے مطالبات (مسٹر جناح) کے چودہ نکات کی تصدیق ڈاکٹر انصاری اور دوسرے نیشنلسٹ مسلمانوں سے کرائیں اور سکھوں کو راضی کریں کہ وہ پنجاب میں زیادہ مراعات نہ طلب کریں۔ مسلمانوں نے ان دونوں باتوں کے ماننے سے انکار کر دیا کیونکہ ڈاکٹر انصاری مرحوم غیر مشروط طور پر کانگرس کے ساتھ تھے وہ مسلمانوں کے مطالبات میں سے ایک مطالبے کے بھی حامی نہ تھے۔ یہی حال ان کے نیشنلسٹ رفقاء کا تھا۔ رہے سکھ تو وہ اپنے حقوق سے کہیں زیادہ مراعات طلب کر رہے تھے۔ مسلمان انہیں ضرورت سے زیادہ رعائتیں دے کر خود تو اقلیت نہیں بن سکتے تھے۔

گول میز کانفرنس نے ایک "مجلس اقلیت" بنائی تھی۔ جو فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کے لئے قائم کی گئی تھی۔ لیکن وہ بھی ناکام رہی۔ آخر کار گاندھی جی کے مشورے اور مسز نائیڈو کی تائید سے پنڈت مدن موہن مالوی اور بعض دوسرے ہندو لیڈروں نے وزیر اعظم مسٹر میکڈونلڈ سے درخواست کی کہ وہ ثالث بن کر تصفیہ کر دیں مگر مسٹر جناح نے مسلمانوں کی طرف سے اس ثالثی کے ماننے سے قطعاً انکار کر دیا۔" [2]

مجلس اقلیت کا اجلاس ۸ اکتوبر کو منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں مسٹر گاندھی نے یہ کہہ کر آزادی ہند کے ہر طلبگار کو مایوس کر دیا کہ میں نہایت رنج کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ گفت و شنید ناکام ہو گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ "مجلس اقلیت" کا اجلاس غیر معینہ عرصہ کے لئے ملتوی کر دیا جائے۔

---

[1] دی میموائرز آف آغا خان صہ ۲۲۸

[2] تاریخ مسلم لیگ صہ ۱۹۲، ۱۹۲، ۱۹۱

البتہ اس کا اتنا فائدہ ضرور ہو گیا کہ مسلمانوں نے ایک بار پھر دیکھ لیا کہ کانگرس ہو یا مہا سبھا۔ گاندھی جی ہوں یا ڈاکٹر مونجے ان میں سے کوئی شخص برصغیر میں مسلمانوں کو آبرو مندانہ طور پر زندہ رکھنے کا حق دینا نہیں چاہتا۔

اس کا مزید ثبوت اس وقت ملا جب وزیر اعظم برطانیہ مسٹر ریمزے میکڈونلڈ کی طرف سے کمیونل ایوارڈ شائع کیا گیا۔ اس ایوارڈ میں اعلان کیا گیا تھا کہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ حق نیابت کے اصول پر نشستیں مخصوص کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ پس ماندہ اقوام کو بھی کچھ حقوق دیئے گئے تھے۔

عجیب بات یہ ہے کہ یہ تجویز مسٹر گاندھی ہی نے پیش کی تھی کہ چونکہ اقلیتوں کے کسی حل پر ہندوستانی مندوب متفق نہیں ہو سکے ہیں اس لئے وزیر اعظم برطانیہ کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ از خود کسی فیصلے کا اعلان کر دیں۔ قائد اعظم نے ابتدا میں اس تجویز کو رد کر دیا تھا۔ لیکن سر شفیع کے اصرار پر انہوں نے یہ تجاویز قبول کر لی تھی۔ مگر جب وزیر اعظم کا یہ اعلان (کمیونل ایوارڈ) شائع ہوا تو سب سے زیادہ غم و غصے کا اظہار مسٹر گاندھی ہی نے کیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس ایوارڈ کے تحت مسلمانوں کو تناسب آبادی کی بنیاد پر نشستیں دینے کا اعلان کیا گیا تھا اور دوسرے اچھوتوں کو بھی کچھ مراعات مل گئی تھیں۔ یہ دوسری بات مسٹر گاندھی کے خطرناک عزائم کے سب سے زیادہ خلاف تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اچھوتوں کو ہندوؤں سے الگ ایک فرقہ تسلیم کر لیا گیا ہے اور مسٹر گاندھی انہیں ہندوؤں میں شامل رکھنا چاہتے تھے تاکہ ہندوؤں کی تعداد میں اور اضافہ ہو جائے اور کانگرس کی نمائندگی کا دائرہ مزید وسیع ہو سکے۔ چنانچہ انہوں نے اعلان کر دیا کہ کانگرس کو یہ اسکیم منظور نہیں۔ انہوں نے وزیر اعظم برطانیہ کو ایک خط بھی لکھا جس میں یہ دھمکی دی کہ اگر کمیونل ایوارڈ میں ان کی حسب خواہش ترامیم نہ کی گئیں تو وہ ۲۰ ستمبر کو ۱۲ بجے دن سے مرن برت کا آغاز کر دیں گے۔

اب اچھوت لیڈروں کو رام کرنے کی کوششیں شروع کی گئیں۔ انہیں طرح طرح کے سبز باغ دکھائے گئے۔ مختلف قسم کے لالچ دیئے گئے۔ گاندھی جی کی موت کی صورت میں ہندوؤں اور اچھوتوں کے درمیان جس کش مکش کا اندیشہ تھا اس کے خطرناک نتائج سے بھی انہیں ڈرایا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اچھوت لیڈروں نے دباؤ میں آکر جداگانہ نیابت کے حق سے دست برداری کا اعلان کر دیا۔ اس معاملے میں راج گوپال اچاریہ نے اہم کردار ادا کیا اور انہوں نے اچھوتوں کے لئے زیادہ نشستیں مخصوص کرنے کی پیش کش کر کے اچھوت لیڈر مسٹر امبیدکر کو جداگانہ حق نیابت سے دست برداری پر آمادہ کر لیا۔ یہ معاہدہ ۱۹۳۲ء میں بمقام پونا کانگرسی اور اچھوت لیڈروں کے درمیان طے پایا اور حکومت نے اسے تسلیم کر لیا۔ اس طرح گاندھی جی کو کامیابی ہوئی اور اچھوتوں نے اپنی سادہ لوحی اور دباؤ کے تحت اپنی جداگانہ حیثیت خود ختم کر دی۔ اس طرح کانگرس نے اچھوتوں کی سیاسی حیثیت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔

ایک موقع پر اچھوتوں کے رہنما ڈاکٹر امبیدکر نے مسٹر گاندھی کو مخاطب کرتے ہوئے جو تقریر کی وہ اس ہندو رہنما کی ذہنیت اور تنگ نظری پر نہایت جامع تبصرہ ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ :۔

"مہاتما جی کی طرف سے ہمیشہ یہ کہا جاتا رہا ہے کہ کانگرس پس ماندہ اقوام کی حامی ہے۔ وہ یہ بھی فرماتے رہے ہیں کہ مجھ سے اور میرے ساتھیوں سے بھی زیادہ کانگرس پس ماندہ طبقوں کی ترجمانی و نمائندگی کا فریضہ ادا کرتی ہے۔ ان کے اس دعوے کے بارے میں میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اپنی ذمہ داری سے پہلو تہی کرنے والے لوگ دن رات جو دعوے کیا کرتے ہیں یہ دعویٰ بھی انہی میں سے ہے۔ حالانکہ پس ماندہ طبقوں کے رہنماؤں کی طرف سے ان دعوؤں کی متعدد بار تردید کی جا چکی ہے۔" [1]

جب کانفرنس ناکام ہونے لگی تو مسلم نمائندوں نے قائد اعظم کی طرف رجوع کیا۔ اس سلسلے میں سر شفیع نے نہایت اہم خدمات سرانجام دیں اور قائد اعظم کو اس امر پر رضامند کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ وہ مسلمانوں کی طرف سے وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈونلڈ کو یہ اختیار دے دیں کہ وہ اپنے طور پر ہندو مسلم مسئلے کا حل پیش کر دیں۔ اسی قسم کا اختیار ہندو راہنماؤں نے بھی وزیر اعظم کو دے دیا۔

سر شفیع نے مسلم وفد کی طرف سے جو موقف پیش کیا وہ یہ تھا کہ :۔

(۱) پنجاب میں مسلمانوں کو جداگانہ حلقوں کے ذریعے کل ایوان کا ۴۹ فیصد دے دیا جائے۔ لیکن کچھ مخلوط حلقے خاص مفادات کی نمائندگی کے لئے ہوں۔ جن کے ذریعے مسلمان پورے ایوان میں کم از کم ۵۱ فی صد نمائندگی حاصل کر لیں۔

(۲) اسی طرح بنگال میں مسلمانوں کو جداگانہ حلقوں کے ذریعے پورے ایوان کا ۴۸ فیصد دے کر انہیں خاص مفادات کے مخلوط حلقوں کے ذریعے اکثریت حاصل کرنے کا موقع دیا جائے۔

(۳) مسلم اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کا تناسب نمائندگی جداگانہ انتخاب کے ذریعے وہی دیا جائے جو لکھنؤ پیکٹ میں مقرر تھا۔

سر فضل حسین حکومت ہند میں اپنے ساتھیوں کو اس فارمولے کی پوری حمایت پر متفق کر چکے تھے۔

کمیونل ایوارڈ

دوسری گول میز کانفرنس ناکامی پر ختم ہو گئی اور ہندوستانی نمائندے خالی ہاتھ وطن واپس آ گئے۔

---

[1] قائد اعظم جناح دی اسٹوری آف اے نیشن صـ ۲۳۳

انڈیا ایکٹ

۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک کا درمیانی عرصہ برصغیر خصوصاً مسلمانوں کے لئے نہایت کس مپرسی کا تھا۔ لارڈ اردن کے بعد لارڈ ولنگڈن ہندوستان کے وائسرائے ہو کر آ گئے تھے اور انہوں نے آتے ہی کانگریس کو ایک سخت دھمکی دی کہ اگر سول نافرمانی کی تحریک بند نہ کی گئی تو اسے سختی سے کچل دیا جائے گا۔ انہوں نے جیسا کہا تھا ویسا ہی کر دکھایا۔ مسٹر گاندھی جواہر لال نہرو، خان عبد الغفار خاں اور بہت دوسرے کانگریسی لیڈر گرفتار کر لئے گئے۔ پولیس نے سخت تشدد کیا۔ اور چند روز کے اندر اندر کانگریس کی تحریک سول نافرمانی کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ تحریک مسٹر گاندھی کے منصوبہ کے مطابق شروع کی گئی تھی۔ اور مقصد یہ تھا کہ حکومت پر اتنا دباؤ ڈالا جائے کہ وہ اقلیتوں کا تحفظ اور ان کے مطالبات منظور کرنے پر آمادہ نہ ہو۔ اس لحاظ سے کانگریس کی یہ تحریک بظاہر حکومت کے خلاف مگر بباطن مسلمانوں کے خلاف تھی۔ اس لئے اس کی ناکامی پر مسلمانوں میں نہایت خوشگوار ردعمل ہوا۔

مسلم نشستوں کا تعین

کمیونل ایوارڈ کی رو سے صوبوں میں مسلمانوں کی نشستوں کا تعین کر دیا گیا تھا اور اب اس ایوارڈ کو ایکٹ کی صورت دی جانے والی تھی۔ اس کے بعد انتخابات کا مرحلہ آنا تھا۔ اس لئے کانگرس اور مسلم لیگ دونوں جماعتیں اپنی اپنی جگہ نئے رونما ہونے والے حالات کے متعلق غور و فکر میں مصروف تھیں۔ کانگرس کی تنظیمی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہ تھی اور پہلے سے اس سے زیادہ طاقتور جماعت بن چکی تھی مگر مسلمانوں کی حالت سب سے زیادہ ناگفتہ بہ تھی۔ ان کی تنظیم نہایت کمزور تھی اور کام بہت بڑا درپیش تھا۔ ذیل کے نقشے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کیمونل ایوارڈ کی رو سے صوبوں میں انہیں کیا پوزیشن دی گئی تھی اور اس کے لئے انہیں کتنا کام کرنا تھا۔

نام صوبہ	مسلم آبادی کا تناسب	کل نشستیں	مسلم نشستوں کی تعداد
صوبہ سرحد	۹۱ء۸	۵۰	۳۶
پنجاب	۵۷ء۵	۱۷۵	۸۶

سندھ	۷۰٫۷	۱۱۰	۳۴
یوپی	۱۵٫۳	۲۲۸	۶۶
بہار اڑیسہ	۱۰٫۸	۱۷۵	۴۲
بنگال	۵۴٫۷	۲۵۰	۱۱۹
آسام	-	۱۰۸	۳۴
سی پی	۴٫۷	۱۱۲	۱۴
بمبئی	۹٫۷	۱۷۵	۳۰
مدراس	۷٫۹	۲۱۵	۲۹

اس جدول پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثریت کے صوبوں پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی نشستیں کم کر دی گئی تھیں البتہ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک مستقل صوبہ بنا دیا گیا تھا اس طرح مسلم اکثریت کے صوبہ میں ایک صوبہ کا مزید اضافہ ہو گیا تھا یہ مسلمانوں اور مسلم لیگ کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ کا یہ مطالبہ بھی کمیونل ایوارڈ میں تسلیم کر لیا گیا تھا کہ مرکزی اسمبلی میں انہیں ۳۳ فی صد نشستیں دی جائیں مسلم لیگ کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ ان کا جداگانہ حق نیابت تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے کمیونل ایوارڈ مسلمانوں کے لئے کچھ زیادہ برا نہ تھا۔ مگر اس میں بعض ایسی خامیاں ضرور تھیں جن سے مسلم مفادات کی صحیح طور پر نگہداشت نہیں ہو سکتی تھی۔

قائد اعظم کا قیام انگلستان

دوسری گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد قائد اعظم ہندوستان کی سیاست اور کانگرس کے طرز عمل سے دل برداشتہ ہو کر انگلستان میں مقیم ہو گئے اور وہاں پریوی کونسل میں مقدمات کی پیروی کرنے لگے۔ مگر جب کمیونل ایوارڈ کا اعلان ہوا اور اس ایوارڈ کے متعلق مسلمانوں نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا تو اس وقت برصغیر کے مسلمانوں خصوصاً مسلم لیگی حلقوں میں ان کی عدم موجودگی کو بری طرح محسوس کیا گیا۔ ان کے مداحوں نے انہیں متعدد خطوط لکھے کہ وہ ہندوستان واپس آ جائیں اور یہاں آ کر اس نازک وقت میں مسلمانوں کی رہنمائی کریں حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ملک میں کوئی ایسا مسلمان رہنما موجود نہ تھا جو مسلمانوں کی قیادت کا اہل ہوتا۔ مولانا محمد علی ۱۹۳۱ء میں انتقال کر گئے تھے۔ اسی سال یعنی ۱۹۳۱ء ہی میں راجہ صاحب محمود آباد سر علی محمد خاں بھی وفات پا گئے جو بلاشبہ مسلمانوں کے جاں نثار اور نہایت ہر دلعزیز رہنما ہونے کے علاوہ نہایت بیدار مغز انسان تھے ۱۹۳۲ء میں سر شفیع کا بھی انتقال ہو گیا اور بلاشبہ انہیں بھی مسلمانوں کے مفادات خصوصاً جداگانہ حق نیابت کے مسئلے سے نہایت گہری دلچسپی تھی اور بڑے آڑے وقتوں میں انہوں نے مسلمانوں کی رہنمائی کی تھی۔ عوامی مسلم رہنماؤں میں اب صرف دو آدمی ایسے باقی رہ گئے تھے جنہیں ملک گیر شہرت حاصل تھی۔ اور

مسلمان عوام جن کا احترام کرتے اور اُن کی بات سنتے تھے ایک مولانا شوکت علی اور دوسرے مولانا حسرت موہانی۔ مولانا شوکت علی بلاشبہ مسلمانوں میں نہایت مقبول تھے اور انہیں مسلمانانِ ہندوستان کے مفادات کے تحفظ کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔ وہ اعلیٰ درجے کے منتظم تھے اور برصغیر کی سیاست میں اس پائے کا منتظم شاید ہی پیدا ہوا ہو مگر ان میں اس سیاسی بصیرت اور فکر و نظر کی اس گہرائی کی کمی تھی جو سیاسی مسائل حل کرنے کے لئے اس وقت درکار تھی۔ مختصر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ سیاست دان سے زیادہ جرنیل تھے۔ رہ گئے حسرت موہانی تو اُن کے خلوص اعلیٰ کردار، حق گوئی، دیباکی اور اپنے موقف پر چٹان کی طرح قائم رہنے کے اوصاف سے انکار کرنا کفر ہے وہ شمع آزادی کے جاں باز پروانے تھے اور اُن سے بڑا حریت پسند ہندوستان کی سیاست نے شاید ہی پیدا کیا ہو مگر ان کے پاس وہ وسائل نہ تھے جو کسی تحریک کو جاری کرنے اور عوام کو منظم کرنے کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ ان کا مزاج اور افتادِ طبع بھی کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ عوام اور خواص دیر تک ان کے ساتھ نہیں چل سکتے تھے۔ ان باتوں کے باوجود ان کی عظمت اور ملک و ملت کے لئے ان کی عظیم قربانیوں کا اعتراف نہ کرنا گناہ ہے ان حالات میں صرف ایک شخصیت باقی رہ گئی تھی جس کی ذات جامع کمالات تھی اور جس کی ہندوستان کے مسلمانوں کو سخت ضرورت تھی یہ شخصیت قائد اعظم محمد علی جناح کی تھی جو ان دنوں ہندوستان کے معاملات سے لاتعلق ہو کر انگلستان میں مقیم تھے مگر واقعات شاہد ہیں کہ وہاں بیٹھ کر بھی انہیں ایک پل چین نصیب نہ ہوا اور مسلمانانِ ہند کی حالتِ زار نے انہیں مضطرب ہی رکھا۔ اس زمانے کے ایک مسلم سیاست دان مسٹر عبدالمتین چوہدری اور نواب زادہ لیاقت علی خاں نے قائد اعظم سے پے بہ پے درخواستیں کیں کہ وہ ہندوستان واپس آ کر مسلمانوں کی رہنمائی کریں۔ اس سلسلے میں مسٹر عبدالمتین چوہدری اور قائد اعظم کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی وہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہے اور ان خطوط کے مطالعے سے اس عہد کی مسلم سیاست اور اس کے متعلق قائد اعظم کے احساسات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان خطوط کے بعض اقتباسات مسٹر جی الانا نے اپنی کتاب "قائد اعظم جناح دی سٹوری آف اے نیشن" میں درج کئے ہیں جو قائد اعظم کی شخصیت اور ان کی سیاسی زندگی پر نہایت عمدہ کتاب ہے اور اس عہد کے ہندوستان کی ایک تاریخی دستاویز بھی ہے۔

قائد اعظم کے خطوط عبدالمتین کے نام

پہلا خط ۵ مئی سنہ ۱۹۳۲ء کا لکھا ہوا ہے جس میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ

"آپ کے ۱۶ اپریل کے مکتوب گرامی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ہندوستان کے حالات کے متعلق میں آپ کی اطلاعات کا منتظر رہتا ہوں اور آپ کی یہ اطلاعات میرے نزدیک دوسروں سے زیادہ قابلِ اعتماد ہوتی ہیں۔ آپ نے جو مکتوبات مجھے اس وقت تک لکھے ہیں وہ میرے لئے نہایت مفید ثابت ہوئے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ سلسلہ آپ آئندہ بھی جاری رکھیں گے کچھ عرصہ قبل میں

میں نے آپ کو جو خط لکھا تھا اس کے بعد کوئی خاص بات قابل تحریر نہیں سوائے اس کے کہ برطانوی حکومت ٹال مٹول سے کام لے رہی ہے اور اس انتظار میں ہے کہ تینوں کمیٹیوں کی رپورٹ اُسے موصول ہو جائے۔

موسم سرما گزر چکا ہے اور ان دنوں موسم نہایت خوشگوار ہے۔ مجھے یہاں بہت آرام ہے کام میں مصروف ہوں مگر دل ہندوستان کی طرف لگا ہوا ہے۔[1]

۳۰ مارچ ۱۹۳۳ء کو قائد اعظم نے ایک خط اور مسٹر عبدالمتین چوہدری کو تحریر فرمایا جس میں انہوں نے زیادہ وضاحت سے ہندوستان کے سیاسی حالات اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ گو ان میں مایوسی زیادہ ہے مگر کہیں کہیں اُمید کی جھلک اور رہنمائی بھی ملتی ہے۔ ذیل میں یہ خط درج کیا جاتا ہے۔

"مجھے تار مل گیا۔ لیگ نے جن جذبات کا اظہار کیا ہے۔ میں اُن کی قدر کرتا ہوں مگر دسمبر سے قبل میرا ہندوستان آنا ممکن نہیں۔ آپ نے درست لکھا ہے کہ میں انتخابات میں حصہ لوں مگر سوال یہ ہے کہ کیا ہندوستان میں کوئی سیاسی کام کیا جا سکتا ہے؟ اس لئے میں اکثر یہ خیال کرتا ہوں کہ شاید ہندوستان میری خدمات کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ میں نہایت تکلیف کے ساتھ اس امر کا اعادہ کرتا ہوں کہ ہندوستان کو بچانے کے لئے اس وقت تک کچھ کرنا ناممکن ہے جب تک ہندو حالات کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش نہیں کریں گے اگر ہندو چاہیں تو حالات کا رُخ تبدیل ہو سکتا ہے۔ ان حالات میں رجعت پسند طاقتوں کا قوت پکڑنا قدرتی امر ہے اور ان کی سرگرمیاں روز بروز بڑھ رہی ہیں۔ مسلمانوں کو بھیڑوں بکریوں کی طرح ہانک کر لے جایا جا رہا ہے۔ ان حالات میں ان کا حریفوں کے ہاتھوں کھلونا بن جانا ایک فطرتی چیز ہے۔ حالات کی کنجی ہندوؤں کے پاس ہے اور اگر ان میں جرأت و فراست ہو تو وہ حالات کا رُخ تبدیل کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کو آئندہ دستوری صورت میں جو ملنے والا ہے اس میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کی وضاحت کی ضرورت ہو۔ صرف صوبوں کو خود مختاری دی جائے گی اور وفاق کا قیام معرض تعطل میں رہے گا۔ ہندوؤں کو بیوقوف بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے اگر کوئی اسکیم حسن اتفاق سے منظور ہو گئی تو اس سے حالات موجودہ صورت حال سے بھی زیادہ خراب ہو جائیں گے۔ جو لوگ کسی ایسی سکیم کی تائید میں ہیں اُنہیں محسوس ہو گا کہ ان کے ساتھ فریب کیا گیا ہے۔

---

[1] قائد اعظم جناح۔ دی ہسٹری آف اے نیشن ۱۹۴۷ء ۲۵ مؤلفہ جی الانا۔

آپ نے تجویز پیش کی ہے کہ سر ابراہیم مستعفی ہونے والے ہیں اس لئے میں ہندوستان آکر انتخاب لڑوں، اس پیش کش کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن میں دسمبر سے قبل ہندوستان نہیں آسکتا۔ اس لئے اس سے قبل کچھ نہ لکھوں گا۔ چند ماہ اور انتظار کیجئے۔

اخبارات کے ذریعے مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہندوؤں کے طرز عمل میں تبدیلی کا آغاز ہو گیا ہے مگر یہ تبدیلی بہت سست رفتاری سے ہو رہی ہے اور ادھر حالات میں نہایت تیزی سے تغیر ہو رہا ہے۔ اگر ہم نے ان حالات کا ساتھ نہ دیا تو ہم بہت پیچھے رہ جائیں گے۔[1]

انڈی پینڈنٹ پارٹی:

قائد اعظم کی عدم موجودگی میں جن لوگوں نے برصغیر کے مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت کرنے اور انہیں منظم کرنے کی کوششیں کیں ان میں مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، نواب حمید اللہ خاں آف بھوپال اور چوہدری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خاں کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان بزرگوں نے حالات کو سازگار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور اس میں ان لوگوں کو کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ یہ حضرات جن مسلمان اکابر سے تعاون کر رہے تھے اُن کی اکثریت، کانگرس کی طرف دیکھے اور اس کے اشارے کے بغیر کوئی قدم نہ اُٹھاتی تھی اس لئے بہت سی اُلجھنیں پیدا ہوتی گئیں۔

اسی دوران میں مسلمانوں کے مشہور حریت پسند رہنما مولانا حسرت موہانی نے انڈی پنڈنٹ پارٹی کے نام سے ایک جماعت قائم کی مولانا حسرت موہانی اس جماعت کے ذریعے ہندو مسلم اختلافات ختم کر کے انہیں ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنا چاہتے تھے تاکہ برصغیر کو انگریزی حکومت سے نجات دلائی جائے۔ اسی لئے انہوں نے اس پارٹی میں ہندو اور مسلمان دونوں کو شامل کیا اور اس کے لئے ملک گیر دورے کئے۔ اس پارٹی کے صدر مبشر حسین قدوائی آرگنائزنگ سیکرٹری خود مولانا حسرت موہانی اور سیکرٹری سید حسن ریاض مقرر ہوئے مگر جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ مولانا کا مزاج اور افتاد طبع اس قسم کے تنظیمی کاموں کے لئے موزوں نہ تھی اور پھر اس دور میں دونوں فرقوں کے جذبات اس قدر شدت اختیار کر چکے تھے کہ انہیں اعتدال پر لا کر کوئی ایسی تنظیم قائم کرنا ناممکن تھا جس میں ہندو اور مسلمان شانہ بشانہ کام کر سکیں بہر حال مولانا حسرت موہانی کے خلوص اور آزادی کی لگن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مسلم یونیٹی بورڈ:

اسی دوران میں چوہدری خلیق الزماں نے اپنے رفقائے کار کی امداد سے مسلم یونیٹی بورڈ کے نام سے ایک جماعت

---

[1] قائد اعظم جناح دی سٹوری آف اے نیشن ص ۲۴۴ مولفہ جی الانا۔

قائم کی چوہدری صاحب اس وقت تک کانگریس کے سرگرم رہنما تھے مگر وہ اُن کانگریسی مسلمانوں میں سے نہیں تھے۔ جو کانگریس ہائی کمان کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہدیا کرتے تھے۔ اِن کا اپنا ایک ذہن اور اپنی فکر تھی۔ انہوں نے مسلم نیشنلسٹ پارٹی، مسلم کانفرنس اور جمعیتہ العلماء کے اشتراک سے اپنی جماعت قائم کی مسلم یونیٹی بورڈ کے قیام کی غرض وغایت در اصل یہ تھی کہ ۱۹۳۴ء میں مرکزی اسمبلی کے جو الیکشن ہونے والے تھے اُن میں مسلم نمائندوں کو کامیاب کرایا جا سکے۔ چوہدری خلیق الزماں بھی ان مسلمان رہنماؤں میں سے تھے جو کمیونل ایوارڈ کو مسلمانوں کے لئے غنیمت سمجھتے تھے۔ کیونکہ اس میں اُن کا دیرینہ مطالبہ جداگانہ حق نیابت تسلیم کر لیا گیا تھا اور سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک مستقل صوبہ کی حیثیت دیدی گئی تھی چنانچہ چوہدری صاحب نے مسلم یونٹی بورڈ کے انتخابی منشور میں کمیونل ایوارڈ کی حمایت کو سرفہرست رکھا۔ دوسرا نکتہ آئینِ آزادی کا مطالبہ تھا جبکہ حکومت برطانیہ کے تجویز کردہ آئین میں معاملہ صرف صوبائی خود مختاریوں تک محدود تھا۔ چوہدری صاحب کی ذہانت مستعدی اور اثر و رسوخ سے اس پارٹی کو خاصی کامیابی ہوئی اور ۱۹۳۴ء کے انتخابات میں اس پارٹی کی طرف سے یوپی سے بہت سے نمائندے منتخب ہو کر مرکزی اسمبلی میں چلے گئے۔ جہاں انہوں نے جداگانہ انتخاب اور مرکز میں مسلمانوں کے لئے ۳۳⅓ فی صد نمائندگی کے سوال پر مسلمانوں کی نمائندگی کی اور ہندوستان کے لئے آزادی کا مطالبہ کیا۔ اس جماعت نے بیشتر معاملات میں قائد اعظم کی حمایت کی۔

قائد اعظم کے کاغذات نامزدگی۔

قائد اعظم انگلستان میں مقیم تھے اور ان کو ہندوستان واپس بلانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اسی دوران میں مرکزی اسمبلی کے الیکشن قریب آگئے اور بمبئی کے مسلمانوں نے اکتوبر ۱۹۳۴ء میں اُن کی عدم موجودگی میں اُن کی طرف سے کاغذات نامزدگی داخل کر دیئے ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو کاغذات نامزدگی کی جانچ پڑتال ہوئی اور قائد اعظم بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ یہاں اس حقیقت کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قائد اعظم کے کاغذات نامزدگی ان کی اجازت اور اطلاع کے بغیر داخل کئے گئے تھے۔ قائد اعظم کے انگریز سوانح نگار مسٹر ہیکٹر بولائیتھو نے بھی یہی مشہور روایت قبول کر لی ہے کہ قائد اعظم کے علم اور اطلاع کے بغیر بمبئی کے مسلمانوں نے ان کے کاغذات نامزدگی داخل کر دیئے تھے اور اپنی کامیابی کی خبر انہیں لندن کے اس ہوٹل میں ملی جہاں وہ قیام پذیر تھے۔[۱]

حالانکہ یہ بات واقعات کے سراسر خلاف ہے حقیقت یہ ہے کہ بمبئی کے مسلمان اکابر کا ایک جلسہ مسٹر ابوبکر بیگ محمد کے مکان پر ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ قائد اعظم سے درخواست کی جائے کہ وہ بمبئی کی نشست سے انتخاب میں حصہ لینے پر آمادہ ہو جائیں تاکہ ان کی منظوری حاصل ہونے کے بعد کاغذات نامزدگی بروقت داخل کئے

---

[۱] محمد علی جناح — مولفہ مسٹر بولائیتھو

جا سکیں، یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ اس غرض کے لئے قائد اعظم کو تار بھیجا جائے چنانچہ اس تار کے جواب میں قائد اعظم کی طرف سے منظوری حاصل ہو گئی اور وہ بلا مقابلہ مرکزی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے۔ [1]

یہاں ایک اور امر کی صراحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ قائد اعظم اپنے کاغذات نامزدگی داخل ہونے سے قبل ایک بار اپریل ۱۹۳۴ء میں ہندوستان آئے تھے اور اس موقع پر انہوں نے مسلم لیگ کے اندرونی اختلافات ختم کرنے کے لئے نہایت مؤثر کوشش کی تھی۔ قائد اعظم کی غیر حاضری میں مسلم لیگ کی تنظیم میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں اور دو تین مسلم لیگیں قائم ہو گئی تھیں۔ ایک اصل اور پرانی مسلم لیگ، دوسری عبدالعزیز بیرسٹر کی مسلم لیگ اور تیسری حافظ ہدایت حسین کی مسلم لیگ۔ اس طرح اس جماعت کی طاقت جو پہلے ہی ایک کمزور جماعت تھی اور کمزور ہو گئی تھی، چنانچہ قائد اعظم نے ہندوستان آکر ان تینوں جماعتوں کے لیڈروں کے اختلافات ختم کرائے اور ان کی کوششوں سے ان تینوں لیگوں کو ملا کر صرف ایک مسلم لیگ بنائی گئی جس کے صدر قائد اعظم اور سیکرٹری حافظ ہدایت حسین منتخب ہوئے۔ اس کے بعد اس نئی مسلم لیگ کا اجلاس قائد اعظم کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں کمیونل ایوارڈ پر بحث و تحقیق ہوئی قائد اعظم نے اس ایوارڈ کو مسلم مفادات کی ضمانت کے سلسلے میں غیر تسلی بخش قرار دیا۔ اجلاس نے فیصلہ کیا کہ جب تک کوئی متبادل سکیم سامنے نہیں آتی اُس وقت تک کے لئے مسلم لیگ یہ ایوارڈ منظور کرتی ہے۔

کانگرس اور کمیونل ایوارڈ

کمیونل ایوارڈ کے متعلق مسلم لیگ نے تو ایک واضح فیصلہ دے دیا تھا اور اس میں مسلمانوں کے حقوق کی کافی ضمانت نہ ہونے کے باوجود اسے قبول کر لیا تھا کیونکہ یہ ایوارڈ ہندو مسلم سمجھوتے کی بُنیاد بن سکتا تھا مگر کانگرس نے جس کی نیت میں شروع سے کھوٹ تھی اس معاملے میں بھی مکر و فریب اور مصلحت بینی سے کام لیا ہم امئی ۱۹۳۴ء کو بمبئی میں کانگرس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں مسٹر گاندھی پنڈت مالوی اور مسٹر آنے کے درمیان کشمکش ہوئی اور کمیونل ایوارڈ کے رد و قبول کے متعلق کئی روز تک کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ اس اجلاس میں سب سے زیادہ عجیب و غریب پوزیشن مسٹر گاندھی نے اختیار کی۔ انہوں نے جو مسودہ پیش کیا اس میں کہا گیا تھا کہ کانگرس کمیونل ایوارڈ کو نہ تو قبول کرتی ہے اور نہ رد کرتی ہے۔ بہ ظاہر یہ بڑی عجیب منطق تھی لیکن اگر کانگرس اور مسٹر گاندھی کی سیاسی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو اس میں قدم قدم پر ایسے ہی عجائب و غرائب نظر آئیں گے۔ آج کے لوگ اس عجیب منطق کو کہ کانگرس نہ کمیونل ایوارڈ کو قبول کرتی ہے نہ اسے رد کرتی ہے شاید نہ سمجھ سکیں لیکن جب انہیں اس کا پس منظر معلوم ہو جائے گا تو وہ اسے بآسانی سمجھ لیں گے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس زمانے میں چوہدری خلیق الزماں

---

[1] قائد اعظم جناح دی سٹوری آف اے نیشن صفحہ ۲۴۷

کی پارٹی "مسلم یونیٹی بورڈ" ایک مضبوط جماعت تھی اور چوہدری صاحب کمیونل ایوارڈ کی منظوری کا اعلان کر چکے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی نہایت ہی قابل قدر اور پُر از معلومات کتاب "شاہراہ پاکستان" میں رقم طراز ہیں کہ

"میں نے میٹنگ شروع ہونے سے قبل مسٹر نائیڈو کو بتلا دیا تھا کہ اگر کمیونل ایوارڈ کو رد کر دیا گیا تو میں بورڈ (یعنی کانگرس پارلیمنٹری بورڈ) سے مستعفی ہو جاؤں گا۔"[1]

دوسری طرف ہندو رہنما اور کانگرس کے اراکین کمیونل ایوارڈ کے سخت مخالف تھے کیونکہ اس میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ حق نیابت کی بنیاد پر صوبوں میں نشستیں متعین کر دی گئی تھیں دوسرے سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک مستقل صوبہ کی حیثیت دینے کا اعلان کر دیا تھا اور یہ دونوں باتیں ہندو مفادات اور ہندو ذہنیت کے خلاف تھیں مسٹر گاندھی سخت کشمکش میں مبتلا تھے چنانچہ اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے انہوں نے یہ چال چلی اور ایک گول مول بات کہہ دی تاکہ چوہدری خلیق الزماں اور ان کی جماعت بھی گاندھی جی اور کانگرس کی مخالف نہ ہو جائے نہ ہو جائے جس کے تعاون کی انہیں اس وقت سخت ضرورت تھی اور دوسری طرف وہ ہندو قوم اور کانگرسی ممبروں کو بھی ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے۔

قائد اعظم کی مرکزی اسمبلی میں شرکت

جنوری ۱۹۳۵ء میں مرکزی اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا اور قائد اعظم لندن سے اس میں شرکت کرنے کے لئے ہندوستان تشریف لے آئے یہاں آکر انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اسمبلی میں اپنی پارٹی کی تشکیل دی۔ اس وقت تک مسلم لیگ نے بحیثیت جماعت مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ نہیں لیا تھا بلکہ سرے سے کسی نوعیت کے انتخابات میں شریک نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس کی جڑیں ابھی عوام میں زیادہ گہری نہ تھیں اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی آواز کو مؤثر بنانے کے لئے انہیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے چنانچہ اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنے ہم خیال ممبروں کی ایک جماعت قائم کی سید نور احمد اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:-

"مسٹر جناح اب بھی اپنی پارٹی پر فرقہ وارانہ لیبل لگانے کو تیار نہ تھے انہوں نے اپنی پارٹی کے لئے وہی پرانا نام "انڈی پنڈنٹ پارٹی" پسند کیا۔ لیکن اب مسلمان ممبروں نے بھاری تعداد میں جمع ہو کر اسے عملاً ایک مسلم پارٹی بنا دیا۔ ۱۹۲۴ء کی اسمبلی میں مسٹر جناح کی انڈی پنڈنٹ پارٹی کی تعداد اٹھارہ تھی جن میں صرف چار مسلمان تھے ۱۹۲۶ء کے انتخابات کے بعد کئی ہندو اس پارٹی کو چھوڑ گئے تھے اور اس پارٹی کی تعداد صرف دس رہ گئی تھی جن میں پانچ مسلمان تھے ۱۹۳۰ء کے انتخابات میں مسٹر جناح نے حصہ ہی نہیں لیا تھا۔ اب ۱۹۳۴ء کے انتخابات کے بعد اس پارٹی

---

[1] شاہراہ پاکستان صفحہ ۵۵۳ مولفہ چوہدری خلیق الزماں

کی تعداد بائیس ہو گئی تھی جن میں اٹھارہ مسلمان تھے" [۱]

۴ فروری کو جب مرکزی اسمبلی کے اجلاس میں ہندوستان کے نئے آئین کا مسودہ پیش ہوا تو اس موقع پر قائداعظم نے ایک نہایت دانشمندانہ تقریر کی جس میں کمیونل ایوارڈ کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کرنے کے بعد نئے آئین کے صوبائی حصوں اور فیڈرل مرکز کی ہیئت میں تغیر و تبدل کا مطالبہ کیا اس موقع پر انھوں نے اپنی مشہور تین تجاویز پیش کیں۔

(۱) یہ اسمبلی کمیونل ایوارڈ کو منظور کرتی ہے تاوقتیکہ اس کا کوئی نعم البدل باہمی فیصلے سے سامنے نہ آئے

(۲) صوبائی حکومتوں کی اسکیم کے سلسلہ میں اس ہاؤس کی یہ رائے ہے کہ وہ بالکل غیر اطمینان دہ اور مایوس کن ہے کیونکہ اس میں بہت سے سخت قابل اعتراض عنصر موجود ہیں خصوصاً دوسرے چیمبر کا قیام، گورنر کے خصوصی اختیارات، پولیس کے متعلق ہدایات، سی آئی ڈی کے شعبہ جات سے متعلق قوانین اور اختیارات جو انتظامیہ کی اجارہ داری کو بالکل مجہول کر دیتے ہیں اور جب تک اس کی یہ قابل اعتراض صورتیں دفع نہ کر دی جائیں وہ ہندوستان کی رائے عامہ کو قبول نہیں ہو سکتیں۔

(۳) مرکزی اسمبلی کے متعلق اس ایوان کی رائے یہ ہے کہ آل انڈیا فیڈریشن بنیادی اعتبار سے خراب ہے اور وہ برٹش انڈیا کے لوگوں کو قبول نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ ایوان گورنمنٹ آف انڈیا سے سفارش کرتا ہے کہ وہ حکومت برطانیہ کو مشورہ دے کہ وہ کوئی قانون اس سکیم کے تحت نہ بنائے اور مطالبہ کرتا ہے کہ حکومت فوری اقدامات کے ذریعہ یہ غور کرے کہ تنہا برٹش انڈیا میں صحیح اور پوری ذمہ دار حکومت کیسے قائم ہو سکتی ہے اور اس غرض کے ماتحت ایسے اقدامات فوری کئے جائیں جن سے ہندوستانی رائے کی شمولیت سے تمام اسکیم پر نظر ثانی کی جا سکے" [۲]

ان تجاویز پر اظہار خیال کرتے ہوئے قائداعظم نے ایک نہایت پُر مغز اور جامع تقریر کی جس میں انہوں نے کانگریس اور پنڈت مدن موہن مالویہ کے نیشنلسٹ ساتھیوں کا خوب تعاقب کیا۔ اس موقع پر ہندو اراکین اسمبلی کئی گروہوں میں بٹ گئے تھے کچھ نئے آئین کے حامی تھے جن کی تعداد بہت کم تھی کچھ غیر جانبدار ہو گئے تھے اور کچھ اس کی کھلم کھلا مخالفت کر رہے تھے ان کا مطالبہ تھا کہ اسے رد کر دیا جائے کیونکہ اس میں مسلمانوں کا پرانا مطالبہ جداگانہ حق نیابت تسلیم کر لیا گیا تھا۔ ان کے لئے صوبوں میں نشستوں کا تعین کر دیا گیا تھا۔ قائداعظم کا موقف یہ تھا کہ جب تک اس سے بہتر سکیم پیش نہیں کی جاتی اسے قبول کر لینا چاہئے

---

۱ مارشل لاء سے مارشل لاء تک صد ۱۵۲/۱۵۴ ۲ شاہراہ پاکستان سنہ ۹۵۰/۹۵۱ مصنف چوہدری خلیق الزماں

اس موقع پر انہوں نے اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "میری تجویز یہ ہے کہ جب تک ہم آپس میں مل کر کوئی اعلیٰ اور معقول لائحہ عمل پیش نہ کرسکیں اس وقت تک فرقہ وارانہ حل تسلیم کر لینا چاہئے۔ میرے دوست اپوزیشن کے لیڈر (بھولائی بھائی ڈیسائی) نے کہا ہے کہ پہلے ہمیں آپس میں مل کر حقوق حاصل کر لینے چاہئیں اس کے بعد (حقوق) کی تقسیم کا معاملہ طے ہوتا رہے گا۔ اقلیتوں کے مسئلے کا حل یہ نہیں کہ پہلے حصول حقوق پر عمل کیا جائے اور تقسیم حقوق کو مستقبل کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ یہ کوئی جاگیر نہیں کہ پہلے حاصل کی جائے اور بعد میں اس کی تقسیم ہو نہ یہ کوئی لوٹ کا مال ہے کہ بعد میں حصہ رسدی اس کی تقسیم عمل میں آئے۔ اگر بات یہ ہے تو گاندھی جی نے اچھوتوں کے معاملے میں مرن برت کیوں شروع کیا تھا اور حصولِ حقوق سے پہلے تعینِ حقوق کو کیوں ترجیح دی تھی۔ میں اسی اسپرٹ کو اپنے (مسلمانوں کے لئے بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ پس آیئے اور ہمارے ساتھ انصاف کیجئے۔ میرا ہاتھ دوستی کے لئے بڑھا ہوا ہے۔ دوسروں سے لڑنے کی بجائے ہم خود کیوں نہ کسی معاہدے پر متفق ہو جائیں"۔[1]

قائداعظم کی یہ تقریر اتنی مدلل اور ان کے فقرے اتنے چبھتے ہوئے تھے کہ ہندو اراکین اسمبلی کے پاس بغلیں جھانکنے کے سوائے اور کوئی جواب نہ تھا۔ ان کی ترامیم پر تین روز تک بحث جاری رہی۔ اس کے بعد ان پر رائے شماری ہوئی۔

قائداعظم کی یہ ترامیم ۱۵ کے مقابلے میں ۶۸ ووٹوں کی اکثریت سے منظور ہو گئیں یہ مرکزی اسمبلی میں قائداعظم کی بہت بڑی فتح تھی اور خود مسلمانوں کے مفادات کے حق میں بھی یہ ترامیم نہایت مفید ثابت ہوئیں۔

جناح راجندر فارمولا

ہندوستان کے مسلمان اکابر اور بمبئی کے مسلمانوں کا قائداعظم سے ہندوستان واپس آکر مسلمانوں کی رہنمائی کی درخواستیں کرنا، قائداعظم کا بمبئی کے حلقے سے بلا مقابلہ منتخب ہو جانا، مرکزی اسمبلی میں انڈیپنڈنٹ پارٹی کی تشکیل اور قائداعظم کا اس کی قیادت کے منصب پر فائز ہونا اور آخر میں ان کی ترامیم کا پیش ہو کر کثرت رائے سے منظور ہو جانا یہ ایسے واقعات نہ تھے جنہیں آسانی سے نظر انداز کر دیا جاتا۔ قائداعظم نے اپنے تدبر اور قابلیت سے ہر اس شخص کو اپنی اہمیت بلکہ عظمت کا احساس دلا دیا تھا جسے سیاسی مسائل سے تھوڑا سا بھی تعلق تھا یہی وجہ ہے کہ کانگرس کے رہنماؤں نے مرکزی اسمبلی کے اجلاس کے دوران اس امر کی کوشش کی کہ قائداعظم اور کانگرس کے درمیان کوئی مصالحت ہو جائے۔ کیونکہ کانگرس کو احساس ہو گیا تھا کہ مسلمانوں اور خصوصاً تعلیم یافتہ

---

[1] حیات محمد علی جناح صفحہ ۱۹۳ - ۱۹۵

مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت قائد اعظم کے ساتھ ہے۔ چنانچہ کانگرسی ارکان کی کوشش سے اس زمانے کے صدر کانگرس ڈاکٹر راجندر پرشاد اور قائد اعظم کے درمیان مفاہمت کی گفتگو شروع ہوئی جو تھوڑے تھوڑے وقفے سے کافی دن جاری رہی۔ ان ملاقاتوں میں جناح راجندر نام سے ایک فارمولا تیار ہوا جس میں مسلم لیگ کا نقطۂ نظر تسلیم کر لیا گیا۔ مگر راجندر پرشاد نے اس کے لئے یہ شرط لگائی کہ جب تک مہاسبھا اسے قبول نہ کرے کانگرس اس کی توثیق نہیں کرے گی۔ ادھر پنجاب کے ہندوؤں اور سکھوں نے اس فارمولے کی مخالفت نہایت شدت سے شروع کر دی نتیجہ یہ ہوا کہ مفاہمت کی کوششیں ناکام ہو گئیں اور قائد اعظم دل برداشتہ ہو کر پھر انگلستان چلے گئے۔

انڈیا ایکٹ کا نفاذ

قائد اعظم انگلستان میں مقیم تھے کہ ہندوستان کے نئے آئین کے مسودے کو برطانوی پارلیمنٹ نے منظور کر لیا اور شاہ انگلستان نے جولائی ۱۹۳۵ء میں اس کی توثیق کر دی انڈیا ایکٹ پر مشہور آسٹریلوی مدبر مسٹر آر جی کیسی نے جو رائے ظاہر کی ہے اسے ہمارے اکثر و بیشتر مورخوں بلکہ یورپی مصنفوں نے بھی قابل قدر سمجھا ہے مسٹر کیسی کے خیال میں:۔

"انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں اہل ہند کو جو اختیارات دیئے گئے تھے وہ سائمن کمشن کی سفارشات سے کہیں زیادہ تھے۔ یہ دستور ایک بڑا اقدام تھا جو ہندوستان کی خود مختاری کے لئے کیا گیا۔ اس آئین کی رو سے صوبائی حکومتوں کو وہ تمام اختیارات منتقل کر دیئے گئے تھے جو کسی وفاقی ملک کے صوبوں کو دیئے جا سکتے ہیں۔ گورنر کو اس امر کا پابند کر دیا گیا تھا کہ وہ بیشتر معاملات میں وزراء کے مشوروں کی پابندی کرے سوائے بعض معاملات کے جن میں وہ وزارتی کونسل کے مشوروں سے آزاد تھا۔ ان چند امور کے بارے میں بھی گورنر کو ہدایات کر دی گئیں تھیں کہ ان اختیارات کو وہ اسی صورت میں استعمال کرے جب اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے۔ گورنر کو اس امر کا خیال رکھنے کی تلقین کی گئی تھی کہ وہ اپنے طرز عمل سے یہ نہ محسوس ہونے دے کہ وزراء کو ان کے اختیارات سے محروم کر دیا گیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بہت کم ایسا ہوا کہ گورنر نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کئے ہوں۔"

انڈیا ایکٹ کے دوسرے حصے کا تعلق مرکزی حکومت کے امور سے تھا۔ اس کا مقصد مرکزی حکومت کو بھی وزارتی دائرہ کار میں لانا اور مرکز میں ایسی حکومت قائم کرنا تھا جو عوامی ہو۔ لیکن آئین کے اس دوسرے حصے پر کبھی عمل نہ ہو سکا کیونکہ ہندوستان کے والیان ریاست نے اس میں شمولیت سے انکار کر دیا۔ اس طرح مرکزی حکومت کا انتظام اسی طرح جاری رہا جس طرح اس سے پہلے تھا۔[1]

---

[1] این آسٹریلین ان انڈیا صفحہ ۴۹-۵۰ مولفہ مسٹر آر جی کیسی۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ اس آسٹریلین مدبر نے واقعات کو سمجھنے میں غلطی کی یا غلط بیانی سے کام لیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ۱۹۳۵ء کا انڈیا ایکٹ سائمن کمیشن کی افسوسناک سفارشات سے کہیں بہتر تھا۔ مگر مسٹر کیسی نے سائمن کمیشن کے عہد کی ہندوستانی سیاست کو ۱۹۳۵ء کے زمانے کی سیاست سے متمیز کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ اس حقیقت کو سامنے رکھا کہ اس درمیانی عرصے میں ہندوستانیوں کے احساسات میں کتنا تغیر و تبدیل ہوا اور ان کے نقطہ نظر میں کتنی تبدیلی ہوئی۔ ان کے سوچنے کا انداز کس حد تک بدل گیا۔ انہوں نے اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیا کہ ۱۹۲۷ء میں جو چیز بہت بڑی سمجھی جاتی تھی ۱۹۳۴ء۔ ۱۹۳۵ء میں وہ بہت معمولی نظر آتی تھی۔ اب ہندوستان کے لوگ چند اصلاحات پر اکتفا نہیں کر سکتے تھے اب تو حکومت خود اختیاری اور کامل آزادی کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ ان حالات میں یہ آئین کس درجہ مایوس کن تھا اس کا اندازہ مسٹر کیسی نہیں کر سکے۔ اس کا اندازہ اگر کسی کو ہوا تو وہ ہندوستانی سیاست دان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قائد اعظم نے انگلستان سے ہندوستان واپس پہنچ کر ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے انڈیا ایکٹ کو ایک ایسا دستور قرار دیا جو ہندوستان کے سر تھوپ دیا گیا ہے۔

بمبئی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے بھی انہوں نے اس آئین کے خلاف ایک قرارداد منظور کرائی جس میں فیڈریشن والے حصے کی مذمت کی گئی تھی اور حکومت برطانیہ سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ اس سکیم پر دوبارہ غور کرے کیونکہ مسلم لیگ کے خیال میں یہ اسکیم ہندوستان میں قیام امن کا مسئلہ حل کرنے میں ناکام ثابت ہوگی نہ اس سے عوام کو اطمینان حاصل ہوگا۔ البتہ اس آئین کا وہ حصہ جو صوبائی حکومت سے متعلق تھا ان حالات میں برامر مجبوری منظور کر لیا گیا تھا۔

کانگرس اور انڈیا ایکٹ

کانگرس کمیونل ایوارڈ کو منظور یا نامنظور کرنے کے معاملے میں سخت مذبذب رہنے کی وجہ سے اپنی پوزیشن کو حد درجہ مضحکہ خیز بنا چکی تھی۔ ہندوؤں کی اکثریت اسے رد کر چکی تھی اور کانگرس کے سب سے بڑے لیڈر مسٹر گاندھی کانگرس سے بد دل تھے۔ وہ جیل سے رہا ہو چکے تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنے اوپر یہ سمجھنے کی عجیب و غریب پابندی لگائی تھی کہ وہ جیل میں ہیں جب انڈیا ایکٹ کا نفاذ عمل میں آیا تو انہوں نے اس کے تحت انتخابات میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ اس وقت گاندھی جی کی عمر ۶۵ سال کی تھی ویسے بھی وہ ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے اور کانگرس پر اب نوجوانوں کا اثر زیادہ ہو گیا تھا۔ جواہر لال نہرو ان نوجوانوں میں پیش پیش تھے جو چاہتے تھے کہ انتخابات میں ضرور حصہ لیا جائے۔ ڈاکٹر انصاری مسٹر آصف علی اور پنڈت نہرو کے صلاح و مشورے سے ایک تحریک شروع کی گئی جس کا مقصد ہندوستان کے لوگوں کو خصوصاً کانگرس کو انڈیا ایکٹ کے تحت انتخابات میں حصہ لینے پر آمادہ کرنا تھا۔ گاندھی جی اس تحریک کا مقابلہ نہ کر سکے اور انہوں نے سپر ڈال دی۔ ہمارے خیال میں اس موقعہ پر گاندھی جی سے کہیں زیادہ بصیرت کا ثبوت

جواہر لال اور کانگریسی لیڈروں ڈاکٹر انصاری اور آصف علی مرحوم نے ویلڈ ورنہ اگر گاندھی جی کے مشورے پر عمل کیا جاتا تو کانگرس کی سیاسی موت ہی واقع ہوجاتی۔ بہر حال ۲۹ مارچ ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں کانگرس کا اجلاس منعقد ہوا اور پنڈت نہرو کو کانگرس کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ پنڈت نہرو کی تحریک پر کانگرس نے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا مگر ساتھ ہی وزارتیں تشکیل دینے کا معاملہ کانگرس کی مجلس عاملہ کے سپرد کر دیا کہ وہ اس کے متعلق جو فیصلہ کرے گی اس پر عمل کیا جائے گا۔

مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ

اپریل ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا وہ تاریخی اجلاس منعقد ہوا جس میں مسلم لیگ کی تاریخ میں پہلی بار عوامی رابطے کی مہم شروع کرنے کا تاریخی فیصلہ کیا گیا۔ اس سے قبل مسلم لیگ خواص کی جماعت تھی عوام کی نہیں اس میں داخلے کے دروازے بھی ہر ایک کے لئے نہیں کھولے گئے تھے مگر اب وقت آگیا تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کو منظم کرنے اور انہیں مسلم لیگ کے پرچم تلے متحد کرنے کے لئے اس جماعت کو عوامی جماعت بنایا جاتا چنانچہ اپریل ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس بمبئی میں سر وزیر حسن کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ اجلاس میں قائد اعظم کو ۵۴ افراد پر مشتمل ایک بورڈ تشکیل دینے کا اختیار دیا گیا، یہ ادارہ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کہلایا۔ آئندہ انتخابات میں حصہ لینے اور مسلم لیگ کا انتخابی منشور مرتب کرنے کا کام بھی اسی بورڈ کے سپرد کیا گیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ میں مسلم لیگ کے علاوہ جمعیۃ العلماء، مسلم یونٹی بورڈ، نیشلسٹ مسلمان اور احرار غرض مسلمانوں کی تمام قابل ذکر جماعتوں کے نمائندے موجود تھے اور علماء میں سے مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید جیسے حضرات کو اس بورڈ میں شامل کیا گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک ان اصحاب کو دو قومی نظریے اور مسلم لیگ کی پالیسی سے پورا اتفاق تھا۔ اس اجلاس میں نوابزادہ لیاقت علی خاں کو آل انڈیا مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ اس عہدے پر وہ قیام پاکستان تک فائز رہے۔

مسلم لیگ کا منشور

مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ نے طویل غور و خوض اور بحث و مباحثہ کے بعد اپنا وہ تاریخی منشور مرتب کیا جو اس جماعت کے بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مسلم لیگ کا پہلا انتخابی منشور تھا جس میں مسلم لیگ نے اپنا آئندہ لائحہ عمل قوم کے سامنے پیش کیا تھا اور جس میں پہلی بار مسلمان عوام بلکہ ہندوستان کے جملہ عوام کے مسائل کی طرف توجہ دی گئی تھی۔ منشور میں کہا گیا تھا کہ :۔

مسلم لیگ اسمبلی پارٹیاں اسمبلیوں میں اس امر کی کوشش کریں گی کہ تمام ظالمانہ قوانین کا خاتمہ ہو جائے۔ اقتصادی لوٹ کھسوٹ بند ہو جائے انتظامی امور پر جو اخراجات ہو رہے ہیں ان میں کمی کی جائے دیہات میں رہنے والے افراد کی بہبود کے لئے بجٹ میں زیادہ سے زیادہ رقم مختص کی جائے ایسی صنعتیں قائم کی جائیں

جن سے عوام کو فائدہ پہنچے۔ مسلمانوں کے مذہبی حقوق کے تحفظ کے لئے مؤثر تدابیر اختیار کی جائیں ان کی زبان اُردو اور رسم الخط کی حفاظت کا مناسب انتظام کیا جائے ابتدائی تعلیم مفت دی جائے فوج کو قومی فوج بنایا جائے اور اس کے غیر ضروری خرچ کا بار کم کیا جائے۔ سکہ زر مبادلہ اور قیمتوں کو ایسے دائرے میں لایا جائے جس سے ملک کے اقتصادی مفاد کا تحفظ ہو سکے۔ محصولات کے بوجھ میں کمی کی جائے مسلم قوم کی حیثیت اور عام حالت کی بہتری کے لئے مناسب اقدامات کئے جائیں۔

مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کا پہلا اجلاس

بمبئی کے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں جس پارلیمنٹری بورڈ کے قیام کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس کے پہلے اور تاریخی اجلاس کے لئے لاہور کو منتخب کیا گیا یہ اجلاس ۸ جون ۱۹۳۶ء سے ۱۰ جون ۱۹۳۶ء تک، یعنی تین روز جاری۔ اس اجلاس میں شرکت کرنے والوں میں مولانا حسین احمد مدنی۔ مولانا شوکت علی مولانا کفایت اللہ مولانا احمد سعید چوہدری خلیق الزماں۔ راجہ صاحب محمود آباد نواب زادہ لیاقت علی خاں نواب اسماعیل خاں، راجہ سلیم پور عبد المتین چوہدری۔ ملک برکت علی احمد یار خاں دولتانہ، راجہ غضنفر علی خاں اور قائد اعظم کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں یہی وہ اجلاس ہے جس میں علماء اور مسلم سیاست دانوں میں اس وقت اختلاف رونما ہوا جب یہ شق زیر بحث آئی کہ مذہبی معاملات سے متعلق امور اس وقت تک منظور نہ کئے جائیں جب تک علماء اُن کی تائید نہ کریں۔ شرکائے اجلاس کی اکثریت کا موقف یہ تھا کہ علماء صرف یہی حضرات نہیں ہیں جو اس اجلاس میں شامل ہیں ان اصحاب کے علاوہ جید اور صاحب فکر و نظر علماء ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ مذہبی معاملات میں ان کو نظر انداز کر کے صرف اس اجلاس میں شریک علماء کو یہ اختیار دیدیا جائے۔ آخر کار اس نکتہ پر اتفاق ہو گیا کہ جب کبھی مذہبی معاملہ زیر بحث آیا تو ان حضرات کی رائے کو اہمیت ضرور دی جائے گی[1]

اس اجلاس میں قائد اعظم نے مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ سے جو فیصلے کرائے بلاشبہ وہ بڑی انقلابی نوعیت کے تھے اور مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کی طرف ایک اہم قدم کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن قابل افسوس بات یہ ہے کہ اس بار لاہور میں قائد اعظم کا گرم جوشی سے استقبال نہیں ہوا۔ انہیں سابق پنجاب سے اتنے حامی بھی میسر نہ آسکے جو الیکشن میں اُن کی امداد کرتے۔ سر فضل حسین سر سکندر حیات اور ملک خضر حیات خاں یونینسٹ پارٹی کو برسر اقتدار لانے میں کوشاں تھے۔ اس لئے ان اصحاب نے قائد اعظم کے ساتھ نہایت سرد مہری کا برتاؤ کیا۔ البتہ علامہ اقبال ملک برکت علی راجہ غضنفر علی خاں اور احمد یار خاں دولتانہ

---

[1] پاتھ وے ٹو پاکستان صفحہ ۱۴۵ مصنفہ چوہدری خلیق الزماں

نے ان سے مخلصانہ تعاون کیا لیکن ظاہر ہے کہ دو چار آدمیوں کے تعاون سے الیکشن نہیں جیتا جا سکتا۔

مسلم اکثریت کے دوسرے صوبے

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جب مسلم لیگ انتخابات میں حصہ لینے کے لئے میدان عمل میں آئی تو اسے سب سے زیادہ مشکلات کا سامنا اُن صوبوں میں کرنا پڑا جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی جیسا کہ قبل ازیں عرض کیا جا چکا ہے کہ پنجاب میں سر فضل حسین ہندوؤں اور سکھوں کے تعاون سے یونی نسٹ پارٹی کو مستحکم کرنے میں کوشاں تھے۔ انہیں مسلم لیگ کی کامیابی سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ در پردہ اس کی مخالفت میں مصروف تھے کہ اس کے بغیر یونی نسٹ پارٹی کامیاب ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ سابق صوبہ سرحد میں سر عبد القیوم ڈاکٹر خاں صاحب اور خان عبد الغفار خاں کانگرس کا دم بھر رہے تھے سندھ میں بھی مسلم لیگ کا اثر برائے نام تھا اور یہاں عبد اللہ ہارون کی سندھ یونائیٹڈ پارٹی، سندھ مسلم پارٹی اور سندھ آزاد مسلم پارٹی کے نام سے جماعتیں بن چکی تھیں اور انہی جماعتوں کا زور اور اثر تھا پنجاب، سرحد اور سندھ کی طرح بنگال بھی مسلم اکثریت کا صوبہ تھا اور وہاں مولوی اے کے فضل الحق، حسین شہید سہروردی اور خواجہ ناظم الدین جیسے ممتاز مسلمان رہنما موجود تھے۔ مگر بدقسمتی سے مولوی فضل الحق نے کرشک پرجا پارٹی کے نام سے اپنی الگ جماعت بنائی تھی جس میں یونی نسٹ پارٹی کی طرح مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل تھے اور بلاشبہ یہ نہایت مستحکم اور با اثر جماعت تھی البتہ خواجہ ناظم الدین اور حسن شہید سہروردی نے مسلم لیگ کی حمایت کی۔

انتخابات اور نتائج

مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے اجلاس لاہور کے بعد صوبائی پارلیمنٹری بورڈ قائم ہوئے اور قائد اعظم کی زیر قیادت مسلم لیگ نے مسلم اکثریت کے صوبوں کے علاوہ مسلم اقلیت کے صوبوں میں بھی انتخابات لڑنے کا فیصلہ کر لیا اس مقصد کے لئے قائد اعظم نے ملک گیر دورے کئے وہ مختلف صوبوں کے مرکزی مقامات پر گئے اور تمام با اثر مسلمان رہنماؤں سے ملے۔ انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ اس انتخاب میں کم از کم مسلم اکثریت کے صوبوں میں تو مسلم لیگی وزارتیں قائم ہو جائیں مگر افسوس کہ انہیں اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی اور مسلم اکثریت کے کسی ایک صوبے میں بھی مسلم لیگ اتنی نشستیں حاصل نہ کر سکی جن کی بنا پر وہ اپنی خالص وزارت بنا سکتی۔ اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ ماضی میں مسلم لیگ نے مسلمان عوام سے وہ رابطہ نہیں رکھا تھا جو انتخابات کے موقع پر اس کے لئے مفید ثابت ہوتا اس میں شک نہیں کہ بعض بڑے شہروں میں اس کی شاخیں ضرور قائم تھیں اور تعلیم یافتہ لوگ اس کے نام اور اس کی خدمات سے واقف تھے مگر ملک کے دور دراز مقامات جیسے صوبہ سرحد۔ بلوچستان۔ سندھ، سی پی آسام بنگال اور پنجاب کے دیہات اور قصبات میں لوگ

مسلم لیگ سے شناسا نہ تھے۔ دوسرے کانگرس نے جو مسلم لیگ کے مقابلے میں اس وقت ۔۔۔ کہیں زیادہ فعال اور بااثر جماعت تھی ملک کے دور دراز علاقوں تک اپنے اغراض و مقاصد کا پروپیگنڈہ کیا تھا اور ایسے لوگوں کو اپنی تنظیم میں شامل کر لیا تھا جن کا عوام میں اثر و نفوذ تھا انتخابات سے قبل مسلم لیگ کو اتنا وقت نہ مل سکا اور نہ اس کے پاس ایسے ذرائع تھے کہ وہ کانگرس کے اثرات زائل کر سکتی اور مسلمان عوام کو اپنے پروگرام سے متفق کر سکتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں مسلم اکثریت کے صوبوں میں سے وہ کسی صوبہ میں کامیاب نہ ہو سکی البتہ اس نے مسلم اقلیت کے صوبوں میں مقابلتاً زیادہ کامیابی حاصل کی اس کا ایک سبب مسلم اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کا یہ احساس بھی تھا کہ وہ اقلیت میں ہیں اس احساس نے ان میں سیاسی بیداری مقابلتاً زیادہ پیدا کر دی تھی۔ اس کی دوسری وجہ غیر مسلموں کے وہ مظالم تھے جن کا مسلم اکثریت آئے دن شکار رہتی تھی اس صورت حال نے بھی ان میں حریت کا جذبہ اور قومیت کا احساس زیادہ پیدا کر دیا تھا۔ اس کی تیسری وجہ یہ تھی کہ مسلم لیگ میں جو مسلمان رہنما شامل تھے اُن کی اکثریت ان ہی صوبوں سے تعلق رکھتی تھی جہاں مسلمان اقلیت میں تھے جیسے یو۔پی، آسام، بمبئی، مدراس، بہار اور سی پی وغیرہ یہ بااثر لوگ تھے اور انہوں نے اپنے ذاتی روپیہ سے مسلم لیگ کا پروپیگنڈہ کیا اور اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ انتخابات میں ان صوبوں میں خاصی نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ یہ انتخابات ۱۹۳۶ء کے آخر اور ۱۹۳۷ء کے شروع میں ہوئے ان میں مختلف صوبوں میں مسلم لیگ، کانگرس اور دیگر مسلم جماعتوں نے جو نشستیں حاصل کیں ذیل کے نقشے سے ان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

نام صوبہ	کل نشستیں	کانگرس کی حاصل کردہ نشستیں	کل مسلم نشستیں	مسلم لیگ کی حاصل کردہ نشستیں	دیگر مسلمانوں کی حاصل کردہ
صوبہ سرحد	۵۰	۱۹	۳۶	-	۳۶
پنجاب	۱۷۵	۱۸	۸۴	۱	۸۳
سندھ	۶۰	۷	۳۵	-	۳۵
یو۔پی	۲۲۸	۱۳۴	۶۴	۲۷	۳۷
بہار	۱۵۲	۹۸	۳۹	-	۳۹
اڑیسہ	۶۰	۳۶	۴	-	۴
بنگال	۲۵۰	۵۴	۱۱۷	۴۰	۷۷
آسام	۱۰۸	۳۳	۳۴	۹	۲۵
سی پی	۱۱۲	۷۰	۱۴	-	۱۴

بمبئی	۱۷۵	۸۶	۲۹	۲۰	۹
مدراس	۲۱۵	۱۵۹	۲۸	۱۱	۱۷
میزان	۱۵۸۵	۷۱۴	۴۸۴	۱۰۸	۳۴۶

اس جدول کے مطابق ان انتخابات کے نتیجے میں کانگرس نے یوپی، سی پی، بہار، اڑیسہ اور مدراس میں قطعی اکثریت حاصل کر لی مسلم اکثریت کے صوبوں میں سے کسی صوبہ میں بھی مسلم لیگ اتنی نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی جن کی بنا پر وہ اپنی وزارت کی تشکیل کر سکتی۔ ان صوبوں میں سے سندھ اور سرحد کے آزاد اُمیدوار کانگرس میں شامل ہو گئے۔ اس طرح ان دونوں صوبوں میں بھی کانگرس کو قطعی اکثریت حاصل ہو گئی پنجاب میں یونی نسٹ پارٹی کو کامیابی حاصل ہوئی اور یہ جماعت بھی کانگرس ہی کا ضمیمہ تھی۔ بمبئی میں بھی یہی صورت رُونما ہوئی یعنی آزاد اُمیدواروں نے کانگرس میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس طرح ہندوستان کے ۱۱ صوبوں میں سے ۷ میں تو کانگرس کو قطعی اکثریت حاصل ہو گئی باقی ۴ صوبوں میں بھی اس کا اتنا اثر تھا کہ کوئی جماعت کانگرس کو نظر انداز کر کے وزارت بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔

کانگرس کی عہد شکنی ،

ہندوستان کی تاریخ کا یہ پہلا انتخاب تھا جس میں مسلم لیگ نے صوبائی سطح پر حصہ لیا اور ۴۸۴ مسلم نشستوں میں سے ۱۰۸ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی جن میں مدراس، بمبئی، یوپی اور آسام جیسے مسلم اقلیت کے صوبوں کی نشستیں بھی شامل تھیں بظاہر کامیابی کا یہ تناسب کچھ زیادہ حوصلہ افزا اور تسلی بخش نظر نہیں آتا۔ مگر جب اس نکتہ پر غور کیا جائے کہ مسلم لیگ کا پہلا امتحان تھا اور اسے انتخابات کے لئے تیاری اور پروپیگنڈہ کرنے کے لئے وقت بھی نہایت کم ملا تو اس کی یہ کامیابی نہایت حوصلہ افزا محسوس ہوتی ہے خصوصاً یہ دیکھ کر کہ مسلم اقلیت کے صوبوں یعنی مدراس بمبئی اور یوپی میں اس نے ۷۰ نشستیں حاصل کر لیں۔ مسلم لیگ تو اپنے امتحان میں کامیاب ہو گئی۔ اب کانگرس کے امتحان کا وقت تھا۔

ان انتخابات کی ایک قابلِ ذکر خصوصیت یہ بھی کہ مسلم لیگ نے بعض علاقوں خصوصاً یوپی میں کانگرس کے ساتھ مخلصانہ تعاون کیا اور ایک ہی پلیٹ فارم سے دونوں نے انتخاب لڑا مسلم لیگی رضاکار کانگرس کے پنڈال میں انتظام پر مامور تھے اور پولنگ اسٹیشنوں پر کانگریسی کارکنوں کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ کانگرسی مسلمانوں کی مسلم لیگ نے اپنے فنڈ سے بھی امداد کی۔ ان حالات میں انتخابات کے بعد یہ توقع تھی کہ کانگرس صوبائی وزارتوں کی تشکیل کے وقت مسلم لیگی رہنماؤں کو نظر انداز نہیں کرے گی کیونکہ اس نے مسلم لیگ کو اس امر کی یقین دہانی کرائی تھی مگر جب کانگرس کو ۱۱ صوبوں میں سے ۷ میں

قطعی اکثریت حاصل ہوگئی تو اس نے مسلم لیگ کو یکسر نظرانداز کر دیا اور مخلوط وزارت بنانے سے انکار کر دیا۔ اس نے ایک شرائط نامہ پیش کیا اور مسلم لیگی نمائندوں سے کہا کہ وہ اس پر دستخط کر دیں اس صورت میں انہیں وزارتوں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ شرائط نامہ درج ذیل ہے۔

مسلم لیگ کے قتل کی دستاویز،

(۱) یوپی کی مجلس قانون ساز میں مسلم لیگ پارٹی اپنی جداگانہ حیثیت ختم کرنے کا اعلان کر دے۔

(۲) یوپی کی مجلس قانون ساز کا مسلم لیگی گروپ کانگرس میں ضم ہو جائے۔ اسے وہی رعایتیں دی جائیں گی اور ان پابندیوں کو قبول کرنا ہوگا جو کانگرسی ارکان کے لئے ضروری ہیں۔ اس طرح انہیں پارٹی کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا حق دے دیا جائے گا۔ دیگر اراکین کی طرح وہ کانگرس کے نظم وضبط کی پابندی کریں گے۔ انہیں دیگر اراکین کی طرح کانگرس کے فیصلوں پر عمل کرنا ہوگا۔ جملہ معاملات کا فیصلہ کانگرس پارٹی کی کثرت آراء سے ہوگا۔ ہر رکن کا ایک ووٹ ہوگا۔

(۳) کانگرس کی مجلس عاملہ مجالسِ قانون ساز کے لئے جو طریقِ عمل وضع کرے گی کانگرس کے تمام اراکین کی طرح مسلم لیگ سے آنے والے اراکین بھی وفاداری سے اس کی پابندی کریں گے۔

(۴) یوپی میں مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ توڑ دیا جائے۔ کسی ضمنی انتخاب میں بھی مذکورہ بورڈ کوئی اُمیدوار نامزد نہ کرے اور کانگرس جس نشست کے لئے جو اُمیدوار بھی کھڑا کرے جملہ اراکین اس کی حمایت کریں نیز کانگرس کے جملہ اراکین کانگرس کے آئین کے پورے پابند ہوں گے اور کانگرس کے وقار میں اضافہ کرنے کی خاطر اس کے ساتھ پرخلوص تعاون کریں گے۔ اگر کسی وقت کانگرس وزارت یا مجلس قانون ساز کی رکنیت سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کرے تو مسلم لیگی ممبر بھی اس فیصلے کی پابندی کریں گے۔

(۵) اگر ان شرائط سے اتفاق کر لیا گیا اور مسلم لیگی ممبروں نے باقاعدہ ممبروں کی حیثیت سے کانگرس میں شمولیت اختیار کر لی تو اُمید ہے کہ مسلم پارٹی کا جداگانہ وجود ختم ہو جائے گا۔ اس صورت میں متذکرہ جماعت (مسلم لیگی گروپ) کو وزارت میں نمائندگی دی جائے گی۔ [۱]

اس آخری شق کا اضافہ مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا تھا۔

ظاہر ہے کہ ان شرائط کو قبول کر لینے کا مطلب مسلم لیگ کا اپنے قتل کے محضر نامے پر دستخط کرنے کے مترادف تھا۔ یہ اتنی اہانت آمیز شرائط تھیں کہ کوئی باحمیت انسان انہیں قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو

---

[۱] پاتھ وے ٹو پاکستان صفحہ ۱۶۱

سکتا تھا یہی وجہ ہے کہ بعض انگریز اور ہندو مصنف و مورخ اور سیاست داں بھی ان کی مذمت کئے بغیر نہ رہ سکے چنانچہ رچرڈ سائمنڈز نے کانگرس کے اس افسوسناک طرز عمل پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا کہ :

"جن صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت تھی خیال تھا کہ ان صوبوں میں وزارتیں بناتے وقت مسلم لیگ کو بھی شریک کیا جائے گا۔ یوپی کے معاملے میں اس کی قوی امید تھی کیونکہ یہاں مسلم لیگ اور کانگرس نے مشترکہ طور پر انتخاب لڑا تھا اور اس صوبے میں مسلم لیگ نے دوسری تمام جماعتوں کی مسلم نشستوں سے زیادہ نشستیں جیتی تھیں پھر انتخابات سے قبل کانگرس نے مسلم لیگ کو یقین دلایا تھا کہ اسے وزارت میں شامل کر لیا جائے گا لیکن انتخابات کے بعد جب بہ حیثیت مجموعی کانگرس کو تمام صوبوں میں اکثریت حاصل ہو گئی تو اس نے مسلم لیگ کو ایسی شرائط پیش کیں جو کسی آزاد سیاسی جماعت کے لئے ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتی تھیں[1]"

یہی مصنف لکھتا ہے کہ :

"یہ واقعہ پاکستان کو معرض وجود میں لانے کا سب سے بڑا سبب ثابت ہوا خلیق الزمان اور ان جیسے رہنماؤں کے لئے اب ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ کانگرس اور مسلم لیگ (ان دونوں جماعتوں کے یہ رکن تھے) میں سے کسی ایک کو اپنی سرگرمیوں کے لئے منتخب کریں۔ کانگریس رہنماؤں کی ان حرکات کی وجہ سے انہوں نے بجا طور پر یہ محسوس کیا کہ انہیں دھوکا دیا گیا ہے[2]"

مسٹر گاندھی کے مشہور تذکرہ نگار پیارے لال بھی کانگرس کی اس روش کو شاطرانہ غلطی قرار دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ :

"کانگرس ہائی کمان نے یہ فیصلہ کر کے ایک بہت بڑی شاطرانہ غلطی کی اور یہ فیصلہ گاندھی جی کے فیصلے کے سراسر خلاف تھا[3]"

مولانا آزاد کا تاسف

کانگرس کے مشہور مسلمان رہنما مولانا ابوالکلام آزاد بھی جو عرصے تک کانگرس کے صدر رہے اس واقعے کو افسوسناک قرار دینے پر مجبور ہو گئے چنانچہ مولانا اپنی مشہور کتاب میں رقمطراز ہیں :

"ان دنوں چوہدری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خاں یوپی میں مسلم لیگ کے رہنما تھے جب میں

---

[1] دی میکنگ آف پاکستان صفحہ ۵۳

[2] دی میکنگ آف پاکستان صفحہ ۵۳   [3] مہاتما گاندھی صفحہ ۸۰ مولفہ پیارے لال

تشکیلِ وزارت کے سلسلے میں لکھنؤ گیا۔ ان دونوں سے میری ملاقات ہوئی اور انہوں نے اس امر کی یقین دہانی کرائی کہ وہ کانگریس کے ساتھ اشتراکِ عمل کریں گے اور اس کے پروگراموں کی حمایت میں کام کریں گے۔ ان لوگوں کو امید تھی کہ نئی وزارت میں مسلم لیگ کو بھی اس کا حصہ ملے گا وہاں کے مقامی حالات کچھ اس نوعیت کے تھے کہ ان میں سے کسی ایک کو وزارت میں شریک نہیں کیا جاسکتا تھا بلکہ اگر لیا جاتا تو دونوں کو یا پھر کسی کو نہ لیا جاتا چنانچہ میں نے ان سے اس امید کا اظہار کیا کہ آپ دونوں کو وزارت میں شامل کر لیا جائے گا۔ اگر وزارت سات ارکان پر مشتمل ہوئی تو اس میں دو مسلم لیگی ہوں گے باقی کانگریسی اور اگر نو ارکان پر مشتمل وزارت بنی تو کانگریسی ارکان کی اکثریت اور زیادہ ہو جائے گی۔ اس گفت و شنید کے بعد ایک مسودہ تیار ہوا جس کا مضمون یہ تھا کہ مسلم لیگ گروپ کانگریس کے اشتراک سے کام کرے گی اور کانگریس کا پروگرام اسے قبول ہوگا۔ اس پر نواب اسماعیل خاں اور چوہدری خلیق الزماں نے دستخط کئے۔ اس کے بعد میں پٹنہ روانہ ہو گیا۔ جب میں واپس الہ آباد آیا تو مجھے یہ معلوم ہو کر نہایت افسوس ہوا کہ جواہر لال نے چوہدری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خاں کو ایک خط تحریر کیا جس میں انہوں نے لکھا کہ ان دونوں میں کسی ایک کو وزارت میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ ان دونوں نے اس واقعے پر افسوس کا اظہار کیا اور جواہر لال کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

یوپی میں یہ بہت افسوسناک واقعہ رونما ہوا اگر یوپی مسلم لیگ کی پیش کش منظور کر لی جاتی تو مسلم لیگ کا گروپ کانگریس میں مدغم ہو جاتا اور اس کی عملی حیثیت بھی کانگریس کے تابع ہو جاتی جواہر لال نے اپنے اس طرزِ عمل سے یوپی میں مسلم لیگ کو حیاتِ تازہ بخش دی۔ سیاسیات ہند کے ہر طالب علم کو یہ بات معلوم ہے کہ یوپی ہی وہ صوبہ تھا جہاں سے مسلم لیگ کی تنظیم کا آغاز ہوا مسٹر جناح نے ان حالات سے پورا فائدہ اٹھایا اور اس حملہ کی ابتداء کی جس نے آخر کار قیام پاکستان کی تحریک میں قائدانہ رول ادا کیا۔"[1]

مولانا ابوالکلام آزاد کے اس بیان سے اتنا ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ کانگریس نے مسلم لیگ کو وزارت میں شامل کرنے کی پیش کش کی تھی بلکہ وعدہ کیا تھا اور یہ معاملہ احاطۂ تحریر میں بھی آ گیا تھا مگر پنڈت جواہر لال نے کانگریس ہائی کمان کے وعدے کو پسِ پشت ڈال دیا جس کا مولانا آزاد کو سخت افسوس ہوا مولانا

---

[1] انڈیا ونس فریڈم ص ۱۴۸-۱۴۹ مؤلفہ مولانا ابوالکلام آزاد۔

کے اس بیان میں بعض باتیں محلِ نظر بھی ہیں۔ مثلاً انہوں نے مسلم لیگ اور کانگرس کے اختلاف کو وزارت میں مسلم لیگی ممبروں کی تعداد تک محدود کر دیا ہے۔ حالانکہ وجہِ اختلاف وزارت میں مسلم لیگی ارکان کی تعداد نہیں بلکہ وہ شرائط نامہ تھا جو کانگرس کی طرف سے مسلم لیگ کے سامنے رکھا گیا تھا اور جس میں مولانا آزاد نے ایک شق کا اضافہ اپنی طرف سے بھی کر دیا تھا چنانچہ چوہدری خلیق الزماں نے جو اس شرائط نامہ کے سلسلے میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں اپنی کتاب شاہراہِ پاکستان میں اس واقعہ کا ذکر جس رنگ میں کیا ہے اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ وجہِ اختلاف وزارت میں مسلم لیگی ارکان کی تعداد نہیں بلکہ یہ شرائط نامہ تھا۔

چوہدری خلیق الزماں اور مولانا آزاد کی گفتگو

چوہدری خلیق الزماں کے بیان کے مطابق مولانا ابوالکلام آزاد الہ آباد سے لکھنؤ واپس آئے اور اس بار مجھے اکیلے نہیں بلکہ پنڈت پنتھ کے ساتھ برلنگٹن ہوٹل میں ملے اور عجیب معذرتی انداز میں انہوں نے شرائطِ صلح ایک کاغذ پر لکھے ہوئے پیش کئے ...... متذکرہ بالا ٹائپ نوٹ کے ساتھ مولانا کا ایک مختصر نوٹ بھی چسپاں تھا جو حسب ذیل تھا۔

"اُمید کی جاتی ہے کہ اگر یہ تمام شرائط مسلم لیگ گروپ قبول کر کے کانگرس پارٹی کے ساتھ پورے ممبر کی طرح شریک ہو جائے اور کوئی علیحدہ وجود اپنا باقی نہ رکھے تو صوبہ کی وزارت میں اس گروپ کی شرکت پر ہمدردی سے غور کیا جائے گا۔"

یہ سب پوتھی پڑھ کر میں نے مولانا سے کہا کہ یہ سب کیا واہیات باتیں آپ لکھ کر لائے ہیں۔ آج آپ مجھ سے یوپی مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے لیڈر کی حیثیت سے باتیں کر رہے ہیں اور آپ مجھ سے یہ کہنے آئے ہیں کہ میں اس بورڈ کو پھانسی پر لٹکا دوں اور مسلم لیگ کو جہنم واصل کر دوں یہ نوٹ آپ اپنی جیب میں رکھیں، میں اس کو دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ اس کے بعد میں کھڑا ہو گیا"[1]

چوہدری خلیق الزماں کے اس بے لاگ بیان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مسلم لیگ اور کانگرس کا اختلاف کانگریسی وزارت میں چند نشستیں کم یا زیادہ حاصل کرنے کے سوال پر نہیں تھا بلکہ اختلاف کی وجہ کانگرس کی یہ ذہنیت تھی کہ مسلم لیگ اپنا جداگانہ وجود ختم کر کے خود کو کانگرس میں ضم کر دے۔ اپنے اس ارادے کو بروئے کار لانے میں کانگرس نے اس معاہدہ کو بھی فراموش کر دیا جو انتخابات سے قبل لیگ اور اس کے درمیان ہوا تھا اور جس کے تحت دونوں جماعتوں نے مشترکہ انتخاب لڑا تھا۔

---

[1] شاہراہِ پاکستان ص ۶۳۷، ص ۶۳۸، ص ۶۳۹

مسلم لیگ کی تنظیمِ نو

۱۹۳۷ء مسلمانانِ پاک وہند کی تاریخ کا اہم ترین سال ہے۔ اسی سال ہندوستان میں پہلی بار کانگرس کو صوبائی وزارتیں بنانے اور بالفاظ دیگر ہندوؤں کو کم وبیش نو سو سال کے بعد مسندِ حکومت پر بیٹھنے کا موقع ملا اور کانگرس کا حکومت میں شریک ہونا ہی برصغیر میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا پیش خیمہ ثابت ہوا تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب کانگرس کو انتخابات میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوگئی اور اس نے محسوس کر لیا کہ وہ ہندوستان کے ہر صوبے میں کسی دوسری جماعت کی امداد کے بغیر اپنی وزارت قائم کر سکتی ہے تو اس احساس نے کانگرس کے مزاج میں رعونت پیدا کر دی اور اس نے اُس وقت تک وزارتیں بنانے سے انکار کر دیا جب تک گورنر جنرل اور گورنر یہ وعدہ نہ کریں کہ وہ ان اختیارات کو استعمال نہیں کریں گے جو اقلیتوں کے تحفظ کے بارے میں دستور کی رو سے اُنہیں حاصل ہیں۔ کچھ رد وکد کے بعد کانگرس کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا گیا۔ بالفاظ دیگر حکومت اس کے سامنے جھک گئی اور ہندوستان کے ۸ کروڑ مسلمانوں کو ہندو کانگرس کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا۔ ہر منصف مزاج اور بالغ نظر انسان کو بجا طور پر سوچنا پڑتا ہے کہ آخر کار کانگرس کو یہ شرط عائد کرنے کی کیا ضرورت تھی اور وہ گورنر اور گورنر جنرل کو اقلیتوں کے تحفظ کے فرض سے کیوں سبکدوش کرنا چاہتی تھی؟ اس کا جواب واضح ہے کہ ہندو کانگرس کی نیت اوّل دن سے خراب تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر گورنر اور گورنر جنرل اقلیتوں کے مفادات کا تحفظ کرتے رہے تو کانگرس کی صوبائی وزارتیں مسلمانوں کی جان ومال عزت وآبرو، تہذیب وتمدن اور زبان ومذہب کو غارت کرنے کے پروگرام پر آزادی سے عمل پیرا نہیں ہو سکیں گی اور چونکہ اُن کے پروگرام کا یہ اہم جزو تھا اس لئے کانگرس نے گورنر اور گورنر جنرل کو مجبور کیا کہ وہ اقلیتوں کے تحفظ کے فرض سے سُبکدوش ہو جائیں تاکہ مسلمان اقلیت کے ساتھ ظالمانہ سلوک روا رکھا جا سکے اور کوئی انہیں روکنے ٹوکنے والا نہ ہو۔

چنانچہ وائسرائے کی اس یقین دہانی کے بعد کہ صوبائی وزارتیں آزادی سے اپنا کام کریں گی اور اقلیتوں کے تحفظ کے سلسلے میں گورنر یا گورنر جنرل اپنے خصوصی اختیارات استعمال نہیں کریں گے کانگرس نے صوبوں میں وزارتیں قائم کر لیں۔ ان وزارتوں میں برائے نام مسلمان وزراء بھی شامل کئے گئے۔ مگر وہی جو کانگریسی خیال کے

تھے یا جو مسلم لیگ سے مستعفی ہو کر صرف وزارت کے لالچ میں کانگرس میں شامل ہو گئے تھے۔ اس کے بعد سارے ملک میں مسلم کشی، مسلم آزاری اور اسلام دشمنی کا ایک طوفان بپا ہو گیا اور کانگرس کے ترنگے کے سایہ میں مسلمانوں پر وہ مظالم کئے گئے کہ انصاف اور انسانیت دونوں نے اپنا سر پیٹ لیا ان حالات نے مسلم لیگی رہنماؤں خصوصاً قائد اعظم کو نہایت درجہ متاثر کیا۔

جواہر لال کی لاف زنی

حالات کو خراب کرنے میں کانگرس کے صدر پنڈت جواہر لال کی کوتاہ بینی اور جذباتیت کو بڑا دخل تھا۔ صوبائی انتخابات میں کانگرس کی غیر معمولی کامیابی نے جس شخص کو سب سے زیادہ جذبات سے مغلوب کر دیا وہ یہی پنڈت جواہر لال تھے انہوں نے نتائج سے بے پروا ہو کر مدراس میں تقریر کرتے ہوئے یہ غیر دانشمندانہ اور خلاف واقعہ نعرہ لگایا کہ "ہندوستان میں صرف دو پارٹیاں ہیں ایک کانگرس اور دوسری حکومت برطانیہ" یہ مسلمانوں کے وجود سے انکار تھا اور مسلم لیگ کے وجود سے انکار۔ اس پر قائد اعظم نے کہا کہ "نہیں ایک تیسری پارٹی بھی ہے اور وہ ہیں مسلمان اور مسلم لیگ"

"یو پی میں پانچ ضمنی انتخاب ہونے والے تھے۔ قائد اعظم نے اعلان کر دیا کہ اگر کانگرس کو یہ دعویٰ ہے کہ مسلمان اس کے ساتھ ہیں، تو وہ مسلم لیگ کے مقابلے میں یہ انتخاب لڑے اور جیت کر دکھائے یہ انتخابات ہوئے۔ ایک طرف کانگرس تھی دوسری طرف مسلم لیگ۔ پانچوں نشستوں پر مسلم لیگ کے اُمیدوار کامیاب ہوئے۔ سہارنپور، بلند شہر اور مراد آباد وہ مقامات تھے جن میں جمعیت العلمائے ہند کا بڑا اثر تھا۔ جمعیت العلماء نے اپنی تمام قوت صرف کر دی اور کچھ نہ کر سکی۔ اس سے ابوالکلام صاحب آزاد کے اس باطل دعوے کی حقیقت کھل گئی کہ یو پی میں مسلم لیگ کو جمعیۃ العلماء کی تائید سے کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں۔"[1]

مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ

اب وقت آگیا تھا کہ مسلمانوں کو کانگرس کے اثر سے بالکل آزاد کر کے خالص قومی و اسلامی بنیادوں پر ان کی از سر نو تنظیم کی جاتی۔ چنانچہ قائد اعظم نے چوہدری خلیق الزماں، نواب اسماعیل خاں، خواجہ ناظم الدین اور دوسرے بہت سے مسلم لیگی رہنماؤں کے مشورے اور تعاون سے لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس تاریخی اجلاس کے انعقاد میں جس شخص نے سب سے زیادہ

---

[1] پاکستان ناگزیر تھا صفحہ ۱۸۹ / ۱۹۰ مؤلفہ سید حسن ریاض،

مستعدی اور سرگرمی سے حصہ لیا وہ چوہدری خلیق الزماں تھے۔ ان کے بعد راجہ صاحب محمود آباد۔ اس جلسے کے متعلق جو یادداشت چوہدری خلیق الزماں نے اپنی کتاب میں قلم بند کی ہے۔ ہمارے خیال میں وہ سب سے زیادہ مستند ہے۔ اس لئے ذیل میں اس کے بعض اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔

۱۹۳۷ء کا اجلاس مسلم لیگ

"مسلم لیگ کی قوت میں دن دونا رات چوگنا اضافہ ہو رہا تھا اور صوبہ کے عوام اب بے طرح جاگ پڑے تھے، تقریباً تمام شہروں قصبوں اور ضلعوں میں مسلم لیگ کی شاخیں ابھر چکی تھیں، جن کے بنانے میں ملکی نظام کا دخل کم اور لوکل جذبات کا عمل دخل زیادہ تھا، بہرحال یہ صورت دیکھ کر میں نے طے کیا کہ اب ایک مسلم کانفرنس مسلم لیگ کی قیادت میں لکھنؤ میں منعقد کی جائے جس کے لئے راجہ محمود آباد نے تمام ذمہ داری اخراجات کی اپنے سر لی اور ہم نے اس جلسے کی صدارت کے لئے مسٹر جناح کو دعوت دے دی۔ میں جانتا تھا کہ میرے اس انتخاب پر سب سے زیادہ اعتراضات جمعیۃ العلماء کی طرف سے ہوں گے کہ مسلم لیگ جس کو مسلم عوامی جماعت کہا جاتا ہے اس کے صدر نماز روزہ سے بے بہرہ عربی اور اردو زبان سے بھی واقف نہیں ہیں، مگر مجھ کو یقین تھا کہ اب جمعیۃ العلماء اپنا اثر و وقار کھو چکی ہے اور ان کے اعتراضات کا کوئی اثر مسٹر جناح کی صدارت پر نہیں پڑے گا ......

(مگر) میں ہوشیار ہو گیا، کہ غالباً اب احراری اور جمعیۃ العلماء والے جناح صاحب کی آمد پر جلوس اور مسلم لیگ کے جلسے میں گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کریں گے چنانچہ میں خود شہر کے کونے کونے میں بارہ ایک بجے رات تک پھر کر مسلمانوں کو جلوس میں شرکت کے لئے دعوت دینے لگا، جس میں یہ واقعہ ہے کہ میری میونسپلٹی کی چیئرمینی کے اثرات نے مجھے بڑی مدد دی، ورنہ شاید جمعیۃ العلماء، کانگرس اور احراریوں کی متحدہ کوششوں نے مسٹر جناح کے جلوس اور لیگ کے جلسہ کو ناکامیاب بنا دیا ہوتا میں نے مسلم لیگ والنٹیرز بھی بنانے شروع کر دیئے، پہلے تو لوگ کچھ ہچکچائے، لیکن جب ایک دن میرے چھوٹے بھائی مشفق الزماں عبدالعزیز وکیل ایوب قریشی اور ملک قریشی نے یونیفارم پہن کر امین آباد کے چوراہے کے کئی چکر لگائے تو دوسرے دن اتنے نوجوان والنٹیرز آئے جن کی کوئی حد نہ تھی اور سب نے اپنے اپنے خرچہ سے یونیفارم بنوائی، جلسے کا پنڈال میں لال باغ میں بنوایا جو ایک زمانہ میں میری فٹ بال فیلڈ تھی اور اس کی حفاظت کے لئے مسلم لیگ کے والنٹیرز اور راجہ محمود آباد کے سپاہی تعینات تھے مسٹر جناح ۱۳ اکتوبر کو بمبئی سے شام کی گاڑی سے پہنچے جہاں ان کے استقبال کے لئے ہزارہا مسلمان کھڑے ہوئے تھے جس شان سے ان کا استقبال کیا گیا اسی شان سے ان کا جلوس بھی نکالا گیا۔ امین آباد پہنچ کر پارک کے پیچھے سے کچھ

لوگوں نے آوازے کسے جن پر مسلم لیگ کے والنٹیر جھپٹ پڑے اور وہ فرار ہو گئے۔ مسٹر جناح راجہ محمود آباد کے قیصر باغ کے مکان میں ٹھہرے۔ سر سکندر حیات خاں اور مسٹر فضل الحق بھی دوسرے دن پہنچ گئے اور ان کے علاوہ تمام صوبوں کے زعماء اس تعداد میں لکھنؤ آ گئے کہ ہمارے لئے ان سب کا انتظام کرنا بھی دشوار ہو گیا۔ اتنا بڑا اجتماع اس سے پہلے مسلمانوں کا کبھی نہیں ہوا تھا۔[1]

تاریخی خطبہ صدارت

۱۵ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا وہ تاریخی اجلاس قائد اعظم کی صدارت میں منعقد ہوا جس نے برِ صغیر کے مسلمانوں کی جدوجہد کا رخ ہی موڑ دیا۔ اس اجلاس میں قائد اعظم نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا بلاشبہ وہ تاریخ ساز ثابت ہوا۔ اس خطبۂ صدارت نے مسلم لیگ کی آئندہ پالیسیوں اور عزائم کی نشاندہی کر دی۔ اس میں مسلمانوں کو جھنجھوڑا گیا۔ حکومت برطانیہ کو متنبہ کیا گیا۔ کانگرسی وزارتوں کی اسلام دشمنی کی تصویر دکھائی گئی اور مسلم لیگ کو پہلی بار عوامی جماعت بنانے اور ہر مسلمان کو اس کا رکن بننے کی دعوت دی گئی۔ اس خطبہ میں قائد اعظم نے فلسطین کی تقسیم کے مسئلے پر حکومت برطانیہ کی پُرزور مذمت کی اور اس مسئلے کو مسلمانانِ ہند اور مسلم لیگ کا مطالبہ قرار دیا۔ ذیل میں اس تاریخ ساز خطبۂ صدارت کے بعض اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

"ہندوستان کے مسلمانوں کو کانگرس سے علیحدہ کرنے کی ساری ذمہ داری کانگرس کے موجودہ لیڈروں پر ہے اور خصوصاً گذشتہ دس سال سے ان کا طرزِ عمل کچھ ایسا ہو رہا ہے کہ مسلمان خود بخود اس سے بیزار ہو کر کنارہ کش ہو رہے ہیں۔ اپنے چھ اکثریت والے صوبوں میں جب سے انہوں نے وزارت قائم کی ہے تب سے اپنے پروگرام اور اعمال و الفاظ نے مسلمانوں پر واضح کر دیا ہے کہ انہیں حق و انصاف کے خیال کو بالائے طاق رکھ دینا چاہئے۔ ہندی کو ہندوستان کی قومی زبان اور بندے ماترم کو قومی ترانہ قرار دیا جا رہا ہے اور جبراً ہر شخص کو اس پر عمل کرنے کے لئے مجبور کیا جا رہا اور سختیاں کی جا رہی ہیں۔ کانگرس کے جھنڈے کی اطاعت و عزت ہر شخص کے لئے لازمی قرار دی جا رہی ہے، اپنے قلیل اختیارات و ذمہ داری کے نشے میں اکثریت نے واضح طور سے یہ جتا دیا ہے کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کے لئے ہے — آئین کی رو سے اقلیت کے حقوق کے تحفظ کے لئے گورنر و گورنر جنرل کو جو اختیارات و خاص ذمہ داری دی گئی تھی اس کے استعمال کرنے سے وہ سب گریز کر رہے ہیں — زمانے کا یہ بہت نازک و قابلِ غور مسئلہ ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنی تنظیم

---

[1] شاہراہِ پاکستان صفحہ ۶۵۱ تا ۶۵۴

زور شور کے ساتھ شروع کر دیں ۔ تاکہ وہ مکمل اختیارات پر حاوی رہ سکیں ۔ جو خود اپنی مدد نہیں کرتا خدا بھی اُس کی مدد نہیں کرتا ۔ مسلمان جب تک متفق و منظم نہ ہو جائیں گے اس وقت تک طاقت و اختیار کا حاصل کرنا ناممکن ہے اور اس کے بغیر کامیابی بھی ناممکن ہے ۔ آل انڈیا مسلم لیگ ہندوستانی سیاست کی دُنیا میں دخل اندازی کے لئے میدان عمل میں آ گئی ہے ، کانگرسی خیال کے مسلمان یہ اشاعت کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کو بغیر کسی شرط کے کانگرس کے حلقے میں آ جانا چاہیئے ۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ بہت بڑی غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں ۔ اگر مسلمان اس فریب کا شکار ہو گئے تو سمجھ لیجئے کہ ان کی قومی ہستی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہونے والا ہے ۔ کانگرس خواہ کتنا ہی دعویٰ کرے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کے لئے کچھ نہیں کیا ہے ، مسلمان اور دیگر اقلیتوں کا اعتماد حاصل کرنے میں کانگرس بالکل ناکامیاب ثابت ہوئی ہے

اب میں فلسطین کے مسئلے کی طرف رُخ کرتا ہوں ، حکومت برطانیہ نے جنگ عظیم کے بعد اپنے اعلان میں یہ وعدہ کیا تھا کہ عربوں کو مکمل آزادی عطا کی جائے گی اور ایک عرب کنفڈریشن قائم کیا جائیگا ۔ لیکن اب برطانیہ فلسطین کو تقسیم کرنا چاہتا ہے ۔ اگر برطانیہ اپنے اصل اعلان اور جنگ عظیم کے بعد کے عہد و پیمان پر قائم نہ رہے گی ، تو مسلمانان ہند تو کیا ساری دُنیا کے مسلمان بالاتفاق برطانوی حکومت ، کو آگاہ کرتے ہیں کہ وہ خود بخود اپنی قبر کھودے گی "۔

" تمہاری اس جدوجہد میں ہزاروں روڑے اٹکائے جائیں گے تم پر صدہا مظالم کے پہاڑ توڑے جائیں گے ، دھمکیاں دی جائیں گی ۔ لہٰذا جب تک تم ان مصائب کو برداشت کرنے کے لئے شیر کا دل پیدا نہ کرو گے ، اُس وقت تک تمہاری گذشتہ روایات و عظمت کو تسلیم کرنے کے لئے کوئی تیار نہ ہو گا[۱] "

مسلم لیگ کی قرار دادیں

مسلم لیگ کے اس تاریخی اجلاس میں پندرہ قرار دادیں منظور کی گئیں ، ان میں پہلی قرار داد میں ڈاکٹر انصاری ، سر راس مسعود ، سر فضل حسین ، خان بہادر مسعود الحسن اور شیخ محمد علی کی وفات پر غم و اندوہ کا اظہار کیا گیا تھا ۔ ایک قرار داد میں رائل فلسطین کمیشن کی سفارشات اور برطانوی وزیر نوآبادیات کے اس بیان کی مذمت کی گئی تھی جس سے مسلمانوں کے

---

[۱] حیات محمد علی جناح صفحہ ۲۲۸ مؤلفہ رئیس احمد جعفری ندوی (مرحوم)

جذبات مجروح ہوئے۔ قرارداد میں حکومت برطانیہ سے کہا گیا تھا کہ وہ فلسطین کمیشن کی سفارشات اور پارلیمنٹ میں دیئے گئے بیانات واپس لے۔ علاوہ ازیں عربوں کی سپریم کونسل، عرب ہائر کمیٹی اور اس وفد پر اعتماد کا اظہار کیا گیا تھا جو ۲۵ دسمبر ۱۹۳۷ء کو فلسطین کانفرنس کی طرف سے تشکیل دیا گیا تھا۔ قرارداد اس انتباہ پر ختم ہوئی تھی۔

اگر حکومتِ برطانیہ نے یہودیوں کی حمایت ترک نہ کی تو نہ صرف برِصغیر کے مسلمان بلکہ ساری دُنیا کے مسلمان متفق الرائے ہو کر برطانوی حکومت کو دشمنِ اسلام قرار دیں گے اور وہ تمام طریقے اختیار کریں گے جو اسلامی تعلیم کی رُو سے ضروری ہیں ایک اور قرارداد میں کانگریس کے اس اقدام کی مذمت کی گئی تھی جس کے تحت بندے ماترم کو تعلیمی اداروں میں قومی ترانے کے طور پر رائج کیا گیا تھا۔ اسے بُت پرستانہ ذہنیت کا غماز اور رُوحِ اسلام کے خلاف قرار دیا گیا تھا۔ ایک اور قرارداد میں کانگرسی وزارتوں کی تشکیل کے خلاف اظہار ناراضگی کیا گیا تھا اور اُنہیں انڈیا ایکٹ کی رُوح کے خلاف قرار دیا گیا تھا۔ اس قرارداد میں صوبائی گورنروں کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا گیا تھا جو اقلیتوں کی حفاظت کے سلسلے میں اُن اختیارات کو استعمال کرنے میں ناکام رہے جو دستور کی رُو سے اُنہیں حاصل ہیں۔ ان قراردادوں میں سب سے اہم وہ قرارداد تھی جس میں آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ نصب العین متعین کیا گیا تھا کہ وہ خودمختار اور جمہوری ریاستیں حاصل کرنے کی کوشش کرے گی جن کا آئین مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے تحفظ کی ضمانت دے گا۔ ایک اور قرارداد میں انڈیا ایکٹ میں تجویز کردہ آل انڈیا فیڈریشن کی اسکیم کو ناقابلِ قبول قرار دیا گیا اور حکومت کو متنبہ کیا گیا تھا کہ وہ اسے نافذ نہ کرے کیونکہ یہ اسکیم اہلِ ہند خاص طور پر مسلمانوں

کے مفاد کے لئے سخت نقصان دہ ہے، ایک دوسری
قرارداد میں کانگرس کی صوبائی حکومتوں کی اس مہم کی مذمت
کی گئی کہ میونسپل بورڈوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں مخلوط
انتخابات کا طریقہ رائج کیا جائے۔ ایک اور قرارداد اس مضمون
کی منظور کی گئی کہ اُردو زبان کی ترقی۔ اُس کے تحفظ اور
سرکاری محکموں میں اس کے استعمال پر کوئی روکاوٹ نہ
ڈالی جائے۔ اور جن علاقوں میں اُردو زبان کو ابھی تک
رائج نہیں کیا گیا وہاں اِسے رائج کرنے کے لئے
مؤثر اقدامات کئے جائیں۔

مسلم لیگ کا نیا دائرۂ عمل۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کی متذکرہ بالا قراردادوں کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مسلمانانِ ہند کی یہ سیاسی جماعت اب عوامی جماعت بننے کی راہ پر گامزن ہو چکی تھی۔ اس نے عوام کے مسائل اور قومی نوعیت کے جملہ اُمور کو اپنے دائرۂ فکر وعمل میں شامل کر لیا تھا۔ ہندوستان سے ہٹ کر سارے عالمِ اسلام کے مسائل کو یہ اپنے مسائل سمجھنے لگی تھی اب اس کے سامنے ایک واضح نصب العین تھا اور اس کا صدر جو اب تک کسی نہ کسی رنگ میں کانگرس سے حسنِ ظن رکھتا تھا اور دیرینہ رشتہ کو یکسر توڑنا نہیں چاہتا تھا، اب کانگرس سے قطعی طور پر مایوس ہو کر آخری اور حتمی فیصلہ کر چکا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو جداگانہ بنیادوں پر مسلم لیگ کے پرچم تلے متحد کیا جائے اور اُن کے سیاسی اقتصادی اور مذہبی حقوق کے لئے مؤثر اور نتیجہ خیز جدوجہد کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے خطبۂ صدارت میں برصغیر کے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے بڑی دلسوزی سے کہا۔

خود پر اعتماد کیجئے

میری خواہش ہے کہ مسلمان اپنے اوپر بھروسہ کریں
اور خود اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں۔ ہمیں ایسے لوگ درکار
ہیں جو باہمت ہوں اور مضبوط ارادے کے مالک

ہوں۔ یہ ایسے لوگ ہوں جو اپنی کوششوں میں تنہا مصروف رہیں، خواہ ساری دُنیا اُن کی مخالفت کرے،

اُنہوں نے اپنی تقریر کے آخر میں فرمایا۔ کہ:

میں ہر صوبہ، ہر ضلع، ہر تحصیل اور ہر قصبے کے مسلمانوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی فلاح کے طریقے تلاش کیجئے اور ایک ایسا منصوبہ تیار کیجئے جس سے قومی تعمیر میں مدد مل سکے۔ میں ہر مرد ہر عورت اور بچے کو تلقین کرتا ہوں کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں۔ کوشش کیجئے کہ آپ جلد سے جلد بہت بڑی تعداد میں آل انڈیا مسلم لیگ صوبائی مسلم لیگ... اور ضلعی مسلم لیگ کی رکنیت قبول کرلیں، اپنی تنظیم کیجئے اور اپنی صفوں میں اتحاد قائم رکھئے ہر وقت اس طرح چوکس رہیئے جیسے تربیت یافتہ سپاہی ہمہ وقت چاق و چوبند رہتے ہیں۔ اپنے آپ کو ملک اور اس کے عوام کی جاں فشانی اور فرض شناسی کے ساتھ خدمت کے لئے وقف کر دیجئے۔ یاد رکھیے کہ اس وقت تک کچھ حاصل نہیں ہوتا، جب تک سخت محنت نہ کی جائے، مصائب برداشت نہ کئے جائیں اور قربانیاں نہ دی جائیں۔ آپ کو مصائب سے بھی گزرنا پڑے گا۔ مگر اس حقیقت کو فراموش نہ کیجئے کہ سونا آگ کی بھٹی میں تپ کر ہی کُندن بنتا ہے..... فیصلہ کرنے سے پہلے سو مرتبہ غور کیجئے مگر جب آپ کوئی فیصلہ کرلیں تو پھر اس پر مضبوطی سے قائم ہو جائیے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کامیابی آپ کے قدم چُومے گی۔"

قائداعظم کی یہ تقریر اس قدر مدلل مؤثر اور بیباکانہ تھی کہ ہندو کانگرس کے مشہور راہنما مسٹر گاندھی بوکھلا اٹھے، اور انہوں نے قائداعظم کو لکھا کہ "میں نے آپ کی تقریر پڑھی میرے خیال میں یہ آپ کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔" بلاشبہ یہ اعلان جنگ تھا مگر اس جنگ کی طرح خود مسٹر گاندھی اور ان کی فرقہ پرست کانگرس نے ڈالی تھی۔ قائداعظم اور مسلم لیگ تو دفاعی جنگ کا اعلان کر رہے تھے اور اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ہندو اکثریت ہندوستان کی سرزمین سے مسلمانوں کو نیست و نابود کر دیتی۔

مسلم لیگ میدان عمل میں

اب مسلم لیگ میدانِ عمل میں آگئی تھی۔ اس کی شاخیں ہر ضلع ہر قصبہ اور ہر محلہ میں قائم ہو رہی تھیں، مسلمان جاگ اٹھے تھے۔ مسلم لیگ نے اپنے دروازے ہر مسلمان کے لئے کھول دیئے تھے۔ اس کا چندۂ رکنیت دو آنہ مقرر کیا گیا۔ جو شخص دو آنے ادا کر دیتا تھا وہ اس کا رکن بن جاتا تھا۔ اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں مسلمان مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ قائداعظم نے رابطۂ عوام کا ایک جامع منصوبہ بنایا۔ وہ ہر صوبے کے بڑے بڑے شہروں میں گئے، عظیم الشان جلسوں سے خطاب کیا۔ عام مسلمانوں تک مسلم لیگ کا پیغام پہنچایا۔ اور انہیں مسلم لیگ کے جھنڈے تلے متحد ہونے کی دعوت دی۔

کلکتہ اور پٹنہ کے اجلاس

اِن اجتماعات میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس کلکتہ منعقدہ ۱۸، ۱۹ اپریل ۱۹۳۶ء اور اجلاس پٹنہ منعقدہ ۲۶ دسمبر تا ۲۹ دسمبر ۱۹۳۸ء خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان جلسوں کی صدارت قائداعظم نے فرمائی اور برصغیر کے مسلمانوں کو حیات آفریں پیغام دیا۔ ان کے حوصلے بلند کئے۔ انہیں امید کی روشنی دکھائی۔ اور ان میں ایک نیا ولولہ پیدا کیا۔

اس مہم کا نہایت خوشگوار اثر ہوا اور سارا ملک مسلم لیگ زندہ باد اور قائداعظم زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگا۔ یہ دراصل جواب تھا پنڈت جواہر لال نہرو کے اس متکبرانہ اعلان کا کہ "ہندوستان میں صرف دو جماعتیں ہیں ایک کانگرس اور دوسری برطانیہ۔"

مسلم لیگ کی تنظیم نو برِصغیر کی تاریخ کا کوئی معمولی واقعہ نہیں یہ ہماری تاریخ کا
ایک اہم موڑ ہے۔ جہاں سے برِصغیر کے مسلمانوں کے کاروانِ حریت نے ایک نئی
سمت اختیار کی۔ وہ قافلہ جو سرسید کی قیادت میں روانہ ہوا تھا اب اس منزل پر
پہنچ چکا تھا جہاں اسے پھر سرسید کی طرح ایک مسیحائے قوم کی ضرورت تھی اور
وہ مسیحا اسے میسر آگیا تھا۔ سرسید نے اپنی دوربینی سے مستقبل میں پیش آنے
والے جن خدشات کا اظہار کر دیا تھا وہ بالکل سامنے اور صاف نظر آرہے تھے
سرسید نے مسلمانوں کے لئے نصف صدی قبل جو نسخہ تجویز کیا تھا نئے دور کا مسیحا
اب اس کو مسلمان قوم کے لئے اکسیر قرار دے رہا تھا۔ یعنی دو قومی نظریہ۔ مسلمانوں
کے لئے جُداگانہ سیاسی تنظیم اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان حدِ فاصل کا قیام۔

ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام نہیں لینا چاہیئے کہ
سرسید کے بعد اس کے چند جانشینوں نے اپنے پیش رو کا بنایا ہوا راستہ
اختیار کئے رکھا۔ مگر ان کے بعد جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اس راستے کو ترک
کر دیا اور کانگرس کا ہندو مسلم اتحاد کا پُر فریب نعرہ ان کے دلوں میں اُتر گیا۔
مولانا محمد علی جوہر۔ مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں۔ ڈاکٹر انصاری اور خود قائد اعظم
عرصے تک اس غلط فہمی کا شکار رہے کہ جب تک ہندو اور مسلمان متحد ہو کر انگریزوں
سے آزادی کا مطالبہ نہیں کریں گے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو
سکیں گے۔ ان کا طرزِ فکر بظاہر درست تھا؛ کیونکہ مشترکہ دشمن کے مقابلے
میں جب تک متفقہ جدوجہد نہ کی جائے اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔
مگر مسلمانوں کے ان رہنماؤں کو اس حقیقت کا ادراک بہت بعد میں ہوا۔
کہ دشمن سے مقابلہ کرنے کے لئے دوست سے تو امداد لی جا سکتی ہے مگر دشمن
سے نہیں، یہ لوگ ہندوؤں کو اپنا دوست اور انگریز کو اپنا مشترکہ دشمن سمجھتے
رہے۔ حالاں کہ یہی ان کی غلط فہمی تھی۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ
ہندو مسلمان کا انگریز سے بھی زیادہ خطرناک دشمن ہے۔ ان حالات نے مسلمان
رہنماؤں کو اپنا طرزِ فکر بدلنے پر مجبور کر دیا اور انہیں پچاس برس پیچھے جا کر سرسید
کے افکار کو اپنا رہنما بنانا پڑا۔ جنہوں نے صاف لفظوں میں اپنی قوم کو ہدایت

کی تھی کہ کانگرس خالص ہندو تنظیم ہے مسلمان اس میں شامل نہ ہوں — اور یہ کہ مسلمان ہندوؤں سے مختلف ایک جُداگانہ قوم ہیں۔ بعد میں یہی نظریۂ دو قومی نظریہ کہلایا۔ آئندہ صفحات میں ہم اسی طرزِ فکر کو موضوعِ گفتگو بنائیں گے۔

دو قومی نظریہ

اب ہم تاریخ کے اس موڑ پر آپہنچے ہیں جہاں کچھ دیر ٹھہر کر ماضی پہ ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اسلام ہی پر منحصر نہیں، جب بھی کوئی نبی مبعوث ہوا اس نے اپنے مشن کی تکمیل کے لئے پاک باز اور راست گفتار افراد کی ایک جماعت قائم کی۔ یہی جماعت "جماعتِ مومنین" کہلائی اور اپنے ہادی و پیشوا کی معین و مددگار ثابت ہوئی۔ اس کے مقابلے میں دوسری جماعت اس پہلی جماعت کے درپے آزار ہوگئی اور حق کو مٹانے کی کوشش کرنے لگی۔ یہ دوسری جماعت منکرین کی جماعت کہلائی۔ ہر نبی کے زمانے میں یہ دونوں جماعتیں موجود رہیں حتیٰ کہ ہمارے آقا و مولا احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ آپؐ کے پاکیزہ مشن کی تکمیل کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو مومنوں اور فدائیوں کی ایک جماعت عطا فرمائی۔ اس جماعت کے مقابلے میں بھی منکروں کا ایک طاقتور گروہ صف آرا ہوگیا۔ گویا دو جماعتوں، دو ملتوں یا دو قوموں کی آویزش کا یہ سلسلہ ازل سے جاری ہے اور شاید ابد تک جاری رہے گا۔ عجیب بات یہ ہے کہ جب بھی کفر و اسلام کا معرکہ ہوا اسلام کے مقابلے میں کفر کی ساری طاقتیں باہم متحد ہو کر صف آرا ہوگئیں درآنحالیکہ ان میں عقائد و نظریات اور رنگ و نسل کے بے شمار اختلافات موجود تھے۔

چنانچہ جب قریش مکہ نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے گئے ہیں اور مسلمان بھی ان کی دست برد سے نکل گئے ہیں تو انہوں نے آپ کے مقدس مشن کو ناکام بنانے کے لئے مختلف الخیال قبائل کو دعوت دی حتیٰ کہ مدینہ کے یہود بھی ان کی امداد پہ کمربستہ ہوگئے۔ حالانکہ قریش اور یہود میں کوئی قدر مشترک نہ تھی بلکہ مذہبی لحاظ سے ایک دوسرے سے کوئی علاقہ ہی نہ رکھتے تھے مگر حق کی مخالفت اور اسلام کو مٹانے کے لئے ان مختلف النوع قبائل میں پوری طرح اتحاد ہوگیا۔ خود ہمارے اپنے ملک (برصغیر پاک و ہند) میں بھی تاریخ کی یہی حقیقت دہرائی گئی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد جب برصغیر کے مسلمانوں کا شیرازہ بکھرنے لگا تو برہمن، مرہٹے، جاٹ اور سکھ جن میں باہم شدید مذہبی، لسانی، تہذیبی اور سیاسی اختلافات تھے ایک امر پر سب متحد ہوگئے تھے کہ جس طرح بھی ہو سلطنت مغلیہ کا خاتمہ کر دیا جائے اور مسلمانوں کی طاقت کو توڑ کر انہیں ہمیشہ کے لئے مغلوب کر لیا جائے۔

دو قومی نظریے کے اولین داعی ﷺ

یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "الکفر ملتہ واحدۃ"۔ کفر ملت واحدہ کی حیثیت رکھتا ہے یعنی جب بھی مسلمانوں کا کفار سے مقابلہ ہوتا ہے تو وہ سب اسلام کے مقابلے میں متحد ہو جاتے ہیں خواہ ان میں باہم کتنے ہی نظریاتی اور طبقاتی اختلافات کیوں نہ ہوں۔ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روئے زمین پر بسنے والوں کو دو حصوں اور دو ملتوں میں تقسیم فرمایا۔ ایک ملتِ اسلام اور دوسری ملتِ کفر۔ اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو قومی نظریے کے سب سے پہلے داعی اور علمبردار تھے اور جو شخص اس نظریے کو کسی دنیوی شخصیت سے منسوب کرتا ہے وہ حقائق کا خون کرتا اور تاریخ کا منہ چڑاتا ہے۔ مسلمانوں کو یہ نظریہ دے کر آپ نے ان پر احسانِ عظیم فرمایا اور انہیں ہمیشہ کے لئے متنبہ کر دیا کہ وہ غیر مسلموں سے ہوشیار رہیں۔ ان سے معاشرتی تعلقات ضرور قائم رکھیں اور انسانی ہمدردی کے موقع پر ان سے حسن سلوک بھی کریں۔ ان کے حقوق کا بھی خیال رکھیں مگر اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کریں کہ غیر مسلم بہر حال ایک الگ ملت کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کا مذہب، ان کی تہذیب، اور ان کی سیاست مسلمانوں سے بالکل جداگانہ ہے۔ کافر بہر حال کافر ہے اور مسلمان بہر حال مسلمان۔ جب تک مسلمانوں نے اپنے ہادی و مولا کی اس تنبیہہ کو مدنظر رکھا وہ غیر مسلموں کے ہاتھوں نقصان اٹھانے سے محفوظ رہے مگر جب انہوں نے اس تنبیہہ کو نظر انداز کر دیا تو سماجی، سیاسی، حتیٰ کہ ان کا مذہبی نظام بھی متاثر ہوا بلکہ سارا ڈھانچہ ہی متزلزل ہو گیا۔

برصغیر کی فاتح اقوام میں ترک، عرب اور افغان سلاطین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس تنبیہہ کو مدنظر رکھا انہوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔ اس دور میں اسلامی نظریات اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن ہندو فلسفے اور ہندو رسوم و رواج کے اثرات سے محفوظ رہے ورنہ اس سے قبل یونانی، پارتھین اور تورانی نسل کے لوگ جب برصغیر میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تو کچھ عرصے کے بعد وہ یہاں کے لوگوں میں اس طرح گھل مل گئے کہ رسوم و رواج، مذہب، حتیٰ کہ ناموں کے لحاظ سے بھی ان میں اور ہندوؤں میں کوئی فرق باقی نہ رہا اور وہ ہندو معاشرے کا جزو بن گئے۔ افسوس کہ بعد کے مسلم سلاطین (مغلوں) نے اس احتیاط کو مدنظر نہ رکھا جو ان کے پیش رو فاتحین نے ضروری سمجھی تھی۔ ان میں سے بعض نے مذہبی اور معاشرتی لحاظ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ملت کی شکل دینے کی کوشش کی۔ چنانچہ اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور داراشکوہ نے ہندوؤں کے ساتھ شادی بیاہ، تحریر و تقریر اور ایک گمراہ کن تصوف کے ذریعے ایسی کوششیں کیں جن کے نتیجے میں مسلمانوں کے لئے ہندوؤں میں مدغم ہونے کی راہیں کھل گئیں۔ چنانچہ اکبر کا دین الٰہی اور داراشکوہ کی کتاب "مجمع البحرین" اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

ایک قوم بنانے کی مکروہ کوشش

جن لوگوں نے برصغیر کی تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ہندوؤں نے اس ملک میں اسلامی طاقت کو کمزور کرنے کے لئے ایک منظم سازش کی تھی۔ یہ سازش مغلوں کی آمد سے قبل ہی شروع ہو چکی تھی اس کا آغاز شنکر اچاریہ نے کیا اور رامانند نے اسے بھگتی تحریک کی شکل دی۔ ان کے زیر اثر بھگت کبیر کی قبیل کے بعض مسلمان صوفیوں نے اپنی سادہ لوحی سے اسے پروان چڑھایا۔ شاید وہ اس کی مضرت رسانیوں کا اندازہ نہیں کر سکے۔ اس تحریک کے بانیوں نے جو نظریات پیش کئے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ سارے مذاہب سچے ہیں۔ یہ سب ایک ہی حقیقت کی مختلف صورتیں ہیں۔ خدا ایک ہی ہے اس کے نام مختلف ہیں۔ جس طرح بھی عبادت کرو خدا راضی ہو جائے گا۔ نجات حاصل کرنے کے لئے ہندو اور مسلمان کی قید ضروری نہیں۔ نیک اعمال انجام دے کر ہر شخص نجات حاصل کر سکتا ہے۔

بظاہر یہ بڑے دل خوش کن اور بے ضرر نظریات ہیں اور ان میں بڑی کشش اور معقولیت معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک خوبصورت فریب تھا جس میں مسلمانوں کو مبتلا کیا جا رہا تھا۔ اس طرح ان کی نگاہ سے مذہب کی اہمیت کم کی جا رہی تھی۔ انہیں اسلام سے بیگانہ کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ دوسری طرف ہندوؤں میں یہ مذموم خیال ذہن نشین کرایا جا رہا تھا کہ جب سارے مذاہب کی اصل ایک ہی ہے، تو انہیں دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اس طرح مسلمان مبلغوں کی تبلیغی کوششوں کو ناکام بنایا جا رہا تھا۔ اس تلوار سے ایک وار اور کیا جا رہا تھا کہ جب سارے مذاہب بنیادی طور پر ایک ہی صداقت کے حامل ہیں تو مسلمانوں کا ہندو ہو جانا قابل اعتراض نہیں۔ اسی فضا میں اکبر نے برصغیر کے جملہ باشندوں کے لئے ایک ہی دین جاری کرنے اور دارا شکوہ نے ایک ہی تصوف تشکیل دینے کی کوشش کی تاکہ برصغیر کے تمام باشندے ایک ہی مذہب میں داخل ہو جائیں۔ اس طرح ہندوستان کی مختلف الانواع قوموں کو ایک قوم میں تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی۔ شاید یہ کوششیں بار آور ہو جاتیں کہ حضرت اورنگ زیب عالمگیر رح نے خطرے کا بروقت اندازہ کر لیا اور اپنے سخت اقدام سے اس شجر ملعونہ کی جڑیں کاٹ دیں۔ حضرت اورنگ زیب رح کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح برصغیر کے دوسرے عظیم رہنما تھے جنہوں نے مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کو مسلمانوں کا مشترک دشمن قرار دیتے ہوئے برصغیر کے مسلمان حکمرانوں اور افغانستان کے مسلمان فرماں روا کو دعوت دی کہ وہ سب مل کر ملت کفر کے مقابلے میں صف آرا ہو جائیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح کے بعد کوئی مسلمان رہنما اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا کہ برصغیر کے مسلمانوں کو غیر مسلموں کے مقابلے میں اس طرح صف آرا کرتا تاآنکہ مسلمانوں نے ایک بار پھر دھوکا کھایا اور اپنے

انگریز دشمن کو شکست دینے کے لئے ہندو دشمن کو اپنا دوست سمجھ لیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا یہ غیر حقیقی اتحاد اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آیا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تحریک ناکام ہو گئی اور سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو اٹھانا پڑا حالانکہ یہ آگ ہندوؤں نے لگائی تھی۔ سر سید احمد خاں کے بقول "غدر میں کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا۔ مسلمان دل جلے تھے وہ بیچ میں کود پڑے۔ ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے"[۱]

تاریخ گواہ ہے کہ یہ تحریک ہندوؤں نے اپنے مخصوص مقاصد کے تحت شروع کی تھی۔ مسلمان بھی اپنی سادہ لوحی سے ان کے ساتھ ہو گئے اور ان کی دلجوئی میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ اپنے مذہب کے ایک رکن (عیدالاضحیٰ کے موقع پر گائے کی) قربانی کو بھی قربان کر دیا مگر جب یہ تحریک ناکام ہو گئی تو انہی ہندوؤں نے اس کی ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی اور خود انگریزوں کی چشم اعتبار میں جگہ پا کر ہر شعبۂ حیات میں فائز المرام ہو گئے۔ انگریزوں نے بدلہ مسلمانوں سے لیا اور پھر اس قوم کا جو حشر ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ اگر مسلمان ہنود کی شرکت کے بغیر ایک تنظیم کے تحت یہ تحریک شروع کرتے تو اس کے نتائج یقیناً مختلف نکلتے۔

سر سید اور دو قومی نظریہ

افسوس کہ ۱۸۵۷ء میں ہندوؤں کی سازش کا شکار ہونے کے باوجود برصغیر کے مسلمانوں کی آنکھیں نہ کھلیں اور جب ایک انگریز کی کوشش سے انڈین نیشنل کانگرس کا قیام عمل میں آیا تو چند عاقبت نا اندیش مسلمانوں نے بھی اس تنظیم میں شمولیت اختیار کر لی۔ ہمارے خیال میں اس تنظیم کا نام "نیشنل کانگرس" تجویز کر کے مسلمانوں کو اس میں شامل کرنے کی کوشش کرنا مسلمانوں کی قومیت کے خلاف انگریز اور ہندو کی پہلی سازش تھی۔ اس طرح مسلمانوں کے دلوں سے ان کی جداگانہ قومیت کا احساس مٹا کر انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ ہندوستان میں صرف ایک نیشن آباد ہے اور ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اس ایک نیشن (قوم) کی مختلف شاخیں ہیں۔ سر سید احمد خاں پہلے مسلمان رہنما ہیں جنہوں نے اس سازش کو قبل از وقت بھانپ لیا اور مسلمانوں کو اس دامِ ہمرنگِ زمین کا شکار ہونے سے بچانے کے لئے اپنی ساری قوتیں اور صلاحیتیں صرف کر دیں انہوں نے شاخیں تراشنے کی بجائے جڑ پر تبر چلایا اور ایک قومی نظریے کی بنیاد پر زور تردید کی۔ چنانچہ جب ہندوؤں کی طرف سے وائسرائے کی کونسل کے لئے (مخلوط) انتخابات کا مطالبہ کیا گیا تو سر سید احمد خاں نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے جو الفاظ کہے اس میں صاف طور پر اس حقیقت کا اعلان کیا کہ ہندوستان

---

[۱] حیاتِ جاوید ص ۱۸۶

میں ایک نہیں دو قومیں آباد ہیں۔ سر سید نے کہا تھا کہ :-

"کانگرس کی یہ تجویز ایسے ملک کے لئے جہاں دو مختلف قومیں مل کر آباد ہیں، ایک کنوئیں کا پانی پیتی ہیں، ایک شہر کی ہوا کھاتی ہیں، ایک کی زندگی دوسری پر منحصر ہے نہایت بد اندیشی کی تجویزیں ہیں"

ایک اور تقریر میں جو سر سید نے ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو انڈین نیشنل کانگرس مدراس کے موضوع پر لکھنؤ میں کی تھی وائسرائے کی کونسل کے لئے انتخاب کے طریقے پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا :-

"..... انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ یہ دونوں مختلف قومیں ہیں۔ بڑی بڑی لڑائیاں آپس میں ہوئی ہیں اور بہت بہادری طرفین نے دکھائی ہے۔ لیکن وہ زمانہ جاتا رہا اور اب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے بمنزلہ ایک قوم کے نہیں ہیں۔ مگر ہمارے ملک کی جس میں مختلف قومیں آباد ہیں یہ حالت نہیں ہے۔ ایک طرف ہندو، دوسری طرف مسلمان اور تیسری طرف پارسی ہیں۔ ہندوؤں میں بھی ہمارے ملک کے ہندو اور مشرقی ملک کے بنگالی (ہندو) اور دکنی ملک کے مرہٹہ ایک نہیں ہیں[1]"

یہی نہیں کہ سر سید ہندو اور مسلمانوں کو دو الگ الگ قومیں سمجھتے تھے بلکہ انگریزوں کے تسلط کے بعد ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف جو متحدہ محاذ بنایا تھا اور ان کا مذہب، ان کی تہذیب اور ان کی زبان کو ملیامیٹ کرنے کے لئے جو مکروہ طریقے اختیار کر رہے تھے انہیں دیکھ کر سر سید کو یقین ہو گیا تھا کہ اب یہ دونوں قومیں اکٹھا نہیں رہ سکتیں۔ اُن کے اسی خیال کو مزید تقویت اس وقت پہنچی جب بنارس کے بعض متعصب ہندوؤں نے ۱۸۶۷ء میں عدالتوں سے اردو زبان کے اخراج اور اس کی بجائے بھاشا زبان جاری کرنے کی تحریک شروع کی۔ خود سر سید کا بیان ہے کہ :-

"انہی دنوں میں جبکہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے ان سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ انہوں نے کہا اگر آپ کی پیش گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیش گوئی پر مجھے پورا یقین ہے[2]"

---

[1] انڈین نیشنل کانگرس مدراس پر سر سید کا لکچر صـ مطبوعہ نامی پریس کانپور

[2] حیات جاوید صـ ۹۴

بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ اس پیرِ روشن ضمیر کی یہ پیش گوئی کتنی صحیح تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو کانگرس میں شریک ہونے سے روکا، وہ سمجھ گئے تھے کہ ہندوؤں کی نیت ٹھیک نہیں ہے اور وہ مسلمانوں کو زک دینے اور انہیں ہندو سوسائٹی میں مدغم کرنے کے لئے جو طریقے اختیار کر رہے ہیں یہ انہی میں سے ایک طریقہ ہے۔ گویا سرسید نے پہلے یہ ثابت کیا کہ برصغیر پاک و ہند میں ایک نہیں دو قومیں آباد ہیں پھر مسلمانوں کو کانگرس میں شریک ہونے سے روکا اور آخر میں اس امر کی جانب ہماری رہنمائی کی کہ ہندو اور مسلمان اس ملک میں اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ کیا اس سے زیادہ واضح اشارہ تقسیمِ ملک کی تجویز کی طرف ہو سکتا تھا؟

بدرالدین طیب جی اور دو قومی نظریہ

اب ہم سرسید احمد خاں کے ایک عظیم معاصر کی رائے مسلم قومیت اور کانگرس کی مسلمانوں میں مقبولیت کے بارے میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بدرالدین طیب جی ہیں جن کی شخصیت سے ہر وہ شخص واقف ہے جس نے برصغیر کے اس دور کی تاریخ کا تھوڑا سا بھی مطالعہ کیا ہے۔ طیب جی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، روشن خیال، شریف سیاست دان اور نہایت غیر متعصب انسان تھے۔ انہیں ہندوؤں، مسلمانوں اور پارسیوں میں یکساں مقبولیت حاصل تھی۔ ان کی اسی عظمت کے پیش نظر کانگرسی رہنماؤں نے انہیں اپنی تنظیم میں شمولیت کی دعوت دی، کانگرس کے جو تین ابتدائی صدر ہوئے ہیں ان میں سے ایک بدرالدین طیب جی بھی تھے۔ مگر کچھ ہی عرصے کے بعد انہوں نے محسوس کر لیا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے کانگرس میں شامل نہیں ہو رہے اور اس کی نمائندہ حیثیت مشکوک ہے۔ چنانچہ جب انہیں دوسری بار کانگرس کی صدارت کی دعوت دی گئی تو انہوں نے یہ دعوت رد کر دی اور ۲۷ اکتوبر ۱۸۸۸ء کو کانگرس کے بانی مسٹر ہیوم کے نام ایک خط لکھا جس کے یہ الفاظ تاریخی نوعیت کے حامل ہیں:-

"خواہ ہم پسند کریں یا ناپسند لیکن اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ مسلمانوں کی غالب اکثریت اس تحریک (نیشنل کانگرس) کی مخالف ہے اور یوں جب مسلمان من حیث القوم کانگرس کے خلاف ہوں تو پھر یہ تحریک نہ عوامی حیثیت کی حامل رہتی ہے اور نہ اس ادارے کو قومی کانگرس کا نام دیا جا سکتا ہے[1]۔"

بدرالدین طیب جی کی یہ رائے ایک ایسے شخص کی رائے تھی جو کانگرس کے اندرونی حالات سے بخوبی واقف تھا جسے معلوم تھا کہ اس سے مسلمانوں کو کس حد تک دلچسپی ہے اور مسلمانوں کو اس میں شریک کرنے کے

---

[1] حبیب اللہ اوچ صاحب ایڈیٹر ہفت روزہ "پاک جمہوریت" لاہور کے قلمی مسودہ سے ماخوذ۔ ان کے شکریہ کے ساتھ۔ (مولف)

لئے کیا کیا جتن کیئے جا رہے ہیں۔ یہ سرسید کے دل کی آواز تھی۔ گویا طیب جی کے روپ میں انہیں اپنا ایک اور ہم راز مل گیا تھا۔ انہوں نے طیب جی کو خط لکھا جس میں کانگرس کی قومی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کیا کہ :

"میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ قومی کانگرس (نیشنل کانگرس) کی اصطلاح کا کیا مفہوم ہے۔ کیا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہندوستان میں مختلف عقائد و نسل کے جو لوگ رہتے ہیں وہ ایک قوم سے تعلق رکھتے ہیں یا انہیں ایک قوم کے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے اور یہ کہ ان کے مقاصد اور مطمح ہائے نظر بھی ایک اور یکساں ہیں؟ میرے خیال میں یہ بات ناممکنات سے ہے اور جب یہ ناممکن العمل ہے تو پھر قومی کانگرس قسم کی کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی اور نہ اس سے سب ہی کو یکساں فائدہ پہنچ سکتا ہے[1]۔"

مولانا حالی اور دو قومی نظریہ

سرسید کی طرح ان کے بالغ نظر رفقاء مولانا حالی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، آنریبل الحاج محمد اسمٰعیل خاں اور شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد بھی ایک قومی نظریے کے شدید مخالف تھے اور اس نظریے کو واقعات کے خلاف اور مسلمانوں کے لیئے سخت نقصان دہ سمجھتے تھے۔ ان لوگوں کی دیانتدارانہ رائے تھی کہ ہندوستان ایک قوم کا نہیں بلکہ متعدد اقوام کا مسکن ہے جن میں ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں ہیں۔ ذیل میں رفقائے سرسید میں سے صرف تین بزرگوں کی آراء درج کی جاتی ہیں۔

سرسید احمد خاں کے رفقا میں مولانا الطاف حسین حالی کا سیاسیات سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ لیکن برصغیر اور اسلامی تاریخ پر ان کی گہری نگاہ تھی جس نے ان میں قومی اور سیاسی شعور پیدا کر دیا تھا۔ رفقائے سید میں وہ سب سے زیادہ روشن ضمیر بزرگ تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کے طرز عمل سے بجا طور پر اندازہ لگا لیا تھا کہ اب ایسے حالات پیدا ہونے والے ہیں کہ مسلمانوں کو ہندو انڈیا سے رخصت ہو کر اپنا مستقر الگ بنانا پڑے گا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی مشہور و مقبول نظم "شکوۂ ہند" کے پہلے شعر میں اس طرف اشارہ کیا ہے ؎

رخصت اے ہندوستاں، اے بوستانِ بے خزاں   رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی میہماں

حالی نے اس شعر میں "ہندو ہندوستان" سے مسلمانوں کے صرف رخصت ہونے ہی کی طرف اشارہ نہیں کیا بلکہ بدیسی میہماں کہہ کر صاف لفظوں میں انہیں ایک جداگانہ قوم قرار دیا۔ اس شعر میں ان ہندو مفکروں پر نہایت بھرپور طنز بھی ہے جو مسلمانوں کو ایک ہزار سال تک ہندوستان میں بود و باش رکھنے کے

---

[1] حبیب اللہ اوج صاحب (ایڈیٹر ہفت روزہ پاک جمہوریت لاہور) کے قلمی مسودے سے ماخوذ۔

باوجود غیر ملکی باشندے قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد اس نظم کے دوسرے بند میں حالیؔ نے اور زیادہ وضاحت سے ہندو اور مسلمانوں کو دو الگ الگ قومیں قرار دیا ہے ؎

رشتہ و پیوند کوئی ہم میں اور تجھ میں نہ تھا — تھی ہماری قوم و ملت، رسم و عادت سب جدا
تجھ سے ہم تھے اجنبی اور ہم سے تو ناآشنا — بول چال اپنی الگ تھی اور زباں تیری الگ

ان اشعار کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالیؔ مسلمانوں کو ایک الگ قوم قرار دیتے ہیں جس کی تہذیب، عادات و اطوار اور زبان غرض ہر چیز ہندوؤں سے بالکل الگ تھی۔ ہمارے خیال میں حالیؔ سے پہلے کسی شاعر نے دو قومی نظریے کو اپنی شاعری کا موضوع نہیں بنایا۔ مولانا حالیؔ کے اس نظریہ میں بلاشبہ سرسید کے افکار کو بھی بڑا دخل ہے مگر ان کی پوری نظم کا مطالعہ کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ نظریہ کسی کی تحریک پر قبول نہیں کیا بلکہ اس کے پیچھے ان کے گہرے تاریخی مطالعے کا شعور کار فرما ہے۔

آنریبل اسماعیل خاں اور دو قومی نظریہ

دوسری رائے علی گڑھ کے رئیس اور صوبہ متحدہ کی مجلس قانون ساز کے ممبر آنریبل الحاج محمد اسماعیل خاں کی ہے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ :۔

"ہندوستان دو قوموں سے مرکب ہے جو آپس میں بالکل مختلف ہیں اور یہ اختلاف محدود امور میں ہی نہیں ہے بلکہ نامحدود ہے۔ مذہب میں اختلاف ہے۔ خیالات میں اختلاف ہے۔ اصل و نسل میں اختلاف ہے۔ دولت مندی میں، علم میں، تعداد میں اختلاف ہے، شجاعت اور بزدلی میں اختلاف ہے۔ مسلمان تعداد میں کم ہیں، علم و دولت میں کم ہیں، مگر اپنی اس عزت پر ایک دم سے فدا ہو جانے پر آمادہ ہیں جو ان کو بوجہ ہندوستان میں حکمران رہنے کے اب تک حاصل ہے ...... بنگالہ کے تعلیم یافتہ مگر ناعاقبت اندیش ہندوؤں نے ایک کانگرس از نام نیشنل کانگرس بنائی۔ ان کی یہ ظاہر میں خوش کن باتوں کو دیگر انگریزی داں ہندوؤں نے خوشی خوشی سے سنا اور سمجھ لیا کہ بس ہندوستان کی کنجی ہمارے ہاتھ لگ گئی۔ ہندوستان سے لے کر انگلینڈ تک شور و غل کی آوازوں سے گونج گیا۔ پارلیمنٹ نے ناواقفیت کی وجہ سے سمجھا کہ ہندوستان بھی مثل انگلینڈ ایک نیشن ہے اور جو کچھ غل کیا جا رہا ہے درست اور ٹھیک ہے۔"[1]

ڈپٹی نذیر احمد اور دو قومی نظریہ

سرسید کے تیسرے رفیق اردو زبان کے مایۂ ناز ادیب، مصنف، جید عالم اور مصلح قوم شمس العلما

---

[1] نیشنل کانگرس کی نسبت مسلمانوں کی رائے ص ۱۲، ۱۱ مطبوعہ مطبع اسلامیہ لاہور۔

مولوی حافظ ڈپٹی نذیر احمد ہیں جنہوں نے ایک قومی نظریے کی اپنے مخصوص انداز میں پرزور مخالفت کی اور اسے مسلمانوں کے حق میں سم قاتل قرار دیا۔ ذیل میں ان کی رائے درج کی جاتی ہے۔ مولانا نذیر احمد نے ۱۵ اکتوبر ۱۸۸۸ء کو ٹاؤن ہال دہلی میں انڈین نیشنل کانگرس پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا :-

"ایک طفل مکتب جس کو ہندوستان کے جغرافیے اور تاریخ سے کچھ بھی مناسبت ہے، ہندوستان کے نام کے ساتھ لفظ نیشنل سن کر کان کھڑے کرے گا کہ کجا ہندوستان اور کجا نیشنلٹی ع من چہ می سرائم و طنبورۂ من چہ مے سرائد۔ تمام روئے زمین پر کوئی ایسا ملک نہیں کہ جس میں اس کثرت سے مختلف العقائد، مختلف الرسم، مختلف العادات اور مختلف الاغراض قومیں رہتی ہوں جیسے ہندوستان میں۔ پس ایسے اجزائے متضادہ کو یکجا کر کے ایک معجون مرکب قوم واحد قرار دینا صریح مغالطہ دہی ہے مگر کس کو؟ ان بھچ انگریزوں کو جو انڈیا کا اتنا ہی حال جانتے ہیں کہ ایک بڑی زرخیز کالونی ہے اور بس۔ بھلا شکلی تفریقوں کا لحاظ بھی کرو اور ہندو، ہندو ایک اور مسلمان، مسلمان ایک قوم سمجھو تو خیر یہاں تک بھی مضائقہ نہیں مگر ہندو اور مسلمان کیونکر ایک قوم میں شامل ہو کر انڈین نیشن کہلا سکتے ہیں۔ گنگا اور سندھ کا سنگم ہو سکتا ہے اور نہیں ہو سکتا تو ہندو اور مسلمان کا۔

کانگرس والے جو چاہیں سو کہیں۔ میونسپلٹی کے ممبروں کے انتخاب اور مذہبی تقریبات محرم و دسہرہ ہولی عید وغیرہ میں ہر مرتبہ اس کے شواہد پیش آتے رہتے ہیں کہ ہندو مسلمان دو عنصر ہیں، بالطبع ضد یک دگر ایک دوسرے سے نفور جن کو حاکمان وقت نے بزور حکومت یکجا کر رکھا ہے[1]"

سر سید کے ان تین رہ کشن خیال اور بالغ نظر رفقا کے بیان سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ کانگرس کے قیام کے ساتھ ہی اس دور کے مسلمان رہنماؤں نے اس کے عزائم کو بھانپ لیا تھا اور مسلمانوں کو کانگرس کی گمراہ کن روش کا شکار ہونے سے بچانے کے لئے ان کی رہنمائی کا فرض ادا کرنے کے لئے میدان میں آ گئے تھے۔ وہ قومی نظریہ کو انہوں نے مسلمانوں کی زندگی اور موت کا سوال بنا لیا تھا اور وہ بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم قرار دے دیا گیا تو برصغیر میں اسلامی کلچر، مسلمانوں کی زبان، ان کی قومی روایات اور خود ان کا مذہب تک نہ صرف خطرے میں پڑ جائے گا بلکہ اس کا خاتمہ بھی ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف دو قومی نظریہ کو مسلمانوں کے دلوں میں جاگزیں کیا بلکہ اس کی بنیاد پر مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا اور اس مطالبہ کو پورا کرانے کے لئے انہوں نے اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دیں۔

---

[1] انڈین نیشنل کانگرس پر مولانا حافظ نذیر احمد خاں کا لکچر صفحہ ۲۷ مطبوعہ نامی پریس کانپور۔

جداگانہ انتخابات کا مطالبہ

چنانچہ اسی زمانے میں جب تقسیم بنگال کے خلاف ہندوؤں اور نیشنل کانگرس کی اشتعال انگیز اور تشدد آمیز تحریک شروع ہوئی تو مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان میں سے جو لوگ اب تک کسی غلط فہمی میں مبتلا تھے ان پر بھی یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ ہندو اور ان کی فرقہ وارانہ جماعت کانگرس برصغیر کے مسلمانوں کی سماجی و اقتصادی ترقی کی ہرگز خواہاں نہیں بلکہ انہیں ہر شعبۂ حیات میں پس ماندہ اور اکثریت کا دست نگر رکھنا چاہتی ہے۔ اسی زمانے میں وزیر ہند جان مارلے نے اپنی بجٹ تقریر میں ہندوستان کے حالات پر اظہار خیال کرتے ہوئے وائسرائے کی کونسل میں توسیع کا مشورہ دیا۔ اس مقصد کے پیش نظر اس وقت کے وائسرائے لارڈ منٹو کی ہدایت پر ایک کمیشن تشکیل دیا گیا تاکہ وائسرائے کی کونسل میں توسیع کے مسئلے پر غور و خوض کیا جائے۔ اس اعلان پر مسلمان رہنماؤں نے جو تقسیم بنگال کے اعلان کے خلاف ہندوؤں کا ردعمل دیکھ چکے تھے فیصلہ کیا کہ اب مسلمانوں کو اپنے حقوق کے لئے دو قومی بنیاد پر مطالبہ کرنا چاہیئے کیونکہ اس سے پہلے کانگرس نے جو بزعم خود ایک قومی نظریہ کی بنیاد پر ہندوستان کے تمام فرقوں کی نمائندہ ہونے کی مدعی تھی مسلمانوں کے مفاد کی نہ صرف یہ کہ حفاظت نہیں کی تھی بلکہ اسے صریحاً نقصان پہنچایا تھا۔ چنانچہ نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور الحاج نواب محمد اسماعیل خاں رئیس علی گڑھ نے باہمی خط و کتابت سے وائسرائے سے ملاقات کرنے اور ان کی خدمت میں مسلمانوں کی طرف سے ایک عرضداشت پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ سارے ملک میں مسلمانوں سے دستخط حاصل کرنے کی مہم جاری کی گئی اور چار ہزار افراد کے دستخط حاصل کر کے مذکورہ عرضداشت وائسرائے کو پیش کرنے کا مرحلہ طے ہو گیا۔ ان دستخط کرنے والوں میں ہر صوبے اور ہر طبقے کے تعلیم یافتہ مسلمان شامل تھے۔

نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی جو بمبئی میں مقیم تھے نواب محسن الملک کی دعوت پر ۲۴ اگست ۱۹۰۶ء کو علی گڑھ آئے اور انہوں نے عرضداشت کا مسودہ تیار کیا جو وائسرائے کو پیش ہونی تھی۔ مسودہ تیار ہونے سے پہلے نواب محسن الملک نے بنگال، پنجاب، سندھ، بمبئی اور مدراس کے اہل الرائے مسلمانوں سے بذریعہ خط و کتابت دریافت کیا کہ اس عرضداشت میں کون کون سے امور شامل ہونے چاہئیں۔ ان آرا کی روشنی میں یہ مسودہ مرتب کیا گیا۔ اس کے بعد ملک کی مختلف اسلامی انجمنوں کے اراکین اور اہل فکر و نظر مسلمان اکابر کو دعوت دی گئی کہ وہ لکھنؤ آ کر اس اجلاس میں شرکت کریں جو اس مسودے پر آخری غور و فکر کے لئے منعقد کیا جانے والا ہے۔ یہ اجلاس ۱۵، ۱۶ ستمبر ۱۹۰۶ء کو منعقد ہوا اور اس میں مختلف صوبوں کے چالیس نمائندہ مسلمانوں نے شرکت کی اور بحث و تمحیص کے بعد اسے منظور کر لیا گیا۔ اس کے بعد نواب محسن الملک نے وائسرائے سے ملاقات کرنے کے لئے ایک وفد تشکیل دیا۔ ہز ہائی نس سر آغا خاں کو وفد کا قائد منتخب کیا گیا۔ اس عرضداشت میں کہا گیا تھا کہ :۔

"جو طریقہ نیابت و قائم مقامی کا یورپ میں رائج ہے وہ اہل ہند کے لئے بالکل نیا ہے۔ ہماری قوم کے بعض دور اندیش افراد کا خیال ہے کہ اس طریقے کو ہندوستان کی موجودہ سیاسی اور تمدنی حالت پر کامیابی کے ساتھ منطبق کرنے کے لئے نہایت حزم و احتیاط اور مآل اندیشی سے کام لینا پڑے گا جو اگر نہ لیا جائے گا تو منجملہ خرابیوں کے ایک بہت بڑی خرابی یہ پیش آئے گی کہ ہمارے قومی اغراض کا سیاہ و سپید ایک ایسی جماعت کے حوالے ہو جائے گا جسے ہمارے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ..... قومی حیثیت سے ہم مسلمانوں کی ایک جداگانہ حیثیت ہے جو ہندوؤں سے بالکل الگ ہے[1]"

عرضداشت کا خلاصہ

اس عرضداشت میں جن امور کی طرف وائسرائے کی توجہ مبذول کرائی گئی تھی ان کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے :۔

(۱) میونسپلٹی ڈسٹرکٹ بورڈ اور لیجس لیٹو کونسلوں میں جو قائم مقام بذریعہ انتخاب کے مقرر ہوتے ہیں ان میں قومیت کے لحاظ سے مسلمانوں کو بھی حصہ ملنا چاہیئے۔

(۲) امور مملکت میں مسلمانوں کی وقعت اور اہمیت تسلیم کرنی چاہیئے اور قائم مقامی میں نہ صرف مسلمانوں کی تعداد کا لحاظ رکھا جائے بلکہ ان کی سیاسی حیثیت بھی ملحوظ رہے اور اس کا بھی خیال رکھا جائے کہ صرف ایک ہی صدی پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کا درجہ اور مرتبہ کیا تھا۔

(۳) چونکہ سرکاری ملازمت کی تعداد کا اثر کسی قوم کی وقعت اور پولیٹیکل اہمیت پر پڑتا ہے اس لئے گورنمنٹ کی مندرجۂ گزٹ ملازمتیں اور خدمات ذیلی اور انتظامی پر ہمیشہ ایک مناسبت کے ساتھ مسلمانوں کو مقرر کیا جائے

(۴) ہائی کورٹ اور چیف کورٹ میں مسلمان جج مقرر کیئے جائیں۔

(۵) ہر میونسپل و ڈسٹرکٹ بورڈ میں بلحاظ وہاں کے ہندو مسلمانوں کی مقامی نسبت کے مسلمان ممبروں کی تعداد صاف طور پر بتا دی جائے اور ہر قوم کو اپنے قائم مقام منتخب کرنے کا حق دیا جائے۔

(۶) ہندوستانی یونیورسٹیوں کی سنڈیکیٹ اور سینیٹوں میں بھی مسلمانوں کی تعداد مقرر کی جائے۔

(۷) مسلمانوں کی اہمیت، ان کی سیاسی حیثیت اور وقعت کا لحاظ رکھتے ہوئے پراونشل کونسلوں میں مسلمانوں کی تعداد بہ لحاظ قومی مناسبت کے معین کر دی جائے اور مسلمان جاگیرداروں، تعلقہ داروں، زمینداروں، تاجروں اور بڑے شہر کے معزز باشندوں، میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے مسلمان ممبروں اور

---

[1] تاریخ مسلم لیگ ص ۶۲،۶۱ مولفہ سید رئیس احمد جعفری ندوی مرحوم

یونیورسٹی کے پانچ سالہ رجسٹرڈ مسلمان گریجویٹوں ..... کو پراونشل کونسل کے مسلمان ممبروں کی تعداد منتخب کرنے کا اختیار دیا جائے۔

(۸) امپیریل کونسل میں مسلمانوں کی نشستیں بہ لحاظ مردم شماری مقرر نہیں ہونی چاہئیں بلکہ یہ تعداد بہ لحاظ مسلمانوں کی اہمیت کے مقرر کی جائے اور یہ تعداد ایسی ہو کہ ان کے اثر میں فرق نہ پڑے اور امپیریل کونسل میں مسلمان ممبروں کے انتخاب میں :-

۱۔ طریقۂ انتخاب میں نامزدگی کو ترجیح دی جائے۔

۲۔ امپیریل کونسل کے مسلمان ممبروں کو منتخب کرنے کا حق صرف مسلمانوں کو ملنا چاہیئے۔

(۹) محمڈن یونیورسٹی قائم کرنے میں مسلمانوں کی مدد کی جائے[۱]

مسلمانانِ ہند کا یہ نمائندہ وفد یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو بمقام شملہ وائسرائے ہند لارڈ منٹو کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ تاریخی یادداشت پیش کی۔ اس وفد نے مسلمانوں کے یہ مطالبات نہایت خوش اسلوبی سے پیش کئے اور وائسرائے کو اراکینِ وفد کے مطالبات سے اتفاق کرنا پڑا۔ وائسرائے نے اراکین وفد کے سامنے مسلمانوں کی سیاسی اہمیت کا اعتراف کیا اور انہیں یقین دلایا کہ میونسپلٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں اور قانون ساز کونسل میں مسلمانوں کو ان کی آبادی اور ان کے مذہب کی بنیاد پر حقِ نیابت دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ مشرقی بنگال کے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا بھی یقین دلایا گیا۔

اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دو قومی نظریہ کی بنیاد پر سیاسی نمائندگی کے مطالبے کی یہ پہلی آواز تھی جو شملہ کے پہاڑوں سے بلند ہوئی اور سارے ہندوستان میں گونجتی ہوئی انگلستان کی حکومت کے ایوان سے جا ٹکرائی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ مسلمانوں کو جداگانہ نیابت کا مطالبہ کرنے پر اگر کسی نے مجبور کیا تو وہ فرقہ پرست ہندو اور فرقہ پرست جماعت انڈین نیشنل کانگریس کی یہ کوشش تھی کہ برصغیر کے باشندوں کو ایک قوم بنا دیا جائے۔

دو قومی نظریہ جانشینانِ سرسید کے بعد

برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی دینی، قومی، ثقافتی، سماجی اور سیاسی حیثیت کے تحفظ اور اس اقلیت کو اکثریت میں مدغم ہونے سے بچانے کے لئے سرسید احمد خاں اور ان کے رفقائے کار ڈپٹی نذیر احمد، نواب وقار الملک، اور نواب محسن الملک نے دو قومی نظریہ اور اس کی بنیاد پر جداگانہ انتخاب کی جو تحریک

---

[۱] حیاتِ محسن ص ۱۸۳، ۱۸۲ مولفہ مولوی محمد امین زبیری مارہروی

شروع کی وہ بے اثر نہ رہی ان کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا اور انہیں ایک جداگانہ قوم قرار دیا گیا۔ ہمارے خیال میں یہ سرسید اور ان کے جانشینوں کی بہت بڑی اور سیاسی میدان میں سب سے پہلی فتح تھی۔ اسی فتح نے ان کی آئندہ کامیابیوں اور آخر میں سب سے بڑی کامیابی یعنی قیام پاکستان کے لئے راستہ ہموار کیا۔ سرسید اور ان کے جانشینوں نے دو قومی نظریہ اور جداگانہ انتخاب کی جو تحریک شروع کی تھی وہ رفتہ رفتہ سارے برصغیر کے مسلمانوں کی تحریک بن گئی اور اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے سرسید کے جانشینوں کے بعد مسلم زعماء کی جماعت اٹھی جس نے اس ننھے منے پودے کو ایک تناور درخت بنا دیا۔ جانشینان سرسید میں قائداعظم محمد علی جناح، مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان اور سر شفیع نے اپنی زندگی اسی مشن کی تکمیل کے لئے صرف کر دی۔

دو قومی نظریہ اور کانگرس

میثاق لکھنؤ سرسید اور جانشینان سرسید کی کامیابی کا وہ روشن مینار ہے جس نے مسلمانان پاک و ہند کے قافلہ آزادی کی رہنمائی کی۔ یہ دو قومی نظریہ ہی تھا جس نے ١٩١٥ء میں مسلم زعما کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر یہ سوچنے پر آمادہ کیا کہ عنقریب ہندوستان کو اصلاحات ملنے والی ہیں۔ اس موقع پر مسلمانوں کو کیا طریق کار اختیار کرنا چاہیئے جس سے ان کی جداگانہ قومیت برقرار رہے اور ان کے سیاسی حقوق پامال نہ ہوں چنانچہ ١٩١٥ء میں جب بمبئی کے مقام پر آل انڈیا نیشنل کانگرس کا اجلاس ہونے والا تھا عین انہی ایام میں قائداعظم نے اسی بمبئی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس طلب کیا اور اجلاس میں یہ تجویز پیش کی کہ عنقریب ہندوستان کو کچھ سیاسی مراعات ملنے والی ہیں، اس لئے مناسب ہوگا کہ ملک کی دونوں سیاسی جماعتیں یعنی کانگرس اور مسلم لیگ کسی ایسی اسکیم پر متفق ہو جائیں جس میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہو۔ قائداعظم کی اس تجویز کی تائید مسٹر اے کے فضل الحق اور مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی کی۔ اس تجویز کو بروئے کار لانے کے لئے قائداعظم نے ایک کمیٹی تشکیل دی جس میں یہ اصحاب شامل تھے۔ خود قائداعظم، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں، سر شفیع، سر فضل حسین، ملک برکت علی، راجہ صاحب محمود آباد، سر رضا علی، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، سر وزیر حسن، مسٹر اے کے فضل الحق، سر آغا خاں، سر ابراہیم رحمت اللہ، سیٹھ یعقوب حسن، سر علی امام، مسٹر مظہر الحق، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑے بڑے کٹر کانگرسی مسلمان ابتدا میں قائداعظم کے رفیق کار، ان کے ہم نوا اور دو قومی نظریہ کے حامی تھے۔ جیسے مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر سید محمود مگر مصلحت بینی

اور ذاتی اغراض نے ان لوگوں کو بعد میں قائد اعظم کا مخالف بنا دیا اور ان اصحاب نے اپنے قول و عمل کے تضاد کو محسوس کئے بغیر مسلمانوں کے مخالف کیمپ میں شرکت کر لی۔

بہر حال ۳۱ دسمبر ۱۹۱۶ء کو لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس قائد اعظم کی زیر صدارت منعقد ہوا اور اس میں دو قومی نظریے کی بنیاد پر جداگانہ انتخاب کی وہ سفارشات منظور کر لی گئیں جو بمبئی میں قائد اعظم کی مقرر کردہ کمیٹی نے مرتب کی تھیں۔ چند روز کے بعد یعنی ۲۶ دسمبر ۱۹۱۶ء کو آل انڈیا کانگرس نے بھی جو مسٹر مزمدار کی زیر صدارت لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا مسلم لیگ کی سفارشات منظور کر کے دو قومی نظریہ اور جداگانہ انتخاب پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ بلاشبہ کانگرس سے یہ تجاویز منظور کرانے میں قائد اعظم کے اثر و نفوذ اور ان کے تدبر و فراست کا بڑا دخل تھا کہ وہ اس وقت تک مسلم لیگ کے رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ کانگرس کے بھی عظیم رہنما تھے۔ اس طرح برصغیر کی سب سے بڑی ہندو جماعت نے تسلیم کر لیا کہ ہندوستان ایک قوم کا مسکن نہیں ہے بلکہ یہاں دو قومیں آباد ہیں اور یہ کہ مسلمانوں کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے۔ کانگرس نے یہ اسکیم منظور تو کر لی مگر اس جماعت کے بعض رہنماؤں نے اسے کانگرس کی خطرناک سیاسی غلطی قرار دیا۔ ان لوگوں میں پنڈت مالوی اور لاجپت رائے بھی شامل تھے بلکہ اس گروہ کی قیادت یہی اصحاب کر رہے تھے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ کانگرس نے جداگانہ انتخاب کی بنیاد پر مبنی سفارشات منظور کر کے اپنے پیروں پر خود کلہاڑی ماری ہے اور مسلمانوں کے ہاتھ میں ایسا خوفناک ہتھیار دے دیا ہے جو ہمیشہ ان کا تحفظ کرے گا۔ یہ بات درست تھی واقعی دو قومی نظریہ اور جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر کے کانگرس نے اپنے ہاتھ کٹوا لیے تھے اور مسلمانوں کو ان کی ملی بقا کا راستہ مل گیا تھا۔

اب تک ہم نے دو قومی نظریے کے متعلق جو تصریحات پیش کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ برصغیر میں سرسید اس نظریہ کے سب سے پہلے داعی تھے اور ان کے رفقا میں مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، نواب وقار الملک اور محسن الملک کے بعد سر شفیع اور قائد اعظم نے دو قومی نظریہ کو فروغ دینے کی بھرپور کوشش کی۔ رفتہ رفتہ یہ نظریہ قائد اعظم اور مسلم لیگ کا نظریہ اور نصب العین بن گیا اور کانگرسی رہنماؤں نے جن میں بعض مسلمان اکابر بھی شامل تھے اس نظریہ کی شدید مخالفت کی اور برصغیر کے باشندوں کو ایک قوم کے فرد قرار دیا۔

مولانا آزاد اور دو قومی نظریہ

مولانا ابو الکلام آزاد اس متحدہ قومیت کے بہت بڑے علمبردار تھے۔ مگر بعض لوگوں کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہو گی کہ خود مولانا آزاد بھی عرصے تک دو قومی نظریے کے حامی اور داعی کی حیثیت سے برصغیر

کے مسلمانوں کی رہنمائی فرماتے رہے۔ ذیل میں حضرت مولانا کی بعض تحریروں کے اقتباسات درج کیے جاتے ہیں جن سے ہمارے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ:۔

"البتہ بطور تحدیثِ نعمت کے عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو یہ راہ سوجھائی کہ مسلمانوں کے پولیٹیکل نصب العین کو بھی قرآن کریم سے ماخوذ ہونا چاہیئے اور ان کو اس راہ میں از روئے مذہب قدم رکھنا چاہیئے نہ کہ یا تباع حریتِ یورپ و تقلید اخوانِ وطن، پھر یہ اس کا ایک فضل ہے اور اس میں گلے شکوے کی گنجائش نہیں۔ آج چالیس برس سے مسلمان پالٹیکس پر انکار یا اقرار سے بحث کر رہے ہیں لیکن براہ کرم بتایئے کہ آج تک ایک صدا بھی تمام اسلامی ہند میں اس کی بلند ہوئی۔ آج تک مسلمانوں نے اور ان کے تمام لیڈروں نے پولیٹیکل آزادی کو ہمیشہ ہندوؤں کی آرزو اور یورپ کے نئے آزادانہ دور کا نتیجہ سمجھا لیکن کسی نے اس پہلو پر نظر نہ ڈالی کہ خود اسلام بھی مسلمانوں کو ان کی سیاست کے لئے کوئی بلند جگہ دیتا ہے یا نہیں؟ اس کا دعویٰ کس کو ہے کہ نئی بات دکھلا دی البتہ ایک کھوئی ہوئی بصارت تھی جو اب واپس آگئی ہے[1]"

یہاں تک تو مولانا آزاد نے برصغیر کے مسلمانوں کو صرف اتنی ہی تلقین فرمائی کہ وہ بیرونی نظریات سے روشنی حاصل کرنے کی بجائے اپنی فکر کا چراغ قرآن اور اسلام کے چراغ سے روشن کریں کیونکہ اسلام مسلمانوں کی آزادی کا جامع ترین تصور دیتا ہے۔ اب مولانا آزاد کا ایک اور ارشاد ملاحظہ فرمایئے جس میں وہ ہندوؤں کے نظریات قبول کرنے سے نہ صرف مسلمانوں کو روکتے ہیں بلکہ ان سے سیاسی معاملات میں تعاون کرنے سے بھی باز رہنے کی تلقین فرماتے ہیں۔

"کفار سے مسلمانوں کو ساز باز نہ رکھنی چاہیئے۔ ان سے بے تعلق ہونا لازم ہے۔ جو ساز باز رکھتے ہیں جنہیں ان سے بے تعلق ہونے میں اپنے اور اپنی قوم کے لئے مشکلات اور مصائب کا اندیشہ ہو وہ غلطی پر ہیں۔ ان کو پشیمان ہونا پڑے گا۔ اسلام کو فتح نصیب ہوگی اور مسلمانوں کی بہبود و بہتری کا قدرت کاملہ کوئی اور انتظام کردے گی اس وقت معلوم ہوگا کہ "لات حین مندم ولا ینفع الندم" اس وقت نادم ہوئے جب ندامت مفید ہی نہ رہی[2]"

---

[1] الہلال ۲۰ دسمبر ۱۹۱۲ء بحوالہ تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علما مولفہ چوہدری حبیب احمد

[2] مضامین آزاد حصہ سوم بحوالہ تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علما۔

اپنی اس تحریر میں مولانا آزاد مسلمانوں کو صاف الفاظ میں مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ کفار سے جن میں تمام غیر مسلم شامل ہیں تعاون نہ کریں ورنہ ان کو پشیمان ہونا پڑے گا اور فتح انہی کو حاصل ہوگی جو صرف اور صرف اسلام سے اپنا پیوند جوڑیں گے۔ اب آخر میں مولانا کی ایک ایسی تحریر کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس میں وہ واشگاف الفاظ میں یورپ کی نیشنلزم کی مخالفت کرتے اور متحدہ قومیت کو باطل نظریہ قرار دیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے :-

"آج دنیا قوم اور وطن کے نام میں جو تاثیر دیکھتی ہے مسلمانوں کے لئے وہ اثر صرف اسلام یا خدا کے لفظ میں ہے۔ یورپ میں نیشن کا لفظ کہہ کر ایک شخص ہزاروں دلوں میں حرکت پیدا کر سکتا ہے لیکن آپ کے پاس اس کے مقابلے میں کوئی لفظ ہے تو وہ خدا یا اسلام ہے"

"ہو سکتا ہے کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کا دشمن بن جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا کے تمام عہد مودت خون اور نسل کے باندھے ہوئے پیمانِ وفا و محبت ٹوٹ جائیں مگر جو رشتہ ایک چین کے مسلمان کو افریقہ کے مسلمان سے ایک عرب کو بدو قریشی سے پیوست و یک جان کر سکتا ہے دنیا کی کوئی طاقت نہیں جو اسے توڑ سکے اور اس زنجیر کو کاٹ سکے جس میں خدا کے ہاتھوں نے انسان کے دلوں کو ہمیشہ کے لئے جکڑ دیا ہے[۱]"

کیا اس سے صاف ثابت نہیں ہو جاتا کہ حضرت مولانا ابو الکلام آزاد ۱۹۱۳ء تک تو یقیناً مسلمانوں کو ایک جداگانہ ملت قرار دیتے تھے مگر اس کے بعد انہوں نے اپنے ہی فرمودات پر خط تنسیخ کھینچ دیا اور ایک قومی نظریے کے داعی بن گئے۔ یقیناً یہ ان کی زندگی کا بہت بڑا المیہ ہے جس کے نتیجے میں ہندوستان کے ہزاروں مسلمان سیاسی لحاظ سے گمراہی کا شکار ہو گئے لیکن خداوند کریم کا شکر ہے کہ اسی برصغیر میں ایسے مسلمان رہنما پیدا ہو گئے جنہوں نے سر سید کے مشن کو آگے بڑھایا۔ جن میں قائد اعظم، سر شفیع، چوہدری رحمت علی اور علامہ اقبال اس نظریے کے پر جوش مبلغ تھے۔ علامہ اقبال نے تو اس نظریے کو ایک فلسفے کی شکل دے دی اور اپنی زندگی اس کی تبلیغ کے لئے وقف کر دی۔ اسی نظریہ پر مسلمان مفکرین و قائدین نے تصور پاکستان کا قصر عالی شان تعمیر کیا۔ آئندہ صفحات میں اس تصور کے تاریخی ارتقا پر روشنی ڈالی جائے گی۔

---

[۱] الہلال ۶ نومبر ۱۹۱۳ء

نظریۂ پاکستان کی تاریخ

ہم نے اس کتاب کے آغاز میں ایک مقام پر ثابت کیا ہے کہ ہندوستان ایک مختصر سی مدت کو چھوڑ کر کبھی متحد نہیں رہا۔ یہ اتحاد بھی ہندوؤں کی کوشش سے نہیں بلکہ بدھ سلطنت کے ذریعہ معرض وجود میں آیا تھا اور جلد ہی ہندوؤں کی سازشوں سے خاک میں مل گیا۔ اس کی اصل وجہ اس ملک کے باشندوں کی ایک دوسرے سے مختلف تہذیبیں، مختلف زبانیں، مختلف مذاہب اور مختلف قومیتیں ہیں اور اس عدم اتحاد کا سب سے بڑا باعث ہندوؤں کی وہ مخصوص ذہنیت ہے جو اپنے سوائے کسی دوسری قوم کا وجود گوارا ہی نہیں کرتی۔ چنانچہ ان کی اس ذہنیت کی کارفرمائیوں سے برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ دوسری اقوام کا تو ذکر کیا۔ انہوں نے مسلمانوں جیسی عالی ظرف، رواداراور منصف مزاج قوم کے ساتھ بھی نہایت تنگ نظری، نفرت اور تعصب کا سلوک کیا جس کی تفصیل اس کتاب میں درج کی جاچکی ہے۔ انگریزوں کی آمد کے ساتھ ہی ہندوؤں کا یہ تعصب اور مسلمانوں کو اس سرزمین سے مٹا دینے کا جذبہ شدت اختیار کرتا گیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مسلمان اب نہ صرف اقتدار سے محروم ہو چکے ہیں بلکہ اپنے دو دشمنوں ہندو اور انگریز کے درمیان بُری طرح پس رہے ہیں چنانچہ انہوں نے اس صورت حال سے پوری طرح فائدہ اٹھایا۔ ایک طرف تو انہوں نے انگریزوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا اور ان سے متنفر کرنے کی بھرپور کوشش کی تاکہ انگریزوں کے دل میں مسلمانوں کی ہمدردی کا جذبہ پیدا نہ ہو اور دوسری طرف اپنی تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی تنظیم کی طرف پوری توجہ کی تاکہ جب انگریز اس ملک سے رخصت ہو تو اقتدار بلا شرکت غیرے ان کے ہاتھ میں آجائے۔

نظریۂ پاکستان کا پہلا داعی

ہندوؤں کی اس روش سے مسلمان اکابر بھی بے خبر نہ تھے۔ وہ مسلسل کسی ایسے حل کی تلاش میں مصروف تھے جو مسلمان قوم کی مایوسیوں، ناکامیوں اور نامرادیوں کا مداوا کر سکے اور وہ اس ملک میں ایک آبرومند قوم کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں۔ چنانچہ سرسید احمد خان کی تعلیمی و سماجی تحریک، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی دینی اور انجمن حمایت اسلام لاہور کی تعلیمی و سماجی تحریک اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ عین اس وقت جب یہ بزرگ مسلمانانِ پاک و ہند کی سیاسی، تہذیبی اور دینی فلاح میں کوشاں تھے مسلمانوں کے ایک تہذیبی مرکز لکھنؤ

سے ایک آواز بلند ہوئی۔ یہ آواز اس دور کے ایک مسلمان صحافی مولانا عبدالحلیم شرر کی تھی۔ انہوں نے ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا حل پیش کرتے ہوئے اپنے ماہوار رسالہ "مہذب" میں لکھا کہ:۔

حالات کچھ ایسے ہی ہیں کہ کوئی قوم دوسرے فرقے کے جذبات کو مجروح کئے بغیر مذہبی رسوم ادا نہیں کر سکتی نہ ہی عوام میں اتنی رواداری اور صبر کا اتنا مادہ ہے کہ وہ دوسروں کی توہین کو معاف کر سکیں۔ اگر حالات اس حد تک پہنچ چکے ہیں تو پھر دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہندوستان کو ہندو اور مسلمان دو صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے اور آبادی کا تبادلہ کیا جائے۔ ہندوؤں کا رویہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو اپنا ہمسایہ نہ بننے دیں اور وہ اپنے مندر کی گھنٹیاں "مسلم مشرکین" کو سنانا پسند کرتے ہیں۔ نہ وہ اذان سننے کے روادار ہیں۔ ان حالات میں تقسیم ہند کی تجویز مسلمانوں کے لئے بھی قابل قبول ہو گی۔ کیونکہ وہ بھی ہندوؤں سے بیزار دکھائی دیتے ہیں۔" [1]

تقسیم ملک کی یہ پہلی تجویز تھی جو ۱۸۹۰ء میں پیش کی گئی۔ تقسیم کا یہ مطالبہ خالص مذہبی بنیادوں پر کیا گیا تھا۔ صرف تقسیم ہی کا مطالبہ نہیں بلکہ تبادلہ آبادی کی تجویز بھی اس میں شامل تھی۔ اگر یہ نظریہ اسی وقت قبول کر لیا جاتا تو ہماری آزادی کی منزل بہت قریب آجاتی اور انگریزوں نے ہندو مسلم اختلافات کو بہانہ بنا کر اس ملک کو آزادی دینے میں جو تاخیر کی وہ ہرگز نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ دونوں قوموں میں وسیع پیمانے پر جو خون خرابا ہوا وہ بھی نہ ہوتا۔ مگر اس وقت کے سیاسی حالات ایسے تھے کہ اس قسم کی کسی تجویز پر عمل ہونا مشکل تھا۔ خود انگریزوں کے لئے ان کے اپنے مفادات کے پیش نظر اس تجویز کو قبول کرنا مناسب نہ تھا۔ کیونکہ اس طرح برصغیر کے طول و عرض میں بکھرے ہوئے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر بہت بڑی طاقت بن جاتے اور جب وہ آزادی کا مطالبہ کرتے تو اسے دبانا انگریزوں کے لئے مشکل ہو جاتا۔ اس کے ساتھ ساتھ تقسیم ملک اور تبادلۂ آبادی کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا کہ ملک ہندو مسلم کش مکش سے نجات پا جاتا اور انگریزوں کا فائدہ اسی میں تھا کہ ہندوستان کے لوگ باہم دست و گریباں رہیں۔ پس ان حالات میں مولانا عبدالحلیم شرر کی تاریخی اور انقلابی تجویز کسی طرح پروان نہ چڑھ سکتی تھی بہر حال اس کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ مسلمان مفکرین اور مسلمان اکابر کے سامنے ہندوستان کی سیاسی کش مکش کا ایک حل ضرور آگیا۔ اس وقت نہ سہی بعد کے لوگوں نے اس کا نوٹس لیا اور اسی چراغ سے اپنی فکر کا چراغ روشن کیا۔

---

[1] ماہنامہ "مہذب" لکھنؤ ۲۳ اگست ۱۸۹۰ء۔ یہ حوالہ میں نے اپنے کرم فرما جناب حبیب اللہ اوج ایڈیٹر ہفت روزہ "پاک جمہوریت" لاہور کے قلمی مسودہ سے نقل کیا ہے۔ یہ شمارہ مکرم جناب ڈاکٹر عبدالسلام خورشید صاحب کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی کتاب "صحافت پاکستان و ہند" میں بھی صفحہ ۲۶۱ پر اس کی چند سطور درج ہیں۔ (مولف)

خیری برادران کا نظریہ

مولانا عبدالحلیم شرر کی اس تجویز کے ستائیس سال بعد دہلی کے دو بھائیوں جبار خیری اور ستار خیری نے ایک تجویز پیش کی جسے تقسیم ملک کی دوسری تجویز کہہ سکتے ہیں اور ہندوستان میں ایک ایسے پاکستان کی تجویز قرار دے سکتے ہیں جس کی بنا اسلام پر رکھی گئی تھی۔ جبار خیری اور ستار خیری جو دہلی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ زمانہ طالب علمی ہی میں سیاسی معاملات سے دلچسپی لینے لگے تھے۔ ان میں سے ستار خیری نے زیادہ نام پایا۔ وہ علیگڑھ یونیورسٹی میں جرمن اور فرانسیسی زبانوں کے پروفیسر بھی رہے اور آل انڈیا مسلم لیگ علی گڑھ کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ انہیں اپنے مخصوص سیاسی نظریات کی بنا پر قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں اور جنگ عظیم ثانی کے دوران دو سال تک ڈیرہ دون جیل میں قید رہے۔ ان کے دوسرے بھائی بھی پروفیسر تھے اور ستمبر ۱۹۴۵ء میں فوت ہوئے۔

خیری برادران نے اپنا فارمولا اسٹاک ہالم کی سوشلسٹ انٹرنیشنل کانفرنس میں پیش کیا تھا۔ یہ کانفرنس ۱۹۱۷ء میں منعقد ہوئی تھی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب جنگ عظیم اول اپنے عروج پر تھی۔ کانفرنس میں غور و فکر کے لئے جو موضوع پیش کئے گئے تھے ان میں عالمی امن کا قیام بھی شامل تھا۔ کانفرنس میں ہندوستان سے چار طلبہ شریک ہوئے۔ دو غیر مسلم دیریندر ناتھ چٹو پادھیہ اور ایم اچاریہ اور دو مسلمان ستار خیری اور جبار خیری۔ ان دونوں بھائیوں نے ہندوستان کی ایک مسلم تنظیم کی طرف سے کانفرنس کے شرکاء میں اپنی تجویز کی نقول تقسیم کیں۔ اس مسلم تنظیم کا نام "مسلمانان ہند کی مرکزی کمیٹی" بتایا گیا تھا۔

مذکورہ تجویز میں کہا گیا تھا کہ "حقیقی امن کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ دنیا کے تمام محکوم ممالک کو آزاد کر دیا جائے۔ اس کے بغیر جنگ کے بعد بھی پرامن فضا قائم نہیں ہو سکتی۔ انگریزوں کو ہندوستانیوں پر مظالم جاری رکھنے کا کوئی حق نہیں اور نہ انہیں ایک ایسے ملک کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھنے کا استحقاق حاصل ہے جو ساڑھے تینتیس کروڑ انسانوں کا ملک ہے۔ یعنی جس کی آبادی دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہے۔ .... ہندوستان کے لوگوں میں اپنے ملک کے امور حکومت سرانجام دینے کی صلاحیت ہے اور ہندوستان کو غلام بنائے رکھنے کے لئے یہ دلیل غلط ہے کہ اس ملک میں کئی مذاہب کے پیرو اور مختلف زبانیں بولنے والے لوگ آباد ہیں۔ اس دلیل کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ اہل ہند کو ان کے بنیادی حق سے محروم رکھا جائے۔"

مذکورہ یادداشت کو اس تجویز پر ختم کیا گیا تھا کہ "حق و انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بعض مسلم صوبے جن کا وجود ختم کر دیا گیا ہے پھر قائم کر دیئے جائیں جیسے بنگال، اودھ، سندھ، کرناٹک، مدارس میسور وغیرہ۔ اس ضمن میں دہلی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔" [1]

---

[1] قائد اعظم جناح دی اسٹوری آف اے نیشن ص ۲۹۵

خیری برادران کا فارمولا اور "ہینڈرسن"

خیری برادران کے فارمولے کے سرسری مطالعے سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ان دونوں بھائیوں کے دلوں میں آزادی کا شعلہ بھڑک رہا تھا اور انہوں نے سات سمندر پار جا کر اس زمانے میں برطانوی اقتدار کو للکارا تھا جب آزادی کا بڑے سے بڑا متوالا بھی اس بے خوفی اور بیباکی سے انگریزوں پر تنقید کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی یادداشت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سارے ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اول و آخر مسلمان تھے۔ اس لئے انہیں خطرہ تھا کہ آزادی کے بعد ایسی صورت حال نہ پیدا ہو جائے جس میں مسلم اقلیت ہندو کی محکوم بن کر رہ جائے۔ اس لئے انہوں نے ایسے علاقوں کی علیحدہ آزادی پر خاص زور دیا۔ جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی یا جہاں وہ انگریزوں کے تسلط سے قبل حکمران تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان علاقوں کو مسلم ریاستوں کی حیثیت سے آزادی دی جائے۔

خیری برادران کی اس تجویز پر بعض لوگوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ فارمولا آزاد ہندوستان کا تو ہو سکتا ہے مگر آزاد مسلم ہندوستان کا نہیں ہو سکتا۔ ان لوگوں کے خیال میں خیری برادران نے مذہبی بنیادوں پر تقسیم ملک کی تجویز پیش نہیں کی تھی۔ حالانکہ ان کی تجویز کے یہ الفاظ معترضین کے اعتراض کی نفی کرتے ہیں کہ:-

"حق و انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بعض مسلم صوبے جن کا وجود ختم کر دیا گیا ہے پھر سے قائم کر دیئے جائیں گے۔ جیسے بنگال، اودھ، سندھ، کرناٹک، مدراس، میسور اور دہلی"۔

ان الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے خیری برادران مسلم ریاستوں کے قیام کو حق و انصاف کے لئے ضروری قرار دیتے تھے۔ دراصل یہ اعتراض اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ خیری برادران کی تجویز کا مکمل متن ہمارے سامنے موجود نہیں۔ جن لوگوں کی نظر سے ان کی مکمل تجویز گزری ہے وہ خیری برادران کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم ہند کا داعی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ بلجیئم کے مشہور سوشلسٹ لیڈر اور انٹرنیشنل سوشلسٹ کانفرنس منعقدہ اسٹاک ہوم کے جنرل سیکرٹری مسٹر "کیمبل ہینڈرسن" نے بھی خیری برادران کو تقسیم ہند کا علمبردار قرار دیا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ پروفیسر ستار خیری نے اپنی اسیری کے ایام میں دیرہ دون جیل سے ۲۲ راگست ۱۹۴۷ء کو مسٹر سی آر اٹلی کی معرفت جو بعد کو برطانیہ کے وزیراعظم ہوئے مسٹر کیمبل ہینڈرسن کے نام ایک خط لکھا۔ اس کے جواب میں مسٹر ہینڈرسن نے مسٹر اٹلی کے نام اپنے خط میں تحریر کیا کہ:-

"ہندوستان کے دو مندوبین کے خط کے لئے جو آپ نے مجھے بھیجا ہے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے اسٹاک ہوم کانفرنس میں ان دونوں کی تشریف آوری کا واقعہ بخوبی یاد ہے۔ میں نے اسٹاک ہوم کانفرنس کی جو روئیداد فرانسیسی زبان میں مرتب کی تھی اور جو ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی تھی اس

کے صفحات ۲۰۷ تا ۲۰۸ پر آپ کو "مسلمانانِ ہند کی مرکزی کمیٹی" کی رپورٹ کا خلاصہ درج ملے گا
اگرچہ یہ محض خلاصہ ہے لیکن پھر بھی اس کے گہرے مطالعے سے ان دو مندوبین کے خط کی تصدیق
ہوتی ہے کہ انہوں نے درست لکھا ہے۔ میں بھی اپنی یادداشت کی مدد سے ان کی تائید کرتا ہوں کہ ان
مندوبین نے اسٹاک ہوم کانفرنس منعقدہ [illegible]ء میں ہندوستان کو مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا میں
تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔" [1]

یہ بیان ایک ایسے شخص کا ہے جو غیر اور غیر جانبدار ہونے کے علاوہ اس کانفرنس کا عینی شاہد اور جنرل سیکرٹری تھا جس میں خیری برادران نے تقسیم ملک کی تجویز پیش کی تھی۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس کی رائے کو جھٹلایا جائے۔ اس خط کی روشنی میں یہ خیال حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے کہ مولانا عبدالحلیم شرر کے بعد خیری برادران تقسیم ملک کے نظریئے کے دوسرے علمبردار تھے۔

نادر علی وکیل کی تجویز

پہلی جنگِ عظیم کے دوران جب انگریزوں اور ان کے اتحادیوں نے ترکیہ پر حملہ کر دیا اور ہندوستان میں خلافت کی تحریک جاری ہوئی تو برصغیر کے روشن ضمیر مسلمانوں نے اس تحریک کی اس بنا پر مخالفت کی کہ اس کے نتیجے میں ترکیہ کو تو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا البتہ ہندوستان کے مسلمان لاتعداد مشکلات میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس تحریک سے ہندوؤں کی غیر معمولی دلچسپی انہیں بری طرح کھٹک رہی تھی اور وہ محسوس کر رہے تھے کہ تحریکِ خلافت سے ہندوؤں کے تعاون کا سوائے اس کے اور کچھ مقصد نہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے زیادہ زیادہ نقصان پہنچایا جائے۔ چنانچہ انہی خدشات کی بنا پر بعض تعلیم یافتہ مسلمانوں نے تحریکِ خلافت کی سخت مخالفت کی۔ ان میں آگرہ کے ایک وکیل نادر علی بھی شامل تھے۔ انہوں نے ۱۹۲۰ء میں ایک پمفلٹ بھی شائع کیا جس میں ہندوستان کے سیاسی اور فرقہ وارانہ مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کا حل بھی پیش کیا۔ یہ حل تھا ہندوستان کی مذہبی بنیادوں پر "ہندو ہندوستان" اور "مسلم ہندوستان" میں تقسیم۔ مگر انہوں نے اپنی تجویز میں نہ تو اعداد و شمار پیش کئے تھے اور نہ ان علاقوں کا تعین کیا تھا جنہیں وہ "ہندو ہندوستان" اور "مسلم ہندوستان" میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ [2] گویا انہوں نے تقسیم کا تخیل پیش کیا تھا۔ اس کا کوئی واضح نقشہ ان کے ذہن میں نہ تھا۔

---

[1] مسٹر ہیز مین کا یہ خط پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف پاکستان راولپنڈی کی پریس گیلری میں محفوظ ہے اور راقم الحروف کو اس کی ٹائپ شدہ نقل جناب این۔ ایچ ہاشمی صاحب ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر نے عنایت فرمائی۔ (مولف)

[2] شاہراہ پاکستان ص۸۰ مولفہ چوہدری خلیق الزماں۔

بہر حال اس سے یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ ۱۸۹۰ء میں مولانا عبدالحلیم شرر نے ملک کی تقسیم کی جو تجویز پیش کی تھی۔ وہ کسی نہ کسی رنگ میں مسلمان اکابر کے سامنے موجود رہی اور انہوں نے اس تجویز کو ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے طور پر نہ صرف قبول کیا بلکہ قوم کو بھی اسے قبول کرنے کا مشورہ دیا۔

اس سلسلے میں بعض لوگ مسٹر مارسن سابق پرنسپل علی گڑھ مسلم کالج کا نام بھی لیتے ہیں۔ یقیناً انہوں نے بھی لندن سے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جس میں ہندو مسلم مسئلے کے متعلق ایک تجویز تھی۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ تقسیم کی تجویز نہیں تھی بلکہ ملک میں آئے دن جو فسادات ہوتے رہتے تھے۔ ان کے سدباب کے لئے ایک ایسی تجویز تھی جس میں کہا گیا تھا کہ اگر پچاس لاکھ مسلمان جو شمالی ہند میں منتشر ہیں نقل مکانی کر کے مغربی ہند میں آجائیں۔ تو ملک سے ہندو مسلم نزاع ختم ہو جائے۔ کہا جاتا ہے کہ مسٹر مارسن نے یہ تجویز خیری برادران کی تجویز سے اخذ کی تھی۔

سردار محمد گل خاں کی تجویز

اگر برصغیر کے مسلمان اکابر کے افکار و نظریات کو سلسلہ وار جمع کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی بنیادوں پر ملک کی تقسیم کا خیال ان کے ذہنوں سے ایک لمحے کے لئے بھی جدا نہیں ہوا اور کبھی نہ کبھی ملک کے کسی نہ کسی حصے کے ایک نہ ایک مسلمان کے ذہن میں یہ خیال ضرور موجود رہا اور وقتاً فوقتاً مختلف صورتوں میں اسے پیش بھی کیا جاتا رہا۔ چنانچہ نادر علی وکیل کے مطالبہ تقسیم کے کم و بیش دو سال بعد ڈیرہ اسماعیل خان کے سنگلاخ علاقے سے یہی صدا بلند ہوئی اور نادر علی وکیل کے مقابلے میں اس کا لب و لہجہ زیادہ سخت اور یہ تصور زیادہ واضح تھا۔

یہ ۱۹۲۳ء کا واقعہ ہے کہ صوبہ سرحد کے بعض علاقے سابق پنجاب میں ضم کرنے کے مسئلے پر ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ یہ کمیشن "برے کمیٹی" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کمیشن کے سامنے بیان دیتے ہوئے انجمن اسلامیہ ڈیرہ اسماعیل خان کے صدر سردار محمد گل خان نے اپنا نظریہ ان الفاظ میں پیش کیا۔

> "ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ انجمن اسلامیہ (ڈیرہ اسماعیل خان) کے رکن کی حیثیت سے میرا نظریہ یہ ہے کہ ۲۳ کروڑ ہندوؤں کو جنوب میں اور ۸ کروڑ مسلمانوں کو شمال میں تقسیم کر دینا چاہیئے۔ راسکماری سے آگرہ تک کا علاقہ ہندوؤں کو اور آگرہ سے پشاور تک کا سارا علاقہ مسلمانوں کو دے دینا چاہیئے۔" [۱]

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ ہندو اور مسلمانوں کو شمال اور جنوب میں تقسیم کر دینے کا نظریہ کہاں تک درست تھا۔ دیکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ سردار محمد گل نے ملک کی تقسیم کا نظریہ پیش کیا اور اس نظریہ کی بنیاد خالص مذہبی تھی۔

---

[۱] رپورٹ برے کمیٹی ص ۲۹، ص ۳۷ جلد اول بحوالہ تھاٹس آن پاکستان۔ مولفہ ڈاکٹر امبیڈکر۔

آگرہ اور دہلی ہندوستان کے مسلمانوں کے دو بڑے مراکز تھے اور ان دونوں شہروں سے لے کر (جن میں یو پی کے مغربی علاقے بھی شامل تھے) سابق پنجاب، کشمیر، سرحد اور سندھ تک کے علاقے مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے تھے۔ سردار محمد گل خاں ان علاقوں کو ملا کر ایک اسلامی ریاست میں تبدیل کر دینا چاہتے تھے۔ مگر آزاد اسلامی ریاست کی حیثیت سے نہیں کیونکہ اس وقت اس قسم کی کوئی تحریک موجود نہیں تھی۔ گو بعد کو اس کا لازمی نتیجہ ان علاقوں کی مکمل آزادی کی صورت میں نکلتا۔ البتہ بنگال ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اسی سے ملتی جلتی تجویز علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں پیش کی۔ اس تجویز میں بھی بنگال کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اس تجویز پر ہم آئندہ صفحات میں گفتگو کریں گے۔

مولانا محمد علی جوہر کی پیش گوئی

۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۳ء تک کا زمانہ برصغیر کے مسلمانوں کے لئے نہایت نازک زمانہ تھا۔ اس سات سالہ دور میں ہندوؤں کی مختلف تنظیموں نے ایک طے شدہ منصوبے کے مطابق تحفظ انسداد گاؤ کشی، شدھی اور سنگھٹن کے نام پر ملک کے طول و عرض میں ہزاروں مسلمانوں کا خون بہایا۔ ان کے مکانات اور دکانیں نذر آتش کر دیں، بچوں اور عورتوں کے ساتھ نہایت بہیمانہ اور انسانیت سوز سلوک کیا اور بعض علاقوں سے انہیں ترک وطن پر مجبور کیا۔ یہ ملک گیر فسادات اتنے ہولناک تھے کہ ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے داعی مولانا محمد علی جوہر کو بھی کہنا پڑا کہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں میں خون ریزی اسی طرح جاری رہی تو ہندوستان ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا میں تقسیم ہو جائے گا۔ مولانا نے یہ تقریر ۱۹۲۴ء میں علی گڑھ میں کی تھی[1] گویا محمد علی جوہر نے نہ صرف تقسیم ملک کا تخیل پیش کیا بلکہ برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی پیش گوئی بھی کر دی اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ان کی یہ پیش گوئی ۲۲ سال بعد لفظ بہ لفظ پوری ہو گئی۔

مولانا حسرت موہانی کی تجویز

اسی دوران میں کہ سردار محمد گل خاں اور مولانا محمد علی جوہر ہندوستان کی تقسیم کی تجویزیں پیش کر رہے تھے برصغیر کے بیباک اور حق گو مسلمان رہنما رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی نے اپنی خیال آفریں تجویز پیش کی۔ اگرچہ یہ تجویز آزاد اسلامی ہند کی نہ تھی، مگر اس میں شک نہیں کہ یہ تجویز مسلمانوں کے مفادات کو سامنے رکھ کر پیش کی گئی تھی۔ انہوں نے ۱۹۲۴ء میں بعض ذمہ دار ہندو رہنماؤں سے تبادلۂ خیال شروع کیا اور پھر اپنی وہ تجویز پیش کی جس نے انہیں اپنے عہد کا سب سے بڑا حریت پسند ثابت کر دیا۔ انہوں نے اپنی تجویز میں ہندوستان کے لئے درجۂ نو آبادیات کی بجائے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا اور ہندوؤں سے کہا کہ مسلمان ان کے ساتھ اس معاملے میں مکمل تعاون کریں گے۔ اس کے لئے انہوں نے ہندوؤں سے اس یقین دہانی کا مطالبہ کیا کہ آزادی

---

[1] شاہراہ پاکستان ص۱۰۸

کے بعد ہندوستان کو ہندو اور مسلم دو ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان دونوں کو ایک مرکزی نظام سے وابستہ کر دیا جائے۔

مولانا حسرت موہانی کی اس تجویز میں اگرچہ ایک خامی تھی یعنی ہندو اور مسلم ریاستوں کو ایک مرکزی نظام کے تحت کر دیا گیا تھا۔ مگر اس عہد میں یہ تجویز بھی بہت بڑا کارنامہ تھا جب کہ مکمل آزادی کی جرأت بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں کو بھی نہ ہوتی تھی۔ مولانا نے ہندوستان سے انگریزی اقتدار کے مکمل خاتمے کا مطالبہ کیا اور پھر انہوں نے مسلمانوں کے قومی مفادات کے تحفظ کے لئے اسلامی ریاست کے قیام کی بھی تجویز پیش کر دی۔ اس طرح انہوں نے ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا مطالبہ پیش کر کے ہندو اور مسلمانوں کو دو الگ الگ قومیں قرار دیا۔

لالہ لاجپت رائے کی تجویز

مولانا حسرت موہانی کی تجویز نہایت دور رس نتائج کی حامل ثابت ہوئی اور مسلمان تو مسلمان ہندوؤں نے بھی اس کا نوٹس لیا۔ چنانچہ پنجاب کے مشہور کانگرسی رہنما لالہ لاجپت رائے نے مولانا کی اس تجویز سے متاثر ہو کر تقسیم ہند کا ایک فارمولا پیش کیا۔ جس میں انہوں نے ہندوستان کے چار حصے کئے تھے۔ ایک حصے میں پورا پنجاب، سرحد، سندھ اور دوسرے میں مشرقی بنگال، تیسرے میں وہ علاقے جو کسی مسلم صوبہ میں شامل نہیں تھے۔ مگر ان میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ جیسے جموں و کشمیر اور مالابار۔ ان علاقوں کو مسلم انڈیا قرار دیا گیا تھا۔ چوتھا حصہ باقی ہندوستان پر مشتمل تھا اور یہ ہندو اکثریت کا علاقہ تھا۔ گویا موجودہ پاکستان ان تمام اسکیموں میں سے اس اسکیم سے قریب تر ہے۔ صرف پنجاب کی تقسیم اس فارمولے کے خلاف عمل میں آئی یا بلوچستان اس میں شامل ہوا جسے لالہ لاجپت رائے نے اپنی اسکیم میں شامل نہیں کیا تھا۔ اسی طرح جموں و کشمیر اور مالابار بھی اس میں شامل نہیں ہو سکے۔ لیکن جہاں تک جموں کشمیر کا تعلق ہے انشاء اللہ جلد یا بدیر پاکستان کا جزو بن جائیں گے۔ اس طرح لالہ لاجپت رائے کی یہ اسکیم مکمل طور پر جامۂ عمل پہن لے گی۔

نواب سر ذوالفقار علی خان کی تجویز

سرداروں اور خان بہادروں کے بدنام گروہ میں بعض ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے۔ جن کے دل میں اپنی قوم کا درد تھا اور جن کا سیاسی اور ملی شعور بہت بیدار تھا۔ ان لوگوں میں نواب سر ذوالفقار علی خان مرحوم کا نام سر فہرست ہے۔ نواب صاحب مرحوم ریاست مالیر کوٹلہ کے حکمران خاندان کے ممتاز فرد تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت شاہانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ انہیں انگریزی حکومت میں غیر معمولی اثر و رسوخ بھی حاصل تھا۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود ان کا قلب ایک درد مند مسلمان کا قلب تھا اور برصغیر کے مسلمانوں کی زبوں حالی اور ہندو اکثریت کی متعصبانہ روش دیکھ کر بے چین ہو جاتا تھا۔ وہ مسلمانوں کو صاحب عزت و عظمت اور آزاد

دیکھنا چاہتے تھے اور اس موضوع پر غور و فکر کرتے رہتے تھے۔ ان کے ذہن میں مسلمانوں کی آزادی اور برصغیر میں ان کی آئندہ حیثیت کے متعلق ایک واضح تصور تھا جسے انہوں نے دسمبر ۱۹۲۹ء میں خلافت کانفرنس کے سامنے پیش کیا۔ یہ کانفرنس ۳۰ر دسمبر کو لاہور میں منعقد ہوئی۔ مشہور مسلم لیگی رہنما نواب اسمٰعیل خان مرحوم کانفرنس کے صدر تھے۔ نواب صاحب مرحوم کی تقریر کے مندرجہ ذیل اقتباسات خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں:۔

"ہندوستان کے علاوہ دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں جہاں سات کروڑ افراد پر مشتمل ایک ایسا فرقہ ہو جو مذہب اور مقصد کے اعتبار سے ایک ہو۔ یہ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ ۲۱ کروڑ افراد کے فرقے کو تو ایک قوم تصور کیا جاتا ہے حالانکہ اس میں چھ کروڑ اچھوت ہیں اور جو سینکڑوں جاتیوں میں منقسم ہیں اور جن کا نہ تو ایک مذہب ہے، نہ ایک زبان نہ ایک تہذیب۔ ان میں نہ تو حقیقی انسانی اخوت کا تصور موجود ہے اور نہ ان کا کوئی سماجی ڈھانچہ ہے۔ لیکن چونکہ انہیں مجموعی طور پر ہندو کہتے۔ اس لئے انہیں ایک قوم تصور کر لیا گیا ہے مگر مسلمان جن میں اخوت کا جذبہ موجود ہے اور جو رنگ و نسل کے امتیاز سے بالاتر ہیں اور جن کا طرز زندگی ایک ہے انہیں محض ایک فرقہ وارانہ گروپ سمجھا جاتا ہے اور ان کی علیحدہ ہستی کے حق کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔"

"مسلمانوں کو انگریزوں اور ہندوؤں پر یہ بات واضح کر دینی چاہیئے کہ ہندوستان کا مسئلہ ایک فرقہ کا مسئلہ نہیں بلکہ دو مستقل فرقوں کا مسئلہ ہے۔ مسلمانوں کا قتلِ عام ہو سکتا ہے اور انہیں ہجرت پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ مگر سیاسی اعتبار سے نہ تو انہیں دوسری قوم میں مدغم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی وہ کسی دوسری قوم کی حکمرانی تسلیم کر سکتے ہیں۔ وہ ہندوؤں کے ساتھ پرامن بقائے باہمی کا مستقل اور پائیدار سمجھوتہ کر سکتے ہیں لیکن ان میں مدغم نہیں ہو سکتے۔ دنیا میں کئی ممالک ایسے ہیں جہاں مختلف فرقے بقائے باہمی کے اصول پر امن، اتحاد اور ترقی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور اس کے باوجود انہوں نے اپنی الگ ہستی کو برقرار رکھا ہوا ہے۔"

"جو لوگ ہندوستان میں متحدہ قومیت کے خواہشمند ہیں انہیں قومیت کے بنیادی اصولوں کی وضاحت کرنی چاہیئے۔ مسلمانوں نے اس برصغیر پر آٹھ سو برس حکومت کی۔ مگر اس کے باوجود الگ ہی رہے۔ جس قومیت کی بنیاد سماجی مساوات پر نہ ہو وہ چار دن بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔"

"ہندوستان کی آزادی اور ترقی کا دارومدار اس پر ہے کہ شمالی ہند میں مسلمانوں کو ایسا علاقہ دیدیا جائے جو دو یا تین صوبوں پر مشتمل ہو یا اسے ایک صوبہ میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس علاقے یا صوبہ میں مسلمانوں کی آبادی ۸۰ فی صد سے کم نہ ہو۔ اسی طرح مشرقی ہندوستان میں بنگال کی تقسیم اس طرح کی جائے جس میں مسلمانوں کی آبادی کا ۸۰ فی صد الگ ہو سکے۔ مسلمانوں کو حقوق کی بحالی کے بجائے ایک الگ ملک

اور وطن کا مطالبہ کرنا چاہیئے"۔ ؎

برصغیر کے جن مسلمان مفکروں اور دانشوروں نے اپنی قوم کو تقسیم ملک اور مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن کا تصور دیا ان میں نواب سر ذوالفقار علی خاں مرحوم وہ مظلوم شخصیت ہیں جن کا کسی مورخ نے ذکر نہیں کیا اور جن کی کوششوں کو کاملاً نظر انداز کر دیا گیا حالانکہ ان کی تقریر کے مندرجہ بالا اقتباسات سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ وہ برصغیر کے ہندو مسلم کشمکش کے مسئلے پر وسیع نظر رکھتے تھے اور دو قومی نظریہ کے زبردست مبلغ تھے۔ وہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے ایک الگ قوم اور ان کی طرز زندگی کو دنیا کے لیے نمونہ قرار دیتے تھے۔ وہ پہلے مسلمان رہنما تھے جنہوں نے نہایت تحدی زور اور قوت سے قوم کو اس طرف متوجہ کیا کہ حقوق طلبی کا دور گزر چکا ہے۔ اب مسلمانوں کی فلاح اسی میں ہے کہ انہیں برصغیر میں اپنے لیئے ایک الگ اور آزاد وطن کا مطالبہ کرنا چاہیئے۔ اس وطن کے لئے انہوں نے حدود کا بھی تعین کر دیا یعنی ہندوستان کے وہ صوبے جہاں مسلمانوں کی آبادی ۸۰ فی صد سے کم نہ ہو ظاہر ہے کہ اس طرح انہوں نے مغرب میں پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ کو اور مشرق میں بنگال کے اس حصے کو جہاں مسلمان اکثریت میں تھے آزاد اسلامی علاقہ قرار دیا۔

علامہ اقبال کا تصور

برصغیر کی تقسیم اور مسلمانوں کیلیئے علیحدہ وطن کی جو تجویزیں ۱۸۹۳ء سے ۱۹۲۹ء تک وقتاً فوقتاً پیش کی جاتی رہیں ان کے سرسری جائزے سے بھی اتنی بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں نے ابتداہی میں یہ محسوس کر لیا تھا کہ ان کا ہندوؤں کے ساتھ نباہ ممکن نہیں۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اور ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ نفرت، دشمنی، تعصب اور ظلم و ستم میں اضافہ ہوتا گیا مسلمانوں میں علیحدگی کا رجحان اسی قدر شدت اختیار کرتا گیا اور برصغیر کے مختلف علاقوں سے مسلمانوں کے لیئے الگ اور آزاد وطن کی صدائیں بلند ہوتی رہیں تاآنکہ ۱۹۲۹ء میں نواب سر ذوالفقار علی خاں نے برصغیر کی تقسیم اور مسلمانوں کی آزاد مملکت کا سب سے زیادہ واضح اور جامع فارمولا پیش کیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان تجاویز کے مجوز نہایت صائب الرائے اور اہل علم و نظر لوگ تھے لیکن ۱۹۲۹ء تک پیش ہونے والی ان تجاویز کی حیثیت انفرادی رہی۔ یعنی یہ مختلف مسلمان اکابر کی ذاتی آراء تھیں جو انہوں نے قوم کی بہتری اور مسلمانوں کی عزت و عظمت کی بحالی کے لئے پیش کیں۔ انہیں مسلمانوں کی اجتماعی رائے قرار نہیں دیا گیا۔ نہ انہیں مسلمانوں کے کسی نمائندہ اجتماع میں قوم کے کسی ہر دلعزیز رہنما نے مسلمان قوم کے مطالبے کی

؎ روزنامہ انقلاب لاہور ۱۴ جنوری ۱۹۳۶ء

حیثیت سے پیش کیا۔

۱۹۳۰ء وہ تاریخی سال ہے جب ملک کی تقسیم اور مسلمانوں کے لئے ایک آزاد وطن کے مطالبہ نے قومی حیثیت اختیار کی۔ یہ سعادت برصغیر کے عظیم مسلمان مفکر اور قومی شاعر علامہ سر محمد اقبال کے حصے میں آئی۔ علامہ مرحوم مسلمانانِ ہند کی نشاۃِ ثانیہ کے نقیب تھے۔ انہیں علوم اسلامی اور علوم جدیدہ دونوں پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ وہ اسلامی قانون کے ماہر تھے۔ انہوں نے تاریخ عالم اور تاریخ اسلام دونوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ مسلمانوں کے عروج و زوال اور اُمّتِ رسولِ ہاشمی کی ترکیبِ مزاج سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے یورپ کے دوران قیام میں فرنگی تہذیب کے مختلف پہلوؤں کا دِقّتِ نظر سے جائزہ لیا تھا۔ وہ برہمنی سماج اور برہمن کی افتادِ مزاج سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔ اس مطالعے اور مشاہدہ نے ان میں ایک خاص بصیرت پیدا کر دی تھی۔ ان کے مزاج پر رجائیت کا پہلو غالب تھا۔ وہ مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں ہمیشہ پر امید رہے۔ انہیں اس حقیقت کا بخوبی ادراک ہو چکا تھا کہ دنیا کی تمام تہذیبیں اور تمام فکری نظام تباہ ہو جائیں گے۔ صرف اسلام کا سماجی اور فکری نظام باقی رہ جائے گا۔ اس طرح انہوں نے جو نتائج نکالے اور جو افکار اپنی قوم کو دیئے وہ کسی وقتی اور ہنگامی جذبے کی پیداوار نہ تھے بلکہ ان کے پیچھے تاریخ، سیاست، عمرانیات اور الٰہیات کا وسیع مطالعہ کارفرما تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی مسئلے کے حل کے بارے میں انہوں نے جو تصور پیش کیا اس کی بنیاد غیر متزلزل یقین پر رکھی گئی تھی اور اس میں امید کی کرن نہیں بلکہ روشن آفتاب ضو فگن تھا۔

علامہ اقبال کا خطبہ الٰہ آباد

علامہ اقبال نے اپنا یہ تصور دسمبر ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس میں پیش کیا جو الٰہ آباد میں منعقد ہوا تھا اور جس کے صدر بھی وہ خود تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں کا ایک عظیم مفکر ان کے قومی اجتماع میں ان کے مسائل کا ایسا حل پیش کر رہا تھا جو صرف سترہ سال بعد پوری قوم کا مطالبہ بننے والا تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ تاریخی خطبہ ذرا تفصیل سے پیش کر دیا جائے۔

"حضرات!

میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے ایک ایسے وقت میں مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کا اعزاز بخشا ہے جب کہ مسلمانانِ ہندوستان کی سیاسی زندگی نے ایک نہایت ہی نازک صورت اختیار کر لی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس عظیم الشان اجتماع میں ان حضرات کی کمی نہیں جن کا تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ وسیع،

اور جن کی معاملہ فہمی کا میں دل سے قائل ہوں۔ لہٰذا یہ بڑی جسارت ہوگی اگر میں ان مسائل میں جن کے فیصلے
کے لئے آج یہ حضرات یہاں جمع ہوئے ہیں ان کی رہنمائی کا دعویٰ کروں۔ میں نے اپنی زندگی کا زائد حصہ اسلام
اور اسلامی فقہ و سیاست، تہذیب و تمدن اور ادبیات کے مطالعے میں صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس
مسلسل اور متواتر تعلق کی بدولت جو مجھے تعلیماتِ اسلامی کی روح سے رہا ہے جیسا کہ مختلف زبانوں میں
اس کا اظہار ہوا ہے میں نے اس امر کے متعلق ایک خاص بصیرت پیدا کرلی ہے کہ ایک عالم گیر حقیقت کے
اعتبار سے اسلام کی حیثیت کیا ہے۔"

"یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ بحیثیت ایک اخلاقی نصب العین اور نظامِ سیاست کے اسلام
ہی وہ سب سے بڑا اجزائے ترکیبی تھا جس سے مسلمانانِ ہند کی تاریخِ حیات متاثر ہوئی۔ اسلام ہی کی بدولت
مسلمانوں کے سینے ان جذبات و عواطف سے معمور ہوئے جن پر جماعتوں کی زندگی کا دارومدار ہے اور
جن سے متفرق و منتشر افراد بتدریج متحد ہو کر ایک متمیز و معین قوم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔
اور ان کے اندر ایک مخصوص اخلاقی شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ دنیا بھر میں
شاید ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہوا ہے۔"

"آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو اس امر سے
مایوس نہیں ہو گیا ہے کہ اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہنِ انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد
کر سکتی ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل
ہے اور جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے۔ اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے
نہیں کیا جا سکتا۔ .... یہ ایک زندہ اور عملی سوال ہے جس سے بطور ایک دستورِ حیات اور نظامِ
عمل کے اسلام کی ساری کائنات متاثر ہو سکتی ہے۔ صرف یہی ایک مسئلہ ہے جس کے صحیح حل پر اس امر کا
دارومدار ہے کہ ہم لوگ آگے چل کر ہندوستان میں ایک ممتاز و متمیز تہذیب کے حامل بن سکیں۔ اسلام پر
ابتلاء و آزمائش کا کبھی ایسا سخت وقت نہیں آیا۔ جیسا کہ آج درپیش ہے۔"

"یہ امر کس قدر افسوسناک ہے کہ اب تک ہم نے باہمی تعاون و اشتراک کی جس قدر کوششیں کی ہیں
سب ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہماری ناکامی کا باعث کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شاید
ہمیں ایک دوسرے کی نیتوں پر اعتماد نہیں اور باطناً ہم غلبہ و اقتدار کے خواہشمند ہیں۔ .... اگرچہ ظاہری
طور پر ہمیں ایک نہایت ہی روادارانہ حب الوطنی کا ادعا ہے لیکن دلوں میں ذات پات کی تنگی اور فرقہ آرائی
کی ہوس بدستور کام کر رہی ہے۔ ہم لوگ اس اصول کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ہر جماعت کو

یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تہذیب و تمدن کے نشوونما میں آزادی کے ساتھ قدم بڑھائے ...... جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے مجھے یہ اعلان کرنے میں مطلق تامل نہیں کہ اگر فرقہ وارانہ امور کے ایک مستقل اور پائیدار تصفیئے کے اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانانِ ہند کو اپنی روایات و تمدن کے ماتحت اس ملک میں آزادانہ نشوونما کا حق حاصل ہے تو وہ اپنے وطن کی آزادی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔"

"ہندوستان میں ایک متوازن اور ہم آہنگ قوم کے نشوونما کی طرح مختلف ملتوں کا وجود ناگزیر ہے۔ مغربی ممالک کی طرح ہندوستان کی یہ حالت نہیں کہ اس میں ایک قوم آباد ہو۔ وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہو اور اس کی زبان بھی ایک ہو۔ ہندوستان مختلف اقوام کا وطن ہے۔ جن کی نسل، زبان، مذہب سب ایک دوسرے سے الگ ہیں ...... غور سے دیکھا جائے تو ہندوستان میں کوئی واحد الجنس قوم نہیں۔ پس یہ امر کسی طرح بھی نامناسب نہیں کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کئے بغیر ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کریں۔"

"میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔ خواہ یہ ریاست سلطنتِ برطانیہ کے اندر حکومتِ خود اختیاری حاصل کرے، خواہ اس کے باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی۔ اس تجویز کو نہرو کمیٹی میں بھی پیش کیا گیا تھا۔ لیکن اراکین مجلس نے اسے اس بنا پر رد کر دیا کہ اگر اس قسم کی کوئی ریاست قائم ہوئی تو اس کا رقبہ اس قدر وسیع ہو گا کہ اس کا انتظام کرنا دشوار ہو جائے گا۔ بے شک اگر رقبہ کا لحاظ کیا جائے تو اراکین مجلس کا یہ خیال صحیح ہے لیکن آبادی پر نظر کی جائے تو اس ریاست کے باشندوں کی تعداد اس وقت کے بعض ہندوستانی صوبوں سے بھی کم ہو گی۔ غالباً قسمت انبالہ (انبالہ ڈویژن) یا اس قسم کے دوسرے اضلاع کو الگ کر دینے سے جن میں ہندو آبادی کا غلبہ ہے۔ اس کی وسعت اور انتظامی مشکلات میں اور بھی کمی ہو جائے گی ...... ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقہ میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے۔"[1]

خطبۂ اقبال کا تجزیہ

اقتباسات کچھ طویل ہو گئے لیکن یہ طوالت بلاوجہ نہیں۔ اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ علامہ اقبال نے مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کا مطالبہ کسی وقتی رو کی بنا پر نہیں کیا۔ نہ یہ کوئی ایسا خیال تھا جو اچانک ان کے ذہن میں آ گیا

---

[1] خطبات اقبال ص ۲۵ تا ۳۴۔ شائع کردہ غلام احمد پرویز اردو اکیڈمی سندھ کراچی۔

بلکہ ان کے اس تصور کا ایک واضح پس منظر ہے جو اسلامی تعلیمات، ادیانِ عالم اور ہندوستان کی تاریخ کے وسیع مطالعے سے عبارت ہے۔ افسوس کہ طوالت کے خوف سے ہم ان کا پورا خطبۂ صدارت درج نہیں کر سکے۔ جن لوگوں نے اس کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ علامہ مرحوم نے اس معرکۃ الآراء خطبۂ صدارت میں بعض بنیادی صداقتوں کو نہایت خوبصورتی سے ایک دوسرے سے مربوط کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنے اس فکر انگیز خطبے میں سب سے پہلے جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ اسلام ہی تھا جس نے مسلمانوں کے وجود کو اس مختلف الانواع اقوام کی سرزمین پر قائم و دائم رکھا اور ان میں ایک مخصوص اخلاقی شعور پیدا کیا۔ ان کے یہ الفاظ تاریخی قدر و قیمت کے حامل ہیں کہ "اسلام ہی وہ سب سے بڑا جزوِ ترکیبی تھا جس سے مسلمانانِ ہند کی تاریخِ حیات متاثر ہوئی اور شاید دنیا بھر میں ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہوا ہے۔" ہمارے زمانے میں قیامِ پاکستان کا تاریخ ساز واقعہ علامہ اقبال کے متذکرہ بالا آخری الفاظ کی بہترین تفسیر ہے۔

اس کے بعد علامہ مرحوم نے مسیحیت کے نظامِ افکار، نظامِ سیاست اور نظامِ مذہب سے اسلام کا مقابلہ کیا ہے اور ان اسباب پر روشنی ڈالی ہے جن کی بدولت مغرب نے مذہب کو سیاست سے علیحدہ کر کے اسے فرد کا نجی مسئلہ قرار دے دیا اور جس کے نتیجے میں حضرت مسیح علیہ السلام کا عالمگیر اخلاقی نظام غارت ہو گیا اور اس کے بجائے متعدد تباہ کن نظاموں نے لے لی۔ انہوں نے نہایت تحدی سے اس گمراہ کن خیال کی تردید کی ہے کہ اسلام میں بھی مذہب اور سیاست کے دائرے الگ الگ ہیں۔ علامہ مرحوم نے اس صورتحال پر سخت تشویش ظاہر کی کہ "اس وقت مغرب کے افکار نے نہایت تیزی کے ساتھ نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر تمام دنیائے اسلام میں انقلاب برپا کر رکھا ہے۔ نوجوان مسلمانوں کی خواہش ہے کہ وہ ان افکار کو عملاً اپنی زندگی کا جزو بنا لیں۔" علامہ اقبال نے مسلمان نوجوانوں کو متنبہ کیا ہے کہ وہ ان خطرات سے دوچار نہ ہوں جنہوں نے مغرب کے اخلاقی نظام کو تہہ و بالا کر دیا ہے۔ انہوں نے مسلمان نوجوانوں کو یاد دلایا ہے کہ اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے۔ جو ذہنِ انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے۔ جس کا عقیدہ یہ ہے کہ مذہب، کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

علامہ مرحوم کے اس خطبے کا وہ حصہ خاص طور پر نہایت فکر انگیز ہے جہاں انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں سے یہ سوال کیا ہے کہ "کیا واقعی مذہب ایک نجی مسئلہ ہے اور آپ بھی یہ چاہتے ہیں کہ ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی قوت کے تو برقرار رکھیں لیکن اس کے نظامِ سیاست کے بجائے

ان قومی نظاموں کو اختیار کرلیں، جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔"

اقبال اس سوال کے جواب میں ایک بڑی روشن حقیقت کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں کہ اسلام کوئی ایسا فکری نظام نہیں جس کا تعلق صرف انسان کی اندرونی کیفیت سے ہو اور اس کے بیرونی گردوپیش پر پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے بلکہ یہ ایک ایسا جامع اور ہمہ گیر نظام حیات ہے۔ جس سے متعدد بڑے بڑے نظام تخلیق پاتے ہیں اور اس کے پہلے نتیجے کے طور پر ایک ایسا نظام سیاست وجود میں آتا ہے جس کے اندر تمام قانونی تصورات پوشیدہ ہیں۔ علامہ اقبال ہمیں اسلام کا یہی تصور اپنانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ کیونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واردات اور قرآن حکیم کی تعلیمات کی روشنی میں اسلام کا صحیح تصور یہی ہے۔

اس کے بعد اقبال مسلمانوں کے اس مخصوص نظام حیات کی روشنی میں ہندوستان کی دوسری اقوام کے فکری اور سماجی نظاموں کا جائزہ لیتے ہیں اور اس خیال کو بعید از امکان قرار دیتے ہیں کہ ہندوستان کی دوسری اقوام کے ساتھ مسلمانوں کا اس طرح اتحاد ہو سکتا ہے جس کے نتیجے میں ایک ملک گیر قوم جنم لے لے۔ وہ نہ صرف ہندوستان میں فرقہ وارانہ مسئلہ کا وجود ایک اٹل حقیقت کے طور پر ثابت کرتے ہیں بلکہ نہرو رپورٹ کے مرتبین کی یہ چشم کشا دیوالی رائے پیش کرتے ہیں کہ "وسیع قومیت کے نقطۂ نگاہ سے فرقہ وارانہ بنیادوں پر صوبوں کا قیام ایک بین الاقوامی ریاست کے وجود کیلئے نہایت ضروری ہے۔"

اس کے بعد اقبال اس تاریخی صداقت کا اعادہ کرتے ہیں جس کا ان کے پیش رو سرسید احمد خاں نے بڑے زور اور قوت سے اظہار کیا تھا کہ مغربی ممالک کی طرح ہندوستان میں کوئی ایک قوم آباد نہیں ہے جو کسی ایک نسل سے تعلق رکھتی ہو اور جس کا ایک تمدن ہو، ایک مذہب اور جس کی ایک الگ زبان ہو بلکہ یہاں بہت سی قومیں آباد ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کی نسل، زبان، تہذیب اور مذہب دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر اقبال یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہندوستان کسی زمانے بھی کسی ایک قوم کا مسکن نہیں رہا اور یہ وہ دعویٰ ہے جو کسی ثبوت کا محتاج نہیں۔

ان تاریخی حقیقتوں کی نشاندہی کے بعد اقبال اپنا وہ شہرہ آفاق تصور پیش کرتے ہیں جس کے مطابق پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک اسلامی ریاست قائم ہونی چاہیئے۔ اس مرحلے پر وہ بعض معترضین کا یہ اعتراض دہراتے ہیں کہ رقبہ کے لحاظ سے یہ اتنا بڑا ملک ہو گا جس کا انتظام کرنا یہاں کے لوگوں کے لئے مشکل ہو جائے گا۔ اس اعتراض کے جواب میں وہ پنجاب کی تقسیم کی تجویز پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں اگر انبالہ ڈویژن اور اسی طرح کے بعض دوسرے اضلاع جن میں ہندوؤں کی اکثریت ہے الگ کر دیئے جائیں تو اس اسلامی ریاست کا رقبہ اور کم ہو جائے گا۔

اس زمانے میں بھی اور اس کے بعد بھی علامہ اقبال کے اس تصور پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا گیا تھا کہ

اگر اس کے مطابق کوئی اسٹیٹ قائم ہوئی تو اس کا وجود برقرار نہیں رہ سکے گا۔ اور مخالف طاقتیں اسے بڑی آسانی سے فتح کر دیں گی۔ پنڈت جواہر لال نے بھی ایک موقع پر یہی اعتراض کیا تھا۔ چنانچہ اقبالؒ اس اندیشہ کو غلط قرار دیتے ہوئے وہ اعداد و شمار پیش کرتے ہیں جن کی روشنی میں ہندوستان کے شمال مغربی علاقے کے باشندوں کی شجاعت اور عسکری اسپرٹ ایک مسلمہ حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ اعداد و شمار پیش کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اگر شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک ریاست قائم کر دی گئی تو وہ اپنی جنگجویانہ صلاحیتوں سے تمام بیرونی حملوں کے خلاف نہ صرف اس علاقے ہی کے نہیں بلکہ بقیہ ہندوستان کے بھی بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔

آخری بات جو اقبالؒ نے اپنے خطبۂ صدارت کے اختتام پر کہی ہے بڑی معنی خیز ہے اور وہ یہ کہ "ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام سے سیکھا ہے یہ ہے کہ صرف اسلام تھا جس نے آڑے وقتوں میں مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا نہ کہ مسلمان۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سر نو جمع ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔"

خطبۂ اقبال کا بنیادی تصور

علامہ اقبالؒ کے خطبۂ الٰہ آباد کے یہ آخری الفاظ خاص طور سے ہمیں اس بنیادی تصور کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں جو اقبال ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اقبالؒ نے جب ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں کو ملا کر ایک اسلامی اسٹیٹ بنانے کا مطالبہ کیا تو اس سے ان کا مقصد صرف یہ نہ تھا کہ ایک ایسی ریاست معرض وجود میں آجائے جو غیروں کے تسلط سے آزاد ہو یا جس سے مسلمانانِ ہند کے اقتصادی مسائل حل ہو جائیں۔ کیونکہ جہاں تک روٹی کا تعلق ہے تو شاید موجودہ زمانے کے مقابلے میں ہمیں کہیں زیادہ آسانی سے اور زیادہ پیٹ بھر کر اس زمانے میں میسر آجاتی تھی۔ اسی طرح جہاں تک صرف جسمانی آزادی کا سوال ہے تو یہ بھی اپنی ذات میں اسلام کا منتہائے مقصود نہیں اور نہ اقبالؒ کے افکار سے اس کی ترجمانی ہوتی ہے کیونکہ جسمانی طور پر آزاد ہونے کے باوجود بھی انسان غلام رہتا ہے۔ مغرب کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں ہر قوم آزاد ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو مغربی اقوام پست اخلاق گھٹیا جذبات اور فرسودہ افکار کی قید سے آزاد نہیں۔

پھر وہ کون سا تخیل تھا جس کی بنیاد پر اقبالؒ نے ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں کو ملا کر ایک اسٹیٹ بنانے کا مطالبہ کیا؟ اس کا جواب ہمیں اقبالؒ کے خطبۂ الٰہ آباد ہی میں مل جاتا ہے۔

"میں صرف ہندوستان اور اسلام کے فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازنِ قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائیگا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔" .... اور "ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے۔"

گویا اقبالؒ ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں کو ملا کر ایک اسلامی اسٹیٹ کے قیام کا مطالبہ صرف اس لئے کرتے ہیں تاکہ ہندوستان میں داخلی امن کے بعد اسلام اپنی صحیح شکل و صورت میں نمودار ہو اور وہ ملوکیت کے اثرات سے آزاد ہو جائے۔ اقبال ہندوستان میں اسلامی اسٹیٹ کا مطالبہ اس لئے کرتے ہیں تاکہ اس طرح اسلام کو اپنی نشوونما کے لئے ایک ایسا خطہ مل جائے جس میں وہ تمدنی قوت کے طور پر زندہ رہ سکے۔ وہ برصغیر میں اسلامی اسٹیٹ کے قیام کا مطالبہ اس لئے کرتے ہیں تاکہ اس ریاست میں اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی علوم و فنون کو آزادانہ بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا موقع مل سکے۔ وہ اس ریاست کو خالص اسلامی اسٹیٹ بنانے کے آرزومند ہیں، جہاں کوئی غیر اسلامی نظریہ پروان نہ چڑھ سکے۔ انھوں نے اسلامی اسٹیٹ کا مطالبہ اس لئے نہیں کیا تھا کہ ہم صرف جسمانی طور پر انگریز کی غلامی سے آزاد یا ہندو کی غلامی سے محفوظ ہو جائیں۔ لیکن ہمارے افکار بدستور غلام رہیں۔ ہم وضع میں نصاریٰ ہوں اس تمدن میں ہنود رہیں۔ اسلام کے نظامِ حیات کی موجودگی کے باوصف ہم غیر اسلامی اور غیر ملکی نظریات کو اپنا سرمایۂ افتخار سمجھیں اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ ان پر اسلام کا لیبل لگا کر اسلام کی بھی غارتی لگائیں۔ انھوں نے ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں کو ملا کر ایک اسلامی اسٹیٹ کا مطالبہ اس لئے نہیں کیا تھا کہ یہاں اسلام سے مذاق کیا جائے اور اس کی روح کو مسخ کرنے کی شرمناک کوشش کی جائے اور نہ اس لئے اسلامی اسٹیٹ کا مطالبہ کیا تھا کہ کوئی خاص جماعت یا گروہ صرف اپنے اسلام کو معتبر قرار دے کر دوسروں کے اسلام کو غیر معتبر قرار دے۔

اقبالؒ کا خطبۂ الٰہ آباد ہمیں ایک ایسی اسلامی اسٹیٹ کے قیام کی دعوت دیتا ہے جس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا لایا ہوا دین اسی قوت کے ساتھ ظاہر ہو سکے، جس قوت سے وہ عرب میں ظاہر ہوا تھا اور پھر اس نے ہندوستان کی تاریخ کو متاثر کیا تھا اور ظاہر ہے کہ اقبالؒ کے نزدیک دین

ایک مخصوص روحانی نظام کا نظام نہیں ہے بلکہ یہ فرد اور ریاست کے جملہ مسائل و معاملات پر حاوی ہے جس میں اقتصادی مساوات، عدل و انصاف، تربیتِ نفس، اشاعت علوم، ارتقائے فکر و فن، قوانین امن و جنگ غرض سب کچھ شامل ہے۔ اسی لئے اقبال ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ "اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جمادیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سرِنو جمع ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔"

اقبال کے نزدیک ہم ایک آزاد ریاست قائم کئے بغیر اسلامی تخیل کے مطابق زندگی نہیں گزار سکتے تھے اور نہ اپنی پراگندہ قوتوں کو یکجا کر کے ہلاکت و بربادی سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ گویا اقبال ہمیں ایک آزاد اسلامی ریاست قائم کرنے کا مشورہ اس لئے دیتے ہیں تاکہ اس ریاست کو ہم اسلامی اصولوں کی تجربہ گاہ بنائیں اور دنیا کے سامنے ایک ایسا طرزِ زندگی پیش کر سکیں جو فلاحِ دارین کا نمونہ ہو۔

اسلامی ریاست کا تخیل، اقبال کے بعد

ہندوستان میں اسلامی ریاست کے متعلق علامہ اقبال نے جو تصور پیش کیا سطورِ بالا میں اس پر کافی بحث و گفتگو کی جا چکی ہے۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سر سید اور مولانا عبدالحلیم شرر نے جس تخیل کی بنیاد رکھی تھی وہ مختلف ادوار سے ہوتا ہوا اور مختلف ذہنوں سے نکلتا ہوا اقبال کے ذہن میں پوری تابانی سے روشن ہونے کے بعد کن مراحل سے گزرا اور اس نے کیا کیا صورتیں اختیار کیں۔

چوہدری رحمت علی کا نظریۂ پاکستان

اس حقیقت سے کوئی فہمیدہ شخص انکار نہیں کر سکتا کہ برصغیر کے جس مفکر نے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ علامہ اقبال ہی تھے۔ ان سے متاثر ہونے والوں میں سرفہرست وہ لوگ تھے جو لاہور سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں بھی سرفہرست وہ لوگ تھے جو اسلامیہ کالج لاہور میں تعلیم پا رہے تھے۔ لاہور کا اسلامیہ کالج ایک لحاظ سے اقبال کا کالج تھا کیونکہ اقبال اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے تعلیمی میدان، ریواز ہوسٹل اور اس سے قبل اسلامیہ کالج کی اس عمارت میں جو شیرانوالہ گیٹ میں واقع تھی سال ہا سال تک طلبہ سے خطاب کرتے رہے۔ یہ خطاب نظم کی صورت میں ہوتا تھا جو وہ انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں پڑھا کرتے تھے۔ ان جلسوں میں اسلامیہ کالج کے طلبہ نہایت پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ انہی طلبہ میں ایک طالب علم چوہدری رحمت علی بھی تھے جنہوں نے اقبال سے ذہنی راہنمائی حاصل کی۔ وہ مشرقی پنجاب کے ضلع ہوشیارپور میں ایک گاؤں موہر نامی میں پیدا ہوئے ان کے والد چوہدری شاہ محمد نہایت دیندار بزرگ تھے اور انہوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت میں گہری

دلچسپی لی۔ خود چوہدری رحمت علی کا بیان ہے کہ میرے اسلامی افکار کا سرچشمہ میرے والد کی ذات ہے۔ ان کے علاوہ ایک ممتاز عالم دین سید تاج حسین کی شخصیت کا بھی چوہدری رحمت علی کے افکار پہ نہایت گہرا اثر پڑا۔ یہ بزرگ چوہدری صاحب کے پڑوس میں رہتے تھے۔ قرآن حکیم اور فارسی کی ابتدائی کتابیں انہوں نے اسی جید عالم سے پڑھیں[1]۔ ماحول کی اسی پاکیزگی اور دیندار بزرگوں کی تربیت نے چوہدری رحمت علی کی شخصیت کی تعمیر میں بڑا حصہ لیا۔ لاہور آکر وہ اسلامیہ کالج میں داخل ہوئے۔ اس زمانے کا اسلامیہ کالج خاص طور سے اسلامی افکار و خیالات کی تربیت گاہ تھا۔ ہندو تعلیمی اداروں سے اس کا زبردست مقابلہ تھا۔ اس مقابلے نے اسلامیہ کالج کے اساتذہ اور طلبہ دونوں میں ایک خاص اسلامی اور قومی اسپرٹ پیدا کر دی تھی۔

یہ ۱۹۱۵ء کے لگ بھگ کا زمانہ تھا۔ ہندوستان میں مختلف سیاسی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم کشمکش خونیں رنگ اختیار کر چکی تھی۔ اور ہندو فرقہ پرست مسلمانوں کو ہر شعبۂ حیات میں پسماندہ رکھنے کے ساتھ ساتھ انہیں تباہ و برباد کرنے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف تھے۔ چوہدری رحمت علی جنہوں نے اپنے گھر اور اپنے اردگرد کے ماحول سے اسلام کا سبق سیکھا تھا اور جو اسلام کو سربلند دیکھنا چاہتے تھے مسلمانوں کو خاک بسر اور اسلام کو ستم رسیدہ دیکھ کر تڑپ اٹھے۔ وہ ابتدا ہی سے نہایت ذہین واقع ہوئے تھے۔ ان میں خطابت کے جوہر بھی تھے۔ وہ اپنے ماحول کو متاثر کرنا جانتے تھے۔ چنانچہ ان کی شخصیت نے اسلامیہ کالج میں جلد ہی مرکزی حیثیت حاصل کر لی۔ وہ کالج یونین کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔ اور کالج کے مجلہ "کریسنٹ" کے ایڈیٹر بھی مقرر ہوئے۔ انہوں نے ایک ادارہ "بزم شبلی" کے نام سے بھی قائم کیا۔ اس انجمن کو انہوں نے اپنے قومی نظریات اور سیاسی خیالات کے اظہار کے لئے منتخب کیا۔ اس طرح اسلامیہ کالج میں ان کے ہم خیال افراد کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا۔

مسلم ریاست کا نظریہ

شاید یہ انکشاف بہت سے لوگوں کے لئے تعجب انگیز ہو گا کہ ابھی برصغیر کے مسلمانوں میں سے کسی مسلمان مفکر نے ہندوستان کے شمال مغربی علاقے کو آزاد مسلم ریاست میں تبدیل کرنے کا مطالبہ نہیں کیا تھا کہ لاہور کے تاریخی شہر سے ایک آواز بلند ہوئی :-

"ہندوستان کا شمالی منطقہ اسلامی علاقہ ہے۔ ہم اسے اسلامی ریاست میں تبدیل کریں گے۔ لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس علاقے کے باشندے خود کو باقی ہندوستان سے منقطع کر لیں۔

---

[1] جناب اقبال اسد کا مضمون "چوہدری رحمت علی" مطبوعہ روزنامہ "امروز" ۱۴ اگست ۱۹۶۳ء

اسلام اور خود ہمارے لئے بہتری اس میں ہے کہ ہم یہ علیحدگی جلد سے جلد اختیار کریں۔" ؎

یہ الفاظ چوہدری رحمت علی کے تھے اور اس وقت کہے گئے تھے جب نہ نیری برادران نے، نہ ڈیرہ اسماعیل خان کے سردار محمد گل خاں نے نہ مولانا حسرت موہانی نے نہ لالہ لاجپت رائے نے نہ نواب سر ذوالفقار علی خاں نے اور نہ علامہ اقبال نے اس قسم کا کوئی مطالبہ کیا تھا اور نہ کوئی ایسا تصور پیش کیا تھا۔ یعنی ۱۹۱۵ء میں۔ یہ بات خود چوہدری رحمت علی نے اپنی انگریزی کتاب "پاکستان" میں درج کی ہے کہ انہوں نے یہ نظریہ ۱۹۱۵ء میں "بزم شبلی" کے افتتاحی خطبے میں پیش کیا تھا۔ چوہدری صاحب اپنے نظریات میں بڑے سخت متشدد تھے۔ وہ ہر اس تجویز سے نفرت کرتے تھے جو برصغیر کے شمال مغربی علاقے کے مسلمانوں کو ہندو اکثریت کا غلام بنا دے یا اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے بڑے بڑے مسلم رہنماؤں مثلاً مولانا محمد علی جوہر اور مولانا حسرت موہانی تک پر تنقید کرنے سے گریز نہیں کیا۔ کیونکہ یہ حضرات اس وقت تک ہندوؤں کے اشتراک سے آزادی کی جنگ لڑنے اور متحدہ ہندوستان کی آزادی کے حامی تھے۔ انتہا تو یہ ہے کہ انہوں نے علامہ اقبال کو بھی معاف نہیں کیا اور ان کا حد درجہ ادب و احترام کرنے، انہیں مسلمانانِ ہند کا عظیم مفکر اور عظیم قومی شاعر قرار دینے کے باوجود ان کے خطبۂ الٰہ آباد پر صرف اس لیے اعتراضات کئے کہ علامہ مرحوم نے ہندوستان کو ایک ملک اور اس میں آباد مسلمانوں کو ہندوستانی قوم کیوں قرار دیا۔ ان کے خیال میں علامہ اقبال کی یہ تجویز کہ ہندوستان کے صرف چار صوبوں کو ملا کر ایک مسلم اسٹیٹ قائم کردی جائے نہایت محدود اسکیم ہے اور ان اسکیموں سے بھی کم وسیع ہے جو بعض دیگر اصحاب نے پیش کیں۔ چوہدری رحمت علی نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر علامہ اقبال کے نظریئے کو اپنا کر ہندوستانی وفاق تشکیل دے دیا جائے تو اس سے ہماری مشکلات کہیں زیادہ بڑھ جائیں گی۔" ؎

لفظ "پاکستان" کا خالق

چوہدری رحمت علی مرحوم کے مختصر سوانح اور ان کے افکار کے مطالعے سے یہ بات بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ اول و آخر کٹر مسلمان تھے اور ان کے افکار میں لچک نام کو نہیں تھی۔ وہ ہندو سیاست کی پیچیدگیوں سے خوب واقف تھے۔ انہوں نے برہمنی مزاج کا بڑی گہری نظر سے مشاہدہ کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے دل میں ہندو سیاست اور ہندو سماج کے خلاف سخت نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ہندوؤں کے ساتھ اشتراک عمل کو کسی حالت میں جائز نہیں سمجھتے تھے اور ایسے مسلمانوں کے حق میں سخت مضر تسلسل قرار دیتے تھے۔

؎ پاکستان دی فادر لینڈ آف دی پاک نیشن ؎ پاکستان دی فادر لینڈ آف دی پاک نیشن

وہ ہندی مسلمانوں کو عموماً اور شمال مغربی علاقے کے مسلمانوں کو خصوصاً ایک الگ قوم خیال کرتے تھے۔ جس کا بقیہ ہندوستان کی اقوام سے کسی نوع کا کوئی تعلق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں لفظ ہندی یا ہندوستانی سے بھی سخت نفرت تھی۔ انہوں نے بھی علامہ اقبال کی طرح برصغیر میں ایک مسلم ریاست تشکیل دینے کا مطالبہ کیا اور یہ مطالبہ علامہ اقبال کے مطالبے سے پندرہ سال قبل کیا۔ البتہ انہوں نے اس مطالبے میں جموں و کشمیر کے علاقے شامل کر کے اور وسعت پیدا کر دی۔ کیمبرج کے دوران تعلیم میں انہوں نے اپنا یہ نظریہ پوری شد و مد سے پیش کیا۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اپنی تجویز کو "پاکستان" کا نام دیا اور وکالت ترک کر کے ۱۹۳۳ء میں "پاکستان نیشنل موومنٹ" کے نام سے ایک تحریک جاری کی جس کے وہ خود صدر تھے۔ پاکستان کے نام سے یہ پہلی تحریک تھی۔ انہوں نے پاکستان کا نام پہلی بار اپنے مشہور کتابچے "ناؤ آر نیور" (اب یا کبھی نہیں) میں استعمال کیا۔ یہ کتابچہ انہوں نے جنوری ۱۹۳۳ء میں "پاکستان نیشنل موومنٹ ۱۶ مانٹیگو روڈ کیمبرج" سے شائع کیا۔

انہوں نے لفظ "پاکستان" مغربی ہند کے ان علاقوں کے ناموں کے پہلے حروف کو ملا کر بنایا تھا جو ان کی تجویز کردہ آزاد اسلامی ریاست میں شامل ہونا چاہیے تھے۔ یعنی پ پنجاب کا، الف افغانیہ کا (صوبہ سرحد کا نام جو چوہدری رحمت علی نے تجویز کیا تھا) ک کشمیر کا، س سندھ کا اور تان بلوچستان کا۔

نظریۂ پاکستان کی وضاحت

اس رسالے پر جن افراد نے دستخط کئے تھے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ چوہدری رحمت علی، خان محمد اسلم خان خٹک متعلم آکسفورڈ، صاحبزادہ شیخ محمد صادق متعلم شعبۂ قانون لندن، اور خان عنایت اللہ خان طالب علم ڈنٹری کالج لندن۔

یہ کتابچہ چوہدری رحمت علی نے اس تاریخی موقع پر لندن میں تقسیم کیا جب گول میز کانفرنس منعقد ہو رہی تھی اور ہندوستان کی تمام قابل ذکر سیاسی شخصیتیں لندن میں موجود تھیں۔ برطانوی سیاست دان اور برطانوی پریس بھی اس کانفرنس کی کارروائی کی رپورٹنگ کے لئے یکجا ہو گیا تھا۔ یہ کتابچہ ان تمام لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچایا گیا جو اس کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے کانفرنس ہال میں داخل ہوئے۔ اس طرح چوہدری رحمت علی کی یہ اسکیم گویا لندن سے ہندوستان تک ہر جگہ پہنچ گئی بلکہ اس نے عالمگیر شہرت حاصل کی۔

اس کتابچے کے مقدمے میں چوہدری رحمت علی نے نظریۂ پاکستان کی جو تصریحات پیش کی تھیں۔ ان کے مطالعے سے اس یقین کا اندازہ ہو سکتا ہے جو اپنے نظریہ کی صداقت کے بارے میں چوہدری صاحب کے دل میں راسخ ہو چکا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ "میں یہ اپیل ان تین کروڑ مسلمان باشندوں کی جانب

سے شائع کر رہا ہوں جو ہندوستان کی پانچ شمالی وحدتوں میں رہتے ہیں۔ یعنی پنجاب، افغانیہ (صوبہ سرحد) کشمیر، سندھ اور بلوچستان۔ اس کتابچے میں ان تین کروڑ مسلمانوں کی طرف سے اس مطالبہ کا اعادہ کیا گیا ہے کہ (ان تین کروڑ) پاکستانیوں کو ان کی جداگانہ معاشرتی تاریخی اور مذہبی بنیادوں پر ایک وفاقی دستور دیا جائے اور ان کی وہ قومی حیثیت تسلیم کی جائے جو ہندوستان کے باقی افراد سے انہیں ممتاز کرتی ہے۔"

تاریخ ہند کی اس ساعتِ سعید میں جب کہ برطانوی اور ہندوستانی مندوبین ایک ایسا آئین تشکیل دے رہے ہیں جو وفاقی نوعیت کا ہے پاکستان کے تین کروڑ مسلمان باشندوں کی طرف سے مشترکہ ورثے کے نام پر ہم آپ سے اپیل کرتے ہیں کہ سیاسی صلیب کشی اور قومی استیصال کے مقابلے میں جنگِ آزادی میں ہماری مدد کی جائے۔"

ہندو سیاست دانوں نے ہندوستان میں قومیت کا جو گمراہ کن پروپیگنڈہ شروع کر رکھا تھا، اس کے تار و پود بکھرتے ہوئے اپیل میں کہا گیا تھا کہ" بہ صورت حال ہندوستان کوئی ایسی سرزمین نہیں ہے جسے ایک ملک کا نام دیا جاسکے اور نہ یہ خطہ کسی ایک قوم کا مسکن ہے۔ حقیقت میں یہ ایک ایسی ریاست کا نام ہے جس کا تاریخ میں انگریزوں سے پہلے کوئی وجود نہیں تھا اور جو انہی کی تخلیق کردہ ہے۔ اس میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کی قومی خصوصیات ابتدائے تاریخ سے انگریزوں کے تسلط پذیر ہونے تک ممتاز و منفرد رہی ہیں اور جو تاریخ کے کسی دور میں بھی ہندوستانی قومیت میں مدغم نہ ہو سکے۔"

انہی اقوام میں سے ایک قوم ہماری بھی ہے۔ یہ وہ ٹھوس صداقتیں اور تاریخی حقائق ہیں کہ جن کے متعلق ہمارا چیلنج ہے کہ انہیں کوئی شخص غلط ثابت نہیں کر سکتا۔ ان صداقتوں اور تاریخی حقائق کی روشنی میں ہم بلا خوف تردید اعلان کرتے ہیں کہ پاکستانی مسلمان، ہندوستانی ہندو کے مقابلے میں قطعاً الگ قومیت رکھتے ہیں۔ "ہندو اہلِ ہند" سے ایک دوسری ہی قوم تشکیل ہوتی ہے۔ وہ ہندوستان کے بہت بڑے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں جس میں زندہ رہنے کا وہ پورا حق رکھتے ہیں۔ یہی حق ہمیں بھی حاصل ہے۔ اور اسی حق کی بناء پر ہمارا یہ مطالبہ ہے کہ (ہمارے ملک) پاکستان کو باقی ہند سے منقطع کر دیا جائے اور ایک ایسا وفاقی آئین ہمیں دیا جائے جس کی رو سے ہماری جداگانہ قومی حیثیت مسلم ہو سکے۔"

اس کتابچے کا آخری باب ہندو سیاست دانوں اور برطانوی اربابِ اقتدار دونوں کے لئے ایک للکار کی حیثیت رکھتا ہے جس میں متنبہ کیا گیا ہے کہ" اس معاملے کو سمجھنے میں غلطی نہ کی جائے۔ اگر یہ مسئلہ طے ہونا ہے تو اسی وقت ورنہ پھر کبھی نہیں۔ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم زندہ رہیں گے یا ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گے۔ ہم نے اپنا مستقبل دیوتاؤں کے حوالے نہیں کیا ہے۔ بلکہ یہ خود ہمارے اختیار میں ہے اس کیلئے

صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے عقیدے پر استقلال سے قائم رہیں۔ ہم ہی اپنا مستقبل بنا سکتے ہیں۔ اور خود ہی اسے بگاڑ سکتے ہیں۔ ہماری پچھلی ایک صدی کی تاریخ ایک واضح تنبیہ کی حیثیت رکھتی ہے اگر ہم نے اس تنبیہ سے فائدہ نہ اٹھایا تو ہم پر یہ اعتراض کیا جائے گا کہ دستورِ ہند کا دستور قبول کرکے ہم نے اپنی قومیت سے صریحاً غداری کی اور برصغیر کے سارے اسلامی ورثے کو غارت کرنے کا باعث بنے۔"[۱]

دو اور پاکستان

عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ چوہدری رحمت علی نے جس پاکستان کا تصور پیش کیا تھا وہ صرف پنجاب، صوبۂ سرحد، کشمیر، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل تھا اگر ایسا ہوتا تو ہم انہیں اس رنگ میں خراج تحسین پیش نہ کرتے اور خود انہیں علامہ اقبالؒ کے تصور پر اعتراض کرنے کا حق حاصل نہ ہوتا مگر انہوں نے ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں کے ساتھ ساتھ شمال مشرق کے مسلم اکثریت کے علاقے اور دکن کے اسلامی تہذیب و تمدن کے مشہور مرکز کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ چنانچہ ۱۹۴۰ء میں انہوں نے ایک نیا پمفلٹ شائع کیا اور اعلان کیا کہ اب وہ اپنی اسکیم کے باقی دو حصوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنی مہم کا آغاز کریں گے۔ یہ دو حصے بنگال اور حیدر آباد دکن تھے۔ بنگال میں انہوں نے آسام کو بھی شامل کیا تھا اور اس کا نام بنگا سامستان اور حیدر آباد دکن کا نام عثمانستان تجویز کیا تھا۔ گویا ان کی تجویز ہندوستان میں تین مسلم ریاستیں قائم کرنے کی تھی ایک شمال مغرب میں، دوسری شمال مشرق میں اور تیسری جنوب میں۔

تصورِ دینیہ

۱۹۴۲ء میں چوہدری رحمت علی نے ایک اور تصور پیش کیا جو تصورِ دینیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ (DINIA) دینیہ دراصل (INDIA) انڈیا کا الٹ ہے۔ اس میں انہوں نے ہندوستان کی مسلم اکثریت کے مختلف علاقوں کو شامل کیا تھا اور ان آزاد ریاستوں کے مندرجہ ذیل نام تجویز کئے تھے۔

(۱) حیدرستان (۲) معین ستان (۳) صدیق ستان (۴) فاروق ستان (۵) مپال ستان۔

رحمت علی اور خالدہ ادیبہ

ترکیہ میں ایک نہایت ممتاز خاتون گزری ہیں خالدہ ادیب خانم۔ موصوفہ ہندوستان بھی تشریف لائی تھیں اور یہاں انہوں نے ترکیہ پر متعدد معلومات افزا لکچر بھی دیئے تھے۔ وہ ہندوستان کے بہت

---

[۱] چوہدری رحمت علی کے رسالے "ناؤ آر نیور" کے مندرجہ بالا سارے اقتباسات مسٹر جی الانا کی کتاب "قائداعظم جناح۔ دی اسٹوری آف اے نیشن" سے ماخوذ ہیں صفحہ ۳۰۴ تا صفحہ ۳۰۶

سے ممتاز اور تعلیم یافتہ افراد سے بھی ملیں اور یہاں سے واپس جا کر انہوں نے ایک کتاب لکھی جو "ان سائڈ انڈیا" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے چوہدری رحمت علی سے بھی اپنی ملاقات کا حال درج کیا ہے۔ لیکن انہوں نے چوہدری رحمت علی سے ملاقات ہندوستان میں نہیں لندن اور پیرس میں کی تھی اور یہ ملاقات ۳۷-۱۹۳۶ء میں ہوئی تھی۔ خالدہ ادیب خانم چوہدری صاحب سے بہت متاثر ہوئیں۔ انہوں نے مرحوم کو ایک ذہین قانون دان اور برصغیر کے مسلمانوں کا بہت بڑا ہمدرد قرار دیا ہے۔ اپنی ان ملاقاتوں میں خالدہ ادیب خانم نے چوہدری رحمت سے ان کی تحریک پاکستان کے بارے میں متعدد سوالات کئے۔ چوہدری صاحب نے ان سوالات کے جو جوابات دیئے انہیں خالدہ نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔

ہندوستان کے شمال مغربی علاقے کے مسلمانوں کی تاریخ پہ روشنی ڈالتے ہوئے چوہدری صاحب نے خالدہ ادیب خانم کو بتایا کہ "اس علاقے میں مسلمان بارہ سو سال سے بھی زائد عرصے سے آباد ہیں۔ ان کی اپنی تاریخ ہے۔ ان کی اپنی تہذیب ہے اور ان کا اپنا تمدن ہے۔ انہوں نے کہا کہ محترمہ! میری خواہش ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جو بین فرق ہے اور جو آئندہ بھی برقرار رہے گا آپ اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔"

خالدہ ادیب خانم کے اس سوال کے جواب میں کہ آپ کے خیال میں کیا "متحدہ قومیت" کا نظریہ اپنا کر یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا؟ چوہدری صاحب نے کہا کہ یہ ممکن نہیں کیونکہ ہم مسلمان ہندوستانی قومیت کے نہیں بلکہ پاکستانی قومیت کے حامل ہیں۔ اگر ہم نے متحدہ قومیت کا نظریہ قبول کر لیا تو یہ اپنی قوم کی بدنصیبی پہ مہر تصدیق ثبت کر دینے کے مترادف ہوگا۔ اس طرح ہم اپنی فارغ البالی کو تباہ کرنے کا باعث بنیں گے۔ یہ اپنی تاریخ سے غداری ہوگی اور ہم انسانیت کے بھی مجرم کہلائیں گے۔"

چوہدری صاحب نے ہندوستان کے وفاق کی بابت رائے ظاہر کرتے ہوئے خالدہ ادیب خانم کو بتایا کہ اگر ہندوستان کا کوئی وفاق قائم کیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ "پاکستانی قوم ہندوستانی قوم کی ایک اقلیت بن جائے گی جس پہ ہندوستانی قوم مسلط ہو کر اسے پامال کر دے گی۔ یہی وہ زبردست خطرہ ہے جو ہمارے قومی وجود کو لاحق ہے۔ اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم نے "پاکستان نیشنل موومنٹ" جاری کی ہے۔ اس تحریک کی بنیاد ایک ایسے نظریہ پر ہے جسے پچھلے دس سال سے پس پشت ڈالا جا رہا ہے۔ ہم نے اپنی تجویز گول میز کانفرنس کے شرکا کو بھیجنے کے علاوہ پارلیمانی سلیکٹ کمیٹی کو بھی پیش کی۔ مگر افسوس کہ انگریز اور ہندو دونوں نمائندوں نے ہماری یہ تجویز رد کر دی۔ اس طرح انہوں نے ہماری

قومیت کے احترام اور حق و انصاف سے انکار کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنی مساعی آخری لمحے تک جاری رکھیں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس راہ میں ہمیں بڑی دشواریوں اور مصیبتوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اس حقیقت کا بھی علم ہے کہ جس سرزمین پر ہم آباد ہیں اس پر ہمارے اسلاف نے موجودہ حالات سے کہیں زیادہ دشوار اور خطرناک مسائل کا سامنا کیا اور وہ ساری جدوجہد میں کامیاب رہے۔ ہمارے سامنے اس وقت جو مسئلہ درپیش ہے یہ مسئلہ ہماری موت و حیات کا مسئلہ ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ پاکستان ہمارے لئے مقدر ہو چکا ہے۔"

خالدہ ادیب خانم نے چوہدری رحمت سے مل کر اور ان کے نظریات معلوم کر کے تحریک پاکستان کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے "یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ (چوہدری رحمت علی) کی "پاکستان نشنل موومنٹ" ہندو مسلم اختلافات کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گی یا نہیں؟ لیکن جو شخص بھی آج کے ہندوستان کے حالات کا غیر جانبداری سے مطالعہ کرنا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ یہ مسئلہ (چوہدری رحمت علی کی تحریک پاکستان) نظر انداز نہ کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں جن قوتوں نے دو قومی نظریہ کا پرچم بلند کیا ہے وہ معمولی نہیں ہیں۔" [1]

چوہدری رحمت علی نے اپنی تحریک جاری کرنے کے لئے ہندوستان میں اپنے بہت سے ہم خیال پیدا کر لئے تھے۔ یہاں ان کی تحریک کی بہت سے مقامات پر شاخیں بھی قائم ہو گئی تھیں۔ اس تحریک کی طرف سے ایک ہفت روزہ "پاکستان" بھی شائع ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً مختلف پمفلٹ بھی شائع ہوتے رہتے تھے۔

چوہدری رحمت علی کے سوانح حیات

چوہدری رحمت علی کے نظریات اور ان کے تصور پاکستان کے تذکرے ۔ ۔ ۔ ۔ کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مختصر سوانح حیات درج کر دیئے جائیں تاکہ اس تاریخ ساز شخصیت کے حالات زندگی اختصار ہی کے ساتھ سہی محفوظ ضرور ہو جائیں جس نے قوم کو پاکستان کا سب سے جامع تصور دیا۔ ان کے ذکر کے آغاز میں ہم بتا چکے ہیں کہ انہوں نے اسلامیہ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ ان کی تعلیم کے زمانے کا تعین ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک کیا جاتا ہے۔ کالج کے زمانۂ تعلیم میں انہیں صحافت سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اسی زمانے میں ان کی ملاقات مشہور اخبار نویس اور مورخ کشمیر منشی محمد الدین فوق مرحوم سے ہوئی۔ فوق صاحب کی صحبت

---

[1] انسائیڈ انڈیا صفحہ ۲۵۲، ۲۶۳ مولفہ خالدہ ادیب خانم

نے ان کے علمی ذوق کو نکھارا۔ انہی کی صحبت میں چوہدری صاحب کو اخبار نویسی کا شوق پیدا ہوا اور تین سال تک وہ فوق مرحوم کے اخبار "کشمیری" کے عملۂ ادارت میں شامل رہے۔ اس دوران میں انہوں نے سیاسی موضوعات پر نہایت معلومات افزا مضامین لکھے اور غیر ملکی حکومت کے مظالم پر نہایت سخت اور بیباکانہ تنقید کی۔ "مغرب کی کورانہ تقلید" کے عنوان سے انہوں نے معاشرے پر ایسے تابڑ توڑ حملے کئے گئے کہ حکومت بھی بلبلا اٹھی اور کشمیری اخبار سے ضمانت طلب کر لی گئی۔ آخر کار چوہدری صاحب کو اخبار کے عملۂ ادارت سے الگ ہونا پڑا۔

چوہدری صاحب نے ۱۹۱۸ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کا امتحان پاس کر لیا اور ۱۹۱۹ء میں ایچیسن کالج میں لیکچرار مقرر ہو گئے۔ اس عہدے پر وہ ۱۹۲۳ء تک کام کرتے رہے۔ یہاں سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد وہ کچھ عرصے کے لئے چیف پارلیمنٹری سیکرٹری ہو گئے۔ یہ منصب بھی انہیں راس نہ آیا اور جلد ہی اس عہدے سے مستعفی ہو کر قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے لاء کالج لاہور میں داخل ہو گئے۔ یہاں انہیں چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں، جسٹس محمد منیر، مکند لال پوری اور مسٹر سی ایل آنند جیسے ماہرین قانون سے اکتساب فیض کا موقع ملا۔ ان پروفیسروں کی زیر تربیت ان کی صلاحیتیں نکھر گئیں۔ قانون کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ نواب صاحب مزاری آف ڈیرہ غازی خاں کے مشیر قانون مقرر ہو گئے۔ اکتوبر ۱۹۳۰ء میں وہ مزید تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے اور وہاں کیمبرج اور ڈبلن یونیورسٹیوں سے ایم اے اور ایل ایل بی کیا۔ [۱]

چوہدری صاحب نے ہندوستان کی مسلم سیاست اور پاکستان کے موضوع پر متعدد کتابچے اور تصانیف سپرد قلم کیں جن میں "پاکستان دی فادر لینڈ آف دی پاک نیشن"، "ناؤ اور نیور" اور "دی ملت آف اسلام اینڈ دی منیس آف انڈین ازم" شامل ہیں۔ [۲]

چوہدری رحمت علی کا انتقال

چوہدری رحمت علی وہ خوش قسمت انسان تھے جنہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ایک آزاد اسلامی ریاست کا سب سے زیادہ جامع تصور پیش کیا اور اس تصور نے ان کی زندگی ہی میں جامۂ عمل پہن لیا۔ انہوں نے اسے پاکستان کا نام دیا اور یہی اس کا دائمی نام قرار پایا۔ انہوں نے اس تحریک کے لئے روپیہ اور وقت دونوں کی قربانی کی۔ پاکستان ۱۹۴۷ء میں قائم ہوا اور ۱۹۴۸ء میں پہلی بار انہوں نے اس آزاد اسلامی سرزمین پر قدم رکھا مگر افسوس کہ یہاں ان کے ساتھ نہایت سرد مہری کا سلوک کیا گیا۔ کچھ عرصہ گوشۂ گمنامی میں رہنے کے

---

[۱] انسائیڈ انڈیا صفحہ ۲۵۲ مولفہ خالدہ ادیب خانم [۲] یہ معلومات جناب اقبال اسد کے مضمون "چوہدری رحمت علی" مطبوعہ روزنامہ "امروز" لاہور ۱۴ اگست ۱۹۶۳ء سے ماخوذ ہے اور کچھ "انسائیڈ انڈیا" سے۔

بعدہ پھر انگلستان چلے گئے۔ نہ تو یہاں کسی کو ان کے آنے کی خبر ہوئی اور نہ جانے کی۔ ۱۲ فروری ۱۹۵۱ء کو انگلستان میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اپنے ایک عظیم محسن سے قوم کی یہ لاپروائی اور عدم توجہ یقیناً ناقابلِ معافی ہے۔

چوہدری خلیق الزماں کی اسکیم

چوہدری رحمت علی کے تصورِ پاکستان کے بعد ہندوستان کے مسلمان مفکروں اور سیاست دانوں نے مسلمانوں کی آزادی کے لئے متعدد اسکیمیں پیش کیں مگر ان میں سے کوئی اسکیم علامہ اقبالؔ اور چوہدری رحمت علی کی اسکیموں سے بہتر نہ تھی۔ صرف ایک اسکیم چوہدری خلیق الزماں کی ضرور ایسی تھی جسے علامہ اقبالؔ اور چوہدری رحمت علی کی اسکیموں سے بہتر تو نہیں کہا جا سکتا مگر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس میں شمال مغرب کے ساتھ ساتھ شمال مشرق کے مسلمانوں کی آزادی کا تصور بھی شامل تھا۔ یہ اسکیم چوہدری خلیق الزماں نے ۲۰ مارچ ۱۹۳۹ء کو لندن میں حکومتِ برطانیہ کے سیکرٹری آف اسٹیٹ لارڈ زٹلینڈ کے سامنے پیش کی تھی۔ اس اسکیم کے مطابق ہندوستان کو تین فیڈریشنوں میں تقسیم کرنے کی تجویز کی گئی تھی۔ پہلے فیڈریشن میں پنجاب، کشمیر، سندھ، بلوچستان، دوسرے میں بنگال اور آسام، تیسرے میں بقیہ ہندوستان۔ ریاستوں کا مسئلہ حل کرنے کے لئے یہ طریق کار تجویز کیا گیا تھا کہ جو ریاست ہندو فیڈریشن میں واقع ہوگی وہ ہندوؤں کے ساتھ اور جو مسلم فیڈریشن میں واقع ہوگی وہ مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو جائے گی۔ ہندو اور مسلم دونوں فیڈریشن آزاد ہوں گے، عبوری عرصے کے لئے ان کا دفاع ایک علیحدہ ادارے کے ہاتھ میں ہوگا جو مجلسِ قانون ساز کے دائرہ اختیار میں نہیں ہوگا۔ حکومتِ برطانیہ کا اقتدار ختم ہونے کے بعد مسلم فیڈریشنوں کا دفاع ان کے سپرد کر دیا جائے گا۔[1]

میاں کفایت علی کی اسکیم

اس زمانے یعنی ۱۹۳۹ء میں "اے پنجابی" کے نام سے ایک اسکیم شائع ہوئی۔ بعض لوگ غلطی سے یہ اسکیم نواب شاہ نواز خاں ممدوٹ سے منسوب کر دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کتابچے کی طباعت و اشاعت کے اخراجات نواب شاہ نواز خاں مرحوم نے برداشت کئے تھے مگر یہ اسکیم ایک قومی اور سیاسی کارکن میاں کفایت علی نے مرتب کی تھی۔ یہ پانچ وفاقوں پر مشتمل تھی دو وفاق مسلمانوں کے اور تین ہندوؤں کے۔ پہلا مسلم وفاق دریائے سندھ کے علاقوں کا جس میں پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد، بلوچستان، بہاولپور، امیر، سوات، چترال، خیرپور، قلات، لس بیلہ، کپورتھلہ اور مالیر کوٹلہ شامل کئے گئے تھے۔ ان علاقوں میں مسلم آبادی ۸۲ فی صد دکھائی گئی تھی۔ دوسرا مسلم وفاق مشرقی بنگال، آسام کے، گوال پاڑہ اور سلہٹ کے ضلع

---

[1] پاتھ وے ٹو پاکستان۔ مصنفہ، چوہدری خلیق الزماں

تری پورہ اور مشرقی بنگال کے آس پاس کی مسلم اکثریت کے علاقوں کا اس وفاق میں مسلم آبادی ۶۶ اعشاریہ ایک فیصد دکھائی گئی تھی۔ ہندوؤں کے تین وفاقوں میں پہلا وفاق یوپی، سی پی، بہار، اڑیسہ، آسام، مدراس، بمبئی اور ہندوستان کی کچھ ریاستوں پر مشتمل تھا۔ اس وفاق میں ہندوؤں کی آبادی ۸۳ اعشاریہ ۲، فی صد دکھائی گئی تھی۔ دوسرا ہندو وفاق راجستھان اور وسط ہند کی ریاستوں پر مشتمل تھا۔ اس میں ہندوؤں کی آبادی ۸۶ اعشاریہ ۹۳ فی صد دکھائی گئی تھی، تیسرا ہندو وفاق حیدرآباد، میسور اور بستر کی ریاستوں پر مشتمل تھا۔ اس وفاق میں ہندوؤں کی آبادی ۸۵ اعشاریہ ۸۲ فی صد دکھائی گئی تھی۔

اس اسکیم کا سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ ان پانچوں وفاقوں کو ملا کر ایک کنفیڈریشن بنا دیا گیا تھا۔

علیگڑھ کے پروفیسروں کی اسکیم

اسی زمانے میں ہندوستان کی آزادی کی ایک اور اسکیم شائع ہوئی۔ یہ علی گڑھ یونیورسٹی کے دو ممتاز مسلمان پروفیسروں نے مرتب کی تھی۔ ایک پروفیسر سید ظفر الحسن جو اب وفات پا چکے ہیں اور دوسرے پروفیسر ڈاکٹر محمد افضال حسین قادری جو تا ایں دم بقید حیات ہیں اور آج کل کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ کیمیا کے صدر ہیں۔

اس اسکیم کے مطابق ہندوستان کو چھ ریاستوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ (۱) پاکستان جس میں پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان، جموں کشمیر، مانڈی، چمبہ، سکٹ، سمین، کپورتھلہ، مالیر کوٹلہ، چترال، دیر، قلات، لوہارو، بلاسپور شملہ اور بہاولپور وغیرہ اس حصے میں مسلمانوں کی آبادی کا تعین ۶۰ اعشاریہ ۳ فی صد کیا گیا تھا۔ (۲) بنگال، اس میں بہار کا ضلع پورنیہ اور آسام کا سلہٹ ڈویژن بھی شامل کیا گیا تھا۔ اس حصے میں مسلمانوں کی آبادی ۵۷ فی صد دکھائی گئی تھی۔ (۳)، ہندوستان۔ اس میں باقی ہند اور ہندوستانی ریاستیں شامل کی گئی تھیں۔ اس حصے میں غیر مسلموں کی آبادی کا تعین تخمیناً ۸۱ فی صد کیا گیا تھا۔ (۴) حیدرآباد۔ اس حصے میں ریاست حیدرآباد میسور اور کرناٹک کے علاقے شامل کئے گئے تھے۔ اس حصے میں غیر مسلموں کی آبادی تخمیناً ۸۳ فی صد دکھائی گئی تھی۔ (۵) دہلی۔ اس حصے میں دہلی، میرٹھ ڈویژن، روہیلکھنڈ ڈویژن اور ضلع علی گڑھ کے علاقے شامل کئے گئے تھے۔ اس حصے میں غیر مسلموں کی آبادی تخمیناً ۷۲ فی صد دکھائی گئی تھی۔ (۶)، چھٹا اور آخری وفاق مالابار اور ہندوستان کے جنوبی علاقوں پر مشتمل تھا۔ اس حصے میں غیر مسلموں کی آبادی کا تعین ۷۲ فی صد کیا گیا تھا۔

ان چھ ریاستوں کو آزاد ریاستیں قرار دیا گیا تھا" مگر ایک پنجابی" کی اسکیم کی طرح ان سب ریاستوں کو ملا کر ایک کنفیڈریشن تشکیل دینے کی تجویز کی گئی تھی۔ [1]

---

[1] قائد اعظم جناح۔ دی اسٹوری آف اے نیشن ص

ڈاکٹر سید عبداللطیف کی اسکیم

اسی زمانے میں حیدر آباد دکن کے ڈاکٹر سید عبداللطیف نے برصغیر کو ثقافتی بنیادوں پر تقسیم کرنے کی ایک تجویز پیش کی۔ اس اسکیم کے مطابق مسلمانوں کے چار اور ہندوؤں کے گیارہ وفاق تجویز کئے گئے تھے۔ مسلم وفاقوں میں (۱) سندھ، بلوچستان، پنجاب، صوبۂ سرحد، خیرپور اور بہاولپور کا وفاق۔ اس میں مسلمانوں کی آبادی ڈھائی کروڑ دکھائی گئی تھی (۲) مشرقی بنگال، کلکتہ، آسام پر مشتمل وفاق۔ اس میں مسلمانوں کی آبادی تین کروڑ دکھائی گئی تھی (۳) دہلی اور لکھنؤ کا وفاق (۴) دکن کا وفاق۔ یہ چاروں مسلم وفاق تھے۔ ہندو وفاقوں میں (۱) بنگال کا باقی حصہ (۲) اڑیسہ (۳) بہار کا مغربی علاقہ اور یوپی (اس میں ہمالیہ سے بندھیا تک دہلی لکھنؤ بلاک کا سرحدی علاقہ شامل تھا) (۴) راجپوتانہ کی ریاستیں (۵) گجرات (کاٹھیاواڑ) (۶) مراٹھاس (۷) کناریہ (۸) آندھرا (۹) علاقہ تامل (۱۰) ملایالی (۱۱) ہندو سکھ وفاق (اس میں کشمیر کا بھی کچھ حصہ شامل کیا گیا تھا)۔

اس اسکیم کی خاص طور سے قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ہندو اور مسلم دونوں وفاقوں میں جداگانہ نیابت کے اصول پر انتخابات کی سفارش کی گئی تھی۔ اس اسکیم میں فرقہ وارانہ کشمکش کا حل بھی پیش کیا گیا تھا اور وہ یہ کہ جن وفاقوں کے باشندے چاہیں اپنے ہم مذہب لوگوں کے وفاق میں منتقل ہو کر مستقل سکونت اختیار کرلیں۔ ریاستوں کا مسئلہ حل کرنے کے لئے ان کے محلِ وقوع کو مدنظر رکھا گیا تھا یعنی جو ریاست جس وفاق میں واقع ہو وہ اسی میں شمولیت اختیار کرے۔ لیکن اس اسکیم میں بھی ایک بڑی خامی یہ تھی کہ ہندوستان کے ان ۱۵ وفاقوں کو ایک بڑے وفاق میں شامل کر دیا گیا تھا۔ [۱]

لیکن جب ڈاکٹر سید عبداللطیف کی اسکیم کی اس وجہ سے مخالفت کی گئی کہ اس کو قبول کرنے کے نتیجے میں آزاد اسلامی ریاست کا تصور ختم ہو جائے گا تو انہوں نے اس پر نظرثانی کی اور لکھا کہ "میں تمام افراد پر یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں قیام پاکستان کے خلاف نہیں ہوں"۔ اس بیان میں انہوں نے شمال مشرق اور شمال مغرب میں جہاں مسلمان بہت بڑی اکثریت میں ہیں وہاں ان کی خود مختار ریاستیں قائم کرنے کی حمایت کی۔ [۲]

سر سکندر حیات کی اسکیم

انہی دنوں تقسیم ہند کی ایک اسکیم سابق پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خان مرحوم نے پیش کی۔ اس اسکیم کے مطابق ہندوستان کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ان ساتوں علاقوں کی حد بندی بھی کی گئی تھی۔ مجالسِ قانون ساز وائسرائے اور گورنروں کے اختیارات کی بھی وضاحت کی گئی تھی۔ ملازمتوں کے

---

[۱] دی مسلم پرابلم ان انڈیا صفحہ ۳۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف [۲] دی پاکستان اشو صفحہ ۹۔ مولفہ ڈاکٹر سید عبداللطیف۔

تناسب اور اسمبلیوں میں مذہبی بنیاد پر حق نیابت کے مسئلے کا حل بھی پیش کیا گیا تھا۔ اس اسکیم کے مطابق ہندستان کو مندرجہ ذیل سات علاقوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ (۱) آسام اور بنگال (۲) بہار اور اڑیسہ (۳) یوپی (۴) مدراس ٹراونکور کورگ اور مدراس کی ریاستیں (۵) بمبئی، حیدرآباد، میسور، سی پی اور سی پی کی ریاستیں (۶) راجپوتانہ کی ریاستیں (۷) پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد، بلوچستان، بیکانیر جیسلمیر، کشمیر اور پنجاب کی ریاستیں۔

سر عبداللہ ہارون کی اسکیم

یہ باب نامکمل رہ جائے گا اگر سابق سندھ کے ایک مخیر اور مسلمانوں کے ہمدرد و بزرگ سر عبداللہ ہارون کی اسکیم کو ضبطِ تحریر میں نہ لایا جائے۔ یہ اسکیم ایک کمیٹی کی طرف سے پیش کی گئی تھی۔ جس کے روح رواں سر عبداللہ ہارون تھے۔ اس اسکیم کے متعلق برصغیر کو تین وفاقوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک وفاق شمال مشرق میں جہاں مسلمانوں کی آبادی کا تخمینہ ۴۶ فی صد لگایا گیا تھا۔ دوسرا وفاق شمال مشرق میں جہاں مسلمانوں کی آبادی کا تعین ۵۴ فی صد لگایا گیا تھا۔ تیسرا وفاق باقی ہندوستان کا۔ گویا اس اسکیم کے مطابق دو ریاستیں مسلمانوں کی ایک پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل اور دوسری بنگال اور آسام کے بعض حصوں پر مشتمل قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی اور ایک ریاست ہندوؤں کی جس میں باقی ہندوستان شامل تھا۔

خلاصۂ واقعات

ہمارا خیال ہے کہ اس باب میں ہم نے خاصی تفصیل کے ساتھ ملک کی تقسیم اور مسلمانوں کے لئے جداگانہ وطن کی وہ تمام تجویزیں، اسکیمیں اور نظریات ترتیب دے دیئے ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً مختلف مسلمان رہنماؤں اور سیاسی مفکروں کی طرف سے پیش کئے گئے۔ اس روداد پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے معاً بعد ہی مسلمان رہنماؤں اور ارباب فکر و نظر نے محسوس کر لیا تھا کہ ہندو اکثریت مسلمانوں کو برصغیر میں آبرومند قوم کی حیثیت سے پھلتے پھولتے نہیں دیکھ سکتی اور وہ چاہتی ہے کہ یا تو مسلمان اس ملک سے نکل جائیں اور اگر یہاں رہیں تو ہندوؤں کے غلام بن کر اور ان کے رحم و کرم پر۔ سر سید احمد خاں اس دور کے پہلے مسلمان رہنما تھے، جنہوں نے ہندوؤں کے ان خطرناک عزائم کو بھانپ لیا تھا۔ انہوں نے اپنی سیاسی بصیرت کی بنا پر ۱۸۶۷ء میں یہ پیش گوئی بھی کر دی تھی کہ وہ دن دور نہیں جب ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔ تقسیم ملک کی طرف یہ پہلا اشارہ تھا۔

دوسرے مسلمان مفکر مولانا عبدالحلیم شرر تھے جنہوں نے سر سید احمد خاں کے خطوط پر سوچا اور گائے، باجا، اذان اور ہولی کے نام پر ہندو مسلم فسادات اور ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کی ایذا رسانیوں کے واقعات سے مجبور ہو کر ۱۸۹۰ء میں یہ مطالبہ کیا کہ ہندوستان کو ہندو اور مسلم صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

مطالبۂ تقسیم کے ساتھ ساتھ انہوں نے تبادلۂ آبادی کی تجویز بھی پیش کی ۔ مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کی یہ پہلی واضح اسکیم تھی ۔

۱۹۱۷ء میں خیری برادران نے مسلمانانِ ہند کے لئے "مسلم ہوم لینڈ" کا مطالبہ کیا اور بنگال، اودھ کرناٹک، سندھ، مدراس، میسور اور دہلی کو اسلامی صوبے بنانے کی تجویز پیش کی ۔ ۱۹۲۰ء میں آگرہ کے نادر علی ایڈووکیٹ نے ہندوستان کو ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان میں تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا ۔ ۱۹۲۲ء میں ڈیرہ اسماعیل خان کے سردار محمد گل خان نے آگرہ سے پشاور تک علاقے کو مسلم ریاست میں تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا ۔ ۱۹۲۴ء میں مولانا محمد علی جوہر نے ہندوؤں کی خود غرضانہ اور نفرت انگیز روش دیکھ کر پیش گوئی کی کہ برصغیر مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا میں تقسیم ہو جائے گا ۔ ۱۹۲۴ء ہی میں رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی نے ہندوستان کو ہندو اور مسلم ریاستوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی ۔ مولانا حسرت موہانی کی تجویز سے متاثر ہو کر اس کے فوراً بعد لالہ لاجپت رائے نے تقسیم ملک کا وہ مشہور فارمولا پیش کیا ۔ جس کے مطابق جموں و کشمیر، مکمل پنجاب، سرحد، سندھ، مشرقی بنگال اور مالابار پر مشتمل اسلامی ریاستوں کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا ۔ ۱۹۲۹ء میں نواب سر ذوالفقار علی خاں نے نہایت واضح الفاظ میں مسلمانوں کے جداگانہ قومی وجود کا نظریہ پیش کیا اور ان کے مصائب کا صرف ایک حل قرار دیا کہ ہندوستان کے وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی آبادی ۸۰ فیصد ہے انہیں ایک آزاد وطن کی حیثیت سے دے دیئے جائیں ۔

۱۹۳۰ء میں مسلمانانِ پاک و ہند کے عظیم مفکر علامہ اقبال نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد میں اپنا وہ حکیمانہ خطبۂ صدارت پیش کیا جس میں تاریخ کے گہرے تجزیے اور منطقی استدلال کے بعد مسلمانوں کو ایک مستقل اور جداگانہ قوم قرار دیا گیا تھا اور انہیں مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ ہندوستان کے شمال مغرب میں اپنی خود مختار ریاست کے قیام کے لئے کوشش کریں ۔ صرف یہی نہیں بلکہ علامہ اقبال نے اپنی سیاسی بصیرت کی بنا پر یہ پیش گوئی بھی کر دی تھی کہ " مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی ۔"

اس واقعے کے تین سال بعد یعنی ۱۹۳۳ء میں چوہدری رحمت علی نے کشمیر، پنجاب، صوبۂ سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک آزاد اور خود مختار اسلامی ریاست کا تصور پیش کیا جسے انہوں نے پاکستان کا نام دیا ۔ اس سے قبل تقسیم ملک اور مسلمانوں کے لئے جداگانہ ریاست کے جتنے نظریے پیش کئے گئے ان کے مجوزین نے اپنی پیش کردہ ریاستوں کے لئے نام تجویز نہیں کیا تھا ۔ چوہدری رحمت علی پہلے مسلمان مفکر تھے جنہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ اور خود مختار ریاست کا سب سے زیادہ جامع تصور پیش کیا اور اسے ایک نام بھی دیا یعنی "پاکستان" چوہدری رحمت علی کا یہ نظریہ واضح انداز میں ۱۹۳۳ء میں منظرِ عام پر آیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس

واقعہ سے ۱۸ سال قبل یعنی ۱۹۱۵ء میں "بزم شبلی" کی افتتاحی تقریر میں شمالی ہند کے مسلمانوں کے لئے ایک آزاد اسلامی ریاست کا مطالبہ کر چکے تھے۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں انہوں نے اپنی اسکیم کو اور وسیع کر دیا اور اس میں بنگال اور آسام کی مسلم اکثریت کے علاقے بھی شامل کر لئے۔ ریاست حیدرآباد کو بھی انہوں نے مسلمانوں کے آزاد اور خودمختار علاقے کی حیثیت سے اپنی اسکیم کا حصہ بنا لیا۔ ۱۹۳۹ء میں برصغیر کے معروف مسلمان سیاست دان چوہدری خلیق الزماں نے لندن میں حکومت برطانیہ کے سیکرٹری آف اسٹیٹ کے سامنے تقسیم ملک کی تجویز پیش کی جس کے مطابق ہندوستان کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلے حصے میں کشمیر، پنجاب، سندھ اور بلوچستان۔ دوسرے میں بنگال اور آسام تیسرے میں بقیہ ہندوستان۔

اس کے بعد برصغیر کے مختلف مسلمان دانشوروں کی طرف سے تقسیم ملک کی متعدد تجویزیں پیش کی گئیں جن کی تفصیل ہم اس باب میں بیان کر چکے ہیں مگر ان سب اسکیموں میں ہندو اور مسلم وفاقوں کو ملا کر ایک متحدہ ہندوستان کا نظریہ پیش کیا گیا تھا۔ اس طرح اسلامی ریاستوں کی مکمل خودمختاری پر زد پڑتی تھی۔ البتہ ان لوگوں میں سے حیدرآباد کے ڈاکٹر سید عبداللطیف نے بعد کو اپنی اسکیم پر نظر ثانی کر لی تھی اور قیام پاکستان کی حمایت کی تھی۔

کانگریسی وزارتوں کی سیاہ کاریاں

ہماری کوشش یہ ہے کہ ہم اس کتاب کو خواہ مخواہ ضخیم نہ ہونے دیں اور جہاں تک ہو سکے اختصار سے کام لیں تاکہ کم سے کم صفحات میں اس موضوع کے زیادہ سے زیادہ پہلو نمایاں ہو سکیں۔ لیکن اس باب کے بعد جو باب قلمبند کیا جائے گا یعنی "قرار دادِ لاہور" اس سے پہلے نہایت ضروری ہے کہ ان اسباب کی نشاندہی کر دی جائے جو قرار دادِ لاہور کا فوری باعث بنے۔ ان فوری اسباب میں کانگرسی وزارتوں کے صوبوں میں فرقہ پرست ہندو اکثریت کے وہ لرزہ خیز مظالم خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں جن کے داغ زمانے کی ہزار گردشیں بھی کانگرس اور ہندو فرقہ پرستوں کی پیشانیوں سے مٹا نہ سکیں گی۔ یہ مظالم اتنے ہولناک تھے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر اور برِصغیر کے دس کروڑ مسلمانوں کے عظیم قائد محمد علی جناح کو ان کی تحقیق و تفتیش کے لئے ایک کمیشن مقرر کرنا پڑا۔

پیرپور رپورٹ

چنانچہ ۲۰ مارچ ۱۹۳۸ء کو راجہ سید محمد مہدی آف پیرپور کی سرکردگی میں ایک کمیشن قائم کیا گیا جس نے تقریباً آٹھ ماہ تک کانگرسی وزارتوں کے صوبوں کے دورے کئے۔ تمام بڑے بڑے شہروں اور قصبات میں جاکر حالات کا جائزہ لیا۔ لوگوں کے بیانات قلم بند کئے۔ بعض مقدمات کی مسلوں کا مطالعہ کیا۔ پولیس کے روزنامچے دیکھے اور پھر ایک جامع رپورٹ ۱۵ نومبر ۱۹۳۸ء کو قائدِ اعظم کی خدمت میں پیش کی۔ یہ رپورٹ آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے قیامِ پاکستان سے قبل شایع ہو گئی تھی۔ اسی طرح کی ایک رپورٹ بہار کے مسٹر شریف نے مرتب کی تھی اور اس میں بھی کانگرسی مظالم کی لرزہ خیز روداد خاص شرح و بسط سے بیان کی گئی تھی۔

ان رپورٹوں خصوصاً پیرپور رپورٹ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کانگرسی وزارتوں میں مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے اور مسلم طلبہ کو ہندو تعلیمات کے سانچے میں ڈھالنے کی منظم اور مکروہ سازش کی گئی تھی۔ ہر اسکول میں بندے ماترم کا ترانہ لازمی قرار دیا گیا تھا۔ جو سراسر ہندو ذہنیت کا آئینہ دار تھا۔

لہ پیرپور رپورٹ ۵۳ شایع کردہ نوابزادہ لیاقت علی خاں آنریری سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ۔

پیرپور رپورٹ کی اشاعت کے بعد اس کے دو بند خارج کر دیئے گئے یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ یہ ترانہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچاتا تھا۔ پیرپور رپورٹ کے مرتبین نے عینی شہادتوں کی بناء پر اپنی رپورٹ میں لکھا کہ مسلمان طلبہ کو کانگریسی جھنڈے کی سلامی پر مجبور کیا جاتا ہے۔[1] چونکہ یہ ایک ہندو تنظیم کا پرچم ہے اس لئے مسلمان بچوں کو اس کی سلامی پر مجبور کرنا مسلمانوں کے صبر و ضبط کا امتحان لینا ہے

واردھا اسکیم

کانگریسی وزارتوں میں مسلمانوں کے دین و مذہب کے ساتھ جو خطرناک مذاق کیا گیا واردھا اسکیم اس کا ایک اہم حصہ تھی یہ اسکیم مسٹر گاندھی نے واردھا میں تیار کی تھی۔ موسیقی اس تعلیم کا لازمی عنصر تھا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے مخلوط تعلیم کا طریقہ تجویز کیا گیا تھا۔ دُنیا کے سارے مذاہب کی مشترکہ صداقت اس اسکیم کا ایک اہم جزو تھی۔ ظاہر ہے کہ اس اسکیم کا ہر حصہ مسلمانوں کے لئے ناقابلِ قبول تھا اور اس کا مقصد ان کی قومی روایات کو مسخ کرنے کے سوائے اور کچھ نہ تھا۔ کیونکہ موسیقی اور وہ بھی درس گاہ میں جہاں جوان لڑکے اور جوان لڑکیاں موجود ہوں اور وہ سب مل کر گائیں بجائیں اسلامی تعلیم کی رُو سے نہ صرف معیوب بلکہ مسلم سوسائٹی کے اخلاق کو تباہ کر دینے کے مترادف ہے۔ اسی طرح اسلام لڑکیوں اور لڑکوں کے آزادانہ اختلاط کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ بخصوص عمر کے اس دور میں جب جنسی جذبات میں سخت ہیجان ہوتا ہے مخلوط تعلیم نوجوان عورتوں اور مردوں کے اخلاق کے لئے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح تمام مذاہب کی مشترکہ صداقت کا تصور نہایت گمراہ کن تھا۔ اور اس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ مسلمان طلبہ اپنی اسلامی انفرادیت کو فراموش کر دیں کیونکہ جب یہ مان لیا جاتا ہے کہ ہر مذہب میں ایک جیسی صداقتیں موجود ہیں تو مسلمانوں کے مسلمان رہنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ گویا واردھا اسکیم میں مذاہب کی مشترکہ صداقت کا جزو شامل کر کے مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کرنے کی ایک منظم سازش کی گئی تھی یہی وجہ ہے کہ پیرپور رپورٹ میں واردھا اسکیم کو اسلام اور مسلمانوں کے لئے سخت خطرناک قرار دیا گیا تھا اور اس اسکیم کے خلاف مسلمانوں کی برہمی اور ان کے غم و غصے کو جائز ٹھہرایا گیا تھا۔

وِدیا مندر اسکیم

پیرپور رپورٹ میں ودیا مندر اسکیم کو بھی ہدفِ تنقید بنایا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ کانگرس وزارتیں ظاہر تو یہ کہہ رہی ہیں کہ ناخواندگی ختم کر کے علم کی روشنی عام کی جائے لیکن اس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مسلمان طلبہ کو بت پرست بنایا جائے۔ ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا پٹنہ میں جو اجلاس منعقد ہوا تھا اس میں سید عبدالعزیز بیرسٹر نے ودیا مندر اسکیم پر روشنی ڈالتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کیا تھا

---

[1] پیرپور رپورٹ ص۳۲

ان کے مطالعے سے اس اسکیم کے خطرناک نتائج کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ سید عبدالعزیز نے کہا تھا کہ "ودیا مندر کی اسکیم مسلمان بچوں کے لئے نہایت غیر موزوں ہے مندر کا لفظ ایک خاص مذہبی فرقے اور اس کے مذہبی رجحانات کی عکاسی کرتا ہے الفاظ کے الٹ پھیر سے اس کے معنی اور مفہوم میں تبدیلی پیدا نہیں کی جاسکتی۔ سی پی کے وزیر اعلیٰ مسٹر شکلا نے جو بیان دیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے بیان کے مطابق مندر کا لفظ اس نام کا جزو اس لئے بنایا گیا ہے تاکہ ہندو بچوں میں مذہبی جذبات کو فروغ حاصل ہو۔ حالانکہ حکومت کے تعلیمی اداروں میں صرف ایک فرقے کے بچے تعلیم نہیں پاتے بلکہ مسلمان اور دوسرے فرقوں کے غیر مسلم بھی ہوتے ہیں۔ اس قسم کی مشترکہ درس گاہوں میں ایسے فرقہ وارانہ نام سے تعلیمی اسکیموں کی ترویج کی قطعاً گنجائش نہیں یہ اسکیم واردھا اسکیم کی بنیاد پر مرتب کی گئی ہے حالانکہ گذشتہ دنوں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے جو اسی شہر میں منعقد ہوئی تھی اس اسکیم کے متعلق واشگاف الفاظ میں یہ فیصلہ کردیا تھا کہ یہ مسلمان بچوں کی دینی مزاج کے لئے سخت مضرت رساں ہے"۔

ودیا مندر اسکیم سی پی میں نافذ کی گئی اور اس کے خلاف وہاں کے مسلمانوں میں اس قدر غم و غصہ پیدا ہوا کہ انہوں نے سول نافرمانی کا اعلان کر دیا برصغیر کے قابل احترام سیاسی رہنما نواب صدیق علی خاں مرحوم نے ناگپور میں اس تحریک کی قیادت کی اور حکومت نے انہیں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ اس پر سی پی میں زبردست ہنگامہ برپا ہو گیا اور مسلمان سر سے کفن باندھ کر میدان میں نکل آئے جب صورت حال بگڑنے لگی، تو سی پی کی کانگرسی حکومت نے مسلم لیگ سے رجوع کیا اور نواب زادہ لیاقت علی خاں جنرل سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ کی کوشش سے یہ جھگڑا ختم ہوا اور نواب زادہ کی تحریک پر کانگرسی حکومت نے اجازت دیدی کہ مسلم مدارس میں "ودیا مندر" کی اسکیم کا نام "مدینۃ العلم" کے نام میں تبدیل کر دیا جائے۔

مسٹر اے کے فضل الحق کا بیان

اسی زمانے میں مسلمانوں کے ایک عظیم سیاسی رہنما اور بنگال کے وزیر اعلیٰ مسٹر فضل الحق نے کانگرسی وزارتوں کی سیاہ کاریوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے ایک حقیقت افروز بیان دیا جس میں انہوں نے کہا کہ :-

"کانگرسی وزارتوں نے عہدے سنبھالنے کے ساتھ ہی بعض انوکھی حرکتیں کیں۔ انہوں نے مقامی حکام کے نام تحریری اور زبانی ہدایات جاری کر دیں کہ اہم معاملات میں وہ اپنے ہاں کی کانگرس کمیٹی کے عہدے داروں سے مشورہ حاصل کر لیا کریں۔ انہوں نے احکام جاری کئے کہ پبلک عمارتوں اسکولوں اور دوسرے مقامات پر کانگرسی جھنڈے نصب کئے جائیں بہت سے وزراء نے

نہایت ہی تزک و احتشام کے ساتھ مفصلات اور قصبات میں کانگریسی جھنڈے لہرانے کے لئے دورے کئے اور مسلمانوں کے احتجاج کے باوجود اس کا تمسخر کر کے یہ احکام نافذ کئے اور اجازتیں دیں کہ ہر تقریب میں کانگریس کا ترانہ بندے ماترم گایا جائے۔ انہوں نے ہندی زبان کو رواج دیا اور اس کی ہمت افزائی کی یہاں تک کہ مدارس میں تمام طلبہ کے لئے اس کا پڑھنا لازمی قرار دیا۔" انہوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے منصوبوں کی مسلمانوں سے جبراً تعمیل کرائیں گے، ان کے منصوبے کیا تھے مختصراً یہ کہ:-

(۱) گئو ماتا کی بہر صورت رکھشا ہونی چاہیئے۔ اسی بنا پر مدنا پور، بلیا اور دیگر مقامات پر قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا گیا۔

(۲) مسلمانوں کو گائے کا گوشت کھانے کی اجازت نہ دینی چاہیئے، چنانچہ اس مقصد کو سامنے رکھ کر تلوکری میں وحشیانہ اور انسانیت سوز مظالم کئے گئے اور اسی طرح دوسرے کثیر التعداد مقامات پر خون ریزیاں روا رکھی گئیں جن کی حقیقت سے کسی کو انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی۔

(۳) مسلمانوں کے مذہب کو پامال کر دینا چاہیئے کیونکہ یہ دیش ہندوؤں کا ہے۔ اس منصوبے کو پورا کرنے کے لئے اذانیں روکی گئیں، مساجد میں نمازیوں پر حملے کئے گئے، نماز کے اوقات میں مسجدوں کے سامنے شور و غوغا کرتے ہوئے باجے کے ساتھ فاتحانہ انداز میں جلوس گزارے گئے، بقرعید کے موقعوں پر گائے کی قربانی کو جبراً روکا گیا، مسلمانوں کے قبرستانوں، مسجدوں اور دوسرے مقدس مقامات کی بے حرمتی کی گئی۔"

"کانگریس کے خلاف جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے وہ صرف اتنا ہی نہیں ہے۔ میں نے اردو تا ہندی کی تحریک میں شدت، ودیا مندر اسکیم کے نفاذ، مقامی با اختیار اداروں (مثلاً ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپلٹی) میں جو تھوڑے بہت مسلمان تھے ان کو بالکل ہی معدوم کرنے کی کوشش۔ اردو اسکولوں کی پامالی، ہندو تمدن کی فوقیت دکھانے کے لئے مدارس میں قابل اعتراض درسی کتابوں کی ترویج اور خالص مسلم مدارس کے لئے اپنی کتابوں کی منظوری اور متعدد دوسرے ایسے معاملات کا جو مسلمانوں کی طرف سے کانگریسی حکومت کے خلاف عائد کردہ فرد جرم میں شامل ہیں یہاں کوئی ذکر نہیں چھیڑا، مگر جب کسی عدالتِ مجاز کے سامنے یہ معاملات پیش ہوں گے تو ان مذکورہ شکایات کی تفصیلات بھی اسی وقت پیش کر دی جائیں گی۔[1]"

مسٹر کھرے کی تصدیق

---

[1] حوالہ صفحہ ۶۶ پر ملاحظہ ہو۔

مسٹر اے کے فضل الحق کا یہ دل ہلا دینے والا بیان جس نے کانگرسی وزارتوں کی مسلم آزاری اور مسلم کشی کا مکروہ چہرہ عریاں کر دیا تھا ایسا نہ تھا کہ کانگرسی حکومت اسے نظر انداز کر دیتی۔ چنانچہ اس حقیقت افروز بیان سے کانگرس کے قصرِ استبداد میں زلزلہ آ گیا اور کانگرسی رہنما فضل الحق پر بجلی کی طرح کڑکے بادل کی طرح گرجے اور مینہ کی طرح برسے۔ سب سے زیادہ زیادہ غصہ سی پی کے وزیر اعلیٰ پنڈت راوی شنکر شکلا کو آیا اور انہوں نے مسٹر اے کے فضل الحق کے بیان کے متعلق فرمایا کہ یہ جھوٹ کا ہمالیہ ہے۔ یقیناً یہ بیان ایک مسلمان اور وہ بھی مسلم لیگی رہنما کا تھا۔ اس لئے کانگرسی رہنماؤں کے لئے جواز موجود تھا کہ وہ اسے جانب داری پر محمول کر دیتے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ جب مسٹر راوی شنکر شکلا نے اس بیان کو جھوٹ کا ہمالیہ قرار دیا تو سی پی کے ایک کانگرسی رہنما ڈاکٹر کھرے نے جو اپنے صوبے کے وزیر اعلیٰ بھی رہ چکے تھے اس کی تصدیق کی۔ انہوں نے ناگپور کے مرہٹہ اخبار ہتواد میں ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو ایک بیان شائع کرایا۔ جس میں اُنہوں نے کہا کہ:

"مجھے پنڈت شکلا کا وہ بیان جو جبل پور سے ایسوسی ایٹڈ پریس کے ذریعے اشاعت پذیر ہوا ہے اور جس میں مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال کی فردِ الزامات کو جھوٹ کا ہمالہ کہا گیا ہے دیکھ کر تعجب ہوا۔ اگر پنڈت شکلا کا یہ بیان شائع نہ ہوا ہوتا تو میں اس معاملہ کا تذکرہ پریس کے ذریعے نہ کرتا اس کے علاوہ یہ مناسب بھی نہیں ہوگا کہ اگر اس موقع پر میں واقعات کو جس طرح مجھے معلوم ہیں پبلک کے سامنے نہ لے آؤں، میں نے پہلے بھی کہا اور اب پھر کہتا ہوں کہ وزارت قبول کرنے کے پندرہ روز کے اندر ہی میرے اس وقت کے رفیق کار مسٹر ڈی پی مصرا نے مجھ سے درخواست کی کہ مسٹر نیاز احمد خاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کا جو اس وقت جبل پور جیل میں تعینات تھے تبادلہ کر دیا جائے۔ بلا کسی ظاہری سبب کے مسٹر مصرا کی اس درخواست کا صرف ایک ہی سبب میں سمجھ سکا وہ یہ تھا کہ مسٹر نیاز احمد خاں نے مشہور مقدمہ حسینہ کے اغوا کی تفتیش کی تھی۔ یہ مسلمان افسر کو ایذا پہنچانے کی مثال نمبر ایک ہے۔ میرے بعض دوسرے رفیق یہ چاہتے تھے کہ میں مسٹر انعام الرحیم آئی سی ایس کو جو اس وقت بہ عہدہ ڈپٹی کمشنر ایوت محل میں تعینات تھے اور جو اس صوبہ میں واحد مسلم آئی سی ایس افسر تھے مستقل نہ کروں، یہ مسلمان افسر کو ایذا پہنچانے کی دوسری مثال ہے۔ اگرچہ میں نے اپنے رفقائے کار کے اِن ارشادات کی تعمیل نہیں کی، کیونکہ میں سب کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کا خواہشمند تھا۔

ایک اور مثال مسٹر شریف کا مشہور معاملہ ہے، اس معاملے میں مسٹر شریف سے جو اس وقت

(سی پی کے) وزیر تھے بعض قیدیوں کو جن میں چند مسلمان بھی تھے میعاد سے پہلے رہا کر دینے پر باز پرس کی گئی تھی۔ شریف صاحب کے معافی مانگنے پر کانگرس اسمبلی پارٹی نے اپنے ایک جلسے میں مسٹر شریف کی اس حرکت سے درگذر کر دیا تھا۔ لیکن ہائی کمان اور کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اسمبلی پارٹی کی تجویز نظر انداز کرتے ہوئے ایک ٹریبونل مقرر کر دیا کہ یہ مسٹر شریف کے معاملے کی تحقیقات کرے اور انجام کار شریف صاحب کو نکال باہر کیا۔ ایک بالکل اسی قسم کے معاملے میں جس کا تعلق مسٹر مصرا کے خلاف تحریری شکایت سے ہے ہائی کمان نے مسٹر مصرا کے حق میں یک طرفہ فیصلہ دے دیا اور شکایت کرنے والوں سے کوئی جواب طلب کئے بغیر کہا گیا کہ وہ مسٹر مصرا سے معافی مانگیں۔ اپنی ان حرکتوں سے کانگریس ورکنگ کمیٹی اور ہائی کمان نے مسلمانوں کو موقع دیا کہ وہ ایک ہی قسم کے دو واقعات میں امتیازی سلوک پر معترض ہوں کیونکہ مسٹر شریف مسلمان ہیں اور مسٹر مصرا ہندو۔ ان کے علاوہ مشہور پان والا واقعہ بھی ہے جس میں وزیر قانون نے ایک مسلمان کے ہندو قاتل کو رہا کر دیا۔ لیکن ہائی کمان نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی حالانکہ مسٹر شریف کے معاملے میں بہت شور اٹھایا گیا۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں اگر اس معاملے میں بھی مسلمانوں نے (کانگرس) ہائی کمان پر جانبداری کا الزام لگایا۔ کیونکہ جس وزیر نے یہ حرکت کی وہ ہندو ہے شکلا وزارت نے اکثر دوسرے فرقوں کے مفادات کو قربان کیا ہے ۔۔۔ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ پنڈت جواہر لال نہرو جو کانگریسی وزراء کے خلاف عائد کردہ الزامات کی تحقیقات کے لئے مسٹر فضل الحق کے ساتھ دورہ کرنے کے لئے بیتاب نظر آتے ہیں، وہ صرف ناگپور آکر ان الزامات کی تحقیقات کر لیں جو میں نے عائد کئے ہیں۔ اس میں فائدہ زیادہ ہوگا اور صرفہ کم ہوگا۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ وہ یہ معلوم کر کے کہ سی پی وزارت نے کیا کچھ کیا ہے حیران رہ جائیں گے[1]"

یہ بیان اگر کسی مسلمان یا مسلم لیگی رہنما کا ہوتا تو بلا شبہ کہا جا سکتا تھا کہ اس میں جانب داری سے کام لیا گیا ہے۔ مگر بیان ایک ایسے غیر مسلم کا تھا جو خود سی پی کا وزیر اعلیٰ رہ چکا تھا اور اس نے جن واقعات کی نشاندہی کی تھی وہ خود ان کا عینی شاہد تھا بلکہ خود اس کی وزارت کے زمانے میں اسے ان ناانصافیوں پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسٹر فضل الحق نے کانگرسی وزارتوں کی سیاہ کاریوں کی نقاب کشائی میں کسی مبالغے یا جانبداری سے کام نہیں لیا تھا۔ مسٹر فضل الحق نے کانگرسی وزارتوں میں مسلمانوں پر جسمانی مظالم کی جانب بھی اشارہ کیا تھا۔ ذیل میں اس سلسلے کا ایک واقعہ قدرے

---

[1] مسٹر فضل الحق اور مسٹر کھرے کے یہ بیانات تاریخ مسلم لیگ صفحہ ۲۱۳ تا ۲۱۹ مؤلفہ سید رئیس احمد جعفری سے ماخوذ ہیں۔

تفصیل سے درج کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ کانگرسی وزراء اور ہندو فرقہ پرست صرف داخلی خود مختاری حاصل ہونے پر کس قدر آپے سے باہر ہو چکے تھے اور چاہتے تھے کہ جس طرح بھی ہو مسلمانوں کو نیست و نابود کر دیا جائے اور انہیں ذلیل و خوار کیا جائے

شرمناک مظالم

چاندو رلبسوا سی پی کا ایک قصبہ ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ اس قصبے کے ایک شخص جگدیو پٹیل کے ایک پریس قائم کیا اور ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا "قرآن کی غزل" اس میں مسلمانوں کے عقائد قرآن حکیم اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان میں سخت گستاخیاں کی گئی تھیں۔ یہ کتاب گیتوں کی شکل میں تھی اور جگدیو پٹیل قصبے کے ہندو لڑکوں کو ساتھ لے کر بازاروں میں یہ دل آزار غزلیں یا گیت گاتا پھرتا تھا۔ ایک بار پولیس نے اس کو گرفتار کر کے مقدمہ چلایا اور اسے جرمانہ کی سزا بھی دی گئی۔ یہ کانگرسی وزارت سے قبل کا واقعہ ہے، لیکن جب سی پی میں کانگرس وزارت قائم ہو گئی تو اس کے حوصلے اور بلند ہو گئے اور مارچ ۱۹۳۹ء میں محرم کے موقع پر اسی کی سازش سے تعزیہ پر غلاظت پھینکی گئی۔ اس کے بعد اس نے چند ہندوؤں کے ساتھ ایک مسجد کے قریب جا کر مسلمانوں کے خلاف توہین آمیز نعرے لگائے اور مسجد پر گوبر اور رنگ پھینکا۔ اس پر مسلمانوں نے اُسے ڈانٹا۔ یہ دیکھ کر جگدیو نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ فریقین میں لڑائی ہوئی دونوں طرف کے لوگ زخمی ہوئے۔ جگدیو پٹیل سخت زخمی ہوا اور اسی روز ہسپتال میں فوت ہو گیا۔ اگرچہ اس علاقے کا تھانیدار ایک مسلمان نظام الدین تھا۔ مگر واقعات کو مسخ کرنے کے لئے ایک ہندو سب انسپکٹر پولیس کو متعین کیا گیا تاکہ وہ ہندوؤں کے مفاد میں رپورٹ تیار کر سکے۔ اسی دوران میں مسلمان سب انسپکٹر پولیس کا تبادلہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہندو سب انسپکٹر پولیس نے ہندو مجسٹریٹ کے ساتھ ساز باز کر کے علاقے کے ان معززین کو گرفتار کر لیا۔ جن کا اس واقعے سے دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔ ان میں سید اکرام الدین بھی شامل تھے۔ جو لبسوا کے ایک معزز شخص تھے اور جنہوں نے انتخابات میں کانگرسی اُمیدوار کو شکست دی تھی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس ضلع کا سپرنٹنڈنٹ پولیس مسلمان تھا مگر اسے اس واقعہ کی تحقیقات سے بالکل الگ رکھا گیا اور ساری کارروائی ہندو افسروں کے ہاتھوں مکمل ہوئی۔

اس واقعے کے بائیس روز بعد شناخت پریڈ ہوئی۔ پولیس گارد قصبے کے ناکوں پر متعین کر دی گئی، یہ جمعہ کا دن تھا۔ علاقے کے سارے مسلمانوں کو طلب کیا گیا اور انہیں صبح سے شام تک کھڑا رکھا گیا حتیٰ کہ بوڑھوں اور بیماروں کو بھی معاف نہ کیا گیا۔ یہ لوگ صبح سے شام تک بھوکے رہے جب رات

ہوگئی تو ڈیڑھ سو مسلمانوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا جس کا رقبہ ۳۰ × ۲۰ فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ دوسرے دن کے بعد ان کی پھر شناخت پریڈ ہوئی اور سارا دن انہیں کھڑے رہنے پر مجبور کیا گیا۔ آخر ان مظلوموں میں سے ایک سن رسیدہ بیوہ عورت کا جوان بیٹا ان صدمات کی تاب نہ لاکر ۲۴ اپریل ۱۹۳۹ء کو جاں بحق ہوگیا۔ یہ لوگ ایک ماہ تک جیل میں بند رہے۔ اس دوران میں انہیں طرح طرح کی جسمانی اور روحانی تکلیفیں دی گئیں۔ آخر کار ان میں سے ۱۰۴ مسلمانوں کو ثبوت نہ ملنے پر رہا کر دیا گیا۔

۴۲ مسلمانوں پر مقدمہ چلایا گیا۔ جن میں سے ۶ مسلمانوں کو سیشن جج ناگپور کی عدالت سے پھانسی کی سزا اور ۲۴ کو عمر قید ہوئی۔ باقی سیشن جج کی عدالت سے بھی بری ہوگئے۔ بلوے کے مقدمے میں جارحیت کا ارتکاب کرنے والوں کی بجائے اپنی مدافعت کرنے والے گروہ کو صرف ایک آدمی کے قتل کے جرم میں اتنی سنگین سزا دینا یعنی ۶ افراد کو پھانسی اور ۲۴ کو عمر قید شاید دنیا کی تاریخ عدالت میں پہلی مثال تھی جو کانگریس کے ترنگے جھنڈے کے سایے میں پیش کی گئی۔ کانگرسی حکومت کے اس زبردست اثر کے باوجود سیشن جج بھی اپنے فیصلے میں یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ (ایک تنگ و تاریک کمرے میں ڈیڑھ سو افراد کو شدید گرمی میں ٹھونس دینا) یہ ایسا ظالمانہ سلوک ہے جو نازی جرمنی میں تو روا رکھا جا سکتا ہے۔ مگر برطانیہ کی تہذیب حکومت کے زیر سایہ انتظامیہ کی پیشانی پر نہایت بدنما داغ ہے۔

اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی۔ ان مظلوم مسلمانوں کی خوش قسمتی سے کانگرسی حکومت اس وقت مستعفی ہو چکی تھی ایڈووکیٹ جنرل بھی کانگرسی حکومت کے نامزد کردہ نہ تھے، اس لئے عدالت عالیہ نے مسل کا غیر جانبدارانہ معائنہ کیا اور ۲ مئی ۱۹۴۰ء کو سارے ملزموں کو باعزت بری کر دیا۔ فاضل جج نے اپنے فیصلے میں اس مقدمے کے متعلق جو ریمارکس دیئے اُن کی چند سطروں کے مطالعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سی پی کی کانگرس حکومت نے کس طرح لبوہ کے بے گناہ اور معزز مسلمانوں کو پھانسی پر چڑھانے اور انہیں ذلیل کرنے کے لئے کیسے شرمناک ہتھکنڈے استعمال کئے۔ فاضل جج نے لکھا کہ قتل کے اس اندوہناک مقدمے میں ۴۲ افراد کو ماخوذ کیا گیا۔ اس سلسلے میں جو گواہ پیش کئے گئے۔ انہوں نے جھوٹی شہادتیں دیں۔ انہیں سکھایا پڑھایا گیا۔ ان میں سات کم سن بچے بھی شامل تھے جنہیں جھوٹی گواہی دینے کی تربیت دی گئی۔ انسانی فطرت کی اس سے زیادہ پستی اور کیا ہوگی کہ یہ خیال کئے بغیر کہ یہ لوگ بے قصور ہیں، انہیں پھانسی پر لٹکانے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے اور پہلے سے سکھائے ہوئے لوگوں سے ملزموں کی شناخت کرائی

جاری ہے۔ اپنے حریفوں کو سولی دلوانے کے لئے معصوم بچوں سے جبرًا حلف اٹھوا کر گواہی دلوانے کی کوشش کرنا انتہائی پست فطرتی ہے۔ فاضل ججوں نے اپنے فیصلے میں سی۔ پی کے وزراء کے اس طرزِ عمل کی بھی مذمت کی کہ جب یہ مقدمہ زیرِ سماعت تھا تو اس کے متعلق صوبائی اسمبلی میں بیانات دیئے گئے جو بالکل ناجائز طریقہ تھا۔[1]

گذشتہ صفحات میں مسلمانوں کو جسمانی ایذا پہنچانے، ان کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کرنے اور اُن کی جان لینے کی شرمناک کوششوں کی جو واقعہ پیش کیا گیا ہے یہ صرف ایک صوبہ یعنی سی۔ پی کا ہے اور وہ بھی صرف ایک واقعہ ہے۔ اگر اس زمانے کے اخبارات کا مطالعہ کیا جائے تو سینکڑوں نہیں ہزاروں ایسے واقعات ملیں گے جن سے کانگریسی حکومتوں میں ہندوؤں کی بربریت کی شرمناک تاریخ مرتب ہوگی۔ ظاہر ہے کہ ان صفحات میں یہ سارے واقعات درج نہیں کیے جا سکتے۔ ذیل میں صرف چند واقعات نہایت اختصار سے پیش کئے جاتے ہیں۔

راجپوتانہ

۱۷ جنوری ۱۹۳۹ء کو جمعہ کے دن جے پور میں مسلمانوں کے نہتے مجمع پر گولیوں کی بارش کی گئی پولیس اور فوج کی اس بے رحمی کی وجہ سے ۳۵ افراد شہید اور کئی سو زخمی ہوئے۔ جے پور میں مساجد تک دشمنوں کے ہاتھوں محفوظ نہیں۔ پولیس اور فوج جوتوں سمیت مسجد میں داخل ہوئی اور ۲۸ گھنٹے تک اللہ کے گھر کی بے حرمتی ہوتی رہی۔ اس شدید ظلم و ستم کی تاب نہ لا کر چار ہزار مسلمان جے پور سے ہجرت کر گئے، اور ان کے ایک وفد نے وائسرائے ہاؤس دہلی کے سامنے مظاہرہ کیا۔[2]

(اگرچہ جے پور میں کانگریسی وزارت نہ تھی۔ لیکن اس کا حکمران کٹر ہندو اور کانگریسی ذہنیت کا حامل تھا)

آسام

صوبۂ آسام کی مسلم لیگ کی طرف سے آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کو یہ شکایت بھیجی گئی کہ آسام کی کانگریسی حکومت نے مسلم مہاجرین کو زمینوں سے بے دخل کر کے ہزاروں انسانوں کو مبتلائے مصیبت کر رکھا ہے۔ یہ رپورٹ شملہ میں ۱۳ مئی ۱۹۴۶ء کو قائدِ اعظم کی خدمت میں پیش کی گئی

---

[1] اس زمانے کے اخبارات کے علاوہ یہ واقعہ اختصار کے ساتھ چودھری خلیق الزماں نے بھی اپنی کتاب "شاہراہِ پاکستان" کے صفحہ ۲۸۳ پر درج کیا ہے۔

جہاں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ ؎

یو پی

فروری ۱۹۳۹ء میں کانپور شدید ہندو مسلم فسادات کی لپیٹ میں آ گیا۔ ۲۵ افراد ہلاک اور کئی سو زخمی ہوئے، یہ فسادات کئی دن جاری رہے۔

۹ جون ۱۹۳۹ء کو پھر کانپور میں ہندو مسلم فساد ہوا، ہندوؤں نے رتھ یاترا کا جلوس نکالا جس میں مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیز نعرے لگائے گئے۔ جب یہ جلوس مسلمان محلوں میں سے آوازے کستا ہوا گزرا تو مسلمانوں نے جوش میں آ کر اس پر خشت باری کی۔ دونوں گروہوں میں سخت فساد ہوا۔ پولیس نے گولی چلا دی، ہندو تھوڑی دیر کے لئے منتشر ہو گئے مگر پھر مول گنج کے پاس جمع ہو گئے جہاں ہندو مسلمانوں میں سخت تصادم ہو گیا۔ ۳ افراد ہلاک اور تین مجروح ہوئے۔

جنوری ۱۹۳۹ء میں مہا سبھا نے حیدر آباد کے مسلمان حکمراں کے خلاف "حیدر آباد ڈے" منایا۔ دہلی۔ بریلی اور لکھنؤ میں سخت فرقہ وارانہ فساد ہوئے۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں الہ آباد میں ہندوؤں کا ایک جلوس باجوں کے ساتھ مسجد کے قریب سے گزرا۔ نماز ہو رہی تھی اور جلوس میں شریک افراد باجہ بجا رہے تھے، کچھ مسلمانوں نے اسے روکا۔ اس پر ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ تین مسلمان شہید اور ۱۵ زخمی ہوئے۔

مارچ ۱۹۳۹ء میں بنارس میں ہندوؤں نے مسلمانوں پر سخت حملے کئے جن میں بہت سے مسلمان شہید اور زخمی ہو گئے ؎

بمبئی

بمبئی میں ۱۲ مئی ۱۹۳۹ء سے فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ کامٹی پورہ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان سوڈا واٹر کی بوتلوں چاقوؤں اور لاٹھیوں سے لڑائی ہوئی جس کے نتیجے میں ایک سو اشخاص زخمی اور ۳ ہلاک ہوئے۔

مئی ۱۹۳۹ء میں شولاپور میں سخت خونریز فساد ہوا، یہ مقام آریہ سماجی ستیہ گرہیوں کا صدر مقام ہے جہاں سے ان کے دستے ریاست حیدر آباد میں داخل ہو کر اس اسلامی ریاست میں غدر مچاتے ہیں یہ شولا پور کا دوسرا فساد ہے جس میں متعدد افراد ہلاک اور ۳۰ زخمی ہوئے۔ ؎

؎ ؎ ؎ ؎ یہ اطلاعات ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء کے مختلف روزناموں میں شائع ہوئیں، ان روزناموں سے اخذ کر کے ہفت روزہ حمایت اسلام لاہور نے اپنی ۲۶ جنوری ۱۹۳۸ء، ۹ فروری ۱۹۳۹ء، ۱۶ فروری ۱۹۳۹ء، ۶ اپریل ۱۹۳۹ء، ۱۳ اپریل ۱۹۳۹ء، ۲۵ مئی ۱۹۳۹ء، ۲۲ جون ۱۹۳۹ء، ۲۹ جون ۱۹۳۹ء اور یکم ستمبر ۱۹۳۸ء کے شماروں میں شائع کیں۔

قتل گاہ بہار

دربھنگہ (بہار) سے مصلح الدین احمد بی اے ایل ایل بی سیکرٹری دربھنگہ مسلم لیگ نے ایک بیان شایع کیا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ انہیں ۸ مئی کو معلوم ہوا کہ دربھنگہ سے متصل ایک گاؤں کانسی کے مسلمانوں پر اردگرد کے ہندوؤں نے اچانک حملہ کر کے ان کے گھر اور کھیت جلا دئیے ہیں سیکرٹری دربھنگہ مسلم لیگ یہ خبر سن کر چند دوسرے اکابر مسلمانوں سپرنٹنڈنٹ پولیس اور سول سرجن کی معیت میں کانسی پہنچے۔ وہاں جا کر دیکھا کہ مسلمان محلہ بالکل ویران اور غیر آباد ہے۔ البتہ کہیں کہیں زخمیوں اور مُردوں کی لاشیں خون میں لت پت پڑی ہیں۔ مسجد میں ایک ستر سال کے بوڑھے کی جان کنی کے منظر نے تو ان کے ہوش و حواس کھو دیئے۔ بوڑھے کے جسم پر بے شمار زخم تھے جن سے خون بہہ رہا تھا مگر اس کا کوئی پُرسان حال نہ تھا۔ دیہات کے مسلمان اپنے بیوی بچوں سمیت ہندوؤں کے ڈر سے جنگل میں جا چھپے تھے۔ جب انہیں بڑی دقت سے واپس لایا گیا تو ان لوگوں سے معلوم ہوا کہ ہندوؤں نے متفقہ طور پر لاٹھیوں چھریوں تلواروں اور کلہاڑیوں سے مسلح ہو کر ان پر حملہ کر دیا۔ ہندوؤں کی سختی اور ظلم کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ اُنہوں نے مسجد میں عصر کی نماز پڑھنے والے مسلمانوں کو بھی شہید کرنے سے دریغ نہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسجد کے فرش پر خون بہنے لگا۔ بعض مسلمان بھاگ کر اپنے گھروں میں چھپ گئے۔ ان کے مکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ ان کا خون بڑی آزادی سے بہایا گیا۔[1]

عصمتوں پر ڈاکے

گزشتہ صفحات میں مسلمانوں کو جسمانی ایذا پہنچانے ان کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کرنے اور ان کی جان لینے کے شرمناک کوششوں کے چند واقعات درج کئے گئے ہیں حالانکہ کانگرسی وزارتوں کا نامۂ اعمال ایسے ہزاروں ہزار واقعات سے سیاہ ہے۔ اب ذیل میں ایک ایسا واقعہ درج کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ کانگرسی وزارتوں میں مسلمانوں کی جان و مال اور مذہب ہی نہیں بلکہ اُن کی آبرو بھی محفوظ نہیں تھی یہ واقعہ سی پی سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر سی پی کا کوئی عام ہندو غنڈہ اس جرم کا ارتکاب کرتا تو بھی اس کی سنگینی کم نہ ہوتی لیکن ستم تو یہ ہے کہ اس جرم کا ارتکاب ایک ایسے ہندو نے کیا جو بعد کو امن و قانون کا ذمہ دار اور نگراں بن بیٹھا یعنی سی پی کی کانگرسی وزارت کا ایک وزیر۔ اس بدبخت شخص کا نام دوارکا پرشاد مصر اتھا۔ اس نے اپنے ڈرائیور کی مدد سے جس کا نام نانا نائیڈو تھا ایک نابالغ مسلمان لڑکی حسینہ نامی کو اغوا کر لیا۔ لڑکی نے پولیس کو جو بیان دیا اس کے بعض حصّوں سے کانگرسی حکومت کی سیاہ کاریوں کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے لڑکی نے اپنے بیان

---

[1] سہ روزہ حیات اسلام یکم دسمبر ۱۹۳۸ء

میں کہا کہ نانا نائیڈو نامی ایک شخص میرے مکان پر آیا اس وقت میری والدہ گھر میں موجود نہ تھی نائیڈو نے مجھ سے کہا کہ تمہاری ماں نے تمہیں بلایا ہے۔ جب میں باہر نکلی تو اس نے مجھے پکڑ کر جبراً کار میں ڈال لیا اور کار چلا دی میں نے چیخ پکار کی تو اس نے زور زور سے ہارن بجانا شروع کر دیا تاکہ میری آواز ہارن کی آواز میں دب جائے۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا جسے میں رات ہو جانے کی وجہ سے شناخت نہ کر سکی۔ مجھے گوپال باغ لے جا کر تالے میں بند کر دیا گیا۔ اور نائیڈو نے رات کو کئی بار میری عصمت دری کی۔ اس نے مجھ سے بار بار کہا کہ تم مصراجی کے گھر رہنا وہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ ان کے پاس تمہاری زندگی نہایت آرام سے گزرے گی۔ ایک دو دن کے بعد مصراجی میرے کمرے میں آئے اور مجھ سے اپنے گھر چلنے کو کہا۔ میں نے انکار کیا میری مزاحمت کے باوجود انہوں نے میری آبرو ریزی کی۔" اس کے بعد اس مظلوم لڑکی کو بمبئی بھیجنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن پولیس نے لڑکی کو مصرا کی فلم کمپنی کے ایک ملازم کے گھر سے برآمد کر لیا۔ پولیس کے کاغذات سے اس امر کی بھی شہادت ملتی ہے کہ اس لڑکی کا بلوغت کا جھوٹا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کی بھی کوشش کی گئی اور ڈاکٹر مس قاضی اور ڈاکٹر جارج ڈی سلوا سے کہا گیا کہ وہ اس کے بالغ ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیں مگر ان دونوں ڈاکٹروں نے لڑکی کا معائنہ کرنے کے بعد یہ رائے ظاہر کی کہ لڑکی نابالغ ہے

زانی ہندو منصب وزارت پر

اس وقت تک دوارکا پرشاد مصرا محض ایک فلم ساز اور سیٹھ تھا۔ وزارت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا مگر عین اس وقت جب اس نے ایک نابالغ مسلمان لڑکی کو اغوا کر وا کر اس کی آبرو ریزی کی اور پولیس اس کے خلاف تفتیش کر رہی تھی سی پی کانگرس نے اسے وزارت کے منصب پر فائز کر دیا۔ اس پر کانگرس ہائی کمان کے خلاف شورش برپا ہوئی اور مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ ایک ایسے شخص کو وزارت کے عہدے پر مقرر کرنا سخت ظلم اور انصاف کا خون کرنے کے مترادف ہے جو زنا بالجبر کے مقدمے میں ماخوذ ہے۔ مطالبہ نہایت معقول تھا اس نے اسے نظر انداز کرنا آسان نہ تھا مگر پھر بھی سی پی کی کانگرس ہائی کمان اور کانگریسی وزارت نے ایک سال تک اس مطالبے کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا۔ لیکن جب معاملہ نازک صورت اختیار کر گیا تو کانگرس ہائی کمان اور کانگرسی وزارت نے کسی جج یا کسی غیر جانبدار شخص کو تحقیقات پر مقرر کرنے کی بجائے ایک کٹر اور متعصب کانگرسی مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کو اس معاملے کی تفتیش و تحقیق پر مامور کر دیا۔ انہوں نے نہایت غلط طریق کار اختیار کیا اور بہت سے لوگوں کی شہادتوں کو ہی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر اسی

وقت یہ نزاع مصر اور حکومت کے منصب پر فائز کیا جا چکا تھا اور ظاہر ہے کہ کسی وزیر کے خلاف شہادتیں فراہم کرنا آسان نہیں نتیجہ یہ ہوا کہ مصر ابری کر دیا گیا اور مسٹر ڈیسائی نے فیصلہ دے دیا کہ الزام عاید کرنے والوں نے غلط بیانی سے کام لیا ہے ۔

یہ ہے کانگریس ہائی کمان کی ناانصافیوں، ظلم و ستم اور کانگریسی وزارتوں کی سیاہ کاریوں کی طویل داستان کی چند جھلکیاں جو مظلوم اور محکوم مسلمانوں کے ساتھ روا رکھی گئیں صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں کو آزار پہنچانے اور انہیں طرح طرح سے ذلیل کرنے کی کوشش عام فرقہ پرست ہندوؤں اور چند کانگریسی وزراء نے کی بلکہ کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال بھی مسلمانوں کی ایذا رسانی میں کسی سے پیچھے نہ رہے ۔ انہوں نے یہ فریضہ اپنے مخصوص رنگ میں ادا کیا اور مسلمانوں کے مذہب، ان کی تہذیب ان کی تاریخ اور قومی احساسات پر اپنے قلم سے نہایت بھرپور حملے کئے ۔ ان کی کتاب کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو :-

پنڈت جواہر لال کی مسلم آزاری

"مسلم قومیت کا تصور چند لوگوں نے اختراع کر لیا ہے، یہ محض ایک تخیل ہے، شاید چند افراد سے زیادہ اس تصور سے کوئی واقف بھی نہ ہوتا اگر اخباروں میں اس کی اتنی تشہیر نہ کی جاتی ۔ اور اگر لوگ اس تصور کو قبول بھی کر لیتے تو حقائق کی چٹان سے ٹکرانے کے بعد یہ پاش پاش ہو جاتا ۔ لیکن اس مسلم قومیت کی حقیقت ہے کیا؟ کیا یہ نام ہے فنون لطیفہ زبان اور رسوم و روایت کا ۔ جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے میں نے کسی شخص کو اسلامی آرٹ یا اسلامی موسیقی کا تذکرہ کرتے نہیں سنا ۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ اسلامی تہذیب کے مفہوم تک میری رسائی ہو جائے لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس میں ناکام رہا ۔ مجھے تو اسلامی تہذیب کی یہی نشانی نظر آئی کہ ایک خاص طرز کا پاجامہ جو نہ بہت لمبا ہو نہ بہت چھوٹا، مونچھوں کے تراشنے کا ایک خاص انداز، چہرے پر داڑھی اور ایک لوٹا جس میں ایک خاص طرز کی ٹونٹی ہوتی ہے جہاں تک داڑھیوں کا معاملہ ہے جب کابل میں امان اللہ خاں کے ہاتھوں ان کا صفایا شروع ہوا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی یہ مسلمان بھی عجیب واقع ہوئے ہیں کہ ہمیشہ ماضی کی طرف دیکھتے رہتے ہیں اور ان چیزوں کے پیچھے دوڑتے ہیں جو ان کے ہاتھ سے نکل جاتی ہیں"[1]

---

[1] میری کہانی مولفہ پنڈت جواہر لال نہرو صفحہ ۳۳۱

شاید ایک گندہ ذہن مہاسبھائی بھی اسلامی تہذیب وتمدن اور مسلمانوں کی قومیت کا اس سے زیادہ مذاق نہیں اُڑا سکتا۔ یہ ایسے شخص کے خیالات ہیں جو اس کانگرس کا صدر بھی رہا۔ جسے برصغیر کے چالیس کروڑ باشندوں کی واحد نمائندہ جماعت قرار دینے میں مسٹر گاندھی سے لے کر مولانا ابوالکلام آزاد تک ہر کانگرسی پوری قوت صرف کر رہا تھا، جسے غیر فرقہ وارانہ جماعت ثابت کیا جارہا تھا۔ لیکن اس جماعت کا صدر ایک فرقے کے معتقدات پر بھرپور حملے کرتا ہے۔ اِن کی داڑھیوں اور مونچھوں کا مذاق اڑاتا ہے، اسے ان کے لوٹے کی ٹونٹی تک پسند نہیں۔ ان کی داڑھیوں کا صفایا ہوتے دیکھ کر اسے دلی مسرت ہوتی ہے، اسے مسلمانوں کے تمدن اور مسلمانوں کی تہذیب میں کوئی قابلِ ذکر چیز ہی نظر نہیں آتی وہ ان کے قومی وجود ہی سے انکار کرتا ہے۔ لیکن اسے برہمنوں کے سر پر موٹی اور لمبی چوٹی بُری نہیں لگتی وہ ان کے اس دھاگے (جنیو) کا مذاق نہیں اُڑاتا جو اُن کے شانے اور کمر کے درمیان پڑا رہتا ہے اُسے پیتل کی اس لٹیا سے نفرت نہیں جس سے گنگا میں نہا کر سارے پچھلے گناہ دُھل جاتے ہیں۔ اِسے ایک چوپائے (گائے) کو ماتا قرار دینے میں قطعاً شرم محسوس نہیں ہوتی مندر میں جاکر پتھر کے ایک بدشکل بت کے سامنے ہاتھ جوڑنے اور اس سے مرادیں مانگنے پر وہ طنز نہیں کرتا۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ اوّل و آخر ہندو ہے، اسے مسلمانوں سے نفرت ہے۔ اُن کی تہذیب سے نفرت ہے۔ اُن کی قومیت سے نفرت ہے اسی لئے ان کا مذاق اُڑاتا ہے۔ مگر ہندو مذہب، ہندو تہذیب اور ہندو افکار کے خلاف ایک لفظ نہیں کہتا۔ اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو بھی اور اپنی جماعت کو بھی غیر فرقہ وارانہ قرار دیتا ہے، اس سے زیادہ فریب اس سے زیادہ جھوٹ اور اس سے زیادہ دیدہ دلیری اور کیا ہو سکتی ہے۔

سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ پنڈت جواہرلال کی اس گستاخانہ اور اسلامی تعلیم و تہذیب کے خلاف معاندانہ تحریر پر کانگرسی مسلمان، مجلس احرار، جمعیۃ العلماء کے متشرع اصحاب اور کانگرس کے حامی علمائے دین و شرع متین کی اسلامی غیرت کو ذرا بھی جوش نہ آیا۔ وہ کابل میں داڑھیوں کا صفایا ہوتے دیکھ کر خوش ہونے والے نہرو کے بدستور گن گاتے رہے اور قائدِاعظم کو رسوا کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے جو مسلمانوں کی بحالی عظمت کے لئے سینہ سپر تھے۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن ط

ہم ان صفحات میں پنڈت جواہرلال کی یہ دل آزار تحریر درج نہ کرتے لیکن اس کے بغیر کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔ اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ جب کانگرس کا اتنا ذمہ دار لیڈر مسلمانوں کی دل آزاری

میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے الفاظ لاتا ہے جن سے مسلم معاشرہ اور اسلامی معتقدات پر کاری ضرب لگ سکے تو اگر عام کانگرسی اور عام ہندو فرقہ پرست زبان و قلم کی سطح سے نیچے اُتر کر مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو پر ڈاکہ ڈالے تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ اسی لئے مسلم لیگی رہنماؤں اور عام مسلمانوں نے کانگریسی وزارتوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کا ظالمانہ سلوک دیکھ کر یہ رائے قائم کی کہ یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہو رہا ہے اور اس میں کانگرس ہائی کمان سے لے کر عام ہندو تک سب شامل ہیں

قائدِ اعظم کا احتجاج۔

یہی وجہ ہے کہ قائد اعظم محمد علی جناح جیسا محتاط رہنما بھی کانگرسی وزارتوں کی ناانصافیوں اور مظالم کے خلاف احتجاج کئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں سندھ مسلم لیگ کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے قائد اعظم نے اپنے خطبۂ صدارت میں کانگرسی وزارتوں کو ملک کے لئے ایک مصیبت قرار دیا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں بندے ماترم، ودیا مندر اسکیم اور کانگریسی جھنڈے کو قومی حیثیت دینے کے خلاف، مسلمانانِ ہند کے نفرت انگیز جذبات کا اظہار کرنے کے بعد کہا کہ:

ہر مسلمان کو کانگرس کا ممبر بنانے کی غرض سے آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے مسلمانوں میں رابطۂ عوام کی ایک مہم شروع کی ہے، تاکہ اس طرح مسلم لیگی نمائندوں کو شکست دی جائے اور کمیونل ایوارڈ (فرقہ دارانہ مسئلہ) کا وجود ہی باقی نہ رہے۔ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اور ان کی سیاسی قوت کو تباہ کرنے کے لئے اردو کو مٹایا جا رہا ہے اور اس کی بجائے ایک ایسی زبان کو ہندوستان کے عوام کی زبان بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے جو سنسکرت کی آمیزش سے تیار کی گئی ہے۔

ملازمتوں کے دروازے صرف ان لوگوں پر کھولے گئے ہیں جو کانگرسی ہوں یا مسلم لیگ سے الگ ہو جائیں۔ مسلم لیگ کے ممبروں کو دفعہ ۱۴۴ اور فوجداری قوانین کے ترامیم شدہ آرڈی ننسوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے انتخابات میں اس طرح کے قوانین نافذ کئے جا رہے ہیں جن سے مسلمانوں کی نمائندگی متاثر ہو۔ مسلمانوں کے پریس کو بھی تختۂ مشق ستم بنایا جا رہا ہے، اور بہت سے مسلم اخبارات و رسائل کی ضمانتیں ضبط کر لی گئی ہیں ——

میں حیران ہوں کہ کانگرس اس تھوڑے سے اقتدار کے نشے میں اس حد تک بد مست ہو گئی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب اسے ہندوستان پر حکومت کرنے کے مکمل اختیارات حاصل ہو جائیں گے تو وہ مسلمانوں پر کیسے کیسے مظالم کرے گی۔"

اس پس منظر کے بعد اب ہم آئندہ صفحات میں مسلم لیگ کے اس آخری اقدام پر گفتگو کریں گے جو نتیجہ تھا ہندو کانگرس کے اُن مظالم کا جن کی چند جھلکیاں اس باب میں دکھائی گئی ہیں۔ اس اقدام پر مسلمانوں کو خود ہندوؤں اور اُن کی فرقہ پرست کانگرس نے مجبور کیا اور اس کی فوری وجہ کانگرس کے یہی مظالم تھے جن کا اجمالی خاکہ اس باب میں پیش کیا گیا ہے۔

قرار دادِ لاہور

قارئین کرام گذشتہ باب میں پڑھ چکے ہیں کہ انڈیا ایکٹ کے نفاذ کے بعد ہندو کانگرس کو حکومت کے محدود اختیارات ملے تھے یعنی اسے صرف صوبائی معاملات میں خود مختاری حاصل ہوئی تھی۔ لیکن ان محدود اختیارات کے بل پر اس نے نہ صرف مسلم لیگ کو آنکھیں دکھائیں جس کے اشتراک و تعاون سے اس نے یہ انتخابات جیتے تھے، بلکہ مسلم عوام کی زندگی اجیرن کر دی۔ انہیں ذلیل و خوار کرنے، ان کا قتل عام کرنے، اُن کی مستورات کو بے آبرو کرنے، ان کے معصوم بچوں کو ذبح کرنے اور اُن کی تہذیب و تمدن اور دین و ایمان پر ڈاکہ ڈالنے میں کوئی باک محسوس نہ کی۔ فرقہ پرست کانگرس اور اس کے رہنماؤں کے عزائم اب پوری طرح بے نقاب ہو چکے تھے۔ کانگرسی لیڈر اب ہندو راج کے خواب کو حقیقت بنانے پر تُلے ہوئے تھے۔ اقتدار کے نشے میں وہ اتنے بدمست ہو چکے تھے اور اُن کی آنکھوں پر تعصب کی ایسی پٹی بندھ گئی تھی کہ انہیں اپنے اور انگریزوں کے سوائے ہندوستان میں کوئی تیسری طاقت نظر ہی نہ آتی تھی۔

علامہ اقبالؒ کا حسنِ انتخاب

اِن حالات سے ہندوستان کے تمام باحمیت مسلمان رہنما سخت متفکر تھے اور سوچ رہے تھے کہ اگر صورت حال یہی رہی تو برصغیر کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کا کیا حشر ہو گا۔ ان مسلمان رہنماؤں میں علامہ اقبالؒ وہ ممتاز سیاست داں تھے جو کسی خاص جماعت کی رہنمائی تو نہیں کر رہے تھے۔ ان کے پاس سرمایہ تھا نہ افرادی قوت مگر ان کے پاس ایک ایسی قوت ضرور تھی جس نے انہیں اس عہد کے سیاست دانوں میں ممتاز کر دیا تھا۔ یہ فکر و نظر کی قوت تھی کیونکہ صحیح فکر قوموں کو تعمیر و بقاء کے راستے پر ڈالتی ہے اور اس کے بغیر قومیں ابدی ہلاکت و ذلت کے عمیق غار میں جا گرتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے پاس ایک قوت اور بھی تھی اور وہ تھی مردم شناسی کی قوت۔ تاریخ گواہ ہے کہ بہت سے حکمراں اور بہت سے رہنما صرف اس لئے ناکام ہوئے کہ اُنہوں نے صحیح افراد کا انتخاب نہیں کیا۔ یہ شرف علامہ اقبالؒ کے حصے میں آیا کہ اُنہوں نے فکر کا صحیح رُخ اختیار کیا اور اس کے لئے صحیح ترین اور موزوں ترین فرد کا انتخاب کیا۔

برصغیر کے مسلمانوں کو انگریز کے تسلط سے نجات دلانے اور ہندو کے غلبے سے بچانے کے لئے اُنہوں نے قوم کے سامنے وہی لائحہ عمل پیش کیا جو وہ ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں پیش کر چکے تھے اور جس کی طرف ان کے ہم خیال احباب مثلاً سر سید، عبدالحلیم شرر، خیری برادران، مولانا محمد علی جوہر، سردار محمد گل خان، مولانا حسرت موہانی، نواب سر ذوالفقار علی خان اور چوہدری رحمت علی اشارے کر چکے تھے۔ یعنی برصغیر کو ہندو اور مسلم ریاستوں میں تقسیم کر کے مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ اور آزادانہ اسلامی ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اس کٹھن مہم کو سر کرنا آسان نہ تھا۔ اس کے لئے شہباز کی آنکھ اور چیتے کا جگر درکار تھا۔ ایک ایسے رہنما کی ضرورت تھی جس میں سیاسی بصیرت کے ساتھ ساتھ آہنی عزم، جرأت مردانہ، غیر معمولی خلوص اور ایسی تنظیمی صلاحیتیں موجود ہوں جو ایک منتشر قوم کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیں۔ علامہ اقبال نے اپنے گردوپیش پر نظر ڈالی دور و نزدیک دیکھا۔ انہیں سیاست دانوں کی اس بھیڑ میں ایک ہی شخص نظر آیا جو ان کے معیار پر ہر لحاظ سے پورا اترتا تھا۔ یہ شخص وہی دُبلا پتلا مگر پہاڑوں کی طرح مضبوط ارادے کا مالک محمد علی جناح تھا جسے قوم اس سے پہلے بیسیوں موقعوں پر آزما چکی تھی اور جو ہر امتحان میں پورا اترا تھا۔

چنانچہ علامہ اقبال نے قوم کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو بچانے کے لئے اسی مردِ آہن کو آواز دی۔ اُنہوں نے اس موضوع پر قائداعظم کو متعدد خطوط لکھے اور ان میں سے بیشتر خطوط اس وقت لکھے جب پنڈت جواہر لال نے یہ متکبرانہ دعویٰ کیا کہ "ہندوستان میں صرف دو جماعتیں ہیں ایک کانگرس اور دوسری حکومت برطانیہ"۔ یہ خطوط تاریخی نوعیت کے ہیں اور اس عہد کی سیاست کو سمجھنے میں نہایت خوش اسلوبی سے مدد دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہی خطوط قائداعظم کو برصغیر کے مسلمانوں کی رہنمائی کرنے اور قراردادِ لاہور کو دس کروڑ مسلمانوں کا قومی مطالبہ بنانے کا باعث ہوئے۔ اس لئے ذیل میں ان میں سے بعض کے ضروری اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔

پہلا خط ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء کا ہے

اقبال جناح خط و کتابت۔

"پنڈت جواہر لال نہرو نے آل انڈیا نیشنل کنونشن کے موقع پر جو تقریر کی ہے وہ آپ کی نظر سے گزری ہوگی۔ اس تقریر کے بین السطور میں برصغیر کے مسلمانوں کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس سے بھی آپ مطلع ہو گئے ہوں گے۔ مجھے اس امر کا بھی یقین ہے کہ نئے آئین کے ذریعے مسلمانوں کو منظم کرنے کا جو قیمتی موقع میسر آیا ہے وہ بھی آپ کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ ہوگا کیونکہ اسی طرح ہندوستان اور ایشیا کے اسلامی ممالک میں آئندہ رونما ہونے والے حالات میں وہ ایک قوم کی حیثیت سے اہم حصہ لے سکیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم ہندوستان کی دوسری تمام

ترقی پسند جماعتوں کی طرف دستِ تعاون بڑھانے کے لئے تیار ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ ایشیا میں اسلام ایک سیاسی اور اخلاقی طاقت اس وقت بن سکتا ہے جب ہندوستان کے مسلمانوں کی مستقل بنیادوں پر تنظیم کی جائے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آل انڈیا نیشنل کنونشن میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ہماری طرف سے مسکت جواب دیا جائے پس آپ بلاتاخیر دہلی میں آل انڈیا کنونشن بلائیں۔ اس اجلاس میں صوبائی مجالس قانون ساز کے نئے اراکین کے علاوہ دوسرے معروف مسلمان اکابر کو بھی دعوت دی جائے۔ اس اجلاس میں آپ تصریح فرمائیں کہ ہندوستان کی ایک نمایاں سیاسی وحدت کے طور پر مسلمانوں کے سیاسی مقاصد کیا ہیں اس وقت ہندوستان کے لوگوں کو بھی اور بیرونِ ہند کے لوگوں کو بھی اس حقیقت سے روشناس کرنا نہایت ضروری ہے کہ ہمارا مسئلہ صرف اقتصادی مسئلہ ہی نہیں ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہم مسائل مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کے ہیں جن کے حل نہ ہونے سے نہایت سنگین نتائج نکلیں گے۔ اگر آپ نے یہ کنونشن بلا لیا تو اس سے مجالس قانون ساز کے ان مسلمان اراکین کے چہرے بھی اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہو جائیں گے جنہوں نے دھڑے بندیاں کر کے ہندوستان کے مسلمانوں کی آرزوؤں اور مفادات کو پامال کیا ہے۔ اس کنونشن سے ہندوؤں پر بھی یہ حقیقت کھل جائے گی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اُن کی تہذیبی وحدت سے محروم کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ چند یوم تک میں بھی دہلی آ رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ وہاں ان امور پر آپ سے تبادلۂ خیال کروں گا۔ میرا قیام افغانستان کے قونصل خانے میں ہوگا۔ اگر آپ کے پاس وقت ہو تو ہم دونوں وہاں مل سکتے ہیں۔

مہربانی فرما کر جتنی جلد ہو سکے اس خط کے جواب میں ایک دو سطریں ہی لکھ بھیجئے۔"

اس خط کے بعد علامہ اقبال نے قائد اعظم کو پھر ایک خط لکھا جس میں مسلم لیگ کو عوامی تنظیم بنانے، پنڈت نہرو کے سوشلزم کے خطرناک نتائج اور برصغیر میں مسلمانوں کے لئے ایک آزاد ریاست کے قیام کی طرف انہیں توجہ دلائی۔ انھوں نے لکھا کہ :-

"لیگ کو اس امر کا فیصلہ کرنا ہی پڑے گا کہ کیا وہ بدستور طبقۂ امراء کے مسلمانوں کی نمائندگی کرتی رہے گی۔ اس کے دروازے عامۃ المسلمین کے لئے بھی کھولے جائیں گے جنہیں ابھی تک اس سے لاتعلق ہیں۔ ذاتی طور پر میں اس خیال کا حامی ہوں کہ مسلمان کسی ایسی سیاسی جماعت سے دلچسپی نہیں رکھ سکتے جو ان کے عام مسائل حل کرنے کا عزم نہ رکھتی ہو۔"

"مسلمانوں میں یہ احساس عام ہو رہا ہے کہ گذشتہ دو سال سے ان کی حالت اور زیادہ خراب ہوتی جا رہی ہے۔ عام طور پر ہندو مہاجن اور ہندو سرمایہ دار کو مسلمانوں کی غربت کا سبب قرار دیا جا رہا ہے۔ ابھی نہ سہی لیکن کبھی نہ کبھی لوگوں کو ضرور معلوم ہو جائے گا کہ اس کا ایک سبب بدیسی حکومت بھی ہے۔ جواہر لال کا سوشلزم جو الحاد میں ڈوبا ہوا ہے مسلمانوں میں مقبول ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس لئے اب غور طلب بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی غربت کا مسئلہ حل کرنے کے لئے کیا کیا جائے۔ لیگ کی کامیابی کا دارومدار اس پر ہے کہ وہ اس مسئلے کا کیا حل پیش کرتی ہے۔ اگر مسلم لیگ یہ مسئلہ حل کرنے میں ناکام رہی تو عامۃ المسلمین پہلے کی طرح اب بھی اس سے کوئی دلچسپی نہیں رکھیں گے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلام کے پاس ایک ایسا قانون موجود ہے کہ اگر اسے بروئے کار لایا جائے تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے ...... لیکن اس قانون کا نفاذ اس وقت ہو سکتا ہے جب ایک آزاد اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آ جائے۔"

"جیسا کہ میں قبل ازیں کہہ چکا ہوں کہ مسلمانانِ ہند کو ان کے مسائل حل کرنے کے قابل بنانے کے لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ملک کو نئے سرے سے تقسیم کیا جائے اور ایک یا ایک سے زائد اسلامی ریاستیں قائم کی جائیں جن میں مسلمانوں کی واضح اکثریت ہو۔ کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ اس مطالبے کا وقت اب آ گیا ہے۔ شاید جواہر لال کے سوشلزم کا یہ سب سے بہتر جواب ہو۔

"ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ توقع ہے کہ اس نازک مرحلے میں آپ ان مشکلات کا حل تلاش کرنے میں ان کی امداد کریں گے جو انہیں درپیش ہیں۔" (۲۸ مئی ۱۹۳۷ء)

اس خط کے چند روز بعد علامہ اقبال نے قائداعظم کو پھر ایک خط لکھا۔ اس خط کا پس منظر صدر کانگرس پنڈت جواہر لال کی وہ تقریر ہے جس میں انہوں نے کہا تھا "کہ ہندوستان میں صرف دو جماعتیں ہیں ایک کانگرس اور دوسری حکومت برطانیہ"

"کانگرس کے صدر نے مسلمانوں کے سیاسی وجود سے صاف طور پر انکار کر دیا ہے۔ یہ حالاتِ موجودہ صرف ایک ہی راہ ہے جو ہندوستان میں امن و امان قائم رکھنے کا باعث ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ نسلی، مذہبی اور لسانی مماثلت کی بنیادوں پر ہندوستان کو از سرِ نو تقسیم کر دیا جائے۔ مجھے یاد ہے کہ انگلستان سے واپسی سے قبل لارڈ لوتھین نے مجھ سے کہا تھا۔ ہندوستان کی مصیبتوں کا واحد حل تمہاری اسکیم (ملک کی تقسیم کی تجویز) ہے۔" (۲۱ جون ۱۹۳۷ء)

ملک کے حالات نہایت تیزی سے خراب ہو رہے تھے ہندو مسلم فسادات نے سارے ملک

کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ہندو روز بروز منظم ہو رہے تھے، ان کے سامنے ایک واضح نصب العین تھا متحدہ ہندوستان کی آزادی جس کے معنی یہ تھے کہ انگریزوں کے رخصت ہونے کے بعد سارے ملک پر ہندو راج قائم ہوگا۔ لیکن برعکس اس کے مسلمان ابھی تک منتشر تھے۔ ان کے سامنے کوئی واضح راستہ نہ تھا۔ کوئی منزل تھی نہ مقصد ان حالات نے علامہ اقبال کو بے چین کر رکھا تھا۔ ان کی نظر بار بار قائد اعظم کی طرف اٹھتی تھی چنانچہ انہوں نے پھر ایک خط لکھا۔

"ہندوستان کے مسلمانوں میں اس وقت صرف آپ ہی کی ایک ذات ہے جس سے قوم یہ توقع کرنے میں حق بجانب ہے کہ اس طوفان میں آپ اس کی ناخدائی کریں گے جو نہ صرف شمال مغربی ہندوستان کو بلکہ پورے ملک کو اپنی زد میں لینے والا ہے، میں آپ پر واضح کر دوں کہ ہم اس وقت خانہ جنگی کی سی حالت میں زندگی گزار رہے ہیں[1]۔"

ہندوستان کے سیاسی حالات، مسلمانوں کی زبوں حالی، انگریزوں کی مسلمانوں کے مسائل سے بے اعتنائی ہندو تنظیموں کے خوفناک عزائم اور علامہ اقبال کے چونکا دینے والے خطوط نے قائد اعظم کو مجبور کر دیا کہ وہ ہندو مسلم کے نقطۂ نگاہ سے سوچنا چھوڑ دیں بلکہ صرف مسلمان کے نقطۂ نگاہ سے سوچیں۔ یہ حقیقت کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ کانگرس کے عدم تعاون اور پے در پے بے وفائیوں کے باوجود قائد اعظم اتنا بڑا قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں تھے جو ہندو اور مسلمان دونوں کو ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا کر دے۔ انہوں نے آخر تک یہی کوشش کی کہ اس سرزمین پر دونوں قومیں مل جل کر رہیں اور اپنے اپنے دائرے میں ترقی کی جانب گامزن رہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ قائد اعظم کی یہ کوشش ہر بار ناکام ہوئی اور ہندو کانگرس نے ان کا یہ سہانا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔ انڈیا ایکٹ کے نفاذ کے بعد جو کانگرسی وزارتیں قائم ہوئیں انہوں نے اپنی سیاہ کاریوں سے قائد اعظم کو ہندو سیاست اور ہندو سماج دونوں سے ہمیشہ کے لئے بددل کر دیا اور پھر انہوں نے علامہ اقبال کا مشورہ قبول کر کے کاروانِ ملت کو ایک نئے راستے پر ڈال دیا۔

دوسری جنگِ عظیم

شاید کانگرسی وزارتوں کی عمر کچھ اور طویل ہو جاتی کہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں جرمنی کے آمر مطلق ہٹلر نے یورپ میں جنگ کی ایسی خوفناک آگ بھڑکا دی جس نے ایک ایک کر کے ہر یورپی ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کی سب سے زیادہ زد حکومت برطانیہ پر پڑی اور جلد ہی برطانیہ اور جرمنی ایک دوسرے کے حریف کی حیثیت سے صف آرا ہو گئے۔ کانگرس جس کی ساری تاریخ موقع پرستی سے بھری پڑی ہے یہ موقع غنیمت سمجھ کر حکومت کے خلاف میدان میں آ گئی۔ گو اس کی ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ کانگرسی حکومت نے

---

[1] لیٹرز آف اقبال ٹو جناح۔ شائع کردہ شیخ محمد اشرف لاہور۔

مسلم اقلیت کے صوبوں میں کمزور مسلمانوں پر جو مظالم کئے تھے بعض گورنروں نے کانگرسی وزارتوں کے اس ظالمانہ طرز عمل کا نوٹس لینا شروع کر دیا اور یہ مداخلت کانگرسی وزارتوں کو ناگوار گزری چنانچہ دونوں میں کشیدگی پیدا ہوئی اور کانگرس ہائی کمان کی ہدایت پر اس کی صوبائی وزارتوں نے ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو استعفیٰ دے دیا۔

یوم نجات

کانگرسی وزارتوں کی سبکدوشی برصغیر کی تاریخ کا نہایت اہم موڑ تھا۔ کانگرس ہائی کمان نے اپنے خیال میں یہ نہایت انقلاب انگیز اقدام کیا تھا اور تحریک کو اس راستے پر ڈال دیا جو آزادی کی منزل سے ہم کنار ہوتا تھا۔ لیکن درا صل یہ اقدام مسلم لیگ اور مسلمانان ہند کے حق میں ایک نیک فال ثابت ہوا۔ ادھر کانگرسی وزارتیں اقتدار سے الگ ہوئیں اور ادھر قائد اعظم نے بجلی کی سی سرعت سے اعلان کر دیا کہ کانگرسی وزارتوں کے مستعفی ہونے کی خوشی میں ہندوستان بھی کے مسلمان یوم نجات منائیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ انہیں اس ظالمانہ اقتدار سے نجات ملی۔ یوم نجات کے لئے ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کی تاریخ اور جمعہ کا دن مقرر کیا گیا۔

جلسے کئے گئے۔ جلوس نکالے گئے قراردادیں پاس کی گئیں جن میں خاص طور سے ان مظالم کی مذمت کی گئی جو کانگرسی وزارت کے صوبوں میں مسلمانوں پر روا رکھے گئے تھے یہ یوم نجات اس بات کا غیر مبہم اور ناقابل تردید اعلان تھا کہ کانگرس کا اقتدار خالص ہندو اقتدار ہے۔ جس سے مسلمانوں کو شدید نفرت ہے۔

قائد اعظم کے اس اقدام کا نہایت مفید نتیجہ نکلا۔ حکومت برطانیہ بلکہ ساری دنیا کے سامنے کانگرس کے اس غلط دعوے کی قلعی کھل گئی کہ وہ برصغیر کی جملہ اقوام کی نمائندہ جماعت ہے ملک کے مشہور کانگریسی اخبار "اسٹیٹس مین" کے ایک سابق ایڈیٹر مسٹر آرتھر مور نے قائد اعظم کے اس اقدام کو نہایت عاقلانہ قرار دیا۔ انہوں نے قائد اعظم کی بروقت اور فوری فیصلہ کرنے کی قوت کا برطانیہ کے اس وقت کے وزیر اعظم مسٹر چرچل سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا کہ مسٹر جناح کے اس اعلان کو چرچل کی اس تقریر کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے جو انہوں نے اس موقع پر کی تھی جب روس پر جرمنی نے حملہ کیا تھا۔

"مسٹر جناح کے اس اقدام (یوم نجات کے اعلان) سے کانگرس بوکھلا گئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے جنگلی سؤر زخمی ہو گیا ہو[1]"

حالانکہ یہ وہ شخص ہے جو کانگرسی وزارتوں کی تعریف میں رطب اللسان رہ چکا تھا اور وہ خود اس کا اعتراف بھی کرتا ہے۔ مگر آخر کار اسے تسلیم کرنا پڑا کہ وہ غلطی پر تھا۔ "کانگریسی وزارتوں نے مسلمانوں

---

[1] میٹ مسٹر جناح صفحہ۔ مولفہ اے اے رؤف

خصوصاً دیہات کے مسلمانوں میں اپنے غم و غصہ اور شکایات کا بہت بڑا ذخیرہ فراہم کر لیا تھا۔ یہ اعتراف بھی اُسی کانگرس نواز ایڈیٹر کا ہے۔

مسٹر آر تھر مور نے غلط نہیں لکھا۔ قائد اعظم کے اعلانِ یوم نجات پر واقعی کانگرس بوکھلا اٹھی اور اس جماعت کے سب سے زیادہ "متحمل مزاج" لیڈر مسٹر گاندھی نے اپنے اخبار "ہریجن" میں قائد اعظم کے اس اعلان پر سخت غم و غصہ کا اظہار کیا اور اس شمارے کا ایک نسخہ قائد اعظم کی خدمت میں بھیج کر درخواست کی کہ وہ اس پر تبصرہ کریں۔ قائد اعظم نے اس پر تبصرہ کیا اور گاندھی جی کو لکھا کہ آپ نے سیاست کے اصولوں کو فراموش کر دیا ہے۔ اور اپنی "اندرونی آواز" پر عمل پیرا ہیں۔ ہندوستان ایک ایسا برصغیر ہے جو مختلف اقوام کا مسکن ہے۔ ان میں سے ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں ہیں۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو قائد اعظم کا یہ تبصرہ نہ صرف کانگرس کی غلط روش اور گمراہ کن نظریات کا بہترین پوسٹ مارٹم تھا بلکہ آنے والے واقعات کی جھلک بھی دکھا رہا تھا اور ایک ایسے انقلاب کی خبر دے رہا تھا جو رونما ہونے والا تھا۔

مسلم لیگ کی فتح

۱۰ اکتوبر ۱۹۳۹ء کا دن برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک اہم اور یادگار دن تھا۔ اس روز وائسرائے ہند نے اپنی تقریر میں اعلان کیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ بلاشبہ یہ ہندوستان کے مسلمانوں، مسلم لیگ اور قائد اعظم کی بہت بڑی فتح تھی اور مسلم لیگ کی قوت کا سرکاری طور پر یہ پہلا اعتراف تھا۔ مگر اس کے چند ماہ بعد ہی یعنی ۱۰ جنوری ۱۹۴۰ء کو انہی وائسرائے صاحب نے بمبئی کے ایک کلب میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستان کو متحد رکھنے کی طرف بھی اشارہ کیا۔ اس طرح ملک کی دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کو خوش کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ دوسری جنگ عظیم کے آغاز کا زمانہ تھا اور حکومت برطانیہ ہندوستانیوں کے تعاون کی شدید ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ یہ اعلانات اسی تعاون کے حصول کی غرض سے کئے جا رہے تھے۔ اُدھر مسلم لیگ اور کانگرس کے اختلافات روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتے جا رہے تھے۔ خود حکومت کی کوشش بھی یہی تھی کہ یہ دونوں جماعتیں کسی نکتے یا چند نکات پر متحد ہو جائیں تاکہ ان کے متحدہ تعاون سے مساعیٔ جنگ کو تیز سے تیز تر کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لئے جناح نہرو ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ مگر ان ملاقاتوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ کیونکہ پنڈت نہرو قائد اعظم کا یہ نظریہ کسی طرح تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے کہ ہندوستان میں ایک سے زیادہ قومیں آباد ہیں اور ان میں سے مسلمان قوم کی

نمائندگی کا حق صرف مسلم لیگ کو حاصل ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ملاقاتیں ناکام ہوئیں اور مجبوراً مسلم لیگ کو اپنے لئے واضح اور قطعی راہِ عمل متعین کرنی پڑی۔ اس سلسلے میں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس ۳ فروری ۱۹۴۰ء کو دہلی میں منعقد ہوا جس میں وائسرائے ہند کی اس خواہش پر تبادلۂ خیال کیا گیا کہ مسلم لیگ اپنا ایک وفد لندن بھیجے تاکہ حکومت برطانیہ کے اراکین اور وہاں کے سیاستدانوں کے سامنے وہ اپنا نقطۂ نظر پیش کر کے انہیں اپنا ہم نوا بنا سکے۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ مسٹر اے۔ کے فضل الحق، خواجہ ناظم الدین، سر سکندر حیات خاں اور چوہدری خلیق الزمان پر مشتمل ایک وفد لندن بھیجا جائے۔ تاکہ لندن کے عمائد کے سامنے مسلم لیگ کا نقطۂ نظر پیش کیا جا سکے۔[۱]

اسی اجلاس کے موقع پر ۶ فروری ۱۹۴۰ء کو قائداعظم اور وائسرائے کے درمیان ایک ملاقات ہوئی جس میں قائداعظم نے وائسرائے کو بتا دیا کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں ملک کی تقسیم کا مطالبہ کیا جائے گا۔ گویا دہلی کا اجلاس مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس کا پیش خیمہ تھا اور اسی اجلاس کے دوران قائداعظم نے اپنے مسلم لیگی رفقاء سے تبادلۂ خیال کرنے کے بعد فیصلہ کر لیا تھا کہ کانگرس کی متعصبانہ بلکہ ظالمانہ روش سے نجات حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ خود مختار مملکت کا مطالبہ کیا جائے۔

تقسیم ملک کی تجاویز پر غور و خوض

اس سلسلے میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میرٹھ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو ۱۹۳۹ء میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس کی نوعیت اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اس میں پہلی بار نہایت واضح طور پر مسلم لیگ کے رہنماؤں نے ملک کی تقسیم کے مسئلے پر طویل غور و خوض کیا اور ایک کمیٹی قائم کر کے اس کے سپرد یہ اہم قومی فریضہ کیا گیا کہ "وہ ان تمام تجاویز کا تفصیل سے جائزہ لے جن میں تقسیم ہند کا خاص طور سے ذکر تھا۔ اس کمیٹی میں قائداعظم، سر سکندر حیات خاں، خواجہ ناظم الدین، نواب زادہ لیاقت علی خاں، نواب محمد اسماعیل خاں، سر عبداللہ ہارون، عبدالمتین چوہدری، سید عبدالعزیز اور سردار اورنگ زیب خاں وغیرہم شامل تھے۔ اس کمیٹی نے ان تمام تجاویز کا نہایت دقتِ نظر سے جائزہ لیا اور پھر ہر تجویز کی جزئیات پر از سر نو غور کیا۔ تقسیم کی تجاویز پیش کرنے والے مفکرین کے افکار و خیالات پر گھنٹوں بحث و تمحیص کی گئی اور کمیٹی نے پوری سنجیدگی کے ساتھ ایک

---

[۱] روئیداد آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی منعقدہ دہلی فروری ۱۹۴۰ء۔ زیرِ تجویز نمبر ۶۔

رپورٹ مرتب کی گئی جو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کے سامنے ۱۹۴۰ء میں پیش کی گئی۔[1]

مسلم لیگ کا اجلاس لاہور

اب مسلم لیگ کا قافلۂ حریت اپنے بیدار مغز اور اولوالعزم رہنما کی قیادت میں اپنی فکری منزلِ مقصود کی طرف نہایت تیزی سے بڑھ رہا تھا بلکہ منزل کے قریب پہنچنے والا تھا۔ اب مسلمان ہندو فرقہ پرستوں خصوصاً کانگرس سے بالکل مایوس ہو چکے تھے۔ کانگرس کے تمام سرکردہ رہنماؤں مسٹر گاندھی پنڈت نہرو اور راجندر پرشاد نے قائد اعظم کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھانے اور مسلم لیگ کے مطالبات تسلیم کرنے سے صاف الفاظ میں انکار کر دیا تھا۔ ہندو مسلم کشیدگی اپنے عروج پر تھی اور لیگ کانگرس اختلافات نے نہایت نازک اور شدید صورت اختیار کر لی تھی۔ کانگرسی وزارتوں کے استعفیٰ اور مسلم لیگ کی طرف سے یوم نجات منانے کے اقدام کے بعد ہندوستان کی دونوں قومیں دو متضاد اور مخالف راستوں پر گامزن ہو چکی تھیں اور حکومت برطانیہ کا راستہ ان دونوں سے الگ تھا۔ گویا یہ ملک تین بڑی طاقتوں کی آویزش کی آماجگاہ بن رہا تھا جن میں سے دو طاقتیں نہایت منظم اور مضبوط تھیں۔ تیسری یعنی مسلمانوں کی طاقت کمزور۔ اس کمزور طاقت اور اس منتشر قافلے کو اب ایک مضبوط اور صاحب بصیرت قائد مل گیا تھا جس نے فیصلہ کر لیا کہ برصغیر کے مسلمانوں کو ایک نصب العین دے کر ان کی فکر و عمل کی قوتوں کو نکھارا جائے اور انہیں دو دشمنوں سے نجات دلا کر ایک مستحکم اور ناقابل شکست قلعے میں محفوظ کر دیا جائے۔ اس قلعے کی تعمیر کے لئے اینٹیں اور گارے کی نہیں گوشت، پوست ہڈیوں اور خون کی ضرورت تھی اور قوم کو اس عظیم قربانی کے لئے تیار کرنے کی غرض سے قائد قوم نے بگل بجانے کے لئے لاہور کے تاریخی شہر کو منتخب کیا تھا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس جو ۲۱، ۲۲، ۲۳ و ۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں منعقد ہونے والا تھا کون کہہ سکتا تھا کہ یہ برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کی قسمتیں بدل دے گا اور ساتھ ہی دنیا کا نقشہ تبدیل کر کے دکھا دے گا۔ مگر خلاف توقع ایسا ہی ہوا۔ پنجاب مسلم لیگ کے رہنماؤں نے اس تاریخی اجلاس کو کامیاب بنانے کے لئے شب و روز کوشش کی اور اس کے لئے منٹو پارک کا وہ میدان منتخب کیا گیا جو قائد اعظم کے انگریز تذکرہ نگار مسٹر ہیکٹر بولائتھو کے بقول پہلوانوں کے دنگل کے لئے مخصوص تھا۔ ٹھیک ہے برصغیر کے دس کروڑ مسلمان بھی تو ایک بہت بڑے اور تاریخ کے سب سے بڑے قومی دنگل میں اُترنے والے تھے۔ مسلم لیگی رہنماؤں نے جلسہ کے لئے جگہ کا تو انتخاب کر لیا مگر حکومت نے اس میدان میں جلسہ کرنے

---

[1] "قرار دادِ پاکستان۔ چند حقائق۔ چند واقعات" از عالم علی سید مطبوعہ روزنامہ مشرق "یوم پاکستان نمبر" بابت ۲۳ مارچ ۱۹۷۰ء

کی اجازت دینے سے انکار کر دیا اور اس کے لئے یہ جواز پیش کیا کہ چند روز قبل سکھوں کے ایک اجتماع میں اس باغ کا حلیہ بگڑ گیا تھا۔ اب اگر مسلم لیگ کا جلسہ ہوا تو رہی سہی کسر پوری ہو جائے گی اور منٹو پارک بالکل ویران ہو جائے گا۔ آخر جب مسلم لیگی رہنماؤں نے بہت دباؤ ڈالا تو اس شرط کے ساتھ اجازت دی گئی کہ جلسہ کے منتظمین پانچ ہزار روپے ضمانت کے طور پر داخل کریں تاکہ اگر باغ کو کوئی نقصان پہنچے تو اس رقم سے باغ کی آرائش رفتہ بحال کی جا سکے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں ۵ ہزار روپے کی رقم معمولی نہ تھی مگر بعض مسلم لیگی خیال کے افسروں کی کوششوں سے ۵ ہزار روپیہ داخل کرنے کی نوبت نہ آئی اور مسلم لیگ کا یہ تاریخی اجلاس اسی پارک میں منعقد ہوا۔

سب کمیٹیوں کی تشکیل

انعقاد اجلاس سے قبل پنجاب مسلم لیگ کے رہنماؤں نے جلسہ کے انتظام و انصرام کے لئے متعدد کمیٹیاں تشکیل دیں۔ مجلس استقبالیہ۔ مجلس عاملہ۔ مجلس مالیات۔ مجلس نشر و اشاعت۔ پنڈال کمیٹی اور پروپیگنڈہ کمیٹی۔ مجلس استقبالیہ کے صدر نواب شاہنواز خاں آف ممدوٹ اور سیکرٹری میاں بشیر احمد بار ایٹ لاء مقرر ہوئے۔ مجلس مالیات کا سیکرٹری میاں امیر الدین (موجودہ صدر انجمن حمایت اسلام لاہور) کو نامزد کیا گیا۔ سر سکندر حیات خاں، سر شاہنواز آف ممدوٹ اور سید امجد علی بھی اس کمیٹی میں شامل تھے۔ جلسہ گاہ کی تیاری اور جلسے کے سلسلے کے دوسرے اخراجات کے لئے چندہ فراہم کرنا اور خرچ کرنے کا اختیار بھی اسی کمیٹی کو دیا گیا۔ مجلس عاملہ میں نوابزادہ رشید علی خاں، شیخ محمد یامین، میر خلیل الرحمٰن، ابو سعید انور، ڈاکٹر ضیاء الاسلام، شیخ ظفر حسین ایڈووکیٹ، محبوب قریشی، سید امیر حسین شاہ، حافظ معراج دین، نسیم حسین انصاری، چوہدری عبدالکریم اور کچھ دوسرے حضرات شامل تھے۔ مجلس نشر و اشاعت میں مولانا غلام رسول مہر، مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش، میاں محمد شفیع (م ش) اور پیر تاج الدین بیرسٹر کو شامل کیا گیا تھا۔ ان اصحاب نے ہینڈ بلز اور پوسٹروں کے ذریعہ اور اخبارات میں خبریں بھیج کر اجلاس کو کامیاب بنانے کے لئے مؤثر جدوجہد کی۔

پروپیگنڈہ کمیٹی میں میاں فیروز الدین، نسیم حسین انصاری، پروفیسر عنایت اللہ اور محبوب قریشی کو نامزد کیا گیا تھا۔ ان اصحاب نے گلی کوچوں اور سڑکوں بازاروں میں جلسے کے اعلانات کا فرض اپنے ذمہ لیا اور اس فرض کو نہایت تن دہی سے سرانجام دیا۔ پنڈال کمیٹی شیخ محمد یامین، شیخ ظفر حسین اور چوہدری عبدالکریم وغیرہم پر مشتمل تھی۔ پنڈال کی تعمیر، اس کی آرائش و زیبائش، بیرونی مندوبین کے قیام اور جلسہ گاہ میں نشستوں کا انتظام و انصرام اسی کمیٹی کے ذمہ تھا۔ مجلس استقبالیہ کا دفتر نواب ممدوٹ کی کوٹھی "ممدوٹ ولا" میں قائم کیا گیا جہاں روزانہ ان سب کمیٹیوں کے اراکین جمع ہوتے اور سارے دن کی کارروائیوں اور کارگزاریوں سے صدر مجلس

استقبالیہ کو مطلع کرتے۔

مالی قربانی کی ایمان افروز مثالیں

مسلم لیگ کے اس تاریخی جلسے کی تاریخیں جوں جوں قریب آتی جا رہی تھیں پنجاب مسلم لیگ خصوصاً لاہور کے مسلمانوں کے جوش و خروش میں شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی مسلمان کے پاس جان تھی وہ اسے قربان کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار تھے لیکن اس وقت فوری ضروریات کے لئے جان سے زیادہ روپے کی ضرورت تھی اور اس دور میں مسلمانوں کا کمزور پہلو یہی تھا۔ غیر ملکی حکومت نے اپنی مخصوص مصلحتوں کے تحت مسلمانوں کو اقتصادی لحاظ سے نہایت کمزور کر دیا تھا۔ خصوصاً پنجاب میں سیٹھ ساہوکار اقتصادی وسائل پر پوری طرح قابض تھے اور مسلمان ان کے دستِ نگر تھے۔ ادھر اس عظیم الشان اجتماع کے اخراجات کے لئے ہزاروں روپے کی ضرورت تھی۔ بڑے بڑے مسلمان زمیندار اور متمول لوگ ابھی تک اپنے فرائض سے غافل تھے مگر پاس ہمہ انہی امراء و رؤسا میں سے بعض ایسے لوگ مل گئے جنہوں نے مسلم لیگ کے اس اجلاس کو کامیاب بنانے کے لئے ہر قسم کی مالی امداد کی پیش کش کی ان لوگوں میں نواب امیر محمد خاں آف کالا باغ اور سر شاہنواز خاں آف ممدوٹ کے اسمائے گرامی سرِ فہرست ہیں نواب کالا باغ نے ایک ہزار روپے کی رقم مسلم لیگ کو دی اور اس کے ساتھ یہ پیغام بھی بھیجا کہ اگر کوئی صاحب اس سے زائد رقم دیں تو اتنی ہی رقم میں اور دے دوں گا۔ نواب سر شاہنواز خاں آف ممدوٹ نے فوری اخراجات کے لئے چھ سو روپے دیئے۔ سر سکندر حیات خاں نے بھی اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر معتد بہ رقم فراہم کی علاوہ ازیں مجلس استقبالیہ نے حصولِ زر کی ایک اور ترکیب نکالی۔ اس نے رکنیت حاصل کرنے والوں کے لئے پچاس روپے فیس مقرر کی۔ اس طرح ابتدائی اخراجات کے لئے اتنی رقم فراہم ہو گئی جس سے فوری نوعیت کی ضروریات پوری ہونے لگیں۔

اس سلسلے میں مالی قربانی کا ایک اور ایمان افروز واقعہ پیش آیا جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں پنجاب کے دور افتادہ علاقوں کے مسلمان بھی مسلم لیگ کو اپنے دل کی آواز سمجھنے لگے تھے اور اس کی آواز پر لبیک کہنا اپنا قومی فرض سمجھتے تھے۔ یہ ایمان افروز واقعہ ضلع شیخوپورہ کے موضع ڈھڈ دلی کے ایک اسکول ٹیچر کا ہے۔ ان کا نام سید انور علی شاہ تھا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ لاہور میں مسلم لیگ کا بہت بڑا اجتماع ہو رہا ہے جس میں قائد اعظم تشریف لا رہے ہیں اور سارے ملک سے مسلمان مندوبین بھی شرکت کر رہے ہیں تو انہوں نے سات سو روپے نقد اور بیس من چاول کی بوریاں مجلس استقبالیہ کو ارسال کیں اور ایک خط بھی بھیجا جس میں لکھا تھا کہ یہ چاول اس لئے بھیج رہا ہوں کہ جو مہمان بیرونِ لاہور سے تشریف لائیں ان کے

طعام کے کام آسکیں مجلس استقبالیہ کی طرف سے سید انور علی شاہ صاحب کا شکریہ ادا کیا گیا اور چاول فروخت کر کے اس کی رقم ان کے نام سے مسلم لیگ کے فنڈ میں جمع کر دی گئی۔[۵]

ایک اندازے کے مطابق اس جلسے کے لئے بیس ہزار روپے کی رقم جمع ہوئی جس میں گیٹ ٹکٹ سے حاصل ہونے والی رقم بھی شامل تھی۔ جلسے کے انتظامات پر پونے گیارہ ہزار روپے کے قریب رقم خرچ ہوئی باقی روپیہ آل انڈیا مسلم لیگ کے خزانے میں داخل کر دیا گیا۔

خاکساروں اور پولیس کا افسوسناک تصادم

۲۱ مارچ سے مسلم لیگ کا یہ تاریخی جلسہ شروع ہونا تھا اور اس تاریخ سے ۲ یوم قبل لاہور میں ایک نہایت افسوسناک حادثہ رونما ہوا جس نے فضا کو بے حد مکدر کر دیا۔ ۱۹ مارچ کو بھاٹی بازار میں نو گزے پیر کی قبر کے پاس خاکساروں کے ایک دستہ اور پولیس کے درمیان تصادم ہو گیا۔ یہ تصادم نہایت خونریز تھا۔ اس میں سرکاری اعلان کے مطابق ۳۲ خاکسار کام آئے۔ ایک انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس ایک خاکسار کے بیلچے سے ہلاک ہو گیا۔ دوسرے پولیس افسر کا نصف چہرہ بیلچے کی نذر ہوا۔ بہت سے پولیس کے افراد اور خاکسار زخمی ہو گئے اور شہر لاہور ماتم کدہ بن گیا۔ اس زمانے میں سر سکندر حیات خاں پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے اور عام خیال یہی تھا کہ خاکساروں پر انہی کے ایماء سے گولی چلائی گئی ہے۔ ان کے خلاف شدید ناراضگی تھی۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ مسلم لیگ کا اجلاس فی الحال ملتوی کر دیا جائے۔ جب قائد اعظم سے ٹیلیفون پر رابطہ قائم کر کے انہیں اس حادثے کی اطلاع دی گئی تو انہوں نے اس واقعے پر نہایت افسوس کا اظہار کیا۔ لیکن جب انہیں سر سکندر حیات خاں اور بعض اور مسلم لیگی رہنماؤں کی اس رائے سے مطلع کیا گیا کہ موجودہ ناسازگار فضا میں مسلم لیگ کا اجلاس ملتوی کر دیا جائے تو قائد اعظم نے اس کی سختی سے مخالفت کی اور فرمایا کہ اجلاس انہی تاریخوں میں ہو گا اور لاہور ہی میں ہو گا۔ یہ قائد اعظم کی مستقل مزاجی، اولوالعزمی اور نامساعد حالات میں بھی اپنے فیصلے پر قائم رہنے کی قابلِ رشک مثال ہے۔

قائد اعظم کی دہلی سے روانگی

۲۰ مارچ ۱۹۴۰ء کو دہلی سے مسلم لیگ اسپیشل قائد اعظم کو لے کر روانہ ہوئی اور ۲۱ مارچ کو صبح ۸ بجے امرتسر کے پلیٹ فارم میں داخل ہوئی۔ مشہور قومی رہنما اور ممتاز عالم دین مولانا اسماعیل غزنوی

---

[۵] یہ معلومات سید عالم علی صاحب کے مضمون "قرارداد پاکستان۔ چند حقائق۔ چند واقعات" مطبوعہ روزنامہ مشرق بابت ۲۳ مارچ ۱۹۷۰ء سے ماخوذ ہے۔

کے فرزند ڈاکٹر خالد غزنوی نے امرتسر کے ریلوے اسٹیشن پر قائداعظم کے استقبال کا آنکھوں دیکھا حال اپنے ایک مضمون میں سپردِ قلم کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ "جب مسلم لیگ اسپیشل کا انجن فراٹے بھرتا ہوا امرتسر کے پلیٹ فارم میں داخل ہوا تو اس کے سامنے نکل کیا ہوا ایک بہت بڑا چاند تارا لگا ہوا تھا اطراف میں دونوں طرف مسلم لیگ کے سبز جھنڈے لہرا رہے تھے۔ اس ٹھاٹھ کے ساتھ جب ... اکبر کا بھاری بھرکم انجن قائداعظم کی سواری کا مرکب بنا ہوا اسٹیشن پر آیا تو فضا ہیبت و جلال کے ساتھ نعرہ ہائے تکبیر سے گونج اٹھی۔ گاڑی اسٹیشن پر آ کر رکی تو لوگ قائداعظم کے ڈبے کی تلاش میں دوڑ رہے تھے لیکن جستجو کا یہ مرحلہ اس طرح آسان ہو گیا کہ مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے دو سبز پوش رضاکار ننگی تلواریں لے کر فرسٹ کلاس کے ایک ڈبے کے باہر کھڑے ہو گئے۔ باڈی گارڈ کی موجودگی سے سب کو پتہ چل گیا کہ قائداعظم اس ڈبے میں تشریف رکھتے ہیں ہمارا خیال تھا کہ ابھی بہت سویرا ہے۔ اور وہ آرام کر رہے ہوں گے۔ لیکن جب ان کے دروازے پر کھڑے ہو کر دس ہزار کے ہجوم نے زور زور سے نعرے لگائے تو اس کے جواب میں کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا۔ قائداعظم کریم کلر کی اچکن زیب تن کئے دروازے پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ پہلے مسکرا مسکرا کر لوگوں کے نعروں کا جواب دیتے اور ہاتھ ہلاتے رہے۔ کچھ نوجوان وفورِ جذبات سے دیوانہ وار نعرے لگاتے جا رہے تھے۔ قائداعظم ان کے جذبات کو ہاتھ کے اشاروں سے سراہتے رہے۔ جب لوگوں کا جوش حد سے بڑھا تو انہوں نے انگریزی میں تین منٹ کی ایک مختصر مگر حسبِ حال تقریر کی۔ اگرچہ اس تقریر کے دوران ہر طرف خاموشی تھی۔ مگر اس کے باوجود درمیان میں بار بار نعرے لگتے رہے اور اس کے باعث پوری تقریر تو شاید کسی نے بھی نہ سنی ہو مگر موٹی موٹی باتیں یہ تھیں۔

"مسلمان ایک قوم ہے۔ کوئی قوم بغیر وطن کے نہیں ہوتی۔ اس لئے ہمیں اپنے لئے ایک علیحدہ وطن درکار ہے جسے آپ کوئی نام دینا چاہیں تو پاکستان کہہ لیجئے۔"

"NATIONS CANNOT LIVE IN AIR"

ان کا حسنِ بیان اور شوکتِ الفاظ کے اتنے زبردست پہلو تھے اور جذبات تھے کہ ان کو نکلنے کا راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ گاڑی چند منٹ رکی اور فلک شگاف نعروں کے درمیان چنگھاڑتی ہوئی اپنی منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو گئی۔"[1]

---

[1] "مسلمان ایک قوم ہیں" مضمون ڈاکٹر خالد غزنوی مطبوعہ روزنامہ مشرق بابت ۲۳ مارچ ۱۹۷

قائدِ اعظم کا لاہور میں ورود

اگرچہ قائدِ اعظم کی تشریف آوری سے دو روز قبل خاکساروں پر فائرنگ سے لاہور کی فضا سخت غمناک تھی مگر اس کے باوجود ۲۱ مارچ کی صبح کو لاہور ریلوے اسٹیشن پر ہجوم کا یہ حال تھا کہ تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی، نواب سر شاہنواز خاں ممدوٹ کی قیادت میں پنجاب کے تمام قابلِ ذکر مسلم لیگی رہنما اپنے محبوب قائد کے استقبال کے لئے موجود تھے ہر طرف سبز ہلالی پرچم لہرا رہے تھے اور پلیٹ فارم سے لے کر ریلوے اسٹیشن کے باہر دور دور تک انسانوں کا جمِ غفیر تھا جوں ہی مسلم لیگ اسپیشل پلیٹ فارم کی حدود میں داخل ہوئی اسٹیشن کی عمارت نعرہ ہائے تکبیر اور قائدِ اعظم زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ چند ثانیوں کے بعد قائدِ اعظم کے کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور لوگ دیوانہ وار اپنے قائد کے دیدار اور مصافحہ کرنے کے لئے دوڑے۔ ہجوم پر بڑی مشکل سے قابو پایا گیا۔ اور مسلم لیگ کے مضبوط اور مستعد رضا کاروں نے بڑی جدوجہد سے راستہ بنا کر قائدِ اعظم کو پلیٹ فارم سے باہر نکالا پروگرام کے مطابق قائدِ اعظم کو جلوس کی صورت میں ان کی قیام گاہ تک لے جانا تھا لوگوں کی خواہش تھی کہ قائدِ اعظم بند موٹر میں بیٹھنے کی بجائے کھلی گھوڑا گاڑی میں سوار ہوں اور لاہور کے نوجوان اس گاڑی کو خود کھینچیں۔ مگر خاکساروں اور پولیس کے درمیان تصادم کے افسوسناک واقعہ کی وجہ سے قائدِ اعظم نے جلوس کی ممانعت فرما دی۔ اسٹیشن سے قائدِ اعظم ممدوٹ ولا تشریف لے گئے اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد سب سے پہلے میو ہسپتال جا کر زخمی خاکساروں کی عیادت کی۔ انہیں تسلی دی اور ان کے دل بڑھائے۔ قائدِ اعظم کے اس مشفقانہ طرزِ عمل کا اہالیانِ لاہور خصوصاً خاکساروں اور زخمی خاکساروں کے اعزہ و اقربا پر نہایت اچھا اثر ہوا۔

جلسہ گاہ کی کیفیت

عصر کی نماز کے بعد قائدِ اعظم جلسہ گاہ میں تشریف لائے اور مسلم لیگ کا سبز ہلالی پرچم لہرا کر رسمِ پرچم کشائی ادا کی۔ جن لوگوں کو مسلم لیگ کے اس تاریخی اجلاس میں شرکت کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان کا بیان ہے کہ اس موقع پر منٹو پارک خیموں کے ایک سفید شہر کا منظر پیش کر رہا تھا اس کے وسط میں وسیع و عریض پنڈال تھا۔ پنڈال کے غربی جانب بڑا ڈائس تھا۔ جس پر کرسئ صدارت رکھی گئی تھی۔ ورکنگ کمیٹی کے ارکان بھی ڈائس پر تشریف فرما تھے۔ پنڈال کے مغرب کی طرف مجلسِ مضامین کا وہ عظیم شامیانہ تھا جس میں بائیس مارچ کی شب کو طویل بحث کے بعد وہ قرار داد اپنی آخری شکل کو پہنچی جسے قرار دادِ پاکستان کہا جاتا ہے۔[1]

---

[1] "تاریخی اجلاس" مضمون میاں مغیث الدین مطبوعہ روزنامہ "امروز" بابت ۲۳ مارچ ۱۹۷۰ء

جلسہ گاہ کی وسعت کا صحیح اندازہ اس بیان سے ہو سکتا ہے جو حال ہی میں روزنامہ مشرق لاہور کے یوم پاکستان نمبر میں شایع ہوا ہے مضمون نگار اس جلسہ گاہ کا چشم دید حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "منٹو پارک میں مسلم لیگ کے اجلاس کا پھیلاؤ لیڈی ولنگڈن ہسپتال سے لے کر بادامی باغ کے ریلوے اسٹیشن تک تھا۔ قلعہ لچھمن سنگھ سے متصل رضاکاروں اور دوسرے ڈیلی گیٹوں کے لئے رہائشی خیمے تھے۔ لنگر تھا۔ اور اس کے بعد کونسل اور ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کے لئے خصوصی پنڈال تھا۔ اس کے اردگرد دوسرے خیمے تھے جن میں آل انڈیا مسلم لیگ کے کیمپ دفاتر تھے اور آخر پر عوام کے لئے دریوں پر نشست گاہ تھی۔ ایک اندازے کے مطابق اس پنڈال میں ایک لاکھ آدمیوں کے لئے انتظام تھا۔" ؎

اجلاس کا آغاز

۲۱ مارچ کی شام کو مسلم لیگ کونسل کا جلسہ ہوا۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں جنرل سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ نے رپورٹ پیش کی۔ اس اجلاس میں مجلس مضامین میں چند اور ممبروں کا اضافہ کیا گیا پنجاب سے دو نئے ممبر لئے گئے ڈاکٹر عالم اور میاں فیروزالدین احمد۔

۲۲ مارچ کو جمعہ کے دن آل انڈیا مسلم لیگ کا عام اجلاس منعقد ہوا۔ قرآن حکیم کی تلاوت کے بعد میاں بشیر احمد بار ایٹ لاء کی مقبول عوام نظم "ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح" پڑھی گئی۔ اس کے بعد مجلس استقبالیہ کے صدر نواب سر شاہنواز خاں آف ممدوٹ نے قائد اعظم کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ اس خطبہ استقبالیہ میں پنجاب مسلم لیگ کی طرف سے قائد اعظم کو جن بنیادی امور کی طرف متوجہ کیا گیا تھا اُن میں سے پہلا امر کانگریس کی صوبائی حکومتوں کی وہ سیاہ کاریاں تھیں جن سے ثابت ہو گیا تھا کہ اس ملک میں مغربی طرز حکومت کامیاب نہیں ہو سکتا۔ دوسری بات سر شاہنواز نے یہ کہی تھی کہ ہندو مسلم مسئلہ حل کرنے کے گزشتہ پچیس سال میں کوششیں کی گئیں لیکن ہر کوشش صرف اس لئے ناکام ہوئی کہ کانگرس مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا بنیادی حق دینے کو تیار نہیں ہوئی۔ مسلمان ہر معاملے پر مصالحت کر سکتے ہیں لیکن یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ ان کی ہستی دوسری قوموں میں ضم ہو جائے وہ اپنی انفرادیت اور ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنا وجود ختم کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہو سکتے کیونکہ اس کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ اپنے تصورات و تخیلات کو خیرباد کہہ

؎ "مسلمان ایک قوم ہیں" مضمون ڈاکٹر خالد غزنوی مطبوعہ روزنامہ مشرق ۲۳ مارچ ۱۹۷۰ء

دیں۔ مسلمان کی حیثیت سے انہوں نے اس امر پر ہمیشہ اصرار کیا کہ ان کے علیحدہ وجود کو تسلیم کیا جائے کیونکہ یہ ان کی رگِ حیات تھی۔ کانگرس کی خواہش تھی کہ ان کی رگِ حیات قطع کر دی جائے۔ اس کی کوشش تھی کہ برصغیر کے مسلمان اس ملک میں ان دوسری قوموں کی طرح رہیں جو اپنی جداگانہ قومی حیثیت کو فراموش کر چکے ہیں۔ اس صورت میں کانگرس کے لئے مسلمانوں کو ہندوؤں میں جذب کر لینا آسان ہو جاتا۔ کانگرس کی خواہش تھی کہ مسلمان اپنا وجود ایک مسلمان کی حیثیت سے فراموش کر دیں اس کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔

قائد اعظم کا خطاب

خطبۂ استقبالیہ کے بعد قائد اعظم اسٹیج پر تشریف لائے اور انہوں نے کچھ دیر اردو میں تقریر کی پھر انگریزی میں اپنا تاریخی خطاب شروع کیا۔ یہ پہلے سے لکھی لکھائی تقریر نہ تھی بلکہ برجستہ تقریر تھی۔ قائد اعظم کی یہ تقریر اور اس اجلاس کی کاروائی کی روئداد مشہور مسلم لیگی رہنما خان عبد الوحید خاں نے سپرد قلم کی ہے، خان صاحب موصوف اس موضوع پر سند کی حیثیت رکھتے ہیں ذیل میں ان کی قلم بند کی ہوئی روداد کے بعض اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔

"انہوں نے پچھلے دو سال کے سیاسی واقعات کا خلاصہ بیان کیا۔ پھر انگریز، کانگرس اور دوسرے سیاسی عناصر کا تجزیہ کیا۔ جنگ کے بارے میں مسلم لیگ کی پالیسی کی وضاحت فرمائی۔ اس کے بعد انہوں نے پہلا بم چھوڑا۔ انہوں نے آں جہانی لالہ لاجپت رائے کا ایک خط پڑھ کر سنایا جو انہوں نے ۱۹۲۴ء میں مسٹر سی آر داس کے نام لکھا تھا۔ لالہ لاجپت رائے نے لکھا تھا کہ مسلمان اور ہندو دو الگ الگ قومیں ہیں اور دونوں کو ایک دوسرے میں ضم کرنا ممکن نہیں۔ جلسہ گاہ میں سناٹا چھا گیا۔ قائد اعظم کے دوست اور معتمد ملک برکت علی مرحوم ڈائس پر بیٹھے تھے انہوں نے دبی زبان سے کہا "لالہ لاجپت رائے نیشلسٹ تھے" قائد اعظم گرج کر بولے "کوئی ہندو نیشلسٹ نہیں ہو سکتا ہر ہندو اول تا آخر ہندو ہی رہتا ہے۔"

"اسی رات آٹھ بجے سبجیکٹس کمیٹی کا جلسہ پھر ہوا۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں نے قرار داد پاکستان[1] کا متن پڑھ کر سنایا گیا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے شمال مشرقی اور شمال مغربی علاقوں کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے باقی ملک سے الگ کر کے پاکستان بنایا جائے،

---

[1] خاں صاحب کو سہو ہوا ہے ۲۲، ۲۳ مارچ کے اجلاس میں اس قرار داد کو پاکستان کا نام نہیں دیا گیا تھا۔ اس نام سے یہ قرار داد بعد کو منسوب ہوئی (مؤلف)

قائداعظم چاہتے تھے کہ سب جیکٹس کمیٹی اس اجلاس میں مناسب بحث کے بعد یہ قرار داد منظور کرلے۔ لیکن ممبروں نے اس کے بارے میں سوچنے کی مہلت طلب کی اور عذر کیا کہ قرارداد انگریزی میں ہے۔ قائداعظم کی ہدایت پر مولانا ظفر علی خاں نے وہیں قرار داد کا ترجمہ کیا پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں نے ترجمے اور انگریزی متن کا موازنہ کیا۔ بعد میں سر سکندر "پاکستان" کی اصطلاح سے ہمیشہ گھبراتے رہے۔ اور انہوں نے ہمیشہ قرار داد پاکستان کو قرار دادِ لاہور کے نام سے یاد کیا۔

شیر بنگال کی آمد

سب جیکٹس کمیٹی کا اجلاس جاری تھا کہ باہر ایک غلغلہ بلند ہوا۔ قائداعظم نے پوچھا کہ یہ شور کیسا ہے؟ کسی نے بتایا کہ شیر بنگال مولوی ابوالقاسم فضل الحق تشریف لائے ہیں۔ فضل الحق پنڈال میں داخل ہوئے، چہرے سے لمبے سفر کی تکان کے آثار نمایاں تھے۔ بغیر پھندنے کی ترکی ٹوپی جس کا رنگ کسی زمانے میں سرخ رہا ہو تو رہا ہو، مگر اب تو کالا تھا۔ بچنہ رنگ اور اس پر سفید انگرکھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی۔ یہ وضع قطع دیکھ کر کئی ثقہ لیڈر زیرِ لب مسکرا دیئے۔ لیکن قائد اعظم (از راہ تفنن) یہ کہتے ہوئے اپنی نشست پر بیٹھ گئے "کہ شیر آجائے تو میمنے کو چھپ جانا چاہیئے"۔ شور کم ہوا۔ اور شیر بنگال بصد عزت و احترام محفل میں بٹھائے جا چکے تو قائد اعظم پھر اٹھے اور کہا کہ اب شیر کو زنجیروں میں جکڑا جا چکا ہے، اس لئے میمنا پھر باہر نکل آیا ہے"۔ سب جیکٹس کمیٹی کے اجلاس میں شریک لوگ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے۔ سب جیکٹس کمیٹی کے اجلاس میں میرٹھ کے سر یامین خاں اور اس کے بعد عبدالحمید خاں نے قرار داد کی مخالفت کی۔ پنجاب کے میر مقبول محمود نے قرار داد کے حق میں بڑی خوبصورت تقریر کی [1]"

قرار داد لاہور کا مصنف

برصغیر پاک و ہند کے دس کروڑ مسلمانوں کے عزائم اور امنگوں کی آئینہ دار اس قرار داد کے متعلق دو رائیں ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس قرار داد کا مسودہ سندھ کے

---

[1] "پاکستان، جد وجہدِ آزادی کی طویل داستان"، تحریر خان عبدالوحید خاں۔ مطبوعہ روزنامہ "جنگ" پاکستان ایڈیشن مارچ ۱۹۷۰ء

سر حاجی عبداللہ ہارون کی اُن یاد داشتوں پر تشکیل دیا گیا تھا جو انہوں نے ۱ر فروری ۱۹۴۰ء کو قائدِ اعظم کی خدمت میں ارسال کی تھیں۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ مسودہ سر سکندر حیات خاں نے تیار کیا تھا۔ تیسری رائے یہ ظاہر کی گئی ہے کہ یہ مسودہ کسی ہندوستانی یا مسلمان کا ڈرافٹ کیا ہوا نہیں۔ یہ خیال مشہور مسلم لیگی رہنما عبدالرحمٰن صدیقی مرحوم کا ہے اور چوہدری خلیق الزماں اس کے راوی ہیں۔ لیکن واقعہ ان تینوں آراء سے مختلف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس تاریخی قرار داد کا مسودہ سر سکندر حیات ہی نے تیار کیا تھا اور میر مقبول محمود یہ مسودہ لے کر قائدِ اعظم کے پاس گئے تھے۔ مگر اس مسودے میں اس قدر رد و بدل ہوا کہ خود سر سکندر حیات خاں کو خود اعلان کرنا پڑا کہ اِن کے مسودے میں مجلس عاملہ نے اتنی تبدیلیاں کر دی ہیں کہ اس مسودے کو ان کا مرتب کردہ مسودہ نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ برصغیر کے مشہور سیاستدان راجہ غضنفر علی خاں کے بیان کے مطابق :۔

"صرف نو دن کے بعد مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں ہونے والا تھا جس کی تاریخوں کا رسمی فیصلہ مسلم لیگ کونسل کے اجلاس دہلی مورخہ ۵ فروری ۱۹۴۰ء میں کیا گیا تھا۔ اس دوران میں سر سکندر حیات خاں نے پیش قدمی کی اور حالات اور قائدِ اعظم کے خیالات کا رجحان دیکھتے ہوئے ملک کی تقسیم کے مطالبے کو ایک نرم شکل اور اپنی پسند کی اصطلاحوں میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ آپ نے لیگ کے سیشن میں پیش کرنے کے لئے ایک قرار داد کا مسودہ تیار کیا اور اسے میر مقبول محمود کے ہاتھ قائدِ اعظم کی منظوری کے لئے دہلی بھیج دیا۔ قائدِ اعظم نے اسے سب جیکٹس کمیٹی کے سامنے رکھنا منظور کر لیا اسی مسودے نے مزید کانٹ چھانٹ اور تبدیلیوں کے بعد "قرار داد لاہور" کی صورت اختیار کی۔ سر سکندر نے ۱۱ مارچ ۱۹۴۱ء کو پنجاب اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ قرار دادِ لاہور کا مسودہ بے شک میں نے ہی تیار کیا تھا۔ لیکن سب جیکٹس کمیٹی نے اس میں اتنی تبدیلیاں کر دیں کہ منظور شدہ قرار داد کو میری تصنیف نہیں کہا جا سکتا۔ پھر اسی تقریر میں آپ نے آئندہ آئین کے متعلق اپنے ذاتی خیالات کی وضاحت کی۔ سر سکندر

کے مسودے کا متن اب دستیاب نہیں ہے لیکن اتنا معلوم ہے کہ اس میں آئندہ آئین کو دو بنیادی اصولوں پر مبنی کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ (۱) صوبوں کو خود مختار اور حاکمانہ حیثیت رکھنے والی SOVEREIGN مملکتوں کی حیثیت دی جائے اور (۲) چند محکمے (دفاع) امورِ خارجہ اور مواصلات) ایک مرکزی ادارے یا بورڈ کی تحویل میں رہیں جس کی حیثیت خود مختار صوبوں کے ایجنٹ کی ہو۔ ؎

راجہ غضنفر علی خاں کی ان تصریحات کی روشنی میں بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اصل مسودہ سر سکندر حیات خاں نے تیار کرکے اجلاس لاہور سے قبل قائد اعظم کی خدمت میں بھیجا تھا۔ قائد اعظم نے اسے اجلاس لاہور کی سب جیکٹس کمیٹی کے سپرد کر دیا۔ جہاں طویل غور و خوض کے بعد اس میں بہت سی تبدیلیاں بلکہ بعض بنیادی تبدیلیاں بھی کی گئیں اور کاٹ چھانٹ کر اسے ایک نئی قرارداد کی شکل دیدی گئی۔ اس طرح عبدالرحمٰن صدیقی مرحوم کا یہ خیال غلط قرار پایا کہ یہ مسودہ کسی غیر ملکی شخص کا تیار کردہ ہے۔

قرار دادِ لاہور کا متن

کہا جاتا ہے کہ یہ قرار داد فیصلے کے مطابق مسلم لیگ کے کھلے اجلاس میں مولانا ظفر علی خاں کو پیش کرنی تھی مگر بعد کو قائد اعظم نے فیصلہ کیا کہ قرار داد کا مسودہ مولوی فضل الحق پیش کریں اور چوہدری خلیق الزماں اس کی تائید کریں۔ چنانچہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو وہ قرار داد کھلے اجلاس میں پیش کی گئی جسے صرف سات سال کے بعد ایک نئی اسلامی مملکت کی اساس بننا تھا۔ قرارداد کا متن درج ذیل ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس لیگ کونسل اور مجلس عاملہ کی ان قرار دادوں کی توثیق کرتا ہے۔ جو دستور کے بارے میں ۲۷ اگست ۱۷، اور ۱۸ اگست اور ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء اور ۳ فروری ۱۹۴۰ء کو منظور کی جا چکی ہیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس پر زور طریقے سے اس امر کا اعادہ کرتا ہے کہ انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کے تحت وفاقی طرز کی حکومت اس ملک کے حالات کے پیشِ نظر نامناسب اور غیر ممکن العمل ہے اور مسلمان اسے قبول نہیں کر سکتے۔

یہ اجلاس نہایت شدت کے ساتھ اپنے اس خیال کا اظہار کرتا ہے کہ

؎ مارشل لاء سے مارشل لاء تک صفحہ ۲ حصہ اوّل

حکومت برطانیہ کی طرف سے ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو وائسرائے کے جاری کردہ اعلان کے اس حصے سے ہندوستان کے مسلمان مطمئن نہیں جس میں کہا گیا ہے کہ ہندوستان کے اقلیتی فرقوں اور مختلف جماعتوں کے مشورے سے اس پر دوبارہ نئے سرے سے غور کیا جائے گا۔ مگر اس امر کی صراحت ضروری ہے کہ جب تک سارے دستور پر نئے سرے سے غور نہ کیا جائے اور یہ نیا مسودہ مسلمانوں کی مرضی کے مطابق تیار نہ کیا جائے وہ اسے قبول نہیں کریں گے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی تجویز ہے کہ کوئی دستوری مسودہ اس وقت تک مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول اور اس ملک میں قابلِ عمل نہ ہوگا جب تک اس میں بنیادی امور کو شامل نہ کیا جائے۔

جغرافیائی لحاظ سے متصل وحدتوں کی اس طرح حد بندی کی جائے اور ایسا تغیر و تبدل کیا جائے کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے خود مختار ریاستیں قائم ہو جائیں اور ان میں سے ہر وحدت آزاد و خود مختار ہو۔

ان وحدتوں میں آباد اقلیتی فرقوں کے مذہبی، ثقافتی سیاسی، انتظامی اور دوسرے معاملات کے تحفظ کے لئے ان کے مشورے سے دستور میں تسلی بخش اور کافی انتظامات کئے جائیں۔ اس طرح ہندوستان کے جن خطوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے وہاں دستور میں اُن کے اور دوسری اقلیتوں کے مشورے سے ایسے انتظامات کئے جائیں تاکہ ان کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی نیز دوسرے مفادات کا تحفظ ہو سکے۔

یہ اجلاس مجلس عاملہ کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ مذکورہ بالا بنیادی اصولوں کے تحت ایک ایسا دستوری منصوبہ تشکیل دے جس میں آخر کار ان مجوزہ علاقوں کو دفاع، امور خارجہ، رسل و رسائل اور محصولات نیز دوسرے ضروری امور کے مکمل اختیارات حاصل ہوں۔

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کا اعتراض

اس سے قبل یہ قرارداد جب مجلس عاملہ میں پیش کی گئی تو مشہور مسلم لیگی رہنما ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے اس قرارداد کے اس حصے پر اعتراض کیا کہ "جغرافیائی لحاظ سے متصل وحدتوں کی اس طرح حد بندی کی جائے اور ایسا تغیر و تبدل کیا جائے کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے خود مختار ریاستوں کی صورت اختیار کر سکیں۔"

ڈاکٹر صاحب کا اعتراض یہ تھا کہ یہ الفاظ مبہم اور غیر واضح ہیں۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ قرارداد میں واضح طور پر پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے نام لئے جائیں۔ اس پر نواب زادہ لیاقت علی خان نے یہ موقف اختیار کیا کہ قرارداد میں صوبوں کے نام لینے سے عمداً گریز کیا گیا ہے کیونکہ صوبوں کے نام لینے کی صورت میں ممکن ہے کہ مجوزہ علاقے میں کمی ہو جائے۔ اس کے بعد نواب زادہ صاحب نے "جغرافیائی تغیر و تبدل" کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس سے مقصد یہ نہیں کہ ہم بنگال یا پنجاب کے کسی علاقے سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں بلکہ اس طرح قرارداد میں دہلی اور علی گڑھ جیسے مسلم تہذیب و تمدن کے علاقوں کو شامل کرنے کے لئے گنجائش پیدا کرنا ہمارا مقصد ہے[1]۔ اس وضاحت کو مجلس عاملہ نے قبول کر لیا۔ لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ نواب زادہ مرحوم کا یہ خیال محض خوش فہمی پر مبنی تھا۔

چوہدری خلیق الزماں کی تائید،

جب ۲۳ مارچ کے کھلے اجلاس میں شیر بنگال مولوی فضل الحق یہ قرارداد پیش کر چکے تو قائد نے پیچھے پھر کر چوہدری خلیق الزماں سے کہا کہ تم اس کی تائید کرو۔ چنانچہ چوہدری صاحب مائک پر آئے اور انہوں نے اس کی حمایت میں ایک پُر زور اور نہایت اثر انگیز تقریر کی۔ اس تقریر کا لب لباب انہوں نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

"میں نے کانگرس کی تمام سیاسی غلطیوں کا حوالہ دیتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد کے رام گڑھ کانگرس میں خطبۂ صدارت کا ذکر کیا جس میں انہوں نے بڑے فخر سے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ ہماری ایک اسلامی سیاسی تاریخ ہے۔ ہمارا ایک کلچر اور ہماری ایک

---

[1] انٹروڈکشن ٹو دی فاؤنڈیشن آف پاکستان مؤلفہ سید شریف الدین پیرزادہ۔

زبان ہے اور ہم ہندوستان میں خود دس کروڑ کی تعداد میں ہیں۔ پھر ہم خائف کیوں ہیں! میں نے ان کے جواب میں کہا کہ شکر ہے کہ مولانا نے بہت سے وہ وعدے جو مسلم لیگ کرتی ہے قبول کر لئے ہیں۔ اب سوال یہ رہ گیا ہے کہ پھر ہم ڈرتے کیوں ہیں؟ تو مولانا کو یاد ہونا چاہیئے تھا کہ جس اسلامی تاریخ کا انہوں نے ذکر کیا ہے اس میں تلوار کام دیتی تھی جس کی وجہ سے ہم تعداد سے مرعوب نہیں ہوئے۔ مگر اب ووٹوں کی حکومت ہے جس میں ہم کو سوائے شکست کے کبھی فتح نہیں ہو سکتی۔ اپنی تقریر کے آخر میں میں نے ایک ٹکڑا ایسا ضرور لگایا جس سے معلوم ہو جائے کہ میرے ذہن میں کسی صوبے کی تقسیم کا تخیل نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے کہا تھا کہ "مجھ سے لوگ دریافت کرتے ہیں کہ مسلم اقلیتوں کا تقسیم کے بعد کیا حشر ہوگا۔ میں ان کو بتلانا چاہتا ہوں کہ جو ہندو اقلیتوں کا حشر مسلم صوبوں میں ہوگا وہی ہمارا ہندو صوبوں میں ہوگا۔" اس جملے سے میں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ تقسیم میں جو نسبت آبادی کی اس وقت ہندو اور مسلمانوں کی ہے۔ وہی تقسیم کے بعد برقرار رہے گی۔[1]

چوہدری خلیق الزماں کی تقریر کے بعد مولانا ظفر علی خاں سردار اورنگ زیب خاں اور الحاج سر عبداللہ ہارون نے بھی اس قرارداد کی تائید میں تقریریں کیں۔

اسی دوران میں نماز کا وقت آگیا اس لئے جلسہ برخواست کر دیا گیا، اور دوسرے دن یعنی ۲۴ مارچ کو پھر اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں قاضی عیسیٰ۔ عبدالحمید خان۔ آئی۔ آئی چندریگر۔ ڈاکٹر محمد عالم۔ نواب محمد اسماعیل خاں۔ سید عبدالرؤف شاہ سید ذاکر علی۔ بیگم مولانا محمد علی جوہر اور مولانا عبدالحامد بدایونی نے اس قرارداد کی تائید میں تقریریں کیں۔

پاکستان ریزولیشن

ان تقریروں میں عام طور پر اس آزاد اسلامی مملکت کے لئے کوئی نام استعمال نہیں کیا گیا اور جس مقرر نے اس کی تائید میں تقریر کی اس نے اسے تقسیم ہند کی قرارداد

---

[1] شاہراہ پاکستان ص ۷۱۶

ہی کہا۔" البتہ بیگم مولانا محمد علی جوہر نے اپنی تقریر میں اسے پاکستان کا ریزولیشن کہا اور وہ بھی اس وجہ سے کہ چوہدری رحمت علی کی کوشش اور سعی سے یہ لفظ مشہور ہو چکا تھا۔ وہ اس سے واقف تھیں اور ان کو یہ آسان معلوم ہوا کہ "تقسیم برصغیر ہند کی قرار داد" کی جگہ اس کو پاکستان ریزولیشن کہیں۔ پھر ہندو پریس نے طعن وطنز کے طور پر اس نام کو ایسا اچھالا کہ زبان زدِ عوام ہو گیا۔ بالآخر مسلم لیگ نے بھی بہ خیال آسانی اس ریزولیشن کا نام پاکستان ریزولیشن اور اس دولت (مملکت) کا نام جس کے قیام کے لئے وہ کوشاں تھی۔ پاکستان ہی قرار دے دیا۔"[1]

اس قرار داد کو نہایت جوش و خروش، تالیوں کی گونج اور نعرہ ہائے تکبیر کے غلغلہ میں بہ اتفاق رائے منظور کیا گیا۔ قائد اعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری جناب ایم مطلوب سید کا بیان ہے کہ قرار داد کی منظوری کے بعد قائد اعظم نے ان سے فرمایا کہ:

"آج اقبالؒ ہمارے درمیان موجود نہیں۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو یہ دیکھ کر خوش ہوتے کہ ہم نے ان کی آرزو پوری کر دی۔"[2]

عام طور سے قرار داد لاہور (بعد کو قرار دادِ پاکستان) کی منظوری کی تاریخ ۲۳ مارچ قرار دی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ متذکرہ قرار داد ۲۳ مارچ کے اجلاس میں پیش ضرور ہوئی تھی اور اس کی تائید میں بعض اکابر نے تقریریں بھی کی تھیں مگر شام ہو جانے اور نماز کا وقت آجانے کی وجہ سے اجلاس ملتوی کر دیا گیا تھا دوسرے دن یعنی ۲۴ مارچ کو پھر اجلاس منعقد ہوا اور اسی روز یہ قرار داد کثرت رائے سے منظور ہوئی اس لئے یوم پاکستان ۲۳ مارچ کو نہیں بلکہ ۲۴ مارچ ہونا چاہیئے۔

مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں قائد اعظم نے ایک نہایت مدلل اور برجستہ خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا تھا۔ جس میں کانگریسی حکومت کے ڈھائی سالہ دور، ہندو مسلم اتحاد، مسلم قومیت، وحدانی طرز حکومت، ملک کی تقسیم اور برصغیر کے مسلمانوں کے عزائم

---

[1] پاکستان ناگزیر تھا صفحہ ۳۵۶ مؤلفہ پروفیسر حسن ریاض
[2] محمد علی جناح۔ اے پولیٹیکل اسٹڈی صفحہ ۶۹۹ مؤلفہ ایم۔ ایچ سید

اور امنگوں کا نہایت جامع انداز سے ذکر کیا۔ گذشتہ صفحات میں خان عبدالوحید خان کے حوالے سے اس تقریر کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ چونکہ یہ تقریر تاریخی نوعیت کی ہے۔ اور ہماری ملی تحریک میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے نہایت ضروری ہے کہ اسے تاریخ کا جزو بنا لیا جائے پس یہ تقریر ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

قائد اعظم کا تاریخی خطبۂ صدارت۔

اب ہندوستان چند فرقوں کا مسئلہ نہیں رہا ہے۔ بلکہ اِسے بین الاقوامی مسئلے کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ ضروری ہے کہ اس پر بین الاقوامی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے۔ اگر دستور سازی کے وقت اس کے بنیادی پہلو کو پیش نظر نہ رکھا گیا تو اس کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ ایسے دستور سے صرف مسلمانوں ہی کو نقصان نہیں پہنچے گا بلکہ ہندوؤں اور خود انگریز بھی مشکلات میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ہی قوم کے افراد قرار دینا خواب کے سوائے اور کچھ نہیں۔ گذشتہ بارہ سو سالہ تاریخ گواہی دیتی ہے کہ یہ دونوں قومیں کبھی ایک قوم نہیں بن سکیں اور مسلم ہندوستان اور ہندو ہندوستان کے درمیان ہمیشہ ایک خلیج حائل رہی۔ اس وقت ہمیں ہندوستان میں جو وحدت نظر آرہی ہے وہ نتیجہ ہے برطانیہ کی فتوحات کا اور یہ وحدت برطانوی سنگینوں کی نوک سے قائم ہے۔

ہندوستان کے لئے ایک متبادل دستور کا مسئلہ ہمارے زیر غور ہے۔ ہمیں ماہرینِ قانون کی طرف سے اس سلسلے میں بہت سی تجاویز موصول ہوئی ہیں، لیکن یہ ایک ناقابلِ نظرانداز حقیقت ہے کہ جس رخ سے غور کیا جائے ہندوستان کے مسلمان اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آں جہانی لالہ لاجپت کے ایک خط سے جو انہوں نے آج سے پندرہ سال پہلے تحریر کیا تھا، میرے اس نظریے کی تصدیق ہوتی ہے۔

حکومت برطانیہ اس کی پارلیمنٹ اور برطانوی عوام ہندوستان کے مستقبل کے متعلق ایک مخصوص نقطۂ نگاہ سے سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ان کی فکر کی بنیاد برطانوی دستور ہے جس پر پارلیمنٹ کے ایوانوں اور کیبنٹ کے ذریعہ عمل ہوتا ہے۔ وہ ہر ملک کے لئے پارلیمانی طرزِ حکومت کو سب سے بہتر نظام سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں نے ہندوستان کے لئے ۱۹۳۵ء کا دستور بنانے کی غلطی اسی پُر زور اور یک طرفہ پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر کی اور اب بعض برطانوی مدبر کہہ رہے ہیں کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ

ہندوستان کے بگڑے ہوئے حالات خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔ لندن کے مشہور اخبار ٹائمز نے بھی اسی طرز پر سوچا ہے اور ہندوستان کے ۱۹۳۵ء کے دستور پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین صرف مذہبی لحاظ ہی سے نہیں بلکہ سماجی قوانین اور ثقافتی اعتبار سے بھی بڑا فرق ہے اور یہ دونوں الگ الگ تہذیبوں کے نمائندہ ہیں لیکن جوں جوں وقت گزرتا جائے گا ان کے توہمات ختم ہوتے جائیں گے اور رفتہ رفتہ دونوں ایک ہی قوم بن جائیں گے۔ لیکن ہندو اور مسلمان کے مابین جو روحانی اقتصادی، ثقافتی، تہذیبی اور سیاسی فرق ہے اسے توہمات کہہ کر اس فرق کو نظر انداز کر دینا ہندوستان کی تاریخ کا منہ چڑانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے اساسی اصولوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ جو قومیں ایک ہزار سال گزر جانے کے باوجود پہلے کی طرح آج بھی ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں ان سے یہ اُمید کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ برطانیہ کے غیر فطری اور نام نہاد جمہوری دستور کے تحت ایک قوم بن جائیں گی۔

یہ سوچنا غلط ہے کہ جو کام وحدانی طرزِ حکومت گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں انجام نہ دے سکی وہ مرکزی وفاقی نظام حکومت کو جبری طور نافذ کر کے پورا ہو جائے گا۔ جو حکومت اس طور سے تشکیل دی جائے گی وہ کبھی ایک حکم شاہی سے مختلف النوع اقوام میں اطاعت گذاری کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتی سوائے اس کے مسلح فوجی طاقت اس کی پُشت پناہی کرے۔

ہندوستان کا مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک اس حقیقت کا اعتراف نہ کر لیا جائے کہ یہ مسئلہ فرقہ واری نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ اس کے بغیر جو آئین تشکیل دیا جائے گا اس کا نتیجہ صرف تباہی ہو گا اور مسلمانوں کے علاوہ حکومت برطانیہ اور ہندوؤں کے لئے بھی نقصان رساں اور تباہ کن ہو گا۔ اگر برطانوی حکومت نیک نیتی سے ہندوستان کے باشندوں کی خوش حالی اور امن و امان کی خواہشمند ہے تو اُس کے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ اس ملک کو دو آزاد اور خود مختار ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان دونوں بڑی قوموں کو ایک دوسرے سے جُدا کر دیا جائے۔ کوئی وجہ نہیں کہ یہ دو ملک ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوں بلکہ اس کے برعکس ان دونوں مملکتوں کے لوگوں میں باہمی رفاقت اور دوسرے کے نظام معاشرت پر حاوی ہونے کی کوشش کا جذبہ ختم ہو جائے گا۔ دونوں قوموں کے درمیان ایسی مفاہمت ہو جائے گی جس کی بُنیاد خیر سگالی کے جذبے پر ہو گی اور دونوں قومیں

ایک دوسرے کے ہمسایہ کی حیثیت سے امن و امان کی زندگی گزاریں گے یہی طریقہ ہے جس کے نتیجے میں مسلم ہندوستان اور ہندو ہندوستان کی اقلیتوں کے حقوق و مفادات مکمل طور پر محفوظ ہو جائیں گے۔

میری سمجھ میں یہ بات ابھی تک نہیں آئی کہ میرے ہندو دوست اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے کہ اسلام اور ہندو مت مروجہ معنی میں مذاہب نہیں ہیں بلکہ یہ دو مختلف تہذیبیں بھی ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل جُداگانہ نوعیت کی ہیں، اس تصور کی حیثیت خواب سے زیادہ نہیں کہ ہندو اور مسلمان باہم متحد ہو کر ایک قوم بن جائیں گے ہمارے متعدد مصائب کا منبع یہی غلط طرز فکر ہے اور اگر اس غلط طرز فکر کی بروقت اصلاح نہ کی گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان تباہی کے غار میں جا گرے گا۔

ہندو اور مسلمانوں کا دو مختلف تہذیبوں، فلسفوں، تہذیبی روایات، اور ادبی افکار کا حامل ہونے کے لئے (اس حقیقت کا اظہار کافی ہے کہ) یہ دونوں نہ تو ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ نہ آپس میں شادی بیاہ کرتے ہیں۔ یہ دو مختلف تہذیبوں کے حامل ہیں بلکہ ان کی بُنیاد ہی ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور زندگی اور موت کے نظریات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں ان دونوں کی تاریخیں الگ الگ ہیں۔ اِن کے کلاسیکی ادب بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کے غازی اور سورما بھی مختلف شخصیتوں کے حامل ہیں بلکہ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ جسے ایک ہیرو قرار دیتا ہے وہ دوسرے کے ہاں ویلن بن جاتا ہے ایک کی فتح دوسرے کی شکست قرار پاتی ہے۔ اگر ایسی دو مختلف النوع اقوام کو جن میں سے ایک ہمیشہ اکثریت میں اور دوسری اقلیت میں ہوگی ایک ہی حکومت کے ماتحت رہنے پر مجبور کر دیا جائے تو اس کے باہمی جھگڑوں میں آئے دن اضافہ ہوتا رہے گا اور ایک دن ایسا آئیگا جب اس قسم کی حکومت کے تار و پود منتشر ہو جائیں گے۔

تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جیسے برطانیہ اور آئرلینڈ کی یونین یا چیکوسلاواکیہ اور پولینڈ کا مسئلہ۔ ہمیں تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ایسے علاقے جو ہندوستان سے رقبہ میں کہیں چھوٹے ہیں یہ ایک مستقل ملک کہلانے کے مستحق تھے لیکن اب اتنی ریاستوں میں بٹے ہوئے ہیں جتنی قومیں ان میں آباد ہیں۔ مثلاً بلقان آٹھ آزاد ریاستوں میں بٹا ہوا ہے اسی طرح اسپین اور پرتگال دو الگ الگ اور خود مختار ملک ہیں حالانکہ یہ دونوں ایک ہی جزیرہ نما میں واقع ہیں۔

ہندوستان میں ایک متحد قوم کا فلسفہ نہایت بودا ہے کیونکہ اس قسم کی کسی قوم کا سرے سے یہاں وجود ہی نہیں۔ اسی طرح ایک ملک کا نظریہ بھی غلط ہے کیونکہ گذشتہ بارہ سو سال میں ہندوستان کو ایک ملک کی

حیثیت کبھی حاصل نہیں رہی۔ بلکہ یہ ملک ہمیشہ مسلم ہندوستان اور ہندو ہندوستان میں بٹا رہا۔ ہندوستان کی جو وحدت آج قائم ہے وہ قطعاً مصنوعی ہے اور برطانوی حکومت کی سنگینوں کے سہارے قائم ہے۔ جیسے ہی برطانوی اقتدار ختم ہوگا اور یہ خاتمہ اب قریب ہے اس مصنوعی وحدت کا بھی خاتمہ ہو جائیگا اور پھر اس ملک میں ایسی تباہی آئے گی جس کی نظیر گذشتہ ایک ہزار سال کی تاریخ میں بھی نہیں ملے گی۔ میرا خیال ہے کہ انگریز یہ ہرگز پسند نہیں کریں گے کہ جس ملک پر وہ ڈیڑھ سو سال تک حکومت کر چکے ہیں وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے وہ اس ملک کو ایسی خوفناک تباہی کے سپرد کر جائیں۔

میں پھر اس حقیقت کی وضاحت کر دوں کہ مسلمانوں کو کوئی ایسا دستور منظور نہیں ہوگا جو ان پر ہندو اکثریت کو مسلط کرنے کا باعث ثابت ہو۔ ہندو اور مسلمان کو جمہوریت کے نام پر ایک ساتھ رہنے پر مجبور کرنے کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ان پر ہندو راج مسلط کر دیا جائے جس طرز کی جمہوریت نافذ کرنے کی کانگرس خواہشمند ہے اس کے نفاذ کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی متاع عزیز برباد ہو جائے۔ گذشتہ ڈھائی برس میں صوبائی آئین پر جس طرح عمل درآمد کیا گیا ہے اس کا ہمیں خاصا تجربہ ہو چکا ہے۔ اگر پھر اس کا اعادہ کیا گیا تو ہندوستان خانہ جنگی کی آماجگاہ بن جائیگا اور فرقہ وارانہ فوجیں قائم ہونے لگیں گی۔ مسٹر گاندھی نے سکھر کے ہندوؤں کو تلقین کی ہے کہ وہ اپنی حفاظت کرنے کیلئے عدم تشدد یا تشدد میں سے ہر حربہ استعمال کریں اور مکے کے جواب میں مکہ چلائیں لیکن اگر وہ اپنی حفاظت میں ناکام ہو جائیں تو انہیں ترک وطن کر دینا چاہئے۔

یہ پروپیگنڈہ عام ہے کہ برعظیم میں مسلمان اقلیت میں ہیں حالانکہ یہ غلط خیال ہے نقشہ پر نظر ڈالنے سے آج بھی صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار صوبے ایسے ہیں جن میں مسلمان غالب اکثریت میں ہیں اور یہ صوبے کانگریس کی حکم برداری سے آزاد ہیں، آپ قوم کی جو چاہیں تعریف کریں، ہر تعریف کی رو سے مسلمان ایک قوم ثابت ہوتے ہیں اور ایک قوم کی حیثیت سے ضروری ہے کہ ان کا ایک وطن ہو ایک ریاست انہیں دی جائے جس میں وہ امن و امان سے زندگی گذار سکیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ہم بہ حیثیت ایک آزاد اور خود مختار قوم کے اپنے پڑوسیوں کے ساتھ امن و امان سے رہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنے آزاد وطن میں ایسے اصول نافذ کریں جو ہمارے نزدیک موزوں ہیں۔ اس طرح ہم مذہبی ثقافتی معاشی، تہذیبی اور سیاسی ترقی کے مراحل طے کریں۔

ایمانداری کا تقاضہ ہے اور کروڑوں مسلمانوں کا مفاد بھی اسی میں ہے کہ اس مسئلے کا کوئی ایسا حل تلاش کیا جائے جو آبرومندانہ ہو اور جس کے تحت سب کے ساتھ انصاف ہو سکے۔ میں یہ بات واضح کر دوں کہ ہم کسی گیدڑ بھبکی کی وجہ سے اپنے موقف سے نہیں ہٹیں گے۔ ہم اپنا نصب العین متعین

کر چکے ہیں۔ اس کے حصول کے لئے ہم ہر قربانی دیں گے۔ کوئی نصب العین حاصل کرنا آسان نہیں آزادی حاصل کرنے کے لئے صرف دلائل کافی نہیں ہوتے۔ پس میں مسلمان دانشوروں سے اپیل کرتا ہوں کہ قربانی کا جذبہ لے کر میدان عمل میں گامزن ہو جائیں عوام تک پہنچیں۔ عام مسلمان بیدار ہیں انہیں اقتصادی سماجی سیاسی اور تعلیمی اعتبار سے منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ایسا ہو گیا تو مسلمان ایسی طاقت بن جائیں گے۔ جن کا سب کو احترام کرنا پڑے گا[1]"

ایک پاکستان

ہم نے قائد اعظم کی یہ تقریر دانستہ ایک غیر مسلم اخبار سے اخذ کی ہے جو مسلمانوں یا مسلم لیگ کا طرفدار نہ تھا۔ اس تقریر کے یہ الفاظ خاص طور سے قابل ذکر ہیں کہ:

"اس ملک کو دو آزاد اور خود مختار ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے" یعنی ایک ہندو ریاست اور ایک مسلم ریاست جو شمال مشرق اور شمال مغرب کے مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل ہو اور جس کے پاس دفاع خارجہ، کرنسی اور مالیات کے جملہ اختیارات ہوں۔ گو ۱۹۴۰ء کی قرار داد لاہور میں ایک سے زیادہ مسلم ریاستوں کا ذکر ہے لیکن قائد اعظم کی اس تقریر کی روشنی میں یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ ایک مسلم ریاست کے بجائے ریاستوں کا لفظ دونوں حصوں کی جغرافیائی دوری کی بنا پر استعمال کیا گیا تھا ورنہ قائد اعظم اور قرار داد لاہور کے واضعین کا مقصد یہی تھا کہ برصغیر کے مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل ایک آزاد اور خود مختار ریاست قائم کی جائے جو مختلف صوبوں پر مشتمل ہو اور ان صوبوں کو اندرونی معاملات میں آزادی ہو مگر ان پر مرکز کی بالادستی قائم رہے اور دفاع، خارجہ، کرنسی اور محصولات کے جملہ اختیارات مرکز کے پاس ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو قائد اعظم اپنی اس تاریخی تقریر میں انگریزوں سے یہ مطالبہ کبھی نہ کرتے کہ:

"اس ملک (ہندوستان) کو دو آزاد اور خود مختار ریاستوں میں تقسیم کر دو۔"

پھر تو وہ اس ملک کو تین آزاد ریاستوں میں تقسیم کرنے کا مطالبہ کرتے۔ ایک ہندوؤں کے لئے اور دو مسلمانوں کے لئے۔ مگر انہوں نے مسلمانوں کے لئے ایک ریاست کا مطالبہ کر کے ماضی میں پیش آنے والی سیاسی اور علاقائی الجھنوں کو دور کر دیا۔

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور بابت ۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء

نظریۂ پاکستان پر یورش

۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد لاہور کا منظور ہونا تھا کہ غیر مسلم حلقوں میں کہرام مچ گیا۔ ہندو پریس نے اس کے خلاف نہایت زہریلا پروپیگنڈہ شروع کیا۔ خود حکومت برطانیہ کے اکابر نے اس مطالبہ کو برصغیر کے لئے سخت مضرت رساں قرار دیا۔ مسلمانوں کے بعض نام نہاد دوستوں اور بہی خواہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ خود مسلمانوں کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ اس مطالبے سے دست بردار ہو جائیں۔ غرض نظریۂ پاکستان پر اعتراضات کا ایک سیلاب امنڈ آیا۔ پاکستان کیسے قائم ہوگا؟ اس میں آباد اقلیتوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ "ہندو ہندوستان" میں مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہوگی؟ پاکستان کی حدود کہاں تک ہوں گی؟ ان کا تعین کیسے ہوگا؟ پاکستان کیسے قائم رہے گا؟ معاشی لحاظ سے یہ نہایت کمزور ملک ہوگا۔ اس کے قیام سے ہندو مسلمانوں کے تنازعات اور شدت اختیار کر جائیں گے —— یہ اعتراضات اگر صرف غیر مسلموں کی طرف سے ہوتے تو بھی صبر کر لیا جاتا۔ افسوس تو اس کا ہے کہ منبر و محراب کے بعض وارث بھی جنہیں مسلمانوں کی روحانی پیشوائی کا دعویٰ تھا برصغیر میں ایک اسلامی مملکت کے قیام کے منصوبے سے پراغ پا ہوگئے۔ جمعیت العلماء، جماعت اسلامی، مجلس احرار، خدائی خدمت گار اور تحریک خاکسار کے امیر علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی[1] (مرحوم) نے اس نظریہ کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ ان میں سے جمعیۃ العلماء، مجلس احرار اور خدائی خدمت گاروں نے مسلمانوں کو حصولِ پاکستان کی مہم میں ناکام بنانے کے لئے کانگرس سے اشتراک و تعاون کرنے میں بھی کوئی باک محسوس نہ کی۔ حیرت ہوتی ہے کہ علوم دین کے یہ نکتہ شناس گاندھی، نہرو اور پٹیل جیسے اسلام دشمن لیڈروں سے تعاون کر سکتے تھے۔ گاندھی کی کٹیا کا طواف کرنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتے تھے مگر مسلمانوں کے کلمہ گو رہنما سے اشتراک و تعاون کی مخالفت ان کے

---

[1] علامہ مشرقی بلاشبہ نظریۂ پاکستان اور قائد اعظم کے مخالف تھے لیکن اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اس مخالفت میں ہندو کانگرس سے قطعاً کوئی ساز باز نہیں کی بلکہ ہمیشہ کانگرس کی مخالفت میں سینہ سپر رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ علامہ مرحوم نے مسلم لیگ اور قائد اعظم کو ان کے مقاصد میں ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ (مولف)

نزدیک جائز بلکہ ضروری تھی۔

مخالفین پاکستان کا نظریاتی اتحاد

عجیب بات یہ ہے کہ اس موقع پر ہندو لیڈر، کانگرسی مسلمان علماء، جمعیت العلماء کے اکابر، خدائی خدمت گار (سرخ پوش) مجلس احرار کے رہنما اور انگریز پانچوں ایک ہی راگ الاپ رہے تھے کہ دو قومی نظریہ باطل ہے۔ پاکستان کی تجویز ہندوستان کے لئے سخت نقصان دہ ہے۔ پاکستان کبھی قائم نہیں ہو سکتا ہندوستان ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ پاکستان کی تجویز اہلِ ہند سے غداری ہے۔ گویا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسلم لیگ اور قائد اعظم کے مقابلے میں ان پانچوں کے درمیان کوئی مفاہمت ہو چکی تھی۔ مندرجہ ذیل بیانات سے اندازہ ہوگا کہ مخالفین پاکستان میں کس قدر فکری اتحاد تھا۔

مسٹر گاندھی اور نظریہ پاکستان

ہندو کانگرس کے سب سے بڑے رہنما مسٹر گاندھی نے پاکستان کی بنیاد یعنی دو قومی نظریہ پر براہ راست ضرب لگاتے ہوئے فرمایا :-

"دو قوموں کا نظریہ بالکل باطل ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت یا خود دوسرے مذاہب کو چھوڑ کر مسلمان ہوئی ہے یا ان کے آباد اجداد مسلمان ہوتے تھے اس لئے محض مسلمان ہو جانے سے وہ ایک جداگانہ قوم نہیں بن سکتے ——— میری روح اس امر کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندومت دو مختلف اور متضاد کلچر اور نظریۂ حیات کے مذاہب ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کرنا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مرادف ہے ——— میں اس نظریہ کے خلاف یقیناً بغاوت کر دوں گا کہ وہ لاکھوں مسلمان جو ابھی کل تک ہندو تھے اسلام قبول کر کے اپنی قومیت بھی بدل بیٹھیں[1]۔"

پنڈت نہرو اور نظریہ پاکستان

اب کانگرس کے دوسرے رہنما پنڈت جواہر لال نہرو کے ارشادات ملاحظہ فرمایئے۔ جو صرف مسٹر گاندھی کی طرح نظریۂ پاکستان پر عقب کی طرف سے حملہ نہیں کرتے بلکہ سامنے سے حملہ آور ہوتے ہیں اور سیدھی طرح نظریۂ پاکستان کی مخالفت کرتے ہوئے مسلمانانِ ہند کو یہ "زریں" مشورہ دیتے ہیں کہ :-

"خود مسلمانوں کا مفاد اس میں ہے کہ وہ اس پاکستان کو نہ لیں جسے وہ باقی نہ رکھ سکیں گے

---

[1] ہندوستان ٹائمز ۱۹، اپریل ۱۹۴۴ء بحوالہ تحریک پاکستان و نیشنلسٹ علماء ص ۸۶۲، ۸۶۳

اور جسے ہمیشہ غلامی میں مبتلا رہنا پڑے گا کیونکہ اسے دوسری قومیں ہضم کر لیں گی۔ جنگِ عالمگیر نے ہمیں یہ سبق سکھایا ہے کہ چھوٹی قوموں کے لئے کوئی تحفظ نہیں ہے۔ اس لئے ہندوستان کو تقسیم کرنے کا موقع دینا بہت بڑی غلطی ہے۔ نیز معاشی حیثیت سے بھی پاکستان غیر مناسب ہے[1]۔"

مولانا آزاد اور نظریۂ پاکستان

اب صدر آل انڈیا نیشنل کانگرس، ممتاز عالم دین بلکہ امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے ارشادات ملاحظہ فرمایئے اور دیگر باتوں سے قطع نظر اس عبارت کی داد دیجئے کہ یہ ممتاز عالم دین اور مفسرِ قرآن دس کروڑ مسلمانوں کے مطالبے (پاکستان) کو یہودیوں کے مطالبے سے تشبیہہ دیتا ہے۔

"میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ پاکستان کا لفظ ہی میری طبیعت قبول نہیں کرتی اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کا ایک حصہ تو پاک ہے اور باقی ناپاک ——— علاوہ ازیں میں تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ پاکستان کی اسکیم شکست خوردگی کی ایک واضح علامت ہے اس کی تعمیر جس بنیاد پر رکھی گئی ہے وہ ہے یہودیوں کے قومی وطن کی مثال[2]۔"

مولانا حسین احمد مدنی اور نظریہ پاکستان

اب ہندوستان کے ایک اور نامور عالم دین اور جمعیت العلمائے ہند کے صدر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے خیالات ملاحظہ فرمایئے اور دیکھئے کہ موصوف دو قومی نظریہ اور پاکستان کے مقابلے میں متحدہ ہندوستان کی حمایت میں کس طرح گوہر افشانی فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

"ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی سب شامل ہیں حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے اور اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔"

اس فتوے کے لئے حضرت مولانا جواز کیا لاتے ہیں وہ بھی ملاحظہ فرمایئے :

"آپ روزانہ مسجدیں غیر مسلم انجینئر سے بنواتے ہیں، غیر مسلم ڈاکٹروں سے علاج کراتے ہیں سیکڑوں کام روزمرہ غیر مسلموں سے کراتے ہیں۔ کیا یہ سب ناجائز ہیں[3]۔"

---

[1] حیاتِ محمد علی جناح صد ۳۸۵

[2] تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء صد ۷۶

[3] تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء صد ۵۴۹

مولانا مودودی اور نظریۂ پاکستان

پاکستان کے مخالفین میں امیر جماعت اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی پوزیشن سب سے زیادہ عجیب و غریب ہے۔ مولانا ہمارے ملک کے صاحب علم ہی نہیں بلکہ نہایت روشن دماغ اور صاحب فکر عالم ہیں اور بلاشبہ ان کی تحریروں نے بہت سے لوگوں کو متاثر کیا۔ ان کے قلم میں بڑا زور ہے اور وہ بڑی تنظیمی صلاحیتوں کے مالک ہیں مگر افسوس کہ پاکستان کے بارے میں انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال نہیں کیا۔ کچھ عرصے تک تو مولانا کانگرس کے حامی رہے اور اس فرقہ وارانہ ہندو جماعت سے اشتراک کو ضروری خیال کرتے رہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی مشہور تصنیف میں لکھا کہ :-

"کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ ہم کانگرس سے تصادم چاہتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے تو ہمارا مقصد وہی ہے جو کانگرس کا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس مشترک مقصد کے لئے بالآخر کانگرس ہی کے ساتھ تعاون کرنا ہے[1]۔"

اس کے بعد مولانا کانگرس کی حمایت سے دست بردار ہو گئے اور جب ایک ممتاز کانگرسی عالم دین نے پاکستان کے مطالبے کو یہودیوں کے مطالبۂ وطن سے تشبیہہ دی تو انہوں نے اس طرز فکر کی سخت مخالفت کی مگر اس کے باوجود وہ نظریۂ پاکستان سے متفق نہ ہوئے۔ انہوں نے آزاد اسلامی ریاست کے متعلق اپنا نقطۂ نظر ان الفاظ میں پیش کیا کہ :-

"جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو گی ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہو گا وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہو گی[2]۔"

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ گذشتہ ۲۳ سال سے پاکستان میں جو حکومت قائم ہے وہ مومنانہ ہے یا کافرانہ؟ غور طلب امر یہ ہے کہ ایک ایسے وقت جب مسلمان زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے تھے پاکستان کے متعلق اس قسم کے خیالات اس تحریک کو تقویت پہنچانے کا باعث ہو سکتے تھے یا ضعف پہنچانے کا؟ ظاہر ہے کہ پاکستان کی یہ ہیبت ناک تصویر دیکھ کر کون اس مطالبے کی حمایت کرتا۔ پھر حضرت مولانا نے اسی پہ

---

[1] مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش صفحہ ۶۴ حصہ اول

[2] مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش صفحہ ۱۳۲ حصہ دوم

اکتفا نہیں کیا بلکہ مسلم لیگ کے کارکنوں حتیٰ کہ قائد اعظم کے متعلق بھی یہ اہانت آمیز الفاظ استعمال کئے کہ :۔

"لیگ کے قائد اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت رکھتا ہو یا معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔[1]"

ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں کہ مولانا نے کانگریس کی حمایت ترک کرنے کے بعد اس ہندو جماعت کا نہایت عمدگی سے تعاقب کیا اور اس کے مکروہ عزائم کو خوب بے نقاب کیا انہوں نے کانگرسی علما کی بھی اچھی طرح خبر لی۔ لیکن پاکستان، مسلم لیگ اور قائد اعظم کی شدید مخالفت کر کے مولانا موصوف نے خود کو اسی صف میں کھڑا کر لیا جس میں تحریک پاکستان کے مخالف کھڑے تھے۔ پھر جب نظریۂ پاکستان کی بنیاد پر انتخابات لڑے گئے تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ ان انتخابات میں حصہ نہیں لیں گے۔ اس طرح مولانا کی ذاتِ گرامی اور ان کے علم و فضل سے تحریکِ پاکستان کو کوئی فائدہ نہ پہنچ سکا۔

حکومتِ برطانیہ اور نظریۂ پاکستان

کانگرس کے ہندو لیڈروں اور کانگرسی اور جمعیت العلما کے مسلمان رہنماؤں کے زریں خیالات کے بعد اب اربابِ حکومت کی آرا نظریۂ پاکستان کے متعلق ملاحظہ فرمایئے۔ ۱۷ فروری ۱۹۴۴ء کو لارڈ ویول وائسرائے ہند نے مرکزی مجلسِ دستور ساز میں تقریر کرتے ہوئے یقین دلایا کہ جرمنی کو شکست دینے کے بعد اہلِ ہند کو سیاسی حقوق دے دیئے جائیں گے۔ یہ سیاسی حقوق کس طرح دیئے جائیں گے؟ کیا انگریز اس ملک کو نظریۂ پاکستان کی بنیاد پر دو حصوں میں تقسیم کر کے اس سرزمین سے رخصت ہونا چاہتے تھے؟ —— نہیں، انہوں نے بھی وہی بات کہی جو مسٹر گاندھی، پنڈت نہرو، حضرت مولانا ابو الکلام آزاد اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی فرما چکے تھے۔ چنانچہ لارڈ ویول نے کہا کہ :۔

"آپ جغرافیہ میں تبدیلی نہیں کر سکتے —— ہندوستان قدرتی وحدت ہے۔[2]"

بالفاظ دیگر وائسرائے ہند لارڈ ویول واضح الفاظ میں کہہ رہے تھے کہ ہندوستان مختلف اقوام کا نہیں بلکہ ایک قوم کا مسکن ہے اور ایک متحدہ ملک ہے جو متحدہ ہی رہے گا۔ انہی لارڈ ویول نے ۱۴ دسمبر ۱۹۴۴ء کو چیمبر آف کامرس کے سپاس نامے کا جواب دیتے ہوئے ایک بار پھر صاف الفاظ میں نظریۂ پاکستان کی مخالفت کی اور اسے ملک کی فلاح و بہبود کے خلاف ایک بہت بڑا خطرہ قرار دیا انہوں نے فرمایا کہ :۔

---

[1] مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش ص۳۰ حصہ سوم

[2] دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ص۱۵۴ مولفہ وی۔ پی مینن

مولانا مودودی اور نظریۂ پاکستان

پاکستان کے مخالفین میں امیر جماعت اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی پوزیشن سب سے زیادہ عجیب و غریب ہے۔ مولانا ہمارے ملک کے صاحب علم ہی نہیں بلکہ نہایت روشن دماغ اور صاحب فکر عالم ہیں اور بلاشبہ ان کی تحریروں نے بہت سے لوگوں کو متاثر کیا۔ ان کے قلم میں بڑا زور ہے اور وہ بڑی تنظیمی صلاحیتوں کے مالک ہیں مگر افسوس کہ پاکستان کے بارے میں انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال نہیں کیا۔ کچھ عرصے تک تو مولانا کانگریس کے حامی رہے اور اس فرقہ وارانہ ہندو جماعت سے اشتراک کو ضروری خیال کرتے رہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی مشہور تصنیف میں لکھا کہ :-

"کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ ہم کانگریس سے تصادم چاہتے ہیں۔ ہرگز نہیں، ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے تو ہمارا مقصد وہی ہے جو کانگریس کا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس مشترک مقصد کے لئے بالآخر کانگریس ہی کے ساتھ تعاون کرنا ہے[1]۔"

اس کے بعد مولانا کانگریس کی حمایت سے دست بردار ہو گئے اور جب ایک ممتاز کانگریسی عالم دین نے پاکستان کے مطالبے کو یہودیوں کے مطالبۂ وطن سے تشبیہ دی تو انہوں نے اس طرز فکر کی سخت مخالفت کی مگر اس کے باوجود وہ نظریۂ پاکستان سے متفق نہ ہوئے۔ انہوں نے آزاد اسلامی ریاست کے متعلق اپنا نقطۂ نظر ان الفاظ میں پیش کیا کہ :-

"جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو گی ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہو گا وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہو گی[2]۔"

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ گزشتہ ۲۳ سال سے پاکستان میں جو حکومت قائم ہے وہ مومنانہ ہے یا کافرانہ؟ غور طلب امر یہ ہے کہ ایک ایسے وقت جب مسلمان زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے تھے پاکستان کے متعلق اس قسم کے خیالات اس تحریک کو تقویت پہنچانے کا باعث ہو سکتے تھے یا ضعف پہنچانے کا؟ ظاہر ہے کہ پاکستان کی یہ ہیبت ناک تصویر دیکھ کر کون اس مطالبے کی حمایت کرتا۔ پھر حضرت مولانا نے اسی پر

---

[1] مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش صفحہ ۶۲ حصہ اول

[2] مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش صفحہ ۱۳۲ حصہ دوم

اکتفا نہیں کیا بلکہ مسلم لیگ کے کارکنوں حتیٰ کہ قائد اعظم کے متعلق بھی یہ اہانت آمیز الفاظ استعمال کئے کہ :-

"لیگ کے قائد اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت رکھتا ہو یا معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو[1]۔"

ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں کہ مولانا نے کانگرس کی حمایت ترک کرنے کے بعد اس ہندو جماعت کا نہایت عمدگی سے تعاقب کیا اور اس کے مکروہ عزائم کو خوب بے نقاب کیا انہوں نے کانگرسی علما کی بھی اچھی طرح خبر لی۔ لیکن پاکستان، مسلم لیگ اور قائد اعظم کی شدید مخالفت کر کے مولانا موصوف نے خود کو اسی صف میں کھڑا کر لیا جس میں تحریک پاکستان کے مخالف کھڑے تھے۔ پھر جب نظریۂ پاکستان کی بنیاد پر انتخابات لڑے گئے تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ ان انتخابات میں حصہ نہیں لیں گے۔ اس طرح مولانا کی ذاتِ گرامی اور ان کے علم و فضل سے تحریکِ پاکستان کو کوئی فائدہ نہ پہنچ سکا۔

حکومتِ برطانیہ اور نظریۂ پاکستان

کانگرس کے ہندو لیڈروں اور کانگرسی اور جمعیت العلماء کے مسلمان رہنماؤں کے زریں خیالات کے بعد اب اربابِ حکومت کی آرا نظریۂ پاکستان کے متعلق ملاحظہ فرمایئے۔ ۱۷ فروری ۱۹۴۴ء کو لارڈ ویول وائسرائے ہند نے مرکزی مجلس دستور ساز میں تقریر کرتے ہوئے یقین دلایا کہ جرمنی کو شکست دینے کے بعد اہلِ ہند کو سیاسی حقوق دے دیئے جائیں گے۔ یہ سیاسی حقوق کس طرح دیئے جائیں گے؟ کیا انگریز اس ملک کو نظریۂ پاکستان کی بنیاد پر دو حصوں میں تقسیم کر کے اس سرزمین سے رخصت ہونا چاہتے تھے؟ ——— نہیں، انہوں نے بھی وہی بات کہی جو مسٹر گاندھی، پنڈت نہرو، حضرت مولانا ابوالکلام آزاد اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی فرما چکے تھے۔ چنانچہ لارڈ ویول نے کہا کہ :-

"آپ جغرافیہ میں تبدیلی نہیں کر سکتے ——— ہندوستان قدرتی وحدت ہے[2]۔"

بالفاظ دیگر وائسرائے ہند لارڈ ویول واضح الفاظ میں کہہ رہے تھے کہ ہندوستان مختلف اقوام کا نہیں بلکہ ایک قوم کا مسکن ہے اور ایک متحدہ ملک ہے جو متحدہ ہی رہے گا۔ انہی لارڈ ویول نے ۱۴ دسمبر ۱۹۴۴ء کو چیمبر آف کامرس کے سپاس نامے کا جواب دیتے ہوئے ایک بار پھر صاف الفاظ میں نظریۂ پاکستان کی مخالفت کی اور اسے ملک کی فلاح و بہبود کے خلاف ایک بہت بڑا خطرہ قرار دیا انہوں نے فرمایا کہ :-

---

[1] مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش ص۳۰ حصہ سوم

[2] دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ص۱۵۴ مولفہ وی پی مینن

"اگر ہندوستان سیاسی اختلافات کے بخار میں مبتلا رہا اور اس کے سیاسی ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ اس کے جسم پہ بڑا آپریشن ہونا چاہیئے جیسا کہ پاکستان تو ہندوستان ایک بہترین موقع کھو دے گا اور یہ عظیم ملک خوش حالی اور فلاح کی جنگ میں ناکامیاب رہے گا[۱]"

لارڈ ویول تو صرف وائسرائے ہند تھے۔ ستم تو یہ ہے کہ برطانیہ کے وزیر اعظم لارڈ ایٹلی نے بھی نظریہ پاکستان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور مسلم لیگ کو تحکمانہ لہجے میں ڈانٹا کہ :

"کسی اقلیت کو اس کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ اکثریت (یعنی ہندوؤں) کے سیاسی ارتقائی راہ میں سنگ گراں بن کر حائل ہو سکے[۲]"

وزیر ہند مسٹر ایمرے نے بھی اپنی کانگرس نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے برطانوی دارالعلوم میں حکومت برطانیہ کے اس موقف کا یوں اعلان فرما دیا کہ :-

"ہمارا نصب العین اب بھی یہی ہے کہ ہندوستان کو متحد رکھا جائے۔[۳]"

کیا اس سے ثابت نہیں ہو جاتا کہ کانگرس کے ہندو لیڈر، کانگرسی مسلمان اور جمعیۃ العلماء کے اکابر پوری طرح انگریزوں کے ہم خیال تھے۔ اس پلیٹ فارم پہ یہ سب متحد تھے۔ ان سب کا ایک ہی طرز فکر تھا اور ان سب کی کوشش یہی تھی کہ جس طرح بھی ہو پاکستان کا قیام ناممکن بنا دیا جائے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ انگریزوں کا ایجنٹ قائداعظم کو قرار دیا جا رہا تھا جو اس محاذ پہ انگریزوں سے مسلسل اور شب و روز جنگ آزما تھے اور کانگرس اور انگریز دونوں کے لئے زلزلہ اور طوفان بنے ہوئے تھے ع

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

جن لوگوں نے اس دور کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، جو ان معرکہ آرائیوں سے گذرے ہیں، جنہوں نے ہندو اور انگریز کے چرکے برداشت کئے ہیں، یا جنہوں نے اس موضوع پہ مستند لٹریچر کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے وہ ہمارے اس خیال کی تائید کریں گے کہ غیر مسلموں، بعض نادان مسلمانوں اور انگریزوں کی متحدہ طاقت کے مقابلے میں قائداعظم اور ان کے رفقاء نے جس پامردی اور استقلال کا مظاہرہ کیا اس کی نظیر مشکل ہی سے ملے گی۔ وہ ہر محاذ پہ لڑے، ہر اعتراض کا جواب دیا، نظریہ پاکستان کی تبلیغ و تشہیر کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا اور بڑے سے بڑا طوفان بھی ان کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہ

---

[۱]، [۲] تاریخ مسلم لیگ صد ۳۷۲، صد ۳۷۳ مولفہ رئیس احمد جعفری

[۳] دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا صد ۱۳۷

کو سکا۔ انہوں نے مسلم لیگ میں حرکت و عمل کی ایسی روح پھونک دی اور اس تحریک کے ذریعے ایسے افراد کو منظر عام پر لائے جو قلم اور تلوار دونوں کے دھنی تھے۔ خود قائد اعظم نے نظریۂ پاکستان کی وضاحت میں جو بیانات دیئے وہ اس قدر مدلل و مسکت تھے کہ منصف مزاج غیر مسلم بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ برطانیہ کے ایک مشہور سیاسی مفکر اور صحافی مسٹر بیورلے نکلس برصغیر کی سیاست پر مواد فراہم کرنے کے لئے جب ہندوستان آئے تو انہوں نے یہاں کے سیاست دانوں سے ملاقات کی۔ وہ قائد اعظم سے بھی ملے۔ مسٹر نکلس نے قائد اعظم سے کہا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مسلم لیگ نظریۂ پاکستان کی وضاحت کرنے میں ناکام رہی ہے اس کے جواب میں قائد اعظم نے جو کچھ فرمایا وہ اتنا جامع اور نظریۂ پاکستان کی صداقت کے لئے اتنا کافی ثبوت تھا کہ اس کے بعد ردو کد کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی تھی۔ قائد اعظم نے فرمایا کہ:

بیورلے نکلس کی زبانی

"جب آئرلینڈ کو برطانیہ سے الگ کرنے کا مسودہ تیار کیا گیا تو یہ صرف دس سطروں پر مشتمل تھا۔ اس کی تمام تفاصیل مستقبل کے حوالے کر دی گئیں اور اکثر ہوتا ہے کہ مستقبل سارے تنازعوں کو نہایت احسن طریقے سے طے کر دیتا ہے ——— لیکن میں تو مخالفوں کو دس سطروں سے کہیں زیادہ مواد مہیا کر چکا ہوں، تاکہ پاکستان کے اصولوں اور اس کے لائحہ عمل کے بارے میں اندازہ ہو جائے۔ مگر قبل از وقت تفاصیل مہیا کرنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔ ہندوستان کی تاریخ گواہ ہے کہ تفصیلی دستاویز کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی اور یہ بے نتیجہ رہتی ہے۔ گول میز کانفرنس میں برما کی علیحدگی کا مسئلہ طے کرنے کے لئے کون سی تفصیلات پیش ہوئی تھیں۔ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کے وقت کون سی دستاویز تیار کی گئی تھی۔ اس کا جواب صاف طور پر نفی میں ہے۔ اس قسم کی کسی دستاویز کی کوئی ضرورت نہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ پہلے علیحدگی کا اصول مان لیا جائے۔ تفاصیل آپ سے آپ طے ہوتی چلی جائیں گی۔"

مسٹر بیورلے نکلس نے قائد اعظم سے دریافت کیا کہ آپ پاکستان کے بنیادی اصولوں کی کس طرح تشریح کریں گے۔ قائد اعظم نے جواب دیا کہ "صرف پانچ لفظوں میں" "ہندوستانی مسلمان ایک قوم ہیں" متحدہ ہندوستان کا تصور جس کی مسٹر گاندھی تبلیغ کرتے پھرتے ہیں بے معنی ہے۔ یہ انگریزوں کا پیدا کردہ ہے اور متعدد تنازعات کا باعث ہے۔ جب تک یہ تنازعات موجود رہیں گے انگریز انہیں بہانہ بنا کر اس ملک پر مسلط رہیں گے۔"[1]

---

[1] ورڈکٹ آن انڈیا صفحہ ۱۸۹ از بیورلے نکلس

باوجودیکہ مسلم لیگ اور قائد اعظم کی طرف سے نظریۂ پاکستان کی متعدد بار وضاحت کی گئی اور اخباری بیانات، کتابوں اور پمفلٹوں کی صورت میں اس نظریہ کی تشریح و توضیح کے سلسلے میں لٹریچر کا ڈھیر لگا دیا گیا مگر معاندین پاکستان مسلسل یہی کہے جاتے تھے کہ پاکستان ایک مبہم اسکیم ہے یہ ایک شاعرانہ تخیل ہے جس کے لئے کوئی دلیل نہیں، ہندوؤں، بدھوں اور سکھوں کو یہ کہہ کر ڈرایا جا رہا تھا کہ اگر پاکستان قائم ہوگیا تو اس خطے میں رہنے والی اقلیتوں کو یا تو جبراً مسلمان بنا لیا جائے گا یا انہیں قتل و غارتگری کا نشانہ بنایا جائے گا۔ پاکستان کے باشندوں کو یہ کہہ کر اس اسکیم سے بددل کیا جا رہا تھا کہ یہ چند ایسے صوبوں پر مشتمل ہوگا جن میں سے بعض بنجر ہیں، پھر یہ خود مختار صوبے ہوں گے اور انہیں اپنے ہی وسائل پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔ معاشی لحاظ سے یہ انتہائی کمزور ملک ہوگا اور آبادی کے لحاظ سے متحدہ ہندوستان کے مقابلے میں اس کی حیثیت نہایت حقیر ہوگی۔

قائد اعظم کی ایک اور وضاحت

۹ر نومبر ۱۹۴۵ء کو قائد اعظم نے ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے نمائندے کو ایک بیان دیتے ہوئے ایک بار پھر نظریۂ پاکستان کی وضاحت کی۔ مخالفین پاکستان کے خدشات کو بے بنیاد قرار دیا اور اس نظریہ پر عاید ہونے والے اعتراضات کے مسکت جوابات دیئے۔ آپ نے فرمایا کہ:

"حکومت پاکستان میں اقلیتوں کو خاطر خواہ نمائندگی کا حق دیا جائے گا۔ پاکستان کی ہندو اقلیت کو میں یقین دلاتا ہوں کہ بہر صورت ان کے حقوق کی حفاظت کی جائے گی۔ کیونکہ کوئی مہذب حکومت کامیابی کے ساتھ اس وقت تک نہیں چل سکتی جب تک اسے اقلیت کا پورا پورا اعتماد حاصل نہ ہو۔ پاکستان کے مختلف علاقوں میں امریکہ، کنیڈا اور آسٹریلیا کے اصولوں پر کامل آزادی کارفرما ہوگی لیکن پاکستان کی مرکزی حکومت کو بعض اہم اختیارات حاصل ہوں گے۔ اگر حکومت برطانیہ تمام دنیا میں منتشر رہ کر بھی طاقتور رہ سکتی ہے تو حکومت پاکستان بھی ہندوستان کے مشرق و مغرب میں رہ کر بہت مضبوط رہ سکتی ہے۔ میں ایک شہری اور مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے بول رہا ہوں۔ میں پاکستان کی قانون ساز باڈی پر تبصرہ کرنے سے احتراز کرتا ہوں تاکہ لوگوں میں یہ غلط فہمی نہ ہو جائے کہ میں آج ہی ایسا کرنے کا خواہش مند ہوں۔ پاکستان کی تشکیل حسب ذیل طریقوں پر ہوگی۔

ہندوستان کے شمالی مغرب میں — شمال مغربی سرحد، بلوچستان، سندھ اور صوبہ پنجاب شامل ہوں گے۔ مشرقی ہندوستان میں پاکستان کا دوسرا حصہ ہوگا جس میں صوبہ بنگال (جس میں کلکتہ کا مالدار تجارتی شہر اور بندرگاہ شامل ہوگا) اور صوبہ آسام ہوں گے۔

پاکستان دو حلقوں میں تقسیم ہونے کے باوجود ایسا سمجھا جائے گا کہ گویا یہ ایک ملک ہے جس کی مختلف ریاستیں ایک گروپ میں شامل ہیں اور یہ کہ اس کے فطری ذرائع اور آبادی پاکستان کو دنیا کی صفِ اول کی طاقت کے ساتھ کھڑا کرنے کے لئے کافی ہیں۔ پاکستان کی حکومت دس کروڑ انسانوں پر مشتمل ہو گی۔ انگلستان فقط ساڑھے تین کروڑ کی آبادی سے ایک طاقت بن بیٹھا۔

پاکستان کا مستقبل یقیناً بہت ہی شاندار ہوگا اس میں کثیر مقدار میں لوہا، پٹرولیم، سلفر، کوئلہ اور دیگر نباتات موجود ہیں جن کو اب تک ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا ہے۔ پنجاب میں اس وقت ہائڈرو الیکٹرک اسٹیشن قائم کئے جا رہے ہیں جن کا دنیا کے بڑے بڑے اسٹیشنوں میں شمار ہے۔ جن کی مدد سے دیہاتوں تک میں بجلی کا استعمال عام ہو جائے گا اور صنعتی پروگرام میں ان سے کافی مدد ملے گی۔ یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی کہ کارخانہ جات قائم کرکے کھیت سونے پڑ جائیں گے اور قحط کی وبا پھیل جائے گی۔

مجھے یقین ہے کہ پاکستان میں ایک پارٹی کی حکومت نہیں ہوگی اور میں خود ایک پارٹی کی حکومت کی مخالفت کروں گا۔ طاقتور پارٹی کے مقابلے میں جو پارٹیاں ہوتی ہیں وہ اس پارٹی کی غلطیوں کو سدھارنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔"

قائداعظم نے اپنی اس وضاحت میں نظریۂ پاکستان پر عائد ہونے والے تمام اعتراضات کے جوابات دے دیئے اور بعض ایسے معاملات کا بھی فیصلہ کر دیا تھا جو مستقبل میں متنازعہ فیہ بن سکتے تھے۔ اقلیتوں کے حقوق، پاکستان کی حدود، مشرقی و مغربی پاکستان کا ایک مرکز کے تحت ہونا، ان کے درمیان طویل فاصلے کے باوجود اس ملک کے قائم رہنے کا یقینِ محکم، پاکستان کی آبادی کا اس سے چھوٹے ممالک کی آبادی سے مقابلہ، صوبوں کے اختیارات، مرکز کے اختیارات اور طرزِ حکومت۔

قائداعظم کا دیباچہ

اسی دوران میں ایک کتاب "پاکستان اینڈ مسلم انڈیا" کے نام سے آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کا دیباچہ قائداعظم نے تحریر کیا۔ اپنے اس دیباچہ میں انہوں نے پاکستان کے جواز پہ جس ڈھنگ میں بحث کی وہ مسلم لیگ اور نظریۂ پاکستان کی اساس کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ قائداعظم نے اپنے دیباچے میں لکھا کہ :-

"ہندوستان کی دو بڑی قوموں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں میں بہت اختلافات ہیں۔ اور یہ اختلافات اقوامِ یورپ کے اختلافات سے ہزار گنا زیادہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں نسلی، مذہبی، لسانی اور ثقافتی اعتبار سے اس قدر اختلافات ہیں کہ روئے زمین کے کسی حصے میں ان کی نظیر نہیں مل سکتی۔ مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے

کہ ان کے وطن شمال مغرب اور شمال مشرق میں ہیں جہاں ان کی بہت بڑی اکثریت ہے۔ ان علاقوں میں ان کی آبادی سات کروڑ ہے۔ مسلمان چاہتے ہیں کہ ان خطوں کو باقی ہندوستان سے منقطع کر کے خود مختار ریاستیں قائم کر دی جائیں۔ مسلمانوں کی واضح خواہش ہے کہ اس برصغیر میں وہ بھی آزاد ہوں اور "ہندو ہندوستان" بھی۔ لیکن اس کے برعکس ہندو ایسی چالیں چل رہے ہیں اور ایسے منصوبے بنا رہے ہیں کہ سارے ہند پر ہندو راج مسلط کر کے دس کروڑ مسلمانوں کو ان کا غلام بنا دیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمان برطانوی غلامی کا طوق اتار کر ہندو کی غلامی کا طوق زیب گلو کر لیں۔ دنیا کی رائے عامہ کو گمراہ کرنے کی غرض سے یا جہالت کی بنا پر آج کل یہ پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے کہ ہندوستان کا معاملہ چین، روس بلکہ امریکہ کی متحدہ ریاستوں جیسا ہے۔ ان ممالک کے لوگوں کے تجربات کی روشنی میں ہندوستان کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہر صاحب فہم شخص اس دعویٰ پر معمولی سا بھی غور کرنے کے بعد یہی نتیجہ نکالے گا کہ ہندوستان اور متذکرہ بالا ملکوں کے مسائل کا موازنہ نہایت بے معنی اور مغالطہ آمیز ہے۔ ہندوستان ایک قوم کا وطن نہیں اور نہ یہ ایک ملک ہے۔ یہ ایک نیم براعظم ہے جہاں مختلف قومیں آباد ہیں۔ ان میں ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں ہیں۔ ان کی تہذیب و ثقافت، زبان و ادب، فنِ تعمیر، اصطلاحات، اقدار و معیار، اصول و قوانین، اخلاقی و معاشرتی ضابطے، سماجی رسم و رواج، تقویمی نظام، تاریخ و روایات، رجحانات و نظریۂ حیات غرض ہر چیز ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے بلکہ بعض پہلوؤں سے آپس میں متضاد بھی ہے۔"[1]

ہمارا نصب العین

دس کروڑ مسلمانوں کی طاقت کو ایک جھنڈے کے نیچے اور ایک قائد کی قیادت میں آگے بڑھتا دیکھ کر کانگرس اور مہاسبھا دونوں بوکھلا اٹھے اور معقولیت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر دھمکیوں اور دریدہ دہنی پر اتر آئے۔ مشہور مہاسبھائی لیڈر ساور کر نے مسلمانوں کو یہودیوں سے تشبیہہ دے کر نہ صرف ان کی توہین کی بلکہ انہیں مشتعل بھی کیا۔ اس نے کہا کہ ان کے ساتھ وہی سلوک ہونا چاہیئے جو جرمنی کے یہودیوں سے ہٹلر نے کیا ہے۔ قائد اعظم نے پھر بھی ضبط و تحمل سے کام لیا۔ ان کی تقریر کے لب و لہجہ میں سختی ضرور آئی مگر انہوں نے اس کے جواب میں ہندو قوم کی توہین نہیں کی۔ انہوں نے مسلمانوں کے عزم صمیم کا ذکر کیا۔ انہوں نے ہندوؤں کو قتل کرنے یا ان کے ساتھ وہ سلوک کرنے کی دھمکی نہیں دی جو آریوں نے یہاں کے قدیم باشندوں سے کیا تھا اور انہیں اچھوت بنا کر چھوڑا تھا۔ قائد اعظم نے نہایت متانت اور یقینِ محکم سے فرمایا کہ :-

---

[1] دیباچہ "پاکستان اینڈ مسلم انڈیا"

"ہندوؤں کو رام راج کے خواب سے نکل آنا چاہیئے اور مسلمانوں کا یہ مطالبہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ہندوؤں کا قومی وطن ——— اور مسلمانوں کا قومی وطن۔ اس وقت ہم خود ایک چوتھائی اور ہندوؤں کو تین چوتھائی ہندوستان دینے کے لئے تیار ہیں، لیکن اگر انہوں نے سودے بازی کی کوششیں جاری رکھیں اور کج بحثی سے باز نہ آئے تو ممکن ہے کہ وہ اس تین چوتھائی سے بھی محروم ہو جائیں۔ اب پاکستان ہمارا نصب العین ہے۔ اس کا حصول مسلم ہندوستان کی زندگی کا مقصد ہو گا اور وہ اس کے لئے جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔"[1]

قرار دادِ پاکستان پر لفظی اعتراض

چلیے قرار دادِ لاہور جو بعد میں قرار دادِ پاکستان کے نام سے موسوم ہوئی پہلے تو کانگرس اور انگریز دونوں کے لئے قابلِ التفات ہی نہ تھی لیکن جب خاص طور پر کانگرس کے رہنماؤں پر سے مخالفت کا جنون کچھ کم ہوا تو انہوں نے اس کی خامیاں تلاش کرنی شروع کیں اور لفظی گرفت میں لے کر قائد اعظم اور مسلم لیگ کے دوسرے رہنماؤں کو عاجز کرنا چاہا۔ مثلاً قرار داد میں شمال مشرق اور شمال مغرب کے مسلم علاقوں پر مشتمل آزاد "ریاست" کی بجائے "ریاستوں" کا لفظ درج تھا۔ مسٹر گاندھی نے پاکستان میں شامل ہونے والے علاقوں کے لوگوں میں انتشار پیدا کرنے کے لئے اس لفظ کو پکڑ لیا اور یہ نکتہ اٹھایا کہ قرار دادِ لاہور میں جن مسلم اکثریت کے حصوں کا ذکر کیا گیا ہے کیا وہ اس طرح آزاد و خود مختار ہوں گے کہ دوسرے حصے سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو گا۔

قائد اعظم کا مسٹر گاندھی کو جواب

یہ اعتراض مسٹر گاندھی نے قائد اعظم کے نام ایک خط میں کیا۔ قائد اعظم اپنی خداداد بصیرت اور مومنانہ فراست سے بھانپ گئے کہ دشمن سامنے سے حملہ کرنے میں ناکام ہو کر اب عقب سے حملہ آور ہو رہا ہے چنانچہ آپ نے مسٹر گاندھی کو جواب دیا اور یہ جواب نہایت فیصلہ کن تھا۔ قائد اعظم نے لکھا کہ :۔

> "نہیں۔ وہ پاکستان کی وحدتیں ہوں گی۔ پاکستان ہندوستان کے دو حصوں پر مشتمل ہو گا یعنی شمال مغربی علاقہ اور شمال مشرقی علاقہ۔ اس میں چھ صوبے شامل ہوں گے۔ سندھ، بلوچستان، شمال مغربی سرحدی صوبہ، پنجاب، بنگال اور آسام۔ قرار دادِ لاہور کے مطابق ان کی حدود میں مناسب تغیر و تبدل کیا جائے گا۔"[2]

---

[1] ریسنٹ اسپیچز اینڈ رائٹنگز آف جناح جلد ۱ صفحہ ۲۰۳

[2] "ایوڈ ڈمشن ٹو دی فونڈیشن آف پاکستان" مولفہ سید شریف الدین پیرزادہ (جلد دوم)

مسٹر گاندھی کے نام قائد اعظم کے خطابیں پاکستان کی جغرافیائی حدود اور اس کی ہیئت ترکیبی کے متعلق جو کچھ کہا گیا تھا وہ قائد اعظم کا ذاتی خیال نہ تھا بلکہ آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے بھی بار بار پاکستان کو شمال مشرق اور شمال مغرب کے مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل ایک آزاد اور خود مختار ریاست قرار دیا گیا۔ چنانچہ شملہ کانفرنس کے موقع پر جب کانگرس اور مسلم لیگ کے رہنما وزیر ہند کی دعوت پر جمع ہوئے تو اس موقع پر آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے کانگرس کے ساتھ سمجھوتے کی جو شرائط پیش کی گئیں ان میں جو شرط سب سے پہلے درج تھی وہ یہ تھی کہ :۔

"پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ، بنگال اور آسام پر مشتمل چھ صوبوں کو یکجا کر کے ایک وفاق کی حیثیت دی جائے گی۔ ان چھ صوبوں کی علیحدہ مجلس دستور ساز ہو گی جو ان صوبوں کے لئے آئین بنائے گی[1]"

اس تجویز کے مطابق بھی پاکستان کے چھ کے چھ صوبے ایک مرکز کے ماتحت رکھے گئے تھے۔ اور "دو پاکستان" کا تصور کسی مسلم لیگی یا کسی مسلمان کے ذہن میں نہ آیا تھا۔ مسٹر گاندھی اور کانگرس کے جن رہنماؤں نے اس فتنے کو ہوا دینے کی کوشش کی تھی وہ اپنی موت آپ مر گیا تھا۔ لیکن قائد اعظم کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی بصیرت عطا فرمائی تھی اور بلاشبہ وہ نہایت روشن ضمیر انسان تھے اس لئے ماضی میں پیش آنے والے خطرات کے سدباب کے طور پر انہوں نے اپنی مختلف تحریروں، تقریروں اور بیانات میں اس مسئلے کی وضاحت فرما دی تھی کہ پاکستان دو حصوں پر مشتمل ہو گا ایک مشرق میں اور ایک مغرب میں مگر یہ دونوں ایک ہی مملکت کے حصے ہوں گے اور ایک ہی مملکت کے ماتحت ہوں گے۔ چنانچہ ۱۹۴۵ء میں قائد اعظم نے ایک بار پھر اس معاملے کی وضاحت کی اور اپنی ایک انتخابی تقریر میں فرمایا کہ "ہمارا مطالبہ پاکستان ہے"۔ پاکستان کی تشریح کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ان کی حد بندی کر کے ایک آزاد و خود مختار ریاست قائم کی جائے۔ اگر مسلمانوں نے پاکستان کے خلاف فیصلہ دیا تو میں اپنے اس مطالبے سے دستبردار ہو جاؤں گا[2]"

دہلی کنونشن کا فیصلہ

قائد اعظم کی مندرجہ بالا تقریر میں بھی ایک خود مختار مسلم ریاست کا ذکر ہے۔ ایک سے زیادہ خود مختار

---

[1] اسپیچز اینڈ ڈاکومنٹس ص ۵۲۳ جلد ۲

[2] انٹروڈکشن ٹو دی فاؤنڈیشن آف پاکستان (جلد دوم)

مسلم وحدتوں کا نہیں، کہا جا سکتا ہے کہ یہ آراء ایک شخص کی ذاتی آراء تھیں، اگرچہ وہ مسلم لیگ کا صدر تھا مگر اس نے یہ خیالات مسلم لیگ کے کسی نمائندہ اجلاس کی منظوری کے بعد ظاہر نہیں کئے تھے۔ حالانکہ یہ اعتراض بھی درست نہیں۔ قائد اعظم نے یہ بیانات کسی بند کمرے میں نہیں دیئے تھے کہ انہی میں محدود رہے ہوں۔ انہوں نے یہ تقریریں عام اجتماعات میں کیں۔ ان کے بیانات برصغیر اور بیرونی پریس کے ذریعے دنیا کے کونے کونے تک پہنچے۔ مگر کیا اس وقت کسی ایک مسلمان نے بھی اس کی مخالفت میں آواز بلند کی۔ کسی ایک مسلمان رہنما یا عوام میں سے کسی شخص نے یہ اعتراض کیا کہ قائد اعظم کے یہ بیانات اور تقریریں ۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور کے خلاف ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت کے مسلم لیگی رہنما اور عام مسلمان بھی قرارداد لاہور میں جن آزاد و خود مختار ریاستوں کا ذکر کیا گیا تھا انہیں ایک ہی مسلم ریاست کے دو حصے سمجھتے تھے۔ لیکن قائد اعظم مسلمانوں کے ڈکٹیٹر بننا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ ایک جمہوریت پسند انسان تھے اور عوامی فیصلوں کو قدر و قیمت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ ۹؍ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک کنونشن بلایا جس میں وہ تمام مسلم لیگی ممبر شریک ہوئے جو عام انتخابات میں ہندوستان کے مختلف صوبوں سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے۔ مسلم لیگ کی تاریخ میں مسلمان عوام کے حقیقی نمائندوں کا اتنا بڑا اجتماع اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس اجتماع نے متفقہ طور پر جو قرارداد منظور کی اس میں صاف الفاظ میں اعلان کیا گیا کہ "ہندوستان کے شمال مشرق اور شمال مغرب کے مسلم اکثریتی علاقوں کو باہم ملا کر ایک آزاد و خود مختار اسلامی ریاست قائم کی جائے۔" اس کا مسودہ چوہدری خلیق الزمان نے تیار کیا تھا۔ مسودہ تیار کرنے والی کمیٹی میں حسن اصفہانی، عبدالمتین چوہدری اور مسٹر چندریگر شامل تھے۔ نواب اسماعیل خاں اس کمیٹی کے صدر تھے۔ یہ قرارداد مسٹر حسین شہید سہروردی نے کھلے اجلاس میں پیش کی۔ چوہدری خلیق الزمان نے اس کی تائید کی۔ ملک فیروز خاں نون، مسٹر چندریگر، سر غلام حسین ہدایت اللہ اور کئی لوگوں نے اس کی تائید مزید کی۔ اس قرارداد میں یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ دو علیحدہ علیحدہ دستور ساز اسمبلیاں بنائی جائیں۔ ایک ہندوستان کے لئے اور دوسری پاکستان کے لئے۔[1]"

یہ فیصلہ کسی ایک شخص کا نہیں تھا۔ اس فیصلے کو ۱۹۴۰ء کے اجلاس لاہور کے فیصلے سے بھی زیادہ اہمیت حاصل تھی کیونکہ ۱۹۴۰ء میں جو قرارداد پاس ہوئی تھی بلاشبہ وہ ہندوستان کے دس کروڑ

---

[1] شاہراہ پاکستان صد ۹۷۳

مسلمانوں کی امنگوں کی آئینہ دار تھی اور اس کے پیش کرنے والے اور اس کی منظوری دینے والے بھی وہ لوگ تھے جنہیں برصغیر کے مسلمانوں کا پورا اعتماد حاصل تھا۔ مگر پھر بھی ان میں سے بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو آئینی لحاظ سے کسی صوبے کے مسلمانوں کے نمائندے نہیں تھے مگر ۱۹۴۶ء میں جو کنونشن دہلی میں منعقد ہوا تھا اس میں تو کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جسے ——————

—— مسلمانوں نے عام انتخاب میں واضح اکثریت سے اپنا نمائندہ منتخب نہ کیا ہو۔ اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ۱۹۴۰ء کے اجلاس لاہور کے مقابلے میں ۱۹۴۶ء کا دہلی کنونشن کہیں زیادہ مسلمانوں کا نمائندہ کنونشن تھا اور اس کا فیصلہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ تھا۔ پھر قابل ذکر بات یہ ہے کہ دہلی کنونشن کی اس قرارداد پر برصغیر پاک و ہند کے کسی حصے سے اختلاف کی کوئی آواز نہیں اٹھی۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ اس قرارداد میں ایک آزاد اور خود مختار اسلامی ریاست کا مطالبہ برصغیر کے دس کروڑ مسلمانوں کا جمہوری مطالبہ تھا۔

نظریۂ پاکستان کے غیر مسلم حامی

مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کا سیلاب جوں جوں شدت اختیار کرتا جا رہا تھا بعض غیر مسلم اصحاب اس شدتِ مخالفت سے متاثر ہو کر مطالبۂ پاکستان پر فرقہ وارانہ تعصب سے بلند ہو کر سوچنے لگے تھے۔ ان لوگوں میں جنوبی ہند کے لوگ خاص طور سے قابل ذکر ہیں جو ہزاروں سال سے "اونچی ذات" کے ہندوؤں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ خود کانگرس میں بعض عناصر نے تقسیم ملک کی تجویز پر تعمیری نقطۂ نظر سے غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان میں راج گوپال آچاریہ، ایم۔ این۔ رائے اور جان متھائی کے اسمائے گرامی سرِ فہرست ہیں۔ ذیل میں ان اصحاب کی آراء درج کی جاتی ہیں تاکہ معلوم ہوسکے کہ نظریۂ پاکستان کی معقولیت کو غیر مسلموں کے منصف مزاج طبقے نے بھی تسلیم کیا۔

مسٹر گوپال چیٹی

جنوبی ہند کے ایک ممتاز صحافی مسٹر گوپال چیٹی نے ہندوستان کی تقسیم کے مسئلے پر ایک فکر انگیز اور حقیقت افروز مضمون لکھا جو مدراس کے مشہور اخبار سنڈے آبزرور میں شائع ہوا۔ اس کے بعض اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

"ہندوستان کے پیچیدہ سیاسی مسئلے کا جو حل مسٹر جناح نے پیش کیا ہے اس سے ڈراوڈ مکمل اتفاق کرتے ہیں یعنی ہندوستان کی تقسیم .... ہندوؤں اور مسلمانوں کا حقیقی معنی میں متحد ہونا قطعی طور پر ناممکن ہے۔ اس سے قبل اکبر بادشاہ نے دونوں قوموں کو متحد کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی اس نے ہندوؤں

کی مذہبی کتابوں کے فارسی میں ترجمے کرواتے۔ راجپوتوں کی شہزادیوں کو شاہی محل میں داخل کرکے مسلمان شہزادیوں کے ہم مرتبہ بنایا گیا۔ ایک نیا مذہب دینِ الٰہی جاری کیا گیا جس میں ہندو مت اور اسلام کی خوبیاں داخل کرکے دونوں قوموں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کی گئی۔ ہندوؤں کی دلجوئی کے خیال سے اکبر نے گوشت کھانا چھوڑ دیا۔ اپنی ہندو رانیوں کی مذہبی تقریبات میں شریک ہوکر کوشش کی کہ دونوں قوموں کے اختلافات مٹا کر انہیں ایک قوم بنا دیا جائے مگر کسی کی مداخلت کے بغیر اکبر کی یہ ساری کوششیں اکارت گئیں اور جہانگیر اور شاہجہاں کے دورِ حکومت میں پھر پہلی والی صورت پیدا ہوگئی، ہندو مسلم اتحاد کا خیال' خواب ہوگیا۔

خود ہندو جب باہم متحد ہوکر ایک قوم نہیں بن سکے تو ہندو مسلم اتحاد کے نتیجے میں ایک قوم کا وجود میں آنا کیونکر ممکن ہے۔ دریں حالات اس مسئلے کا صحیح حل یہی ہے کہ ہندوستان کو آریائی ہندوستان دراوڑی ہندوستان اور مسلم ہندوستان یعنی تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے[1]

ڈاکٹر امبیدکر

اچھوتوں کے مشہور لیڈر ڈاکٹر امبیدکر ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اچھوت قوم کو کانگرس کی گود میں ڈال دیا اور اچھوتوں کو ہندوؤں سے الگ قوم قرار دینے کے خلاف جب مسٹر گاندھی نے مرن برت رکھا تو یہی مسٹر امبیدکر تھے جنہوں نے گاندھی جی کی جان بچانے کی خاطر اچھوتوں کو قربان کر دیا مگر جب مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ کیا تو اپنی کانگرس نوازی کے باوجود ڈاکٹر امبیدکر اس مطالبے کی معقولیت کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ انہوں نے لکھا کہ :-

"ہندو کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کے قیام سے ہندوستان کی سائنٹیفک سرحد جاتی رہے گی۔ جواب یہ ہے کہ محض سرحد کے سوال پر مسلمان اپنے مطالبے سے دست بردار تو ہو نہیں سکتے۔ دوسرے یہ کہ قدرتی سرحد کی غیر موجودگی میں مصنوعی سرحد بنائی جاسکتی ہے جو زیادہ فائدہ مند ثابت ہوسکتی ہے .... یہ ایک حقیقت ہے کہ فرقہ وارانہ اور منافرانہ جذبہ اس وقت تک موجود رہے گا جب تک کہ کسی اقلیت کے سر پر کوئی ظالم اکثریت مسلط ہوگی۔ اس کا بہتر حل یہ ہے کہ دستوری ڈھانچے میں اقلیت اور اکثریت ایک ساتھ نہ رہیں .... یہ بات تو تسلیم کی جاچکی ہے کہ دو فرقے کسی بھی حال میں ایک دوسرے سے متحد نہیں ہو سکتے اور ان کے اتحاد کی کوشش تحصیلِ حاصل اور خوش فہمی سے زیادہ نہیں"۔[2]

---

[1] سنڈے آبزرور مدراس بابت ۵ مئی ۱۹۴۰ء

[2] تاریخ مسلم لیگ صفحہ ۳۴۱ از سید رئیس احمد جعفری (مرحوم)

سپرو کمیٹی کا اختلافی نوٹ

سر تیج بہادر سپرو کانگرس کے نہایت مشہور رہنما گذرے ہیں۔ ہندوستان کے آئینی مسائل کے تصفیے کے لئے ان کی سرکردگی میں ایک کمیٹی قائم کی گئی۔ اس کے اراکین میں سر ہومی مودی اور سر جان متھائی بھی شامل تھے جنہیں کمیٹی میں اقتصادی اور مالی معاملات کے ماہرین کی حیثیت سے شریک کیا گیا تھا۔ سپرو کمیٹی نے ہندوستان کی تقسیم کے مطالبے کی نہایت شدت سے مخالفت کی مگر ان دو غیر مسلم ممبروں یعنی سر ہومی اور جان متھائی نے کمیٹی کے فیصلے سے اتفاق نہیں کیا بلکہ اس خیال کا اظہار کیا کہ در ایں حالات ملک کی تقسیم کے سوائے اور کوئی چارہ کار نہیں۔ انہوں نے اپنے اختلافی نوٹ میں لکھا کہ:۔

"ہمیں افسوس ہے کہ پاکستان کے مسئلے پر ہم اپنے رفقا سے اتفاق نہیں کر سکتے۔ ہمارا نظریہ یہ ہے کہ اگر ایک اسکیم جو ہندوستان کی سیاسی وحدت کو مسلّم جانتی ہے مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہ ہوئی اور اگر ہونے والے انتخابات کے نتائج نے عمومی طور پر مسلم لیگ کی پوزیشن کو مضبوط تر کر دیا تو موجودہ جمود کو ختم کرنے کے لئے تقسیم اور علیحدگی پر افسوس نہ کرنا چاہیئے۔ اگر ایک سمجھوتے کے لئے کوئی دوسری بنیاد نہ مل سکے تو ہمیں تقسیم کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔"[1]

راج گوپال آچاریہ اور پاکستان

کانگرسی رہنماؤں میں جن لوگوں کو منفرد و ممتاز مقام حاصل رہا ان میں مسٹر راج گوپال آچاریہ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ ہندوستان میں مسٹر گاندھی کے بعد انہیں بزرگ سیاست دان کے نام سے یاد کیا جاتا رہا۔ لارڈ مونٹ بیٹن کے بعد وہ بھارت کے پہلے ہندوستانی گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ کانگرس کے اس بزرگ سیاست دان نے پاکستان کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا اس نے بلا شبہ انہیں معقولیت پسند سیاست دانوں میں ممتاز مقام پر لا کھڑا کیا۔ وہ کانگرس کے واحد رہنما تھے جنہوں نے مسلم لیگ کی روز افزوں مقبولیت اور نظریۂ پاکستان سے مسلمانوں کی جذباتی وابستگی دیکھ کر اپنے رفقاء کو مشورہ دیا کہ ہندوستان اور کانگرس دونوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ پاکستان کی تجویز قبول کر لی جائے چنانچہ انہوں نے ۲۳ اپریل ۱۹۴۲ء کو مدراس کی مجلس دستور ساز کے کانگرسی ممبروں کے اجلاس میں ایک قرارداد پیش کی جس میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی سے سفارش کی گئی تھی کہ اگر مسلم لیگ تقسیم ہند پر اصرار

---

[1] تاریخ مسلم لیگ ص ۳۵۱

کر رہی ہے تو اس سے گفت و شنید کر کے سمجھوتہ کر لیا جائے اور اس مشکوک فائدے کی خاطر کہ ہندوستان متحد رہے قومی حکومت کے قیام کا موقع ضائع نہ کیا جائے[1]

مسٹر راج گوپال آچاریہ ہی کی ذاتی کوشش سے یہ تجویز منظور ہوئی مگر جب آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس الہ آباد میں یہ تجویز پیش ہوئی تو مسٹر آچاریہ کے خلاف ایسا سخت طوفان برپا ہوا کہ مجبور ہو کر انہیں کانگرس سے مستعفی ہونا پڑا۔ اس کے بعد راج گوپال اچاریہ نے ۱۳ اپریل ۱۹۴۳ء کو مبیلا دالیتی کے ایک جلسے میں جس میں ان کو شرکت کی دعوت مسلمانوں نے دی تھی پاکستان کے متعلق اپنے خیالات کا دوبارہ اظہار ان الفاظ میں کیا کہ :-

"میں اب بھی پاکستان کے حق میں ہوں کیونکہ میں ہندوستان میں ایسی حکومت نہیں چاہتا جس میں مسلمانوں کی کوئی عزت نہ ہو۔ مسلمانوں کو پاکستان دلایا جائے۔ اگر ہم اس پر رضا مند ہوگئے تو ہمارا ملک بچ جائے گا۔ اس کے بعد اگر انگریزوں نے اور دقتیں پیدا کیں تو ہم ان کا مقابلہ کریں گے۔ میں پاکستان کے حق میں ہوں مگر مجھے خوف ہے کہ کانگرس اس کو منظور نہ کرے گی۔ کانگرس کے باغ میں بہت سے پھول ہیں جن کو میں چننا چاہتا ہوں مگر مجھ پر کانگرس کے باغ کے دروازے بند ہیں تاکہ میں وہ پھول نہ چن سکوں[2]"

سر بنرجی اور پاکستان

ریاست کشمیر کے ایک سابق وزیر اعظم سر بنرجی بھی ان غیر مسلموں میں سے تھے جنہوں نے تجویز پاکستان کا غیر جانب دارانہ اور منصفانہ نقطہ نظر سے جائزہ لینے کے بعد اسے ہندوستان کے لئے نہایت مفید قرار دیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ :

"پاکستان کی تجویز کسی طرح بھی ہندو قوم اور ہندوستان کے مفاد کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ ہندوستان کی پیچیدگیوں کا حل اسی میں مضمر ہے —— میں اس امر پر مائل ہوں کہ علیحدہ نظم و نسق (صوبہ جات) کی وحدتوں کو علاقہ وار دفاع کی ذمہ داری سونپی جائے جو مستقبل میں خود مختار ریاستوں کی صورت اختیار کریں —— مسلم لیگ کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ مرکز سے بے نیاز ہو کر اپنی سیاسی، ثقافتی اور

---

[1] دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ص ۱۳۹

[2] شاہراہِ پاکستان ص ۹۱۷

لسانی ترقی کو جاری رکھ سکیں۔"[1]

شاید اقبال نے کسی ایسے ہی موقع کے لئے کہا تھا "پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے" قائد اعظم اور مسلم لیگ کے افکار، طرز عمل اور جہدِ مسلسل نے مخالفوں کی کیمپ میں جو طوفان برپا کیا تھا اس کی شدت کم کرنے کے لئے خود مخالفوں اور غیر مسلموں میں سے ایسے لوگ کھڑے ہو گئے جنہوں نے مطالبۂ پاکستان کی حمایت شروع کر دی۔ انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے ذریعے ایک قوم کو وجود میں لانے کی کوشش کو خواب و خیال قرار دیا اور ہندوستان کی گذشتہ سیکڑوں سال کی تاریخ سے ثابت کر دیا کہ یہ خواب نہ پہلے کبھی شرمندہ تعبیر ہو سکا اور نہ آئندہ اس کا امکان ہے۔ مسلمانوں اور مسلم لیگ کے یہ غیر مسلم وکیل اپنے اس خیال پر آخر دم تک قائم رہے۔ ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ اس طرح نظریۂ پاکستان پر اعتراضات کی یورش کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ اگرچہ ختم نہیں ہوا لیکن قائد اعظم اور مسلم لیگ کے دیگر رہنماؤں کی مدلل تقریروں، وزنی بیانات اور خیال افروز تحریروں سے کمزور ضرور پڑ گیا اور مسلم لیگ کا کیس اتنا مضبوط تھا کہ منصف مزاج غیر مسلموں نے بھی اس کی حمایت شروع کر دی۔ ان حمایت کرنے والوں میں صرف یہی لوگ شامل نہیں جن کے اسمائے گرامی ان صفحات میں درج کئے گئے ہیں بلکہ یہ تعداد خاصی طویل ہے اس میں افراد بھی شامل ہیں اور جماعتیں بھی۔ چونکہ اختصار مد نظر ہے اور صرف ایک جھلک دکھانی مقصود تھی اس لئے نمونے کے طور پر صرف چند اصحاب کی آرا پر اکتفا کیا گیا۔

---

[1] رہبرِ دکن حیدرآباد بابت ۱۶ جون ۱۹۴۱ء

دوسری جنگِ عظیم اور مسلم لیگ

جنگِ عظیم ثانی نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ ساری دنیا کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس جنگ نے عالمی سیاست پر نہایت گہرے اور دور رس اثرات ڈالے اور طاقت کا توازن انگریزوں کے ہاتھ سے نکل کر دوسری قوموں کے پاس چلا گیا۔ ہندوستان اس جنگ سے سیاسی اور اقتصادی دونوں اعتبار سے متاثر ہوا۔ جنگ کا آغاز انگریزوں اور ان کے اتحادیوں کے لئے نہایت مایوس کن تھا اور انہیں پے در پے شکستیں ہو رہی تھیں۔ جرمنی کی فوجیں نہایت برق رفتاری سے یورپی ممالک فتح کرتی چلی جا رہی تھیں۔ ان حالات میں حکومتِ برطانیہ اہلِ ہند کے تعاون کی سخت ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ یہ تعاون حاصل کرنے کا سب سے موثر ذریعہ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کا مکمل اشتراک تھا۔ کانگرسی وزارتیں اس سے قبل مستعفی ہو چکی تھیں اور اب وہ دوبارہ وزارتیں قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھیں تاوقتیکہ انہیں برصغیر کے سیاہ و سپید کا مالک نہ بنا دیا جائے۔ مسلم لیگی وزارتیں بدستور کام کر رہی تھیں لیکن لیگ اور کانگرس یا بالفاظ دیگر ہندو اور مسلمانوں کے درمیان سخت کشمکش تھی۔ اس موقع پر یہ کشمکش برطانوی مفاد کے لئے سخت خطرہ تھی۔ حکومت چاہتی تھی کہ ہندوستان کی ساری جماعتیں متحد و متفق ہو کر اس جنگ میں اس کی مدد کریں۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے وزیر ہند کے ایما پر ہندوستان کے وائسرائے نے مسلم لیگ اور کانگرس کو گفت و شنید کی دعوت دی — مسلم لیگ کی طرف سے قائدِ اعظم نے اور کانگرس کی طرف سے مسٹر گاندھی نے وائسرائے سے ۲۷ اور ۲۹ جون ۱۹۴۰ء کو ملاقات کی۔

قائدِ اعظم کا موقف

اس ملاقات میں قائدِ اعظم نے وائسرائے کو یقین دلایا کہ مسلم لیگ جنگی مساعی میں حکومت سے تعاون کرنے کو تیار ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ صوبائی اور مرکزی وزارتوں میں اسے موثر نمائندگی دی جائے اور آئندہ کے لئے جو دستوری خاکہ مرتب کیا جائے اس میں دو آزاد اور خود مختار ریاستوں کا اصول شامل کیا جائے۔ اس کے بعد اپنے ایک خط میں انہوں نے وائسرائے کو پھر یقین دہانی کرائی کہ آئندہ دستور کے مسودے میں مسلمانوں کے دو قومی نظریے کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ قائدِ اعظم نے جنگی کونسل اور وائسرائے کی

ایگزیکیوٹی کی توسیع کے سلسلے میں یہ مطالبہ پیش کیا کہ ان دونوں اداروں میں صرف ان مسلمانوں کو شامل کیا جائے جن کے نام مسلم لیگ کی طرف سے پیش کئے جائیں۔

اگست کی پیش کش

وائسرائے نے کانگریسی اور مسلم لیگی رہنماؤں سے گفت و شنید اور خط و کتابت کی روشنی میں وزیرہند کو اپنی رپورٹ بھیج دی۔ وزیر ہند نے اس رپورٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک بیان وائسرائے کو بھیجا کہ یہ حکومت برطانیہ کی طرف سے جاری کر دیا جائے۔ ۸ اگست کو یہ بیان جاری ہوا۔ اس بیان میں ہندوستان کو متحد رکھنے پر زور دیا گیا تھا اور اہل ہند کو داخلی خود مختاری دینے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اقلیتوں کے متعلق وعدہ کیا گیا تھا کہ انہیں کسی ایسے نظام کے تحت رہنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا جو انہیں پسند نہ ہو۔ تاریخ میں یہ اگست کی پیش کش کہلاتی ہے۔ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں وزیر ہند کا یہ اعلان زیر بحث آیا اور غور و فکر کے بعد اسے مسترد کر دیا گیا کیونکہ اس میں ہندوستان کے مسلمانوں کے متفقہ مطالبے (پاکستان) کے بارے میں ایک لفظ نہ تھا بلکہ گول مول الفاظ سے انہیں فریب دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ کانگریس نے بھی اسے رد کر دیا کیونکہ اس میں اقلیتوں پر ان کے خلافِ منشا نظام حکومت مسلط کرنے سے انکار کیا گیا تھا۔ کانگریس کی رائے میں یہ پاکستان کا اصول تسلیم کر لینے کے مترادف تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ ایک طرف کانگریس اور حکومت کے درمیان سخت اختلافات تھے۔ دوسری طرف کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین بعد المشرقین پیدا ہو چکا تھا اور تیسری طرف حکومت اور مسلم لیگ کے درمیان کوئی سمجھوتا نہ ہو سکا تھا۔

جنگی کونسل کا قیام

ادھر حکومت کو اہل ہند کے تعاون کی سخت ضرورت تھی کیونکہ جرمنی کی فوجیں یورپ کے بڑے حصے پر قابض ہو چکی تھیں اور برطانیہ کا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا اس لئے وائسرائے نے اپنی ایگزیکیٹو کونسل میں توسیع کا اعلان کیا تاکہ اہل ہند کو حکومت میں زیادہ نمائندگی دے کر ان کا تعاون حاصل کیا جا سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ جنگی کونسل کے قیام کا اعلان ہوا۔ چونکہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں مساعئ جنگ میں حکومت سے تعاون نہ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھیں اس لئے وائسرائے نے ملک کے بعض سرکردہ اور با اثر لوگوں سے رابطہ پیدا کر کے اپنے طور پر ان کونسلوں کا ممبر نامزد کر دیا تاکہ ان لوگوں کے ذریعے حکومت کو زیادہ سے زیادہ افرادی، مالی اور اخلاقی امداد مل سکے۔ ان ممبروں میں کچھ مسلم لیگی اصحاب بھی شامل تھے جن میں سے تین افراد تو ایسے تھے جو اپنے اپنے صوبوں کے وزرائے اعلیٰ تھے یعنی بنگال کے مسٹر اے کے فضل الحق آسام کے سر سعد اللہ اور پنجاب کے سر سکندر حیات خاں۔ قائداعظم نے ان اصحاب سے جواب طلبی کی اور

فیصلہ کیا گیا کہ اگر یہ لوگ جنگی کونسل اور ایگزیکٹو کونسل سے فوری طور پر مستعفی نہ ہوں تو انہیں مسلم لیگ سے خارج کر دیا جائے۔ ان لوگوں کو دس دن کی مہلت دی گئی تھی۔ خوش قسمتی سے تینوں وزرائے اعلیٰ مستعفی ہو گئے۔ دو لیگی ممبروں نے مستعفی ہونے سے انکار کر دیا چنانچہ قائد اعظم نے انہیں مسلم لیگ سے خارج کر دیا۔ یہ لیگی ممبر تھے سر سلطان احمد اور بیگم شاہنواز[1]

کرپس مشن

اسی دوران میں جاپان بھی جرمنی کے حلیف کی حیثیت سے جنگ میں شریک ہو گیا۔ جاپان کی شرکت سے حالات برطانیہ کے حق میں اور زیادہ خراب ہو گئے۔ جاپانی فوجوں نے نہایت سرعت سے پیش قدمی شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے ملایا، سنگاپور اور رنگون پر جاپان کا قبضہ ہو گیا۔ اب ہندوستان براہ راست جاپان کی زد میں تھا اور کلکتہ سے تو ہندو ناپید ہوائی حملوں کے ڈر سے بھاگنے لگے تھے۔ ان حالات نے برطانوی حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ اہل ہند کا تعاون حاصل کرنے کے لئے کوئی ایسی سیاسی دستاویز مرتب کرے جس میں جنگ کے بعد برصغیر کو مکمل آزادی کی ضمانت دی گئی ہو۔ چنانچہ اس مقصد کے تحت برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر چرچل نے "انڈیا کمیٹی" کے نام سے ایک کمیشن تشکیل دیا۔ لارڈ اٹلی اس کمیشن کے چیئرمین مقرر کئے گئے۔ سر جان اینڈرسن، سر جیمس جوگ اور سر اسٹیفورڈ کرپس اس کے اراکین نامزد ہوئے۔

۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء کو کرپس مشن ہندوستان پہنچا۔ لیکن ہندوستان پہنچ کر مشن نے ایک بات ابتدا ہی میں صاف کر دی کہ اس کے ذریعے برطانوی حکومت کی پالیسی میں فوری طور پر کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ اس اعلان کے بعد ہندوستان کی سیاسی جماعتوں میں سے کسی جماعت کو اس مشن کے متعلق کوئی خوش فہمی باقی نہ رہی۔ بہرحال اپنے پروگرام کے مطابق کرپس مشن نے مسٹر گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، قائد اعظم، سر سکندر حیات خاں، مسٹر فضل الحق، سر تیج بہادر سپرو، مسٹر ساورکر اور دیسی ریاستوں کے نمائندوں مہاراجہ بیکانیر اور جام صاحب نوانگر سے ملاقاتیں کیں۔

کرپس کی تجاویز

کرپس مشن نے جن رہنماؤں سے ملاقات کی انہیں اپنی تجاویز کے مسودے کی ایک ایک نقل بھی دی تاکہ وہ اس کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنی رائے ظاہر کر سکیں۔ اس کے بعد یہ مسودہ اخبارات میں شائع کر دیا گیا۔ مسودے کی اہم باتیں یہ تھیں۔

---

[1] قائد اعظم جناح — دی اسٹوری آف اے نیشن ص ۳۳۴۔ بعد میں بیگم شاہنواز کو پھر مسلم لیگ میں شامل کر لیا گیا اور انھوں نے تحریک پاکستان میں بڑا کام کیا (مولف)

(۱) اختتامِ جنگ کے بعد ہی ہندوستان کے لئے ایک ایسا دستور مرتب کیا جائے گا جس میں ہندوستانی ریاستوں کو بھی نمائندگی دی جائے گی۔ اس امر کا بھی انتظام کیا جائے گا کہ اگر کوئی صوبہ یہ دستور قبول نہ کرے تو وہ اپنی موجودہ حیثیت قائم رکھ سکے یا اگر وہ پسند کرے تو اس کے لئے نیا دستور وضع کیا جائے گا۔ ان صوبوں کا وہی مرتبہ ہوگا جو انڈین یونین کا۔

(۲) حکومتِ برطانیہ اور دستور کا مسودہ ترتیب دینے والوں کے درمیان ایک میثاق پر دستخط ہوں گے جس میں اہلِ ہند کو حکومت کے حقوق منتقل کرنے کے بارے میں تمام اہم امور درج ہوں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ اقلیتوں کے مفاد کے تحفظ کا مکمل انتظام کیا جائے گا۔

(۳) جنگ کے بعد صوبائی مجالسِ قانون کے انتخابات ہوں گے۔ یہ منتخب ارکان مرکزی مجلسِ دستور ساز کے اراکین کا انتخاب کریں گے۔ ہندوستانی ریاستوں کو بھی ان کے تناسب کے اعتبار سے نمائندگی دی جائے گی"[۱] —— آخر میں کہا گیا تھا کہ یہ مسودہ یا تو سارا کا سارا منظور کیا جائے یا سارا کا سارا رد کر دیا جائے۔ گویا اس میں کسی ترمیم و تنسیخ کی گنجائش نہ تھی۔ ان تجاویز پر سیاسی جماعتوں نے غور و خوض شروع کیا اور صدر کانگرس مولانا ابو الکلام آزاد نے کرپس مشن کو مطلع کیا کہ کانگرس ان تجاویز کو اس شرط کے ساتھ قبول کرتی ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسی حکومت قائم کی جائے جسے مکمل اختیارات حاصل ہوں یعنی کابینہ تشکیل دی جائے۔ کرپس مشن نے صدر کانگرس کی تجویز یہ کہہ کر رد کر دی کہ اس قسم کی کابینہ کا مطلب یہ ہوگا کہ اکثریتی فرقے کو ملک پر مسلط کر دیا جائے۔

کرپس مشن کے اس جواب پر مسلم لیگی حلقوں میں اظہار اطمینان کیا گیا کیونکہ اس جواب سے اس مرکزی حکومت کے تار و پود بکھر جاتے تھے جس پر ہندو اکثریت کا غلبہ ہوتا۔ کرپس مشن کے اس جواب پر کانگرس نے یہ تجاویز مسترد کر دیں اور گاندھی جی نے ان تجاویز پر یہ دلچسپ تبصرہ کیا کہ "یہ ایک ایسے بنک کا اگلی تاریخ کا چیک ہے جو دیوالیہ ہو چکا ہے"۔ ہندو مہاسبھا نے بھی کرپس مشن کی تجاویز مسترد کر دیں کیونکہ اس کے خیال میں بعض صوبوں کو ہندوستان کی مرکزی حکومت سے الگ ہو کر اپنی آزاد یونین قائم کرنے کا حق دینا پاکستان کے قیام کی راہ ہموار کرنا تھا۔

کرپس مشن اور مسلم لیگ

اگرچہ کرپس مشن نے یہ کہہ کر نظریہ پاکستان کو اصولی طور پر تسلیم کر لیا تھا کہ جو صوبے مرکزی یونین

---

[۱] اسپیچز اینڈ ڈاکومنٹس جلد ۲ صہ ۵۲۰، ۵۲۱۔

میں شامل ہونا نہ چاہیں ان کے لئے الگ دستور بنایا جائے گا مگر یہ پاکستان کی اسکیم قبول کرنے کا واضح اعلان نہ تھا۔ اس لئے آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے اپنے اجلاسوں منعقدہ ۲۷ مارچ تا ۱۱ اپریل ۱۹۴۲ء میں کرپس مشن کی تجاویز کو اس بنا پر رد کر دیا کہ حکومت برطانیہ کے اس مقرر کردہ مشن نے اپنا اصل مقصد یہ قرار دیا ہے کہ ہندوستان کو ایک یونین کی حیثیت دی جائے۔ اس نے ایک سے زیادہ وفاقوں کے معاملے کو ثانوی حیثیت دی ہے پھر مجلس دستور ساز کے نمائندوں کے لئے جو طریق انتخاب تجویز کیا گیا ہے وہ مسلمانوں کے جداگانہ حق نیابت سے مختلف ہے۔ مجلس دستور ساز میں اہم معاملات کے فیصلے اکثریت سے کئے جائیں گے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں مسلمان جن کی آبادی کا تناسب ۲۵ فیصد سے زیادہ نہیں اکثریت کے دست نگر ہو کر رہ جائیں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان تجاویز میں صوبوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو ہند یونین میں شامل ہونے کی بجائے اپنی الگ یونین بنا لیں لیکن کرپس مشن نے ایسا کوئی طریقہ معین نہیں کیا جس سے معلوم ہو کہ یہ صوبے ہند یونین میں شامل نہ ہونے کا فیصلہ کس طرح کریں گے۔ مسلم لیگ کے لئے ایسی کوئی تجویز قبول کرنا ممکن نہیں جو مارچ ۱۹۴۰ء کی منظور کردہ قرار داد پاکستان سے مطابقت نہ رکھتی ہو اور جس سے مسلمانوں کو حق خود ارادیت حاصل نہ ہوتا ہو۔[1]

بہر حال کرپس مشن بری طرح ناکام ہو گیا اور اس کے نتیجے میں ہندوستان کے سیاسی حالات سلجھنے کی بجائے اور زیادہ بگڑ گئے۔ ان حالات کو خراب کرنے میں سب سے زیادہ حصہ کانگرس نے لیا۔ چنانچہ جب کرپس مشن نے کانگرس کی تجاویز قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس کا ایسی وفاقی یونین کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا جس کا مقصد مسلمانوں پر تسلط حاصل کرنا تھا تو وہ انگریزوں کے خلاف میدان میں آ گئی۔ حالانکہ جنگ کے ابتدائی ایام میں مسٹر گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو دونوں نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ کانگرس حکومت برطانیہ کے لئے پریشانی کا باعث نہیں بنے گی۔ مسٹر گاندھی نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ کانگرس ایسی آزادی نہیں چاہتی جو برطانیہ کو تباہ کرنے کے بعد حاصل ہو۔ مگر جب جرمنی کی فوجیں یورپ کے ممالک کو سیلاب کی طرح روندتی ہوئی بڑھنے لگیں انگریز اور ان کے اتحادی پیہم شکستوں سے دوچار ہونے لگے۔ ادھر جاپان انگریزوں کے اہم فوجی مقامات پر قبضہ کرتا ہوا ہندوستان کے دروازے پر پہنچ گیا اور سب سے آخر میں کرپس مشن نے کانگرس کی تجاویز رد کر دیں تو کانگرس نے پلٹا کھایا اور انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ کانگرس کا خیال تھا کہ حکومت ایک ہولناک جنگ میں الجھی ہوئی ہے اور اب وہ ہندوستان کے عوام خصوصاً

---

[1] آل انڈیا مسلم لیگ کی قرار دادیں بابت اپریل ۱۹۴۲ء تا مئی ۱۹۴۲ء ص ۱ تا ص ۶

سیاسی جماعتوں کی محتاج ہے، اس موقع پر اس کے سامنے جو شرائط پیش کی جائیں گی جنگ جیتنے کی خاطر وہ انہیں قبول کرنے پر مجبور ہو جائے گی اور اگر اس نے یہ شرائط بآسانی قبول نہ کیں تو ملک گیر پیمانے پر سول نافرمانی کی تحریک جاری کر دی جائے گی۔ کانگرسی رہنماؤں کا خیال تھا کہ اس موقع پر حکومت دو محاذوں پر جنگ کرنے کی بجائے اپنے بیرونی دشمن سے فیصلہ کن جنگ کرنے کو ترجیح دے گی اور کانگرس کے سامنے ہتھیار ڈال دے گی۔ اس طرح وہ اپنی من مانی شرائط پر حکومت سے تعاون کر کے جنگ ختم ہونے کے بعد بلا شرکت غیرے ہندوستان کی قسمت کی مالک بن جائے گی اور اگر حکومت نے کانگرس کی شرائط تسلیم نہ کیں تو کانگرس اپنے رضاکاروں کے ذریعے پہلے بنگال پر اور پھر باقی ہندوستان پر طاقت کے زور سے قبضہ کر لے گی۔ یہ ہمارے مفروضات اور قیاس آرائیاں نہیں ہیں بلکہ یہ ایسے حقائق ہیں جن کے ہمارے پاس دستاویزی ثبوت موجود ہیں۔ اس سلسلے میں صدر کانگرس مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تحریر خالی از دلچسپی نہ ہو گی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب جاپانی فوجیں برما تک پہنچ چکی تھیں اور امکان پیدا ہو گیا تھا کہ آسام فتح کرنے کے بعد وہ بنگال کا رخ کریں گی۔ اس وقت صدر کانگرس مولانا ابوالکلام آزاد کے عزائم کیا تھے۔ انہی کی زبانی سنیے :-

کانگرس کے عزائم

"میں نے کانگرسی رضاکاروں کو جمع کر کے جاپانیوں کا مقابلہ کرنے کے انتظامات کئے۔ میں نے یہ پروگرام بنایا کہ جن جن مقامات سے برطانوی فوجیں پسپا ہوتی جائیں وہاں کانگرس کے رضاکار قبضہ کرتے جائیں۔ اس طرح بنگال کانگرس کے قبضے میں آجائے اور وہاں کانگرسی حکومت قائم کر دی جائے۔[1]"

قطع نظر اس سے کہ کانگرسی رضاکار جاپان جیسی طاقت کے سامنے ایک دن تو کیا ایک منٹ بھی ٹھہر سکتے تھے؟ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس زمانے میں کانگرس کے عزائم کیا تھے؟

یہ تو کانگرس کے عزائم کا دستاویزی ثبوت ہے۔ اب انہی صدر کانگرس مولانا ابوالکلام آزاد بالفاظ دیگر آل انڈیا کانگرس کا سول نافرمانی کے متعلق اندازہ بھی ملاحظہ کرتے چلئے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ کانگرس کا خیال تھا کہ "جس وقت جنگ ہندوستان کی سرحدوں تک پھیل جائے گی اس وقت سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوتے ہی حکومت برطانیہ کانگرس سے مصالحت کر لے گی۔ اگر

---

[1] انڈیا ونس فریڈم صہ۳۷ مولفہ مولانا ابوالکلام آزاد

ایسا نہ ہو سکا تو اس حالت میں کہ جاپانی فوجیں ہندوستان کے دروازے پر پہنچ چکی ہوں گی حکومت برطانیہ کانگرس کے خلاف سخت اقدامات کرنے سے گریز کرے گی۔ اس دوران میں کانگرس کو اور زیادہ مضبوط کرنے کا موقع مل جائے گا۔[۱]

یہی وجہ ہے کہ مسٹر گاندھی نے حکومت برطانیہ کو بغاوت کی کھلم کھلا دھمکیاں دینی شروع کر دیں اور انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ وہ فی الفور ہندوستان چھوڑ دیں۔ چنانچہ ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں کانگرس کا اجلاس منعقد ہوا اور اس میں مجلسِ عاملہ کی یہ قرارداد منظور کر لی گئی کہ انگریزوں کو چاہئیے کہ وہ فوراً ہندوستان سے چلے جائیں۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو سارے ملک میں عدم تشدد کے اصولوں پر سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی جائے مگر کانگرس کے اندازے غلط ثابت ہوئے اور ۹ اگست ۱۹۴۲ء کی صبح کو مسٹر گاندھی اور کانگرس کی مجلس عاملہ کے ممبر گرفتار کر لئے گئے۔[۲] اس میں شک نہیں کہ حکومت کے اس اقدام کے نتیجے میں اس سرے سے اس سرے تک آگ لگ گئی۔ ریلوے لائینیں اکھیڑی جانے لگیں۔ ڈاک خانے اور دوسری سرکاری عمارتیں نذرِ آتش ہونے لگیں۔ سرکاری حکام پر قاتلانہ حملے کئے گئے اور بہت سے انگریز حکام قتل بھی ہوئے۔ جیل خانے سیاسی قیدیوں سے بھر گئے۔ سارا ملک بدنظمی اور لاقانونیت کی زد میں آ گیا مگر حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی اور اس نے پوری قوت اور نہایت سختی سے چند ہی ہفتوں میں اس ملک گیر بغاوت کو کچل دیا۔

اہنسا کی حقیقت

اس تحریک کی روحِ رواں مسٹر گاندھی تھے اور ہر شخص کو معلوم ہے کہ وہ اہنسا یعنی عدم تشدد کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔ انہوں نے میدانِ سیاست میں قدم رکھنے کے بعد سے لے کر زندگی کے آخری لمحے تک ایک ہی درس دیا کہ برائی اور ظلم و تشدد کا مقابلہ نیکی، پیار اور عدم تشدد سے کیونکہ حقیقی کامیابی کا یہی راستہ ہے۔ انہوں نے اپنی مختلف تقریروں اور تحریروں میں منش (انسان) کا خون بہانے کو سب سے بڑا جرم قرار دیا حتیٰ کہ جنگِ عظیم ثانی کے آغاز میں تو انہوں نے ہر ایسے اقدام سے گریز کرنے کا اعلان کیا جس کے نتیجے میں حکومتِ برطانیہ کے لئے پریشانیاں پیدا ہوں مگر جب حکومت نے کانگرس کی من مانی شرائط پر ہندوستان کو آزادی دینے سے انکار کر دیا تو یہی مسٹر گاندھی حکومت کے لئے نہ صرف پریشانیاں پیدا کرنے کے لئے میدان میں آگئے بلکہ برطانیہ کے تسلط سے ملک کو آزاد کرانے کی مہم کا اعلان کر دیا مگر انہوں نے ابتدا ہی اس اعلان کو پُرامن جدوجہد تک محدود رکھا۔ اس وقت تک مسٹر گاندھی انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کا جو حربہ استعمال کرنا چاہتے تھے بظاہر اس میں تشدد یا توڑ پھوڑ کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ ان کی تحریک کا مقصد صرف اتنا بیان کیا گیا تھا کہ لوگ حکومت سے تعاون کرنا چھوڑ دیں۔ چنانچہ آندھرا صوبہ جاتی کانگرس کمیٹی نے ۲۹ جولائی ۱۹۴۲ء کو تمام ڈسٹرکٹ کانگرس کمیٹیوں کے

---

[۱] انڈیا ونس فریڈم صہ ۷۵ [۲] ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا صہ ۸۳

نام جو ہدایات جاری کیں ان میں یہ نوٹ دیا گیا تھا کہ ریل کی پٹڑیاں نہ اکھاڑی جائیں اور نہ ریل کی سڑک میں کوئی رکاوٹ پیدا کی جائے۔ اس کا خاص لحاظ رکھا جائے کہ کوئی جان نہ ضائع ہونے پائے[1]" لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ ہدایات صرف دنیا کو دکھانے کے لئے تھیں ورنہ کانگرس اور مسٹر گاندھی کا ظاہر و باطن کبھی ایک نہیں رہا۔ کانگرس اور مسلم لیگ میں مفاہمت نہ ہونے کا سبب سے بڑا سبب انہی مہاتما جی کی شخصیت ہے۔ ان کی دوہری اور خول دار شخصیت اس وقت پوری طرح نمایاں ہوئی جب کانگرس نے اپنی کے ایما پر سول نافرمانی کی تحریک شروع کی اور وہ مسٹر گاندھی جو تمام عمر اہنسا کا پرچار کرتے رہے رات کی رات میں یوں بدل گئے گویا انہوں نے دوسرا جنم لیا تھا چنانچہ ایک صبح کو جب لوگ نیند سے بیدار ہوئے اور مسٹر گاندھی کا اخبار ہریجن اٹھا کر دیکھا تو وہ یہ اعلان پڑھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ:

مسٹر گاندھی اصلی روپ میں

"میں نے بہت لمبا انتظار کیا کہ ہندوستان میں اہنسا (عدم تشدد) کی ایسی طاقت پیدا ہو جائے جس سے غیر ملکی غلامی کا جُوا اتر جائے مگر اب میں اپنا طرزِ عمل بدلنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ مجھ میں کچھ اس قسم کا احساس پیدا ہو گیا ہے جیسے کہ مزید انتظار کرنا میرے لئے ممکن نہیں رہا کیونکہ اس طرح تو مجھے قیامت تک انتظار کرنا پڑے گا۔ جس مقصد کے لئے میں نے کام کیا اور دعا بھی کی شاید وہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہو سکے گا اور اس مدت میں میں بھی ان شعلوں کی نذر ہو جاؤں گا جو ہم سب کو بھسم کرنے کے لئے لپکتے چلے آ رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں لوگوں سے مطالبہ کروں کہ غلامی کے مقابلے کے لئے اٹھ کھڑے ہو اگرچہ اس میں بہت سے خطرات ہیں[2]"

اہنسا کا یہ پرچارک اتنی جلد کیوں بدل گیا صرف اس لئے کہ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ برطانیہ اس وقت سخت مشکلات میں پھنسا ہوا ہے۔ اس سے قبل وہ اہنسا کا پرچار اس لئے کرتا تھا کہ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے تشدد یا کھلم کھلا بغاوت کا نام بھی لیا تو حکومت اسے اور اس کے پیروؤں کو ایسی عبرتناک سزا دے گی کہ آنے والی نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔ لیکن اب اہنسا کا یہ پجاری اپنا اصلی خول اتار کر اپنی حقیقی شکل و صورت میں نمودار ہو چکا تھا چنانچہ کانگرس ورکنگ کمیٹی میں سول نافرمانی کی تجویز منظور ہونے کے بعد مسٹر گاندھی نے واردھا میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے جو بیان دیا وہ اس دعوے کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ مسٹر گاندھی کا اصولِ عدم تشدد صرف اس وقت تک کے لئے تھا جب تک کانگرس کمزور اور حکومت طاقتور تھی۔ مگر جب حکومت کمزور ہو گئی تو انہوں نے فوراً اس اصول کو ترک کر کے اس کے بالکل برعکس راستہ اختیار کیا۔ انہوں نے کہا۔

---

[1] "کانگرس کی ذمہ داری متعلق فسادات سنہ ۱۹۴۲ء-۱۹۴۳ء" صفحہ ۱۰۳ ناشر مینیجر مطبوعات حکومت ہند نئی دہلی

[2] ہریجن بابت ۷ر جون سنہ ۱۹۴۲ء

"اس تجویز کے واپس لینے یا اس کے متعلق گفت و شنید کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اب کسی مزید موقع کا سوال ہی نہیں۔ یہ ایک علانیہ بغاوت ہے۔"[1]

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قائد اعظم، مسلم لیگ اور ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کا سابقہ اس قسم کے لیڈر سے پڑا تھا جس کے قول اور فعل میں کوئی مطابقت نہ تھی اور جو سیاست میں ہر چیز کو روا رکھتا تھا۔ اب ذیل میں اختصار سے ایسے واقعات اور کانگرس کی طرف سے جاری ہونے والی ایسی خفیہ ہدایات درج کی جاتی ہیں جن سے اس جماعت کی منافقت اور اہنسائی حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔

غارت گری کی تحریک

بمبئی کانگرس کی طرف سے گجرات صوبائی کانگرس کے نام ۱۲ اگست کو ایک خفیہ سرکلر جاری ہوا جس میں ہدایت کی گئی تھی کہ "اہم دفتروں، ڈاک خانوں، سرکاری عمارتوں اور ریلوں وغیرہ کو جلا ڈالو، پتھر رکھ کر گاڑیوں کو پٹڑی سے اتار دو، رسل و رسائل کے ذرائع کاٹ ڈالو۔"[2]

مسٹر گاندھی نے گرفتاری کے بعد جیل جاتے وقت قوم کو جو بیان دیا اسے کانگرس نے ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا جس کا عنوان تھا "گاندھی بابا کے چھ اپدیش"۔ یہ اپدیش کیا تھے "ستیہ گرہی کو اس جہم میں مرنے کے لئے شریک ہونا چاہیئے نہ کہ زندہ رہنے کی امید میں، گورنمنٹ کے نظم و نسق کو تباہ کر ڈالو، ٹریم، ریل گاڑیوں اور موٹر سروسوں کو توڑ پھوڑ ڈالو، ہر ممکن وسیلے سے ہر ہر کونے تک حکومت کے خلاف اس کھلی بغاوت کی خبریں پہنچاؤ۔"[3]

قتل و غارت گری کے واقعات

یہاں تک تو مسٹر گاندھی اور کانگرسی دفاتر کی طرف سے جاری ہونے والی ہدایات کے چند نمونے پیش کئے گئے۔ اب ذیل میں نہایت اختصار کے ساتھ چند ایسے واقعات درج کئے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوگا کہ اہنسا یا عدم تشدد کے پجاریوں نے ملک کی آزادی کی خاطر نہیں بلکہ ہندوؤں کی آزادی کی خاطر کیسے کیسے "امن پسندانہ" کارنامے سر انجام دیئے۔

"۱۴ اگست کو رام ٹیک میں دو تین ہزار کے مجمع نے تحصیل، دیوانی عدالت، تھانہ، ڈاک خانہ اور ریلوے اسٹیشن کو آگ لگا دی۔ اسٹیشن پر کھڑی ایک ٹرین کو جلا ڈالا۔" بہار میں مسٹر جگ لال چودھری نے جو ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک کانگرسی وزیر رہ چکے تھے ایک مجمع کو اکسا کر ضلع سارن کے ایک تھانے میں آگ لگوا دی اور حملہ کے دوران میں مجمع سے کہا کہ سب انسپکٹر کو بورے میں باندھ کر دریا میں ڈال دو۔" مسٹر جگت لال نرائن نے جو کانگرسی وزارت میں پارلیمنٹری سیکرٹری رہ چکے تھے اور جنہوں نے ۲ مئی ۱۹۴۲ء کو الہ آباد میں آل انڈیا کانگرس

---

[1] ،[2]، [3] کانگرس کی ذمہ داری متعلق فسادات ۱۹۴۲ء، ۱۹۴۳ء ص ۲۶، ۴۸، ۱۵۰

کمیٹی کے اجلاس میں مسٹر راج گوپال آچاریہ کی پاکستان والی تحریک کے خلاف تجویز پیش کی تھی ۱۲ اگست کو پٹنہ کے علاقے میں لوگوں کو ابھار کر لوٹ مار اور آتش زنی کرائی۔" "ضلع بلیا میں ایک انبوہ نے مقامی کانگرسیوں کی سرکردگی میں چار سرکاری اور دو غیر سرکاری باشندوں کے مکان لوٹ لیے۔ موخر الذکر میں ایک ڈاکٹر بھی تھا جس کا سارا دواخانہ تباہ کر دیا گیا۔" "ضلع پیلی بھیت میں ایک مشتعل ہجوم نے دو تین معروف کانگرسیوں کی ہدایت پر ایک کانسٹیبل کو مار ڈالا محض اس جرم میں کہ وہ کانسٹیبل تھا۔" "ضلع بروچ میں تقریباً پچھتر آدمیوں کے ایک مسلح گروہ نے جس کے آگے آگے دو کانگرسی لیڈر تھے ایک تھانے پر دھاوا بول دیا اردلی کو جو بچ کر بھاگنا چاہتا تھا گولی مار کر زخمی کر دیا گیا ایک اور مجمع نے انہی کانگرسی لیڈروں کی سرکردگی میں واگرہ تعلقہ کی ایک پولیس چوکی پر حملہ کیا۔ سنتری کو مار ڈالا دوسرے سپاہیوں کو قابو کر لیا انہیں مارا پیٹا اور چوکی لوٹ لی۔" "ضلع مظفر پور کے مینار پور کے تھانے پر ۱۷ اگست کو چار پانچ ہزار کے مسلح مجمع نے حملہ کر دیا۔ تھانہ لوٹ لیا اور آگ لگا دی افسروں اور کانسٹیبلوں پر ٹوٹ پڑے اور تھانے دار کو زندہ جلا ڈالا۔" "صوبہ متوسط میں ایک سب انسپکٹر پولیس اور چار کانسٹیبل قتل کر دیئے گئے۔" چیمور کے بلووں میں ایک سب ڈویژنل مجسٹریٹ اور ایک نائب تحصیلدار کو جان سے مار ڈالا گیا —— اس کے بعد ہی ایک سرکل انسپکٹر اور ایک کانسٹیبل مارے گئے۔[1]

نظریۂ پاکستان کے خلاف جنگی مہم

یہ عدم تشدد کے علمبرداروں کی غارت گری اور قتل و خون ریزی کے چند واقعات ہیں۔ اگر ان تمام واقعات کی پوری تفصیل درج کی جائے تو کئی ضخیم کتابیں درکار ہوں گی۔ واضح رہے کہ آگ اور خون کا یہ طوفان صرف اس لئے برپا کیا گیا تھا کہ حکومت نے کانگرس کی تجاویز کیوں مسترد کر دیں اور ایسی تجاویز کیوں پیش کیں جن میں پاکستان کا اصول تسلیم کیا گیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ تحریک نظریۂ پاکستان کے خلاف ایک جنگی مہم تھی یہی وجہ ہے کہ مسلمان من حیث الجماعت اس تحریک سے لاتعلق رہے کیونکہ اس کی کامیابی کی صورت میں جہاں انگریز ہندوستان سے رخصت ہو جاتے وہاں مسلمانوں کی غلامی کی دستاویز پر بھی مہر لگ جاتی۔ کانگرس یہ تحریک جاری کر کے حکومت پر اپنی طاقت کا رعب ڈالنا اور اسے یہ بتانا چاہتی تھی کہ اس ملک کے عوام اس کی مٹھی میں ہیں، وہ جدھر چاہے اس سرکش گھوڑے کا رخ موڑ سکتی ہے۔ اس صورت میں مسلمانوں کا بہ حیثیت مجموعی اس تحریک میں شامل ہونا کانگرس کے اس غلط دعوے کی تائید کرنا اور اس کے ہاتھ مضبوط کرنے کے مترادف تھا تاکہ وہ ان مضبوط ہاتھوں سے مسلمان قوم کا گلا دبا دے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس خطرناک اور مسلم دشمن تحریک کے نتائج و عواقب پر غور کرنے کے بعد قائد اعظم کی زیر قیادت مسلم لیگ نے عام مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس مسلم کش تحریک میں شریک نہ ہوں۔

---

[1] کانگرس کی ذمہ داری متعلق فسادات ۱۹۴۲ء ۱۹۴۳ء از صہ ۵۳ تا صہ ۶۱

قائداعظم کا اندازِ فکر

یہ اندازِ فکر وعمل تو کانگریس کا تھا کہ اس نے انگریزوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ملک کو تباہی کے عمیق غار میں دھکیل دیا اور پھر یہ تحریک عظیم جانی ومالی نقصان اٹھانے کے باوجود ناکام رہی۔ بر عکس اس کے قائداعظم اور مسلم لیگ نے اس موقع پر نہایت شریفانہ، عاقلانہ اور اس کے ساتھ ساتھ نہایت غیرت مندانہ طرزِ عمل اختیار کیا۔ قائداعظم سیاست میں شرافت کے قائل تھے وہ اسے انسانیت اور اخلاق دونوں سے بعید سمجھتے تھے کہ اگر دشمن کے گھر میں آگ لگ جائے تو بجائے بجھانے کے اس پر تیل چھڑکنا شروع کر دیا جائے یا ایسی حالت میں اس پر حملہ کر دیا جائے۔ چنانچہ جس وقت دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تو قائداعظم نے انگریزوں کو پریشان کرنے یا ان کی مساعیٔ جنگ کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوئی کوشش نہ کی بلکہ صوبائی مسلم لیگی وزارتوں کو اجازت دے دی کہ وہ اس جنگ میں حکومت سے تعاون کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے حکومت سے گفت وشنید بھی جاری رکھی تاکہ جنگ ختم ہونے کے بعد مسلمانوں اور حکومت میں کوئی ایسا آبرومندانہ سمجھوتا ہو جائے جس کے نتیجے میں مسلمان آزاد اسلامی مملکت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور اس مملکت میں اپنی قومی ودینی روایات کے مطابق زندگی گذار سکیں۔ اس سلسلے میں قائداعظم اور وائسرائے ہند میں جو خط وکتابت ہوئی اس کے مطالعے سے اس حقیقت کا اندازہ ہو جائے گا کہ قائداعظم اس نازک اور مصیبت کے وقت حکومت کے لئے پریشانیاں پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ مسلمان قوم کے وقار اور مسلم لیگ کی آن پر بھی آنچ نہیں آنے دینا چاہتے تھے مزید یہ کہ قائداعظم اور مسلم لیگ کو صرف مسلمانانِ ہند ہی کا مفاد عزیز نہیں تھا بلکہ فلسطین کے مسلمانوں اور تمام عالمِ اسلام کی فلاح اور ان کا تحفظ قائداعظم اور مسلم لیگ کا مطمحِ نظر تھا۔ ذیل میں یہ خط وکتابت درج کی جاتی ہے۔ پہلا خط قائداعظم کا وائسرائے کے نام ہے

"نئی دہلی ۵ر نومبر ۱۹۳۹ء ڈیرلارڈ لن لتھ گو!

۴ر نومبر کو میرے اور آپ کے درمیان جو ملاقات ہوئی تھی اس میں اس مسئلے پر اچھی طرح بحث ہوگئی تھی اور اب میں یور ایکسی لینسی کی خواہش کے مطابق ذیل کے معاملات آپ کے غور اور جلد سے جلد جواب کے لئے پیش کر رہا ہوں۔

(۱) یہ کہ جیسے ہی حالات اجازت دیں یا جنگ کے فوراً بعد گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء سے قطع نظر ہندوستان کے آئندہ دستور کے پورے مسئلہ کی ازسرِنو جانچ کی جائے گی اور اس پر غور کیا جائے گا۔

(۲) یہ کہ ملک معظم کی گورنمنٹ یا پارلیمنٹ میں ہندوستان کی دو بڑی قوموں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کی رضامندی اور منظوری کے بغیر اصولاً یا کسی اور طرح نہ کوئی اعلان کیا جائے گا اور نہ کوئی دستور بہ صورت قانون منظور کیا جائے گا۔

(۳) یہ کہ ملک معظم کی گورنمنٹ کو چاہیئے کہ فلسطین کے عربوں کے تمام معقول قومی مطالبات پورے کرے۔

(۴) یہ کہ ہندوستانی فوجوں سے ہندوستان کے باہر کسی اسلامی ملک یا سلطنت کے خلاف کام نہیں لیا جائے گا۔

آپ کا مخلص ایم اے جناح"

قائد اعظم کے اس خط کا جواب وائسرائے ہند نے ۱۳ر دسمبر کو دیا۔

"کیمپ وائسرائے ہندوستان، کلکتہ مورخہ ۱۳ر دسمبر ۱۹۳۹ء

اب میں اس قابل ہوں کہ آپ کے خط مورخہ ۵ر نومبر کا جس میں آپ نے بعض معاملات میرے غور کے لئے پیش کئے ہیں جواب دے دوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ یہ مانیں گے کہ آپ کے خط میں ایک سے زیادہ ایسے مسائل ہیں کہ اگر ان پر تمام باتوں کی روشنی میں غور کیا جائے جو ان میں مضمر ہیں تو اس کا اثر ہندوستان کے دوسرے فرقوں پر پڑے گا اور نیز آپ یہ بھی مانیں گے کہ میری اور آپ کی باہمی خط و کتابت کا ان مسائل پر اعلان مناسب نہیں لیکن مجھے یہ امید ہے کہ میرے جوابات سے اگرچہ وہ معناً محدود ہیں آپ کی دشواریاں رفع ہو جائیں گی۔
آپ کے پہلے سوال کا میری طرف سے یہ جواب ہے کہ میں نے ملک معظم کی منظوری سے ۱۸ر اکتوبر کو جو اعلان کیا تھا اس سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے کسی جزو کی، یا اس پالیسی کی جس پر وہ مبنی ہے جانچ خارج نہیں ہے۔
آپ کی دوسری بات کے متعلق میں یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ ملک معظم کی گورنمنٹ کو اس معاملے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے کہ ہندوستان کے آئینی استحکام اور ترقی کے لئے آپ کی قوم کا مطمئن ہونا کس قدر اہم ہے لہذا آپ کو اس بات سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ ہندوستان میں اپنی حیثیت کی وجہ سے آپ کی قوم کی رائے کا جو وزن ہے وہ گھٹایا جائے گا۔
فلسطین کے متعلق اپنی پالیسی قائم کرنے میں ملک معظم کی گورنمنٹ نے عربوں کے تمام معقول مطالبات پورے کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کو اس مسئلے کی اہمیت کا احساس ہے۔ آخر میں آپ نے یہ ضمانت چاہی ہے کہ ہندوستانی فوجیں کسی مسلم حکومت یا کسی ملک کے خلاف ہندوستان سے باہر استعمال نہیں کی جائیں گی۔ خوش نصیبی ہے چونکہ ملکِ معظم کی گورنمنٹ کسی مسلم حکومت سے برسرپیکار نہیں ہے لہذا یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہرکیف آپ مانیں گے کہ ایسی وسیع شرائط میں اس کی ضمانت جو آپ کے خط میں درج ہے ممکن نہیں جس کا اثر یہ ہوگا کہ ہندوستان کو اپنے تحفظ میں اور ایسے حالات میں جنہیں کوئی پہلے سے نہیں جان سکتا اپنی فوجیں استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں رہے گا لیکن موجودہ حالات میں جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا کی خواہش پر ملک معظم کی گورنمنٹ اس کی پوری احتیاط کر رہی ہے کہ مسلمانانِ ہند کے جذبات کا پورے طور پر احترام کیا جائے گا۔"[1]

اس سے قبل قائد اعظم اور وائسرائے کی ملاقات ہو چکی تھی اور اس خط کے بعد بھی دونوں کے درمیان بالمشافہ گفتگو ہوتی حکومت کانگرس کو پیشکش کر چکی تھی کہ وہ دوبارہ صوبائی وزارتیں بنالے اور مرکزی وزارت میں بھی اسے شریک ہونے کی دعوت دی گئی تھی مگر چونکہ کانگرس بلا شرکت غیرے اقتدار کی خواہاں تھی اس لئے وائسرائے کی یہ کوشش ناکام رہی۔ اب قائد اعظم کو دعوت دی گئی۔ قائد اعظم کا موقف یہ تھا کہ مسلم لیگ جنگ میں

---

[1] حیاتِ محمد علی جناح ص ۳۰۷ تا ۳۱۰

حکومت کی ہر ممکن امداد کے لئے تیار ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ اسے صوبائی اور مرکزی وزارتوں میں موثر نمائندگی دی جائے اور حکومت اعلان کر دے کہ جنگ ختم ہونے کے بعد ہندوستان کی تقسیم عمل میں لائی جائے گی۔ وائسرائے نے یہ شرائط قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ اور حکومت میں کوئی مفاہمت نہ ہو سکی مگر اس کے باوجود قائد اعظم یا مسلم لیگ نے حکومت کو پریشان کرنے کے لئے سول نافرمانی کی باغیانہ تحریک کی دھمکی نہیں دی۔ البتہ جب مرکزی اسمبلی میں یہ معاملہ زیر بحث آیا اور بعض انگریز ممبروں نے جرمنوں کے مظالم اور بربریت کے واقعات سنا کر اہل ہند کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کی، انہیں طرح طرح کی دھمکیاں دیں تو قائد اعظم نے ایک غیرت مند اور خود دار قوم کے خود دار رہنما کی حیثیت سے اعلان کیا کہ "ہم اپنی جیب کی آخری پائی اور اپنے خون کا آخری قطرہ اس جنگ میں صرف کرنے کو تیار ہیں لیکن شریک اختیار بن کر تابعِ اقتدار بن کر نہیں۔" انہوں نے ۹ نومبر ۱۹۴۰ء کو مرکزی اسمبلی کے ایک اجلاس میں تقریر کی۔ ان کی تقریر سے قبل ایک یورپین نمائندہ مسٹر پی جے گرفتھس نے یہ کہہ کر اہلِ ہند کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ اگر جرمنی جیت گیا تو وہ ہندوستان پر بڑے مظالم کرے گا اور یہاں اب تک جتنی اصلاحات ہوئی ہیں وہ سب غارت ہو جائیں گی۔ قائد اعظم نے اس کے جواب میں نہایت جرأت مندی سے کام لیتے ہوئے فرمایا۔

قائد اعظم کی جرأت رندانہ

"اگر حکومت مجھے اس دلیل سے خوفزدہ کرنے کی کوشش کرے گی کہ اگر انگلستان ہار گیا تو ہندوستان کا کیا حال ہوگا تو میں یہ جواب دوں گا کہ میں ہرگز انگلستان کی شکست نہیں چاہتا میں نے ایسا کبھی نہیں کہا ہے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ اگر انگلستان کو شکست ہو گئی تو زیادہ نقصان میں کون رہے گا میں یا تم؟ —— اگر انگلستان کو شکست ہو گئی تو انگلستان نہ صرف اپنی آزادی اور خود مختاری سے محروم ہو جائے گا نہ صرف وہ نازیوں کی ٹھوکر تلے آجائے گا بلکہ اس کے پاس کچھ بھی باقی نہ رہ جائے گا۔ کیا میں حکومت سے یہ نہ کہہ دوں کہ مجھ سے زیادہ خطرے میں تم گھرے ہوئے ہو۔"[1] اسی دوران میں قائد اعظم نے غیر ملکی نامہ نگاروں کو ایک بیان دیا جس میں انہوں نے کانگرس کی سول نافرمانی کی دھمکی اور ملک گیر بغاوت کے اعلان پر اظہار خیال کرتے ہوئے اسے مسلمانوں کے خلاف بھی اعلان جنگ قرار دیا۔ ان کے بیان کا ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"کانگرس نے حکومتِ برطانیہ کو چیلنج دیا ہے اور وہ اس چیلنج کو قبول کرنے کی پوری طاقت رکھتی ہے لیکن یہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بھی ایک چیلنج ہے کیونکہ مسٹر گاندھی نے یہ اقدام مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کیا ہے اور ان کے مطالبات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس کا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ ہر ممکن طریقے سے ایسے

---

[1] تاریخِ مسلم لیگ صفحہ ۳۱۱

حالات پیدا کر دیئے جائیں جن کے نتیجے میں پاکستان کی اسکیم غارت ہو جائے۔"[1]

اگر غور سے دیکھا جائے تو کانگرس اور حکومت دونوں پاکستان کی اسکیم کو غارت کرنے پر تلے بیٹھے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قائدِ اعظم نے دونوں کو مخاطب کیا اور صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ ہو یا جنگ میں شرکت کا کوئی مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک ہندوستان کے ۱۰ کروڑ مسلمانوں کے مطالبات تسلیم نہ کر لئے جائیں۔

مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا فیصلہ

کانگرس کی دھمکیوں اور کرپس مشن کی ناکامی سے پیدا ہونے والی صورت حال پر غور و خوض کرنے کی غرض سے بمبئی میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ۱۶ اگست ۱۹۴۲ء کو منعقد ہوا۔ قائدِ اعظم نے اس اجلاس کی صدارت فرمائی۔ اس میں جو قرارداد منظور ہوئی اس کے بعض اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں تاکہ ان کے مطالعے سے اندازہ کیا جا سکے کہ اس دور میں مسلم لیگ نے کیا کردار ادا کیا اور مسلم لیگی رہنماؤں کا طرزِ فکر کیا تھا۔

"یکم مئی ۱۹۴۲ء کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے اپنی قرارداد میں مسلمانانِ ہند کے حقِ خود ارادیت کو رد کر دیا ہے ــــ اور اس کی بجائے یہ نقطۂ نظر اختیار کیا ہے کہ جب تک برطانیہ حکومتِ ہندوستان سے دست بردار نہیں ہو جاتا اس وقت تک ہندو مسلم مسئلہ حل نہیں ہو سکتا ــــ مسلمان ہندوستان کی آزادی کے معاملے میں کسی جماعت سے ہرگز پیچھے نہیں اور یہ مسلم لیگ کا عقیدہ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے قطعی طور پر یقین ہے کہ کانگرس کی یہ تحریک در اصل ہندو راج کے قیام کے لئے جاری کی گئی ہے تاکہ مسلمانوں کے نصب العین یعنی پاکستان پر کاری ضرب لگائی جائے ــــ مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کی یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ اگر حکومت مساعیٔ جنگ میں مسلمانوں کا پُرجوش تعاون چاہتی ہے جس سے جنگی کوششوں میں طاقت پیدا ہو جائے تو مسلمان ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہیں مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس تعاون اور قربانی کے نتیجے میں وہ اپنا نصب العین یعنی پاکستان حاصل کر سکیں گے۔ مسلم لیگ حکومت سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ فوری طور پر ایسا غیر مبہم اعلان کرے جو مسلمانوں کے حقِ خود ارادیت کا ضامن ہو اور اس اعلان میں اس امر کی بھی ضمانت دی گئی ہو کہ قراردادِ لاہور کے مطابق پاکستان کی اسکیم کے بنیادی اصولوں کو تسلیم کر لیا جائے گا۔"[2]

---

[1] ریسینٹ اسپیچز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح جلد ۱ صفحہ ۴۳۹

[2] آل انڈیا مسلم لیگ کی قراردادیں اپریل ۱۹۴۲ء تا مئی ۱۹۴۳ء صفحہ ۹-۱۰

نظریہ پاکستان کے خلاف سازش

لارڈ ویول اور مسٹر گاندھی کی مراسلت

جب کانگرس کی تحریک ناکام ہو گئی اور ہندوستان کی سیاسی فضا پر ایک یاس انگیز سناٹا چھا گیا۔ کانگرس کے بڑے بڑے لیڈر جیل میں بند تھے اور سول نافرمانی کی تحریک اپنی موت مر چکی تھی تو مسٹر گاندھی نے اس ساکن سمندر میں پھر تموج پیدا کیا۔ اب لارڈ لن لتھگو ہندوستان سے رخصت ہو چکے تھے اور لارڈ ویول نئے وائسرائے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں سنبھال چکے تھے۔ ۱۷ر جون ۱۹۴۴ء کو مسٹر گاندھی نے آغاخان کے محل سے جہاں وہ نظر بند تھے لارڈ ویول کو ایک خط لکھا کہ ان سے کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے اراکین کو جیل میں ملاقات کرنے کی اجازت دی جائے تاکہ آئندہ کے طریق کار کے بارے میں وہ اپنے رفقائے کار سے مشورہ کر سکیں۔ وائسرائے نے یہ درخواست مسترد کر دی۔ مسٹر گاندھی نے پھر لارڈ ویول کو ایک خط لکھا جس میں اپنی پہلی درخواست دہرانے کے ساتھ ساتھ یہ اضافہ کیا کہ وہ کانگرس اور حکومت کی کشیدگی اور ہندوستان کے سیاسی بحران ختم کرنے کے سلسلے میں کچھ تجاویز بھی پیش کریں گے۔ اس کے جواب میں وائسرائے نے مسٹر گاندھی کو مطلع کیا کہ اگر وہ تعمیری تجاویز پیش کرنا چاہیں تو ان پر غور کیا جائے گا۔

اس خط کے جواب میں مسٹر گاندھی نے وائسرائے کو لکھا کہ وہ کانگرس کی مجلس عاملہ کو سول نافرمانی کی تحریک ختم کرنے اور جنگ میں حکومت کے ساتھ تعاون کرنے کا مشورہ دینے کو تیار ہیں۔ بشرطیکہ ہندوستان کو مکمل آزادی دینے کا فوری طور پر اعلان کر دیا جائے۔ یہ قومی حکومت مرکزی اسمبلی کے سامنے جواب دہ ہو۔ لیکن جنگ کے مصارف کا مالی بوجھ ہندوستان پر نہ ڈالا جائے۔ [1]

مسٹر گاندھی کے اس خط کے جواب میں وائسرائے نے انہیں مطلع کیا کہ آپ کی تجاویز میں کوئی نئی بات نہیں۔ یہ وہی تجاویز ہیں جو کانگرس نے کرپس مشن کو پیش کی تھیں اور مذکورہ مشن کی ناکامی پر منتج ہوئی تھیں۔ ملک معظم کی حکومت نے اہل ہند کو جس قسم کے دستور کی پیش کش کی تھی اس کے لئے ملک کے تمام بڑے بڑے

---

[1] دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا صفحہ ۱۶۱

فرقوں کا اتفاق ضروری تھا تاکہ پست اقوام اور اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جا سکے۔ حکومت برطانیہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے اختیارات اس وقت تک اہلِ ہند کے حوالے نہیں کر سکتی جب تک کہ دستوری تبدیلی عمل میں نہ لائی جائے اور یہ دورانِ جنگ ممکن نہیں۔

وائسرائے کے اس خط کے جواب میں مسٹر گاندھی نے حکومت پر الزام لگایا کہ وہ ہندوستان کے چالیس کروڑ عوام کو اپنے اقتدار کے پنجے سے آزاد کرنا نہیں چاہتی۔[1] اس طرح وائسرائے اور مسٹر گاندھی کے درمیان مراسلت ختم ہو گئی۔

راجہ جی کا فارمولا

وائسرائے ہند کی طرف سے جواب صاف پا کر مسٹر گاندھی نے ایک نئی چال چلی۔ اب کی بار انہوں نے مسٹر راج گوپال اچاریہ کو واسطہ بنا کر قائد اعظم سے رابطہ قائم کیا اور راج گوپال اچاریہ نے قائد اعظم کو لکھا کہ گاندھی جی اور میرے درمیان مارچ ۱۹۴۳ء میں ہندو مسلم سمجھوتہ کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی اور ہم دونوں نے ایک ایسی بنیاد تلاش کر لی ہے جو دونوں فرقوں کے لئے اتحاد و اتفاق کا باعث بن سکتی ہے۔ چونکہ گاندھی جی پر پابندیاں عائد ہیں اس لئے انہوں نے مجھے اختیار دیا ہے کہ میں ان کی طرف سے آپ کو یہ خط لکھوں۔ اس کے جواب میں قائد اعظم نے مسٹر راج گوپال اچاریہ کو لکھا کہ آپ کی تجاویز پر غور و خوض کرنے کے لئے مسلم لیگ کا اجلاس بلانا ضروری ہے۔ اپنی مجلسِ عاملہ کے مشورے کے بغیر میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ مسٹر اچاریہ نے یہ تجویز ماننے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بات جہاں تھی وہیں رہی۔

پاکستان کا اصول منظور؟

مسٹر گاندھی نے راج گوپال آچاریہ کی معرفت قائد اعظم کو ہندو مسلم مفاہمت کے سلسلے میں جو تجاویز بھیجی تھیں ان میں کہا گیا تھا کہ یہ وہ تجاویز ہیں جن پر مسٹر گاندھی اور مسٹر جناح کے درمیان اتفاق ہو گیا ہے اور یہ دونوں کانگرس اور مسلم لیگ کے نمائندہ اجلاسوں میں پیش کر کے انہیں منظور کرائیں گے۔ پہلی تجویز یہ تھی کہ ہندوستان کے شمال مشرق اور شمال مغرب کے متصلہ اضلاع کے لئے جن میں مسلمان اکثریت میں ہیں ایک کمیشن کا تقرر کیا جائے گا جو ان علاقوں کے تمام باشندوں سے استصواب رائے کر کے معلوم کرے گا کہ وہ ہندوستان سے الگ ہونا چاہتے ہیں یا نہیں۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ الگ ہونے کی صورت میں سرحدی علاقے کے باشندوں کو اختیار ہو گا کہ وہ دونوں میں سے جس یونین کے ساتھ چاہیں الحاق کر لیں۔ تیسری تجویز یہ تھی کہ اگر علیحدگی کا فیصلہ ہو گیا تو دفاع، تجارت اور مواصلات وغیرہ سے متعلق امور کے بارے میں دونوں وفاقوں میں ایک معاہدہ کیا جائے گا۔ ایک تجویز یہ

---

[1] دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا صفحہ ۱۴۷

بھی تھی کہ دونوں ریاستوں کے باشندے اپنی خوشی سے تبادلۂ آبادی کر سکیں گے۔ ؎

قطع نظر اس سے کہ ان تجاویز میں کتنی خامیاں تھیں اور قائد اعظم اور مسلم لیگ کو فریب دینے کی کتنی کوشش کی گئی تھی۔ ان تجاویز سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ گاندھی جی نے پاکستان کا اصول تسلیم کر لیا تھا اور وہ اس کے لئے آمادہ ہو گئے تھے کہ اگر ہندوستان کے شمال مشرقی اور شمال مغربی علاقوں کے مسلم اکثریت والے علاقوں کے باشندے اپنی آزاد اور خود مختار ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں تو مسٹر گاندھی کو اس سے اتفاق ہوگا۔ یہ بظاہر مسلم لیگ اور ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی یہ بہت بڑی فتح تھی کہ جو شخص ہندوستان کی تقسیم کا نام سننا گوارا نہ کرتا تھا اور جسے اس تجویز سے بقول اس کے دحشت ہوتی تھی اب وہ اسے منظور کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ بھی ایک دھوکا تھا جو پاکستان کا نام لے کر مسلمانوں کو دیا جا رہا تھا۔

گاندھی جناح ملاقاتیں

مسٹر گاندھی نے وائسرائے کو اپنا ہم خیال بنانے کی جو کوششیں کی تھیں جب وہ اکارت ہو گئیں تو انہوں نے اپنا پرانا اور آزمودہ ہتھیار استعمال کیا یعنی آغا خاں کے محل میں جہاں وہ نظر بند تھے مرن برت رکھ لیا۔ لیکن جب اس برت سے مسٹر گاندھی کی حالت "نازک" ہو گئی تو حکومت نے انہیں رہا کر دیا۔ رہائی کے بعد ۱۷ر جولائی ۱۹۴۴ء کو انہوں نے قائد اعظم کی خدمت میں ایک خط لکھا کہ میں آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں، تاکہ دونوں بالمشافہ گفتگو کر کے اختلافی مسائل کو حل کر لیں۔ قائد اعظم نے ان کی دعوت قبول کر لی اور ۹ر ستمبر کو قائد اعظم کی قیام گاہ پر دونوں رہنماؤں کے درمیان پہلی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات سے قبل قائد اعظم نے ۳۰ر جولائی کو لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ مسٹر گاندھی نے ذاتی طور پر پاکستان کا اصول مان لیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسٹر گاندھی مسلمانوں کو ایک ایسا پاکستان دینا چاہتے ہیں جو کٹا پھٹا اور کرم خوردہ ہے۔ قائد اعظم نے اپنی تقریر میں مسٹر گاندھی کو متنبہ کیا کہ قرار داد لاہور کی بنیاد پر مسلم لیگ سے تعاون کریں۔

قائد اعظم اور مسٹر گاندھی کے درمیان ۹ ستمبر ۱۹۴۴ء سے ۲۷ر ستمبر ۱۹۴۴ء تک بات چیت جاری رہی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور اس گفتگو کے دوران مسٹر گاندھی نے طرح طرح کے رنگ بدلے۔ کبھی انہوں نے ہندوستان کو ناقابلِ تقسیم قرار دیا۔ کبھی دو قومی نظریے کا انکار کیا اور آخر میں تقسیم ملک کے اس فارمولے ہی سے منحرف ہو گئے، جسے وہ خود تسلیم کر چکے تھے۔ آخر کار ۲۷ر ستمبر کو ایک بیان جاری ہوا۔ جس میں اس گفت و شنید کی ناکامی کا اعلان درج تھا۔

؎ گاندھی جناح مراسلت (۱۹۴۴ء) ص ۸۵، ۸۶

اس گفت و شنید کے دوران قائداعظم اور مسٹر گاندھی کے درمیان بعض امور پر خط و کتابت بھی ہوئی۔ اس خط و کتابت کے بعض حصے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ مسٹر گاندھی نے گفتگو کو طول دے کر دو افراد کا نہیں بلکہ دو قوموں کا کتنا وقت ضائع کیا اور پاکستان کا اصول تسلیم کرنے کا اعلان کرنے کے باوجود اس کی بنیادوں پر ضرب لگائی۔

مسٹر گاندھی کا خط

"آپ کو یہ اعتراف کرنا چاہیئے کہ تجویز (لاہور) میں کہیں دو قوموں کے نظریئے کا ذکر نہیں ہے۔ ہماری گفتگو کے دوران میں آپ نے بڑے جوش و خروش سے فرمایا کہ ہندوستان میں دو قومیں ہیں یعنی ہندو اور مسلمان اور اول الذکر (مسلمان قوم) کے وطنی خطے اس طرح ہندوستان میں موجود ہیں جس طرح موخرالذکر (ہندو قوم) کے وطنی خطے .... مجھے تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ اپنا مذہب بدل لینے والے لوگ اور ان کی اولاد اپنے آباؤ اجداد سے مختلف قوم ہونے کا دعویٰ کریں ——" (۱۵ ستمبر کا خط)

قائداعظم کا جواب

"ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ قوم کی جو بھی تعریف اور معیار ہو اس کے مطابق ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں ہیں۔ ہم دس کروڑ کی ایک قوم ہیں۔ ہماری تہذیب و تمدن، زبان و ادب، آرٹ اور فنِ تعمیر نام اور اصطلاحات، قدروں کی پرکھ، قانونی اور اخلاقی نظام، رسوم اور تقویم، تاریخ اور روایات، طبعی میلانات اور رجحانات سب (دوسروں سے) مختلف ہیں۔ مختصر یہ کہ ہمارا نظریۂ زندگی مختلف ہے۔ بین الاقوامی قانون کے ہر اصول سے ہم ایک قوم ہیں۔" (۱۷ ستمبر کا خط)

مسٹر گاندھی اور دو قومی نظریہ

"اگر تجویز لاہور کے مطابق وہ علاقے الگ کئے جائیں گے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے تو علیحدگی کے اس اہم مسئلے کو علاقے کے باشندوں کے سامنے پیش کرکے ان کی رضامندی حاصل کر لینی چاہیئے۔" (مسٹر گاندھی کا خط محررہ ۱۵ ستمبر)

قائداعظم کا جواب

"معلوم ہوتا ہے کہ "خود اختیاری" کے معنی کے متعلق آپ غلط فہمی میں مبتلا ہیں —— ہمارا مسئلہ کسی یونین سے جس کا ہندوستان میں وجود نہیں ہے علیحدگی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ دو بڑی قوموں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی معاہدے سے دو آزاد اور خود مختار ریاستوں کی تشکیل کی جائے۔ حق خود اختیاری جس کا ہم مطالبہ کر رہے ہیں —— یہ صرف مسلمانوں کا حق خود اختیاری ہوگا اور صرف انہی کو یہ حق برتنے کا اختیار ہوگا۔

مسٹر گاندھی کا نیا فارمولا

"عام طور سے مجھے آپ سے اختلاف ہے لیکن پھر بھی میں حسب ذیل شرائط پر کانگرس اور ملک سے سفارش کر سکتا ہوں کہ وہ علیحدگی کے اس مطالبہ کو مان لیں جو مسلم لیگ کی تجویز لاہور سنہ ۱۹۴۰ء میں ہے۔ کانگرس اور لیگ کا مقرر کیا ہوا ایک کمیشن (مسلم) علاقوں کی حد بندی کرے۔ علیحدگی کے متعلق حد بندی کے علاقوں کے باشندوں کی رائے دریافت کر لی جائے، اگر رائے علیحدگی کے حق میں ہو تو ہندوستان کے آزاد ہو جانے کے فوراً بعد یہ علاقے اپنی ریاست بنا لیں گے۔ اس طرح دو آزاد و خود مختار ریاستیں قائم ہو جائیں گی ـــــ آپ نے اپنے ۲۳ ستمبر کے خط میں تجویز لاہور کے بنیادی اصولوں کا حوالہ دیا تھا اور آپ چاہتے تھے کہ میں انہیں قبول کر لوں۔ یہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ میرا خیال ہے کہ میں نے ان تمام نتائج کو تسلیم کر لیا ہے جو ان اصولوں کو قبول کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ (۲۴ ستمبر کا خط)

قائداعظم کا جواب

مسٹر گاندھی نے بہ ظاہر پاکستان کا بنیادی اصول تسلیم کر کے مسلمانوں کے اس عظیم راہنما کو دھوکہ دینے کی جو کوشش کی تھی، ملاحظہ فرمائیے کہ اس زیرک قائداعظم نے اس کی کس طرح دھجیاں بکھیریں۔

"آپ نے تجویز لاہور کے بنیادی اصولوں کو (تسلیم نہیں کیا بلکہ انہیں) رد کر دیا ہے۔ آپ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مسلمان ایک قوم ہیں۔ آپ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مسلمانوں کو فطری طور سے خود ارادیت کا حق حاصل ہے۔ آپ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ صرف انہی (مسلمانوں) کو اپنا حق خود ارادیت استعمال کرنے کا حق ہے۔ آپ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ پاکستان دو علاقوں پر مبنی ہے۔ یعنی شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقے جن میں چھ صوبے یعنی سندھ، بلوچستان صوبہ سرحد، پنجاب، بنگال اور آسام شامل ہیں جیسا کہ لاہور کی تجویز سے ظاہر ہے ـــــ آپ کی خط و کتابت اور گفتگو سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہندوستان کو پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم کر دینے کا مسئلہ صرف آپ کی زبان پر ہے دل میں نہیں ـــــ اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ آپ نے لاہور کی تجویز کے عملی نتائج کو قبول کر لیا ہے تو پھر یہ کیوں نہ کیجئے کہ قرارداد لاہور کے بنیادی اصولوں کو قبول کر کے تفصیلات کا تصفیہ کر لیجئے[1] (۲۵ ستمبر کا خط)

قائداعظم کے اس مدلل اور مسکت خط کے بعد دونوں کے درمیان مراسلت ختم ہو گئی۔ گفتگو کا دروازہ بند ہو گیا۔ ملاقاتیں بے نتیجہ رہیں مگر ان کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ دنیا نے دیکھ لیا کہ مسٹر گاندھی قائداعظم کے دلائل کے آگے بالکل بے بس ہیں۔ نظریۂ پاکستان کو وہ درست تسلیم کرتے ہوئے تسلیم نہیں کرتے۔ اس سے قائداعظم کی

---

[1] قائداعظم اور مسٹر گاندھی کی یہ خط و کتابت تاریخ مسلم لیگ مولفہ سید رئیس احمد جعفری سے ماخوذ ہے۔

عظمت میں اور اضافہ ہوا مسلمانوں میں ان کی مقبولیت اور بڑھی۔ ایک غیر مسلم سیاست داں کے بقول" جناح گاندھی گفت وشنید کے نتیجے میں مسلم لیگ کا مطالبہ (پاکستان) معین صورت میں سامنے آگیا جس کی مسلم لیگ کی طرف سے آنی واضح تعریف نہیں کی گئی تھی۔ اس گفت وشنید نے مسلمان قوم کے دلوں میں مسٹر جناح کی حیثیت اور وقار میں کہیں اضافہ کر دیا" لہ

لیاقت ڈیسائی معاہدہ

۱۹۴۴ء میں دوسری جنگ عظیم کا پانسہ پلٹ چکا تھا۔ حالات انگریزوں کے حق میں نہایت ساز گار تھے۔ جرمنی مسلسل شکستوں سے دوچار ہو رہا تھا۔ اس کا کس بل نکل چکا تھا اور صاف نظر آرہا تھا کہ عنقریب وہ ہتھیار ڈال دے گا۔ یہ فتح جہاں انگریزوں کے لئے زندگی کا پیغام تھی وہاں اس سے نت نئے مسائل پیدا ہونے کا امکان تھا۔ اب تک جنگ کا خوفناک تصور پیش کرکے وائسرائے نے جو مخصوص اور ہنگامی اختیارات حاصل کر رکھے تھے۔ اختتام جنگ کے بعد ان کا کوئی جواز باقی نہیں رہ سکتا تھا۔ ادھر برطانوی فوجوں کے ہندوستانی سپاہیوں کی بیکاری سے روزگار کے مسائل پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خونناک جنگ کے آثار بھی صاف نظر آرہے تھے۔ جس کی کانگریس اور مہاسبھا دھمکیاں دے رہی تھیں۔ ان حالات میں وائسرائے نے نہایت ہوشیاری سے کام لے کر تمام کانگریسی اسیروں کو رہا کردیا اور وزیر ہند مسٹر ایمرے نے واشگاف الفاظ میں اعلان کردیا کہ ہندوستان کو مکمل آزادی دے دی جائے گی۔

اس کے بعد حکومت اور کانگریس کے درمیان گفت وشنید کا آغاز ہوا۔ حکومت نے کانگریس کو مرکزی اسمبلی میں شمولیت کی دعوت دی کانگریس نے یہ دعوت منظور کرلی۔ مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کانگریس اسمبلی پارٹی کے لیڈر تھے۔ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر نواب زادہ لیاقت علی خان تھے۔ ان دونوں رہنماؤں نے اپنے طور پر ہندو مسلم مسئلہ پر تبادلۂ خیال کیا تاکہ آزادی کی راہ میں حائل ہونے والے اس سنگ گراں کے ہٹ جانے سے دونوں قومیں آزاد فضا میں سانس لے سکیں۔ اس کے بعد مسٹر ڈیسائی نے ایک فارمولا مرتب کیا اور وائسرائے کے سیکرٹری سے مل کر یہ خوش خبری سنائی کہ ان کے فارمولے سے نواب زادہ لیاقت علی خاں نے اتفاق کرلیا ہے اس پر وزیر ہند نے وائسرائے کو لکھا کہ وہ مسٹر جناح اور مسٹر ڈیسائی سے ملاقات کرکے اس منصوبے کے متعلق گفتگو کریں۔ جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تو قائد اعظم نے اس فارمولے سے لاتعلقی کا اظہار کیا۔ ادھر نواب زادہ لیاقت علی خان نے اس فارمولے کے متعلق اپنا تردیدی بیان جاری کردیا اور کہا کہ یہ چند بنیادی

لہ دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا صفحہ ۱۹۴۶ مولفہ مسٹر مینن

امور تھے جن پر میرے اور مسٹر ڈیسائی کے درمیان نجی طور پر گفتگو ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نوابزادہ لیاقت علی خاں نے کسی دستاویز کی منظوری نہیں دی تھی اور نہ انہیں ایسا کہنے کا حق تھا جب تک کہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ اور قائداعظم اس کی منظوری نہ دے دیتے۔ اس طرح لیاقت ڈیسائی فارمولا ایک افسانہ بن کر رہ گیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس منصوبے کی چند بڑی بڑی دفعات ذیل میں درج کر دی جائیں تاکہ قارئین کو معلوم ہو جائے کہ جس منصوبے نے ہندوستان سے لے کر انگلستان کے قصرِ حکومت تک ایک ارتعاش پیدا کر دیا وہ کیا تھا۔ منصوبہ میں کہا گیا تھا کہ وائسرائے کی طرف سے مسلم لیگ اور کانگرس کو مرکزی حکومت بنانے کی دعوت دی جائے گی۔ یہ حکومت عبوری عرصے کے لئے ہوگی۔ مسٹر جناح اور مسٹر ڈیسائی لیگ اور کانگرس کی طرف سے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے لئے ناموں کی فہرست پیش کریں گے۔ دونوں سیاسی جماعتوں (کانگرس اور مسلم لیگ) کو چالیس چالیس فی صد اور باقی جماعتوں کو ۲۰ فی صد نشستیں دی جائیں گی۔ جن صوبوں میں وزارتیں معطل کی جا چکی ہیں ان میں لیگ اور کانگرس کے اشتراک سے مخلوط وزارتیں تشکیل دی جائیں گی۔

لیاقت ڈیسائی فارمولا جسے مسٹر گاندھی کی تائید و منظوری حاصل تھی اس حیثیت سے نہایت اہمیت کا حامل تھا کہ اس کے ذریعے پہلی بار عارضی حکومت میں مسلمان اراکین کو نامزد کرنے کا اختیار مسلم لیگ کو دیا گیا تھا۔ اس طرح کانگرس اور اس کے سب سے بڑے رہنما نے نہ صرف دو قومی نظریئے کی تائید کر دی تھی بلکہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کر کے برصغیر میں مسلمانوں کے لئے ایک آزاد ریاست کے قیام کی راہ بھی ہموار کر دی تھی۔

ویول پلان

مئی ۱۹۴۵ء میں جرمنی کو شکست ہو گئی اور اب جنگ صرف جاپان کے محاذ پر محدود ہو گئی۔ حالات صاف بتا رہے تھے کہ یہ محدود جنگ بھی عنقریب ختم ہوا چاہتی ہے اور اس کا خاتمہ اتحادیوں کے حق میں ہوگا۔ ان حالات میں ہندوستان میں جو نت نئے اور خوفناک مسائل پیدا ہونے والے تھے لارڈ ویول وائسرائے ہندان سے کچھ زیادہ ہی متفکر تھے۔ چنانچہ انہوں نے جرمنی کی شکست سے چند روز قبل ہی انگلستان جا کر ہندوستان کی آزادی کے مسئلے پر برطانوی حکمرانوں اور سیاستدانوں سے گفتگو کی اور ۴ جون کو ایک منصوبہ لے کر ہندوستان آئے۔ ۱۴ جون ۱۹۴۵ء کو لارڈ ویول نے آل انڈیا ریڈیو سے اس منصوبے کا اعلان کیا۔ یہی منصوبہ بعد کو ویول پلان کے نام سے مشہور ہوا۔ اس منصوبے کی بڑی بڑی دفعات یہ تھیں کہ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے مشورے سے نئی ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل عمل میں لائی جائے گی۔ یہ کونسل اور یہ پلان اہل ہند پر جبراً مسلط نہیں کیا جائے گا اور نہ یہ مستقبل میں تشکیل پانے والے دستور پر اثر انداز ہوگا۔ اس منصوبے کے تحت وائسرائے

کی ایگزیکٹو میں اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو مساوی نمائندگی دی جائے گی۔ ان نمائندوں کو صوبوں اور مرکز میں کام کرنے والے منتخب ارکان میں سے منتخب کیا جائے گا۔ ہندوستان کی دو بڑی جماعتوں کے نمائندوں کی حیثیت سے وائسرائے سے گفتگو کرنے کے لئے مسٹر جناح اور مسٹر گاندھی کو اچھوتوں کی طرف سے مسٹر شوراج کو اور سکھوں کی طرف سے ماسٹر تارا سنگھ کو مدعو کیا جائے گا۔

لارڈ ویول کی اس نشری تقریر پر ملک کی سیاسی جماعتوں نے ملے جلے ردعمل کا اظہار کیا۔ مسٹر گاندھی نے وائسرائے سے احتجاج کیا کہ مسلمانوں اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے لئے مساوی نیابت کا اصول مقرر کر کے کانگرس کو فرقہ وارانہ اور صرف اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی نمائندہ جماعت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مسٹر گاندھی نے وائسرائے کو اس "نکتہ" سے بھی آگاہ کیا کہ میں اس کانفرنس میں کیسے شرکت کر سکتا ہوں۔ جب کہ میں اس جماعت کا عہدیدار تک نہیں، میری بجائے مولانا ابوالکلام آزاد کو مدعو کیا جائے۔ کیونکہ وہ کانگرس کے صدر ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مسٹر گاندھی نے ان ایام میں علاج مشورے کے لئے شملے میں موجود رہنے پر آمادگی ظاہر کر دی جہاں یہ کانفرنس منعقد ہونی تھی۔

قائداعظم نے ویول پلان پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے وائسرائے کو مطلع کیا کہ اس منصوبے کے نتیجے میں مسلمانوں کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ غیر کانگرسی ہندو اور دوسرے غیر مسلم کانگرس کا ساتھ دیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اکثریت کے ووٹ مسلم مفادات کے خلاف استعمال ہوں گے۔ اس کا ایک ہی حل ہے کہ جب کسی مسئلے سے مسلم اراکین کی اکثریت اختلاف کرے تو اسے منظور نہ کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمان اراکین کی نامزدگی کا اختیار صرف مسلم لیگ کو دیا جائے۔ اس کے علاوہ کوئی فرد یا جماعت کسی مسلمان ممبر کو نامزد نہ کرے۔

شملہ کانفرنس

اپنی نشری تقریر کے بعد لارڈ ویول نے ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کے نام دعوت نامے جاری کر دیئے۔ اس کانفرنس کے لئے ۲۵ / جون کی تاریخ اور شملہ کا تاریخی شہر منتخب کیا گیا۔

۲۱ نمائندوں نے اس کانفرنس میں شرکت کی جن میں سے چھ مسلم لیگ سے تعلق رکھتے تھے یعنی (۱) قائداعظم (۲) نوابزادہ لیاقت علی خان (۳) خواجہ ناظم الدین (۴) سر غلام حسین ہدایت اللہ (۵) سر محمد سعد اللہ (۶) مسٹر حسین امام۔ غیر مسلم لیگی مدعوئین کی تعداد تین تھی۔ (۱) مولانا ابوالکلام آزاد (۲) ملک خضر حیات خاں ٹوانہ (۳) ڈاکٹر خان صاحب۔

۲۵ / جون کو دن کے گیارہ بجے کانفرنس کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے کانگرس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد

نے اور باتوں کے علاوہ اپنا پرانا اعتراض دہرایا کہ کانگرس غیر فرقہ وارانہ تنظیم ہے اس لئے اسے ہندوؤں کے علاوہ مسلمانوں، سکھوں، اچھوتوں اور عیسائیوں کو بھی نامزد کرنے کا اختیار ہے۔ انہوں نے وائسرائے سے اس امر کی ضمانت چاہی کہ کوئی ایسا فیصلہ نہ کیا جائے جس سے کانگرس کی حیثیت ایک فرقہ وارانہ جماعت کی ہو کر رہ جائے۔ اس مرحلے پر وائسرائے نے کہا کہ اس منصوبے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کانگرس کو فرقہ وارانہ جماعت بنا دیا جائے۔ وائسرائے کے ان الفاظ پر قائداعظم نے کھڑے ہو کر سخت احتجاج کیا اور کہا کہ میں اور ہندوستان کے مسلمان کانگرس کو صرف ہندوؤں کی نمایندہ جماعت سمجھتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کرتی۔ اس پر لارڈ ویول نے یہ کہہ کر اپنے موقف میں فوراً تبدیلی کر لی کہ کانگرس اپنے اراکین کی نمایندہ جماعت ہے اس کے جواب میں قائداعظم نے یہ تاریخی الفاظ کہے کہ "مجھے اس سے اتفاق ہے۔" [1]

یہ کانفرنس ۱۱ر جولائی تک جاری رہی مگر افسوس کہ کانگرس اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے مسلم دشمن طرز عمل کی وجہ سے اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور ۱۴ر جولائی ۱۹۴۵ء کو لارڈ ویول نے اعلان کر دیا کہ کانفرنس ناکام ہو گئی ہے۔ اس کانفرنس کی ناکامی کی بڑی وجہ پنجاب کے یونینسٹ وزیراعظم ملک خضر حیات خاں ٹوانہ اور صوبہ سرحد کے کانگرسی وزیراعظم ڈاکٹر خان صاحب کی یہ ضد تھی کہ انہیں مسلمانوں کا ایک نمایندہ نامزد کرنے کی اجازت دی جائے۔ مولانا ابوالکلام آزاد بھی اس کانفرنس کی ناکامی کے ذمہ دار تھے کہ انہوں نے اس غلط گمراہ کن اور مضحکہ خیز دعوے پر اصرار کیا کہ کانگرس کو ہندوؤں کے علاوہ مسلمانوں بلکہ ہندوستان کی تمام اقلیتوں کی نمائندگی کا حق حاصل ہے۔ قائداعظم کا موقف یہ تھا کہ کانگرس کا متحدہ ہندوستان کا نظریہ اور مسلمانوں کا نظریۂ پاکستان ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مسلم لیگ عبوری حکومت میں اس وقت تک شرکت منظور نہیں کر سکتی جب تک مسلمانوں کا حق خود ارادیت تسلیم نہ کیا جائے۔ اسی سلسلے میں ۱۴ر جولائی کو قائداعظم نے اس کانفرنس کی ناکامی پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ویول پلان کی حقیقت ایک جال سے زیادہ اور کچھ نہیں جس کا مقصد مسلم مفاد کو نقصان پہنچانا ہے۔ لارڈ ویول نے کانگرس کے اس مطالبے کی تائید کی کہ خضر حیات خاں کی طرف سے غیر مسلم لیگی مسلمان ممبر کی نامزدگی قبول کر لی جائے۔ اس تجویز سے اتفاق کر لینے کا مطلب یہ ہوتا کہ ہم اپنے نصب العین سے ہٹ گئے ہیں اور یہ اپنے قتل کے محضر نامے پر اپنے قلم سے دستخط کرنے کے مترادف ہے۔ اس لئے ہم اس کانفرنس سے اٹھ آئے۔

قائداعظم نے شملہ کانفرنس میں مسلم قومیت اور نظریۂ پاکستان کی جس قابلیت اور جرأت سے وکالت

---

[1] دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ص ۹۴

کی تھی اسے برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں نے اپنے دل کی آواز قرار دیا۔ اس کا ثبوت ان کا وہ یادگار استقبال ہے جس کے مظاہر شملے سے بمبئی تک تمام بڑے بڑے ریلوے اسٹیشنوں پر دیکھے گئے اور ہزاروں ہزار مسلمانوں نے قائداعظم زندہ باد کے پرخلوص نعروں سے انہیں خراج تحسین ادا کیا۔ اس کے برعکس مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کانفرنس میں جس طرح مسلمانوں کے کاز کو نقصان پہنچایا اس کی کروڑوں مسلمانوں نے سخت مذمت کی اور وہ جب شملے سے روانہ ہوئے تو راستہ میں جگہ بہ جگہ سیاہ جھنڈیوں سے ان کا استقبال کیا گیا۔ مولانا آزاد نے شملہ کانفرنس میں ہندو کانگرس کا آلۂ کار بن کر جس طرح مسلم مفادات کو پامال کیا تھا کلکتہ کے مسلمانوں نے اس کے خلاف برہم ہو کر انہیں امامت کے منصب سے بھی ہٹا دیا۔[1] اس طرح ایک محدود علاقے کے مسلمانوں نے انہیں اپنی دینی پیشوائی کا جو اعزاز عطا کیا تھا وہ بھی ان سے چھین لیا گیا۔

مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ

شملہ کانفرنس کے دوران قائداعظم نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ اسے مرکزی اور صوبائی انتخابات منعقد کرانے کا اعلان کرنا چاہیئے تاکہ ملک میں عوامی حکومت قائم ہو سکے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے انتخابات کی تیاری شروع کر دی۔ شملہ میں مسلم لیگ کی عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا جو ۱۱ر جولائی ۱۹۴۵ء سے ۱۴ر جولائی ۱۹۴۵ء تک جاری رہا۔ اس اجلاس میں متوقع انتخابات کے لئے ایک پارلیمنٹری بورڈ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس بورڈ کے صدر نوابزادہ لیاقت علی خاں اور اراکین چودھری خلیق الزماں اور حسین امام مقرر کئے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک کمیٹی آف الیکشن تشکیل دی گئی۔ نواب محمد اسمٰعیل خاں اس کے صدر نامزد ہوئے۔ نوابزادہ لیاقت علی خان کنوینر اور خواجہ ناظم الدین، چوہدری خلیق الزماں، حاجی عبدالستار سیٹھ، مسٹر آئی آئی چندریگر، نواب افتخار حسین خان ممدوٹ اور میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ اس کے رکن مقرر ہوئے۔

اب مسلم لیگ ایک بہت بڑے امتحان سے گزرنے والی تھی۔ اس کی سب سے بڑی آزمائش کی گھڑی آنے والی تھی۔ مسلم لیگ کے عظیم قائد، اس کے دیگر راہنماؤں اور ان مسلمانوں کے اخلاص و ایثار کا امتحان ہونے والا تھا جو مسلم لیگ اور اس کے نصب العین یعنی "پاکستان" کے حامی تھے۔ چنانچہ یہ امتحان ہوا اور بڑا سخت ہوا۔ نظریہ پاکستان کے حامی امتحان کی بھٹی میں ڈالے گئے مگر کندن بن کر نکلے۔

عام انتخابات کا اعلان

شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد جاپان کے شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرنے کا حادثہ پیش

---

[1] قائدِ فیز آف اسٹرگل فار پاکستان ص۱۷۱ مولفہ جمیل الدین احمد

آیا اور دوسری جنگِ عظیم جرمنی کے بعد جاپان کی شکست کے ساتھ ہی مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ یہ جنگ تو انگریزوں نے جیت لی اور جرمنی ہار گیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ میں فاتحین کی حالت بھی مفتوحین کی حالتِ زار سے کسی طرح بہتر نہ تھی۔ برطانیہ کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ اس کی معاشی اور اقتصادی حالت سخت خراب ہو گئی تھی۔ اب اس کے لئے دور دراز کے مقبوضات اور وہ بھی ہندوستان جیسے مقبوضہ ملک پر آسانی سے حکومت کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ ادھر یہاں کے سیاسی حالات برطانیہ کے حق میں بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اس لئے اسے عافیت اسی میں نظر آئی کہ وہ جتنی جلدی ہو سکے اس ملک سے رخصت ہو جائے۔ چنانچہ ۱۹ ستمبر ۱۹۴۵ء کو ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ویول نے شہنشاہ برطانیہ کی منظوری سے اعلان کیا کہ آئندہ موسم سرما میں انتخابات کرائے جائیں گے۔ انہوں نے اس توقع کا بھی اظہار کیا کہ ملک کے سیاستدان صوبوں میں وزارتیں تشکیل دیں گے۔ اس کے بعد حکومت کی ہر امکانی کوشش ہو گی کہ جلد سے جلد مجلسِ قانون ساز تشکیل پا جائے اور پھر قانون ساز اصحاب سے گفت و شنید کے ذریعے معلوم کیا جائے کہ وہ ۱۹۴۲ء کے اعلان کے مندرجات کو قبول کریں گے یا کوئی اور منصوبہ مرتب کیا جائے گا۔[1]

اس کے بعد ۴ دسمبر کو وزیر ہند مسٹر پیتھک لارنس نے بھی اعلان کیا کہ ہندوستان میں عام انتخابات کرائے جائیں گے اور پھر مجلسِ دستور ساز قائم کی جائے گی۔ وزیر ہند نے یہ بھی اعلان کیا کہ آزاد ہونے کے بعد ہندوستان کو دولتِ مشترکہ میں اس کا جائز مقام دیا جائے گا۔

قائد اعظم کا انتباہ

وائسرائے اور وزیر ہند کے اعلانات میں ہندوستان کو آزادی دینے کی خوش خبری تو سنائی گئی تھی مگر اس میں برصغیر کے دس کروڑ مسلمانوں کے متفقہ مطالبے یعنی پاکستان کا کوئی ذکر نہ تھا۔ بلکہ پورے ملک کے لئے ایک مجلسِ دستور ساز تشکیل دینے کا اعلان کیا گیا تھا۔ قائد اعظم نے فوراً ایک بیان جاری کیا جس میں انہوں نے کہا کہ :-

"جب تک پاکستان کا مطالبہ تسلیم نہ کر لیا جائے اس وقت تک کوئی مفاہمت نہیں ہو سکتی۔ یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے اور اسی میں ہندوستان کی دستوری پیچیدگیوں کا حل مضمر ہے۔ اس لیے میں شہنشاہ برطانیہ کی حکومت سے پوری سنجیدگی سے یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ اعلان کرے کہ ہندوستان میں پاکستان کا قیام عمل میں لایا جائے گا ——— مسلمان ہرگز کوئی ایسا

---

[1] اسپیچز اینڈ ڈاکومنٹس ص ۵۶۷ جلد ۲

دستور قبول نہیں کریں گے جو انہیں ایک مرکز کے تابع کر دے"۔ [1]

قائد اعظم نے اسی روز اپنے ایک اور بیان میں حکومت برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ ہندوستان میں دو قانون ساز اسمبلیاں قائم کی جائیں۔ ایک ہندوستان کے لئے اور دوسری پاکستان کے لئے۔

مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں مسلم لیگ کی کامیابی

ستمبر ۱۹۴۵ء میں وائسرائے نے عام انتخابات کا اعلان کیا اور دسمبر ۱۹۴۵ء میں مرکزی اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ یہ انتخابات مسلم لیگ نے نظریہ پاکستان کی بنیاد پر لڑے۔ یہ زمانہ فروری ۱۹۳۷ء کے زمانے سے بہت مختلف تھا جب کانگریس کو صوبائی انتخابات میں زبردست کامیابی ہوئی تھی اور مسلم لیگ شکست سے دوچار ہو گئی تھی۔ کیونکہ اس وقت تک مسلم لیگ کی جڑیں عوام میں نہ تھیں لیکن ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۵ء تک کے آٹھ سالہ دور میں قائد اعظم کی قیادت میں مسلم لیگ نے پشاور سے لے کر آسام کے دور دراز علاقوں تک اور ہمالیہ پہاڑ کی ترائی سے لے کر راس کماری کے انتہائی کناروں تک مسلمانوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ پاکستان ہر مسلمان کے دل کی آواز تھی۔ چنانچہ جب مرکزی اسمبلی کے انتخابات ہوئے اور مسلم لیگ نے اپنے نمائندے کھڑے کئے تو نہ صرف ان انتخابات میں اسے کامیابی ہوئی بلکہ سو فی صد کامیاب ہوئی اور بعض مخالف امیدواروں کی ضمانتیں بھی ضبط ہو گئیں۔ مسلم لیگ نے تیس امیدواروں کو ٹکٹ دیئے اور تیس کے تیس کامیاب ہو گئے۔ مرکزی اسمبلی میں اب پارٹی پوزیشن یہ تھی۔ مسلم لیگ ۳۰۔ کانگریس ۵۷۔ آزاد امیدوار ۵۔ اکالی ۲ اور یورپین ۸۔ گویا ان انتخابات نے ثابت کر دیا کہ برصغیر میں دو ہی جماعتیں سب سے بڑی اور نمائندہ جماعتیں ہیں۔ ایک کانگریس جو ہندوؤں کی نمائندگی کرتی ہے اور دوسری مسلم لیگ جو مسلمانوں کی نمائندہ ہے۔ یہ کامیابی معمولی نہ تھی۔ اس لئے قائد اعظم نے اعلان کیا کہ اس عظیم الشان کامیابی پر سارے برصغیر کے مسلمان یوم فتح منائیں اور مساجد میں جمع ہو کر نماز شکرانہ ادا کریں۔ چنانچہ ۱۱ جنوری ۱۹۴۶ء کو ہندوستان کے مسلمانوں نے یوم فتح منایا۔ بہت سے مقامات پر جلسے ہوئے اور مسلم لیگ کی کامیابی پر نہایت جوش و خروش کا اظہار کیا گیا۔

---

[1] ری سنٹ اسپیچز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح صفحہ ۳۵۵ جلد ۲

تحریکِ پاکستان

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ نے قائدِ اعظم کی زیرِ صدارت اپنے تاریخی اجلاس لاہور میں برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ایک آزاد اسلامی ریاست کا نظریہ پیش کیا جسے ۲۴ مارچ کو دس کروڑ مسلمانانِ ہند کے متفقہ مطالبے کی حیثیت سے منظور کر لیا گیا۔ ۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء کے بعد اس نظریہ نے تحریک کی شکل اختیار کی۔ اس تحریک نے جس سرعت سے ترقی کی منازل طے کیں وہ نہ صرف اس صدی کا بلکہ تاریخِ عالم کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔ سات سال قوموں کی تاریخ میں کیا ہوتے ہیں؟ بہ ظاہر کچھ بھی نہیں تحریکوں کے بڑھنے، پھلنے پھولنے، پروان چڑھنے اور کامیاب ہونے کے لئے بڑے طویل زمانے درکار ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تحریک صرف سات سال کے قلیل عرصے میں کامیابی کی منزل سے ہمکنار ہو گئی۔ اس کی چند وجوہ تھیں۔ اس کی سب سے پہلی وجہ یہ تھی کہ اس تحریک کے لئے فضا گذشتہ دو سو سال سے تیار ہو رہی تھی۔ جب برصغیر کے غیر مسلم اور یورپی طاقتوں خصوصاً انگریزوں نے یہاں کے مسلمانوں کے ساتھ نہایت معاندانہ بلکہ ظالمانہ رویہ اختیار کر کے ان کے دلوں میں یہ احساس پیدا کر دیا تھا کہ ان کا مذہب ان کی تہذیب اور ان کی قومی روایات نہ صرف خطرے میں ہیں بلکہ اس وقت تک محفوظ نہیں رہ سکتیں جب تک انہیں غیر مسلموں کے تسلط سے نجات نہیں مل جاتی۔ ان کا یہ احساس بلا وجہ اور غلط نہ تھا، بلکہ گذشتہ دو سو سال کی تاریخ نے جس کی چند جھلکیاں اس کتاب کے گذشتہ صفحات میں پیش کی جا چکی ہیں اس احساس کو جنم دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسلم لیگ کے تاریخی پلیٹ فارم سے ایک آزاد اسلامی ریاست کا مطالبہ کیا گیا تو برصغیر کے دس کروڑ مسلمانوں نے دل کی گہرائیوں سے اس کی پذیرائی کی۔

اس تحریک کی بہ سرعت کامیابی کی دوسری وجہ غیر مسلموں اور حکومت کی وہ پر زور مخالفت کی تھی جو آندھی اور طوفان بن کر چھا گئی اور یوں معلوم ہونے لگا گویا ہندوستان میں آزاد اسلامی ریاست کے مطالبے سے برصغیر کے غیر مسلموں پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے اور حکومت کے قصر و ایوان میں زلزلہ آ گیا ہے۔ نظریۂ پاکستان کی اس شدید مخالفت سے مسلمانوں نے بجا طور پر یہ نتیجہ نکالا کہ ہندوستان میں آزاد اسلامی ریاست کا قیام یقیناً یہاں کے غیر مسلموں اور برطانوی حکومت دونوں کے مکروہ عزائم کے خلاف ہے اور اس میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود مضمر ہے۔ اسی لئے اس کی مخالفت پر یہ دونوں اسلام دشمن طاقتیں کمر بستہ ہو چکی ہیں۔ چنانچہ یہ سوچ کر انھوں نے اس نظریئے اور

اس تصور کو حقیقت میں تبدیل کر دینے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

اس تحریک کے منزلِ مقصود سے اتنی جلدی ہمکنار ہو جانے کی ایک بڑی اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اسے ایک ایسا قائد مل گیا تھا جسے کسی قیمت پر خریدا نہیں جا سکتا تھا، جو آہنی ارادے کا مالک، غیر معمولی تنظیمی صلاحیتوں کا حامل، نہایت بے خوف، نڈر، جری اور شیر دل ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کا سب سے بڑا مدبر اور فریس رہنما تھا ——— یعنی قائدِ اعظم محمد علی جناح۔ اس کی شخصی عظمت، اس کے ذاتی کردار اور اس کی مقناطیسی کشش نے اس تحریک کو بہت جلد عوام میں مقبول بنا دیا۔

اس تحریک کے اتنے قلیل عرصے میں کامیاب ہو جانے کی ایک وجہ قوم کا وہ نوجوان طبقہ بھی تھا جسے قائدِ اعظم نے غیر معمولی متاثر کیا اور جس نے اپنے عظیم رہنما کا پیغام عام کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔ نوجوان اور وہ بھی طلبہ کسی قوم کا سب سے زیادہ فعال گروہ ہوتا ہے جس کے جذبات میں شدت اور مزاج میں برق رفتاری ہوتی ہے۔ یہ دور جذباتیت کا تھا اور اس تحریک سے ساری قوم کے جذبات وابستہ تھے۔ پس قائدِ اعظم نے ایک ماہرِ نفسیات کی طرح قوم کے اس سب سے زیادہ جذباتی طبقے کی نبض پر ہاتھ رکھا اور اس سے براہ راست خطاب کیا۔ چنانچہ یہ طبقہ اس تحریک کا ہراول دستہ بن گیا اور اس نے تحریکِ پاکستان کی راہ کے ہر سنگِ گراں کو اپنی ٹھوکروں سے دور پھینک دیا۔

تحریکِ پاکستان کے جرنیل

تحریکِ پاکستان کی اس قدر سرعت سے کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ قائدِ اعظم کو ایسے رفقائے کار مل گئے جنہوں نے ان کے دست و بازو بن کر اس تحریک کو مقبولِ عوام بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ قائدِ اعظم کے یہ رفقا اپنے قائد کے نہ صرف مخلص و وفادار ثابت ہوئے بلکہ ان میں سے بیشتر جنگِ آزادی کے تجربہ کار جرنیل تھے۔ یہ تحریکوں کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف تھے۔ ان کا اپنے علاقوں کے عوام پر نہایت اثر تھا۔ ان کے دلوں میں تحریکِ پاکستان کے لئے سچی لگن تھی۔ یہ نڈر اور بے خوف تھے۔ ان قومی جرنیلوں میں مسلم اکثریت کے علاقوں کے لوگ بھی شامل تھے اور مسلم اقلیت کے علاقوں کے لوگ بھی۔

مسلم اکثریت کے صوبوں میں خواجہ ناظم الدین، سر سعد اللہ، مولوی تمیز الدین خاں، مولانا عبد الحمید خان بھاشانی، مولانا محمد اکرم خاں، ابو الہاشم خاں، حسین شہید سہروردی، سر حسان سہروردی، عبد الرحمٰن صدیقی، نور الامین، حسن اصفہانی، یوسف علی چوہدری عرف موہن میاں، حمید الحق چوہدری، چوہدری معظم حسین، مولانا ظفر علی خان، سر مہر شاہ، . . . .

. . . . ملک برکت علی، راجہ غضنفر علی خاں، کرنل عابد حسین، نواب افتخار حسین خاں ممدوٹ۔

میاں امیر الدین، میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ، میاں بشیر احمد (بار ایٹ لاء) سردار شوکت حیات خان، نوابزادہ رشید علی خاں، ملک فیروز خاں نون، میاں افتخار الدین، خان عبدالقیوم خان، سردار عبدالرب نشتر۔ سردار اورنگ زیب خاں، پیر صاحب مانکی شریف (مرحوم) سردار بہادر خاں، قاضی محمد عیسٰی، میر نبی بخش زہری، سر غلام حسین ہدایت اللہ، محمد ایوب کھوڑو، قاضی فضل اللہ، میر جعفر خاں جمالی، شیخ عبدالمجید سندھی، آغا غلام نبی پٹھان، یوسف ہارون، مسٹر راشدی۔ مسلم اقلیت کے علاقوں میں رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی، نواب زادہ لیاقت علی خاں، چوہدری خلیق الزماں، راجہ صاحب محمود آباد (امیر محمد خاں) مسٹر حسین امام، ابراہیم اسماعیل چندریگر، سر محمد یامین خاں، نواب اسماعیل خاں، سید عبدالرؤف شاہ۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، حاجی عبدالستار سیٹھ، نواب صدیق علی خاں، احمد ہارون جعفر، محمد لقمان، نواب بہادر یار جنگ ظہیر الحسن لاری، مولوی کریم الرضا خاں، سر ضیاء الدین احمد، منظر عالم، خان عبدالوحید خان، کے ایم رحمت اللہ۔ حاجی اسحاق سیٹھ، ایم ایم قلعدار اور مولانا عبدالحامد بدایونی وغیرہم کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں ان اصحاب نے قائد اعظم کے ارشادات، مسلم لیگ کے نصب العین اور تحریک پاکستان کو برصغیر کے گوشے گوشے میں پہنچانے کا فرض بڑی تندہی، جاں فشانی اور تدبر و فراست سے ادا کیا۔ انہی کی بھرپور اور مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ تھا کہ یہ تحریک معجزانہ طور پر کامیاب ہوئی اور نہایت قلیل عرصے میں منزل مقصود سے ہمکنار ہو گئی۔

پنجاب اور تحریک پاکستان

قرارداد لاہور میں برصغیر کے لئے جس آزاد اسلامی ریاست کا مطالبہ کیا گیا تھا اس کے لیے چوہدری رحمت علی مرحوم کا تجویز کردہ نام یعنی "پاکستان" قبول کر لیا گیا۔ پاکستان کا پہلا حرف "پ" پنجاب کی نمائندگی کرتا تھا اور اس صوبے کو اس نئی مجوزہ اسلامی ریاست میں نہایت اہم مقام حاصل تھا۔ مگر بدقسمتی سے اس پہلے ہی صوبے کی فضا قرارداد پاکستان کی منظوری کے وقت سب سے زیادہ خراب اور پاکستان کے حق میں نہایت ناموافق تھی۔ پنجاب کے اس وقت کے وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں قائد اعظم کے حامی اور عقیدت مند ضرور تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ کی رکنیت بھی قبول کر لی تھی مگر وہ ایسے لوگوں میں پھنسے ہوئے تھے جن کی اکثریت غیر مسلموں پر مشتمل تھی اور اپنی وزارت قائم رکھنے کے لئے وہ ایسے لوگوں کی حمایت و تعاون کے محتاج تھے قرارداد پاکستان کا پہلا مسودہ بھی انہی کا مرتب کردہ تھا۔ مگر انہوں نے یہ مسودہ اس رنگ اور اس انداز سے مرتب کیا تھا جو اس تصور پاکستان کی ترجمانی نہیں کرتا تھا جو علامہ اقبال اور ان کے پیش رو مفکروں نے پیش کیا تھا اور جس کے حصول کے لئے قائد اعظم نے ایک نئے دور اور نئی مہم کا آغاز کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مسودے میں اتنی کانٹ چھانٹ کی گئی کہ اس میں ان کا شائبہ ہی کچھ باقی رہا ہو۔ چنانچہ خود انہوں نے بھی پنجاب اسمبلی کے ایک اجلاس میں تقریر کرتے

ہوئے اعتراف کیا کہ قرارداد لاہور کا مسودہ گو میں نے ہی تحریر کیا تھا مگر میرے اس مسودے میں اتنی تبدیلیاں کی گئی ہیں کہ میں اسے اپنی تصنیف نہیں کہہ سکتا۔

اس معذرت کی ضرورت بھی سر سکندر حیات خاں کو اسی لئے پیش آئی تاکہ وہ اپنے یونی نسٹ رفیقوں کے تعاون سے محروم نہ ہو جائیں اور ان پر ظاہر ہو جائے کہ قرارداد لاہور میں مسلمانوں کے آزاد و خود مختار وطن کا جو مطالبہ کیا گیا ہے یہ ان کا نہیں بلکہ دوسرے مسلم لیگی رہنماؤں کا ہے۔ ان کی بعض حرکات قائد اعظم کو ناگوار گزریں اور انہوں نے بار بار کوشش کی سکندر حیات خاں مسلم لیگ کا نصب العین قبول کر لیں مگر اس کوشش کا کوئی مثبت نتیجہ نہ نکلا۔ سکندر حیات خاں کے ساتھ ان کی وزارت کے مسلمان اراکین نے بھی مسلم لیگ کی رکنیت قبول کر لی تھی۔ مگر اس کے باوجود ان سب نے یونی نسٹ پارٹی ہی کا مفاد پیش نظر رکھا جس میں مسلمان، ہندو اور سکھ سب ہی شامل تھے۔ اپنے انہی غیر مسلم وزراء کے دباؤ کے تحت سر سکندر حیات خاں نے بعض ایسے افسوسناک بیانات دیئے جن سے پنجاب میں تحریک پاکستان کے لئے سخت نامساعد حالات پیدا ہو گئے۔ پھر انہوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ تحریک پاکستان کو ناکام بنانے کے لئے صوبائی عصبیت کا سہارا لینے سے بھی گریز نہ کیا۔ چنانچہ قرارداد پاکستان کی منظوری کے ٹھیک ایک سال بعد یعنی مارچ ۱۹۴۱ء میں انہوں نے پنجاب اسمبلی کے ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے مسلم لیگی ہائی کمان کو مخاطب کر کے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر پنجاب کو حقیقی معنی میں آزاد دیکھنا چاہتے ہیں جس میں ہر فرقے کے لوگوں کو ان کا جائز حق مل سکے تو ایسا پنجاب پاکستان کا حصہ ہو گا بلکہ یہ صرف اور صرف پنجاب ہو گا۔ پانچ دریاؤں سے سیراب ہونے والا پنجاب، جس کا جی چاہے کہے، پنجاب پنجاب ہے اور ہمیشہ پنجاب رہے گا۔ [۱]

ظاہر ہے کہ اس تقریر کا مدعا ایک طرف اپنے ہندو اور سکھ رفقائے کار کو خوش کرنا تھا اور دوسری طرف پنجاب کے لوگوں میں صوبائی عصبیت بیدار کر کے ان میں یہ غلط احساس پیدا کرنا بھی تھا کہ اگر پنجاب ایک مرکزی حکومت (یا پاکستان) کا حصہ بن گیا تو اس کی آزادی ختم ہو جائے گی اور پھر پنجابی، پنجابی نہیں رہیں گے۔

اسی سال سر سکندر حیات خاں نے اسلامیہ کالج لاہور کے جلسہ تقسیم اسناد کی صدارت کرتے ہوئے طلبہ کو "یہ زریں" نصیحت فرمائی کہ:۔

> "زندگی میں تمہارا نصب العین کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن یاد رکھو تم کسی ایسی اسکیم کی تائید نہ کرنا جس کا منشا یہ ہو کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے مسلمانوں کے لئے الگ خطہ منتخب کر لیا جائے۔ یہ اسکیم نہ صرف اسلامی تعلیم کی صحیح روح کے ہی خلاف ہے بلکہ اسلام کے اس بنیادی اصول کے بھی منافی ہے جس کی رو سے ہر فرزند توحید پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اسلام کا پیغام دنیا کے ہر گوشے تک پہنچا دے۔" [۲]

---

[۱] دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ص ۱۰۵۔ [۲] تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء ص ۱۴۲

سر سکندر حیات خاں اس واقعہ کے ایک سال بعد یعنی ۲۶ دسمبر ۱۹۴۲ء کو انتقال کر گئے۔ خیال تھا کہ شاید اب پنجاب میں جو وزارت تشکیل پائے گی وہ مسلم لیگ اور نظریۂ پاکستان کے متعلق معاندانہ رویہ ترک کر دے گی۔ مگر بدقسمتی یہ ہوئی کہ پنجاب اسمبلی پارٹی نے سکندر حیات خان کے جانشین کی حیثیت سے پنجاب کے ایک اور رئیس ملک خضر حیات ٹوانہ کو وزیر اعظم منتخب کیا۔ قائد اعظم نے کوشش کی کہ ملک خضر حیات خاں اپنے پیش رو کی روش اختیار نہ کریں اور مسلم لیگی وزیر اعظم کی حیثیت سے مسلم اکثریت کے اس صوبے میں تحریک پاکستان کی امداد کریں مگر افسوس کہ قائد اعظم اور دوسرے مسلم لیگی رہنماؤں کی یہ کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں اور ملک خضر حیات خاں ٹوانہ لیگ دشمنی بلکہ پاکستان دشمنی میں اپنے پیش رو سے بھی آگے بڑھ گئے۔ انہی کے عہد میں مسلم لیگ بلکہ پاکستان کی تحریک نے شدت اختیار کی اور انہی کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں مسلم لیگیوں پر سخت مظالم کئے گئے

مجلس احرار کی پاکستان دشمنی

یہ تو تھا حکومتِ پنجاب کا وہ افسوسناک کردار جو اس نے تحریک پاکستان کے سلسلے میں ادا کیا لیکن سب سے زیادہ افسوس اس کا ہے کہ پنجاب کے مسلمانوں کی ایک عوامی جماعت اپنی پاکستان دشمنی میں یونینسٹ وزارت سے کہیں آگے نکل گئی۔ یہ تھی جماعتِ احرار جس کے پاس شعلہ بیان مقرر، علمائے دین، ہندو سیٹھ اور جوشیلے کارکن غرض وہ سب کچھ موجود تھا جو کسی تحریک کا مقابلہ کرنے اور اسے ناکام کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ یہ تحریک پنجاب میں قائم ہوئی تھی۔ یہیں سے اٹھ کر ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں پہنچی مگر اس کا گڑھ پنجاب تھا اور یہیں اس کا سب سے زیادہ زور تھا۔ اس تحریک کے قائدین نے پاکستان دشمنی میں ہندوؤں کی طرف دستِ تعاون بڑھانے میں بھی کوئی باک محسوس نہ کی۔ اس کے اسٹیج سے مسلم لیگ، قائد اعظم اور نظریۂ پاکستان پر مسلسل حملے کئے گئے اور آخر وقت تک مجلس احرار نے کوشش کی کہ پاکستان قائم نہ ہو۔ انتہا تو یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے عزائم کو جامۂ عمل پہنانے کے لئے تشدد سے بھی گریز نہ کیا۔ پنجاب کے مختلف مقامات پر ان کے ہاتھوں متعدد مسلم لیگی کارکن زخمی ہوئے۔ ایک تصادم میں تو ایک مسلم لیگی کارکن انہی کی کرم فرمائیوں کے نتیجے میں شہید بھی ہو گیا۔

تحریک پاکستان کا پہلا شہید

اس زمانے کے اخبارات میں اس اندوہناک سانحے کی جو تفصیلات شائع ہوئی تھیں ان کے مطابق "گیارہ جنوری کو دو احراری لیڈر نیاز احمد اور عبدالرحمٰن نے لدھیانہ کے بازار خرادیان میں مائیکروفون لگا کر احراری امیدوار تاج الدین کے حق میں پروپیگنڈہ شروع کر رکھا تھا۔ اس اثناء میں سردار شوکت حیات خان (مسلم لیگ) امیدوار کے حامی شہید محمد صدیق اور ان کے تین ساتھی بھی وہاں آ گئے۔ انہوں نے طنزاً ان سے

کہا کہ مغلظات کا سلسلہ بند کردیں۔ اس پر دونوں پارٹیوں میں جھگڑا ہو گیا اور عبدالرحمن ملزم نے شہید محمد صدیق پر چاقو سے حملہ کردیا اور سخت ضربات پہنچائیں جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔[1]

لدھیانہ کا یہ محمد صدیق تحریکِ پاکستان کا پہلا شہید تھا اور یہ کتنی افسوسناک حقیقت ہے کہ اس کی شہادت کا واقعہ کسی ہندو یا سکھ کے ہاتھوں نہیں بلکہ ان لوگوں کے ہاتھوں رونما ہوا جو نہ صرف کلمہ گو تھے بلکہ جن کے قائد مسلمانوں کے دینی رہنما ہونے کے بھی مدعی تھے۔

مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی دھمکیاں

یہ تو عام احراری کارکنوں کا کردار تھا جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ان میں وہ شعور اور احساسِ ذمہ داری نہ تھا جو سیاسی یا مذہبی رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ لیکن حیرت تو اس پر ہے کہ مجلسِ احرار کے بڑے بڑے رہنما بھی پاکستان کے نام پر اس قدر جذباتی ہو چکے تھے کہ آج اس پر یقین کرنا بھی مشکل ہے۔ اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ نیشنل کانفرنس کی دعوت پر مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت نہرو سری نگر تشریف لے گئے۔ وہاں ان کا جلوس نکالا گیا۔ اس جلوس کے دوران بعض ناخوشگوار واقعات پیش آئے۔ مسلم لیگ اور قائد اعظم کے حامیوں اور نیشنل کانفرنس کے کارکنوں کے درمیان تصادم ہوا۔ ایک دوسرے پر خشت باری بھی کی گئی اور کچھ پتھر غالباً جلوس پر بھی پھینکے گئے۔ اس واقعہ کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن نے سری نگر میں نمازِ جمعہ کے بعد ایک تقریر کی جس میں انہوں نے کہا کہ ”اگر مسلم لیگ کا موجودہ رویہ اسی طرح جاری رہا تو قلیل عرصے میں اس کو جاپان و جرمنی کی طرح کچل دیا جائے گا۔ مولانا صاحب نے مزید فرمایا کہ مولانا آزاد اور پنڈت نہرو کی بے عزتی کا نتیجہ مسلم لیگ کو بھگتنا پڑے گا اور ضرور بھگتنا پڑے گا۔“[2]

مولانا آزاد تو خیر مسلمان تھے۔ ان کی ہتک کا بدلہ لینے کی بات کسی حد تک سمجھ میں آ سکتی ہے مگر حیرت اس پر ہے کہ ایک متعصب اور مسلمانوں کے دشمن لیڈر (پنڈت نہرو) کا بدلہ لینے کی دھمکی ایک مسلمان عالم خود مسلمان کو دے رہا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مجلسِ احرار پاکستان کی مخالفت میں کتنی پست سطح پر اتر آئی تھی اور تحریکِ پاکستان کو ناکام بنانے کے لئے متعصب ہندو رہنماؤں سے سازباز کر چکی تھی۔ انہی مولانا کا ایک اور شہ پارہ ملاحظہ فرمائیے اور اس عالم دین کی اسلامی غیرت کا اندازہ لگائیے۔ فرماتے ہیں۔

”دس ہزار جینا (جناح) اور شوکت (مسلمانوں کے عظیم رہنما مولانا شوکت علی) اور ظفر (تحریکِ پاکستان کے ممتاز رہنما مولانا ظفر علی خاں)، جواہر لال نہرو کی جوتی کی نوک پر قربان

---

[1] روزنامہ نوائے وقت ۱۸ بعدہ ۲۲ جنوری ۱۹۴۶ء [2] روزنامہ ملاپ ۱۸ اگست ۱۹۴۵ء

کئے جا سکتے ہیں۔[1] انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ارشادات

مجلس احرار کے سب سے بڑے قائد و رہنما مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری تھے جن کی خطابت اور شعلہ بیانی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ان کا مسلمان عوام پر بڑا اثر تھا اور مسلمانوں کے دینی و سیاسی حلقوں میں انہیں نہایت عزت و احترام سے دیکھا جاتا تھا مگر تحریک پاکستان میں انہوں نے جو کردار ادا کیا وہ نہایت افسوسناک تھا اور اس کردار نے مسلمان عوام میں ان کی عزت و توقیر کم کر دی۔ شاہ صاحب ۔ ۔ ۔ ۔ موصوف نے پاکستان کی مخالفت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا اور اس مقصد کے لئے نہ صرف پنجاب کے بلکہ ملک گیر دورے کئے اور مسلمانوں کو پاکستان کی نہایت ہیبت ناک تصویر دکھا کر انہیں اس تصور سے برگشتہ کرنے کی پوری کوشش کی چنانچہ اپنی ایک تقریر میں پاکستان کی یوں تضحیک فرمائی:-

"پاکستان کے دونوں اجزاء ایک دوسرے سے علیحدہ ہوں گے اور ان کے درمیان ہندو ہندوستان کی ایک زبردست حکومت ہوگی جس کے پاس سرمایہ ہوگا۔ ہنرمند اور صاحب دماغ آدمی ہوں گے جواہر لال ہوگا، گاندھی جی مہاراج ہوں گے۔ کالا ناگ، راج گوپال اچاریہ ہوگا[2]، مالوی جی ہوں گے، بر خلاف اس کے بنگال، پنجاب، سندھ اور سرحد کے زیادہ تر مسلمان مفلس ہیں۔ یعنی لوہار، موچی، بڑھئی، کسان، مزدور ——————— حتی کہ پنجاب کے بعض علاقوں میں مسلمان بھنگی کا کام کرتے ہیں۔ جو علاقے پاکستان کے لئے طلب کئے جا رہے ہیں۔ ان میں بھی ہندو سرمایہ دار ہیں۔ تعلیم یافتہ ہیں، تجارت پر ان کا قبضہ ہے۔ پشاور والوں کو شلوار کے لئے لٹھا امرتسر سے خریدنا پڑتا ہے۔"[3]

مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری کی یہ تقریر سید رئیس احمد صاحب جعفری اپنی کتاب "حیات محمد علی جناح" میں درج کرنے کے بعد اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں "یہ خیالات ایک عالم دین کے ہیں، جو سرمایہ داری سے مرعوب ہے اور مسلمانوں کو مفلس کہہ کر اسلام کی توہین کر رہا ہے۔ یہ اس مذہب کا عالم ہے جس کے داعی نے فرمایا تھا کہ "الفقر فخری"۔ یہ اس قوم کا فرد ہے جس کے شتربانوں نے ایران اور

---

[1] چمنستان ص ۱۶۵ مولانا ظفر علی خان۔ [2] آپ نے سوچا کہ حضرت مولانا نے گاندھی جی کو مہاراج اور راج گوپال اچاریہ کو کالا ناگ کیوں قرار دیا؟ اس لئے کہ کانگرس میں راج گوپال اچاریہ پہلا شخص تھا جس نے اپنی جماعت کو مشورہ دیا تھا کہ اسے پاکستان کا مطالبہ تسلیم کر لینا چاہئیے۔ مؤلف [3] حیات محمد علی جناح ص ۲۱۲

روم کی شہنشاہیتیں الٹ دی تھیں۔ اس استدلال کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ "مسلمان" کمین ہیں لہٰذا وہ اپنے ہندو آقاؤں کی سرپرستی میں زندگی بسر کریں، ورنہ کچل دیئے جائیں گے، تباہ و برباد کر دیئے جائیں گے۔ تعجب ہے کہ جس قوم کے بعض رہنما تک "احساسِ کمتری" کے اس مرض میں مبتلا ہیں، وہ پھر بھی اتنی حساس اور خود دار ہے کہ پاکستان لینے پر تلی ہوئی ہے"۔ [۱]

مولانا صاحب نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی ایک تقریر میں یہاں تک فرما دیا کہ "پاکستان کا بننا تو بڑی بات ہے۔ کسی ماں نے ایسا بچہ نہیں جنا جو پاکستان کی "پ" بھی بنا سکے"۔ [۲]

ہم یہ واقعات درج نہ کرتے لیکن ان واقعات کے اندراج کے بغیر تحریکِ پاکستان کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی اور یہ صریح بددیانتی اور بزدلی ہے کہ ڈر اور خوف کی وجہ سے یا بعض افراد کی ناراضگی سے بچنے کے لئے حقائق کا خون کر دیا جائے۔ ان واقعات کا اندراج اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ اس صوبے میں تحریکِ پاکستان کے کارکنوں کے لئے کتنی دشواریاں پیش آئی ہوں گی جس کی یکے بعد دو وزارتیں نظریۂ پاکستان کی سخت مخالف تھیں اور جس صوبے کی ایک عوامی جماعت اور اس کے مقبولِ عام رہنما اس نظریہ پر پیہم ضربات لگا رہے تھے۔

پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام

یہ تھے وہ نامساعد حالات جن میں کام کرنے کا بیڑا مٹھی بھر نوجوانوں نے اٹھایا اور حکومت اور پنجاب کی ایک طاقتور سیاسی جماعت کے عزائم کو ناکام بنانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ یہ نوجوان پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے اراکین تھے۔ یہ فیڈریشن اسلامیہ کالج لاہور کے چند طلبہ کی کوششوں سے اگست ۱۹۳۷ء میں قائم ہوئی تھی۔ ان طلبہ میں حمید نظامی (مرحوم) اور ڈاکٹر عبد السلام خورشید کے نام سرِفہرست ہیں۔ ان نوجوان طلبہ کا مقصد پنجاب کے طلبہ کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنا تھا۔ ۸ اگست ۱۹۳۷ء کو اس تنظیم کا پہلا بیان جاری ہوا۔ مولانا ظفر علی خاں نے اپنے اخبار زمیندار میں پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے قیام کی خبر خاص اہتمام سے شائع کی اور اس پر "سوئے ہوئے شیروں کی پہلی انگڑائی" کی سرخی درج کی۔

چند روز کے بعد حمید نظامی اور ڈاکٹر عبد السلام خورشید ڈاکٹر اقبال سے ملے اور اس تنظیم کے بارے میں گفتگو کی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس تنظیم کے قیام کو نہایت پسند فرمایا اور اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ قائدِ اعظم ملک برکت علی اور نواب سر شاہنواز خاں ممدوٹ نے اس تنظیم کے قیام پر مبارکباد اور حوصلہ افزائی کے

---

[۱] حیات محمد علی جناح صفحہ ۱۳-۴۱۲ ، [۲] تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء صفحہ ۸۳

پیغامات دیئے۔ یکم ستمبر ۱۹۳۷ء کو اسلامیہ کالج کے اسٹاف روم میں فیڈریشن کا پہلا باقاعدہ اجلاس منعقد ہوا۔ صدارت میاں محمد شفیع (م-ش) نے کی۔ اس اجلاس میں تنظیم کے انتخابات ہوئے۔ حمید نظامی صدر انوار الحق (آج کل جسٹس انوار الحق) نائب صدر۔ اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اس کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔

چند روز کے بعد فیڈریشن کا ایک وفد علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے اس تنظیم کے بارے میں رہنمائی چاہی۔ علامہ اقبال نے فرمایا کہ آپ لوگوں کا نصب العین پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے صوبوں پر مشتمل ایک مسلم مستقل اسٹیٹ کا قیام ہونا چاہیئے۔ اسکے دو تین دن کے بعد اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں ایک پبلک جلسہ منعقد ہوا۔ ملک برکت علی، خالد لطیف گابا اور مسٹر ضیاء الدین پرنسپل صادق ایجرٹن کالج بہاولپور نے بہ طور خاص اس اجتماع میں شرکت کی۔ اس اجلاس میں پبلک طور پر پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام سے مسلم طلبہ کی ایک تنظیم کے قیام کی حمایت کی گئی۔ اسکے بعد اسلامیہ کالج یونین کے زیر اہتمام نواب سر شاہنواز خان آف ممدوٹ کی زیر صدارت حبیبیہ ہال میں ایک مباحثہ ہوا موضوع تھا کہ "پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام ضروری ہے"۔ اکثر مقررین نے موضوع سے اتفاق کیا۔

اس کے بعد حمید نظامی اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے فیڈریشن کا دائرہ عمل وسیع کرنے کے لئے امرتسر لدھیانہ، جالندھر اور گوجرانوالہ کے دورے کئے۔ طلبہ سے ملاقاتیں کیں۔ اجتماعات سے خطاب کیا۔ اس طرح لاہور کے علاوہ پنجاب کے بعض دوسرے شہروں میں بھی فیڈریشن کی شاخیں قائم ہو گئیں۔ اس زمانے میں فیڈریشن طلبہ کے سامنے اپنا نصب العین یہ پیش کرتی تھی کہ " آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام کا قیام"[1] اس کے بعد" آزاد ہندوستان میں آزاد اسلامی ریاست کا قیام"۔ فیڈریشن کا نصب العین قرار پایا

پاکستان کانفرنس

جیسا کہ گذشتہ سطور میں بیان کیا جا چکا ہے کہ پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن ۱۹۳۷ء میں قائم ہو گئی تھی اور اس کے فعال کارکنوں کی کوششوں سے لاہور کے علاوہ پنجاب کے بعض دیگر شہروں میں اس کی شاخیں قائم ہو چکی تھیں مگر اس تنظیم کے جوہر " قرارداد پاکستان" کے بعد کھلے۔ ۱۴ رجون ۱۹۴۰ء کو اسلامیہ کالج کے ایک پرجوش نوجوان مرزا عبدالحمید کو پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا صدر اور چوہدری نصر اللہ (بعد کو ایڈووکیٹ) مرحوم کو جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر محمد شریف، چوہدری حبیب احمد (مولف "تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" حافظ نذر احمد، مولانا عبدالستار خاں نیازی، اشتیاق احمد، چوہدری محمد صادق غلام ربانی، سید محمد اصغر، منظور الحق صدیقی، خواجہ اشرف اور فخر الدین بال (اب ایڈووکیٹ) فیڈریشن کی سرگرمیوں میں پیش پیش تھے اور انہی پرجوش کارکنوں نے فیصلہ کیا کہ لاہور میں پاکستان کانفرنس کے نام سے

---

[1] یہ معلومات مجھے اپنے محترم دوست جناب ڈاکٹر عبدالسلام خورشید سے حاصل ہوئی۔ (مولف)

مسلمانوں کا ایک عظیم الشان اجتماع منعقد کیا جائے۔ کانفرنس کے لئے یکم مارچ ۱۹۴۱ء کی تاریخ اور صبح ۹ بجے کا وقت مقرر ہوا۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کی تاریخی گراؤنڈ میں یہ کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ سر عبد القادر مرحوم اس زمانے میں انجمن حمایت اسلام کے صدر تھے۔ مسلم لیگ کے مخالفین نے ان پر بہت زور ڈالا کہ ایک تعلیمی عمارت کے میدان کو سیاسی سرگرمیوں کے لئے استعمال کرنے کی اجازت دینا کسی طرح مناسب نہیں۔ مگر سر عبد القادر نے اس دباؤ کی قطعاً پروا نہ کی اور اسلامیہ کالج کے طلبہ کو نہ صرف کالج کی گراؤنڈ بلکہ نیو ہوسٹل استعمال کرنے کی بھی اجازت دے دی۔

اس کانفرنس کے سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس کا سارا انتظام اول سے لے کر آخر تک طلبہ نے کیا۔ انہوں نے ہی اس کے لیے چندہ جمع کیا، انہوں نے ہی پنڈال تعمیر کیا۔ قائداعظم کی حفاظت اور ان کے آرام کے جملہ فرائض خود ہی سرانجام دیئے۔ اس کانفرنس میں قائداعظم طلبہ کے مہمان تھے۔ طلبہ ہی نے ان کے قیام لاہور کا سارا پروگرام مرتب کیا۔ ملاقات کرنے والوں سے وقت بھی وہی مقرر کرتے تھے۔ حتیٰ کہ وزیراعظم پنجاب کو بھی قائداعظم سے ملاقات کرنے کے لئے طلبہ ہی سے رجوع کرنا پڑا اور انہوں نے ہی وقت ملاقات کا تعین کیا۔ بعض عناصر جو اس کانفرنس کے انعقاد کے مخالف تھے شرارت پر اتر آئے اور کانفرنس کے لئے جو وسیع اور شاندار پنڈال تعمیر کیا گیا تھا انہوں نے رات کی تاریکی میں اسے گرا دیا۔ مگر پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے طلبہ نے رات ہی رات میں سارا پنڈال دوبارہ تعمیر کر دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لاہور خصوصاً اسلامیہ کالج کے مسلمان طلبہ میں قائداعظم اور پاکستان کے لئے کیسا جنون پیدا ہو چکا تھا۔[1]

قائداعظم کی تشریف آوری

یکم مارچ کو صبح ۸ بجے قائداعظم بذریعہ ایکسپریس سے لاہور پہنچے۔ ریلوے سٹیشن پر عوام کا اتنا اژدحام تھا کہ مجمع کو کنٹرول کرنا ناممکن ہو گیا اور قائداعظم کو دوسرے دروازے سے باہر لایا گیا۔ ریلوے اسٹیشن سے قائداعظم سیدھے اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں تشریف لے گئے اور مسلم لیگ کا جھنڈا لہرایا۔ اس موقع پر آپ نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"میں تہہ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے عزت بخشی اور اس قدر محبت اور

---

[1] یہ معلومات مجھے اپنے محترم دوست جناب آفتاب قرشی سے حاصل ہوئی جو اپنے زمانے میں پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے نہایت سرگرم کارکن تھے اور جنہوں نے تحریک پاکستان میں اپنے رفقاء کیساتھ بڑی جانفشانی سے حصہ لیا۔ (مولف)

جوش سے میرا استقبال کیا کہ مجھے اسٹیشن سے باہر نکلنے کا راستہ بھی نہ مل سکا۔ مجھ سے اتنا پیار اور اتنا ظلم ہوا کہ مجھے عقبی دروازے سے نکلنا پڑا۔ یہ سب پیار و محبت درست سہی، تنظیم بھی ضروری ہے۔ مسلمانوں کو تنظیم کی خاص ضرورت ہے۔ آپ نے یہ عزت مجھے بخشی ہے کہ میں لاہور میں مسلم لیگ کا جھنڈا بلند کروں۔ مسلم لیگ نے تین سال میں آپ کو ایک پلیٹ فارم دیا ہے اور صرف ایک پلیٹ فارم ہی نہیں بلکہ ایک پروگرام دیا ہے ـــــ ہمارا مقصد لاہور ریزولیشن جسے عرفِ عام میں پاکستان کہتے ہیں حاصل کرنا ہے۔ پنجاب کے مسلمانوں میں پاکستان کے لئے سب سے زیادہ جذبہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اس میں سب سے زیادہ فائدہ پنجاب کے مسلمانوں کو پہنچے گا۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے کام میں روڑے اٹکانے والے موجود ہیں لیکن پاکستان کو اب کوئی انسان نہیں روک سکتا۔" [۱]

ٹھیک ۱۰ بجے پاکستان کانفرنس کا پہلا اجلاس قائداعظم کی زیر صدارت شروع ہوا۔ اخبارات کے اندازے کے مطابق حاضرین کی تعداد ۲۰ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ خواتین کے لئے علیحدہ انتظام کیا گیا تھا۔ اسٹیج پر ملک کی ممتاز مسلم لیگی شخصیتیں موجود تھیں جن میں نوابزادہ لیاقت علی خاں، سر سعد اللہ، چوہدری خلیق الزماں، نواب ممدوٹ، ملک برکت علی، سر عبدالقادر، اور میاں بشیر احمد کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

تلاوتِ قرآن حکیم سے اجلاس کا آغاز ہوا۔ مرزا عبدالحمید صدر پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ اس کے بعد قائداعظم نے اجلاس سے خطاب کیا۔ آپ کی تقریر کے یہ الفاظ تاریخی قدر و قیمت کے حامل تھے:

"جب آپ کا دعوت نامہ مجھے ملا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے اور آپ کے مابین گہرا رشتہ اخوت ہے۔ اس لئے میں نے دلی شکریہ کے ساتھ آپ کی اس دعوت کو قبول کر لیا۔ مجھے آپ کی دعوت سے صاف طور پر یہ حقیقت نظر آ گئی کہ آپ اس کانفرنس سے پنجاب میں ایک نئے دور کا آغاز کر رہے ہیں۔ یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ مسلم لیگ کی قرارداد لاہور بھی اسی شہر میں ۲۳ مارچ [۲] کو منظور ہوئی تھی اور آج آپ کی کانفرنس بھی یکم مارچ کو منعقد ہو رہی ہے۔ میں آپ سے کہوں گا کہ "مارچ آن" یعنی بڑھے چلو۔

اس کے بعد عبدالستار خاں نیازی ایم اے نے پاکستان ریزولیشن پیش کرتے ہوئے نہایت پر جوش تقریر کی۔

---

[۱] تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء ص ۱۴۷ مولفہ چوہدری حبیب احمد۔ [۲] اس تقریر کی رپورٹنگ کرنے والے سے سہو ہوا قائداعظم نے ۲۳ مارچ نہیں ۲۴ مارچ فرمایا ہوگا۔ (مولف)

مرزا عبدالحمید نے ریزولیشن کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا نام ہے۔ یہ ہمارے تمام امور پر حاوی ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ اسلام کے قانون کے مطابق اپنا پروگرام تیار کریں۔ قائدِ اعظم کی افتتاحی تقریر کے بعد پاکستان ریزولیشن متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔ لے

مسلم گرلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن

تحریکِ پاکستان میں لاہور کی مسلمان طالبات نے بھی پوری سرگرمی سے حصہ لیا اور اس کے آغاز کا سہرا بھی انجمن حمایت اسلام کے اسلامیہ کالج برائے خواتین کے سر بندھتا ہے۔ چنانچہ پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے قیام کے بعد اسلامیہ کالج کی طالبات نے "مسلم گرلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن" کے نام سے اپنی ایک تنظیم قائم کی۔ پاکستان کانفرنس کے موقع پر مسلم طالبات کی اس تنظیم کی طرف سے بھی قائدِ اعظم کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ اس سپاسنامے کے جواب میں قائدِ اعظم نے جو تقریر کی اس کے بعض حصے اس لحاظ سے خاص طور سے قابلِ مطالعہ ہیں کہ ان میں قائدِ اعظم نے دو قومی نظریہ اور تقسیمِ ملک کے پس منظر پر نہایت جامعیت سے روشنی ڈالی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ:-

"مسلمانوں نے متواتر پچیس سال ہندو مسلم سمجھوتے کے لئے کوششیں کی مگر یہ کوشش ناکام رہی اور اس ناکامی میں قدرت کا ہاتھ کارفرما تھا۔ قدرت نہیں چاہتی تھی کہ ان دو قوموں میں جن میں کوئی چیز مشترک نہیں کوئی غیر فطری سمجھوتہ ہو۔ اس قسم کا کوئی سمجھوتہ ہوتا تو اس کا لازمی انجام ایک عبرتناک تباہی ہوتا۔"

"بعض لوگ پاکستان کے لفظ سے عوام کو ڈراتے ہیں۔ حالانکہ ہر ایماندار آدمی جانتا ہے کہ پاکستان سے ہماری مراد کیا ہے۔ یہ لوگ بددیانتی سے کام لے کر شرارت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن مجھے اس قسم کی شرارتوں سے خائف نہیں کیا جا سکتا۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ میں ہر مرتبہ پاکستان کا لفظ استعمال کروں گا۔"

"ہندوستان کبھی ایک ملک نہ تھا۔ یہاں کبھی ایک قوم آباد نہ تھی۔ صرف جغرافیائی اعتبار سے ہی نہیں ثقافتی اعتبار سے بھی اور سیاسی اعتبار سے بھی ہندوستان کبھی ایک ملک نہیں رہا۔"

"ہندو راج کا مقصد مسلم تمدن کی روح کو کچلنا ہے۔ ہندو کے ارادوں کا ثبوت ڈھائی سالہ کانگرسی عہدِ وزارت میں مل چکا ہے۔ اب چارہ کار کیا ہے؟ ہندوستان کی مشترکہ حکومت ناممکن ہے۔ میرے نزدیک ہمارے مسئلہ کا واحد حل تقسیمِ ہند ہے۔ مسلمان کو اس کے قومی وطن میں رہنے دو اسے اپنی مرضی کے مطابق حکومت کرنے دو۔ تم اپنے وطن میں حکومت کرو۔ اس کے بعد ہم دوستانہ طور پر ایک دوسرے سے تعاون کر سکتے ہیں۔"

لے تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء ص ۱۲۹، ۱۳۰

"دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کو کسی طرح ایک نہیں کہا جا سکتا اور ہندو قوم کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ مغربی جمہوریت کے اصولوں کی بنا پر مرکز میں اکثریت حاصل کر کے مسلمان قوم کے لئے قانون مرتب کرے۔ پاکستان کے حصول کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ مسلسل جدوجہد کرو اور اس کے لئے دن رات کام کرو۔ اس وقت تک آرام نہ کرو جب تک پاکستان قائم نہیں ہو جاتا اور اگر ضرورت پڑے تو پاکستان کے لئے مر جاؤ۔" [1]

حقیقت یہ ہے کہ لاہور کی اس پاکستان کانفرنس نے نہ صرف لاہور بلکہ پنجاب بھر میں حرکت عمل کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔ اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لئے پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے اراکین نے اسلامیہ کالج لاہور کے طلبہ کے علاوہ لاء کالج، گورنمنٹ کالج، دیال سنگھ کالج اور ایف سی کالج کے مسلمان طلبہ سے رابطہ قائم کیا اور انہیں کانفرنس سے تعاون کرنے پر آمادہ کر لیا۔ لاہور کے علاوہ بیرون جات کے مسلمان طلبہ کو بھی کانفرنس میں شمولیت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس دعوت پر کثیر تعداد میں طلبہ لاہور آئے۔ جن کے قیام کا انتظام اسلامیہ کالج لاہور کے ریواز ہوسٹل میں کیا گیا۔ یہ طلبہ لاہور کی پاکستان کانفرنس سے عزم وعمل کا نیا جذبہ لے کر واپس گئے اور اپنے اپنے شہروں میں نظریۂ پاکستان کی تبلیغ واشاعت کے کامیاب مبلغ ثابت ہوئے۔ اس کانفرنس نے پنجاب کے مسلمانوں کو اپنی حکومت کا تصور دیا اور وہ اس کے قیام کے لئے کوشاں ہو گئے۔

کانفرنس کے اختتام کے بعد پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے اراکین نے صوبہ کا وسیع دورہ کرنے کا پروگرام بنایا تاکہ دور دراز کے مسلمان عوام اور طلبہ میں بیداری پیدا کی جا سکے۔ ان میں طلبہ میں ڈاکٹر الیاس مسعود، چوہدری نصر اللہ خاں، عبدالستار خاں نیازی، مرزا عبدالحمید، ذکی الدین پال، اکرام قمر، چوہدری محمد صادق، ظہور الحسن ڈار اور منظور الحق صدیقی کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے امرتسر، جالندھر، ہوشیار پور، رہتک، انبالہ، راولپنڈی، سیالکوٹ اور بعض دوسرے شہروں کا دورہ کیا۔ ایک وفد نے جو ڈاکٹر الیاس مسعود اور ظہور الحسن ڈار پر مشتمل تھا شیخوپورہ کے دور دراز دیہات کا رخ کیا اور وہاں کے مسلمان طلبہ اور مسلمان عوام تک مسلم لیگ اور پاکستان کا پیغام پہنچایا۔ اس موقع پر راجہ حسن اختر مرحوم نے جو اس وقت شیخوپورہ میں افسر مال تھے سرکاری ملازم ہونے کے باوجود طلبہ کی بڑی معاونت کی۔[2] تحریک پاکستان میں پنجاب کے ایک اور مسلمان افسر خواجہ عبدالرحیم (ریٹائرڈ لامر) کی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جنہوں نے سرکاری ملازم ہوتے

---

[1] تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء صفحہ ۱۳۱، تا صفحہ ۱۳۲

[2] یہ معلومات مجھے میرے دوست جناب آفتاب قریشی سے حاصل ہوئی۔ (مؤلف)

ہوئے تحریکِ پاکستان کے کارکنوں خصوصاً طلبہ کی ہر ممکن امداد کی اور ان کے مشن کو آگے بڑھانے میں متعدد آسانیاں بہم پہنچائیں۔

۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۶ء کا درمیانی زمانہ برصغیر کی سیاست کا نہایت ہنگامہ خیز دور تھا۔ اسی زمانے میں کانگرس اور حکومت کے درمیان تصادم ہوا جو دراصل مسلمانوں کے خلاف جنگ تھی۔ اسی دور میں مسلم لیگ اور کانگرس کا آخری معرکہ ہوا اور اسی دور میں تحریکِ پاکستان کو وہ عروج حاصل ہوا جس نے برصغیر کی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ یہی وہ دور تھا جس میں پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے قائدِ اعظم کی ہدایت پر ہندو، سکھ، کانگرسی مسلمانوں، ان کے حامیوں اور انگریزوں کے خلاف تاریخی جنگ لڑی۔ ۱۹۴۲ء کے آغاز میں میاں بشیر احمد نے فیڈریشن کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور حمید نظامی دوبارہ فیڈریشن کے صدر منتخب ہوئے۔ ملک ڈاکٹر الیاس مسعود کو سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ ۱۹۴۲ء میں جب کانگرس نے حکومت کے خلاف "کوئٹ انڈیا" کی تحریک چلائی تو اس موقع پر حمید نظامی نے قائدِ اعظم کی ہدایت پر پے در پے بیانات دیئے اور مسلمان طلبہ کو مشورہ دیا کہ وہ کانگرس کے دام فریب میں نہ آئیں۔ اس دور میں شیخ حامد محمود، ظہور عالم شہید، یحییٰ بختیار، سید قاسم رضوی، آفتاب قرشی، ضیاء الاسلام، خواجہ اشرف، خلیفہ امام الدین لقا، شیخ غلام احمد، اکرام قمر، انصار احمد خاں، شمس الحق جالندھری اور اکرام الحق نے نہایت سرگرمی سے تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا۔

آل انڈیا مسلم فیڈریشن

برصغیر کے تمام مسلمان طلبہ کی ملک گیر تنظیم آل انڈیا مسلم فیڈریشن نے بھی اس دور میں تحریکِ پاکستان کے لئے بڑا کام کیا۔ اس کے صدر راجہ صاحب محمود آباد اور سیکرٹری محمد نعمان تھے۔ اس تنظیم کے ذریعہ صوبائی فیڈریشنوں کے درمیان رابطہ قائم رہتا تھا۔ اس طرح برصغیر کے مسلمان طلبہ مسلم لیگ کے جھنڈے نیچے نہایت منظم طریقے سے معینہ خطوط پر تحریکِ پاکستان کے لئے کام کرتے تھے۔ ستمبر ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ کے دفتر دریا گنج دہلی میں منعقد ہوا۔ پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے بھی ایک وفد نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ حمید نظامی، ضیاء الاسلام، بشیر احمد ایڈووکیٹ اور آفتاب قرشی اس وفد کے رکن تھے۔ اس اجتماع میں آفتاب قرشی نے ایک قرارداد پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ کانگرس کی تحریک "ہندوستان چھوڑ دو" سے مسلمانوں کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ اس تحریک کا مقصد دراصل انگریزوں کو ہندوستان سے بیدخل کرکے ملک پر ہندو راج قائم کرنا ہے۔ قرارداد میں مسلمان نوجوانوں کی طرف سے قائدِ اعظم کی قیادت پر پورے اعتماد کا اظہار کیا گیا تھا۔ یہ قرارداد متفقہ طور پر منظور ہوئی۔ اس خبر کو نہ صرف ہندوستان کی خبر رساں ایجنسیوں اور یہاں کے اخبارات نے بڑے اہتمام سے شائع کیا بلکہ بی بی سی نے کئی بار نشر کیا۔

نومبر ۱۹۴۲ء میں پھر آل انڈیا مسلم فیڈریشن کا اجلاس منعقد ہوا۔ اب کی بار اس کے لیے پنجاب کے مردم خیز شہر جالندھر کو منتخب کیا گیا۔ یہیں اور انھیں تاریخوں میں پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی مجلس استقبالیہ کے صدر میاں بشیر احمد اور پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی مجلس استقبالیہ کے صدر جالندھر کے ایک طالب علم احسان الحق انور تھے جو آج کل سان فرانسسکو میں پاکستانی قونصل ہیں۔ مسلمان طلبہ کے یہ بڑے ہنگامہ خیز اور نہایت کامیاب اجلاس تھے۔ جن میں شرکت کے لئے پنجاب کے علاوہ بنگال، یوپی (خصوصاً علی گڑھ)، بمبئی، سندھ، سرحد اور دوسرے صوبوں میں سے کثیر تعداد میں مسلمان نوجوانوں نے شرکت کی۔ ان اجتماعات نے مشرقی پنجاب خصوصاً انبالہ اور جالندھر ڈویژن کے مسلم طلبہ میں بڑی بیداری اور تحریک پاکستان کے لئے بڑی لگن پیدا کر دی۔

بنگال اور تحریک پاکستان

سرزمین بنگال برصغیر کا وہ علاقہ ہے جہاں آزادی کی جنگ سب سے پہلے لڑی گئی۔ نواب سراج الدولہ اور اس کے بعد نواب میر قاسم نے انگریزوں سے نبرد آزما ہو کر اپنے خون سے بنگال کے مسلمانوں کی حریت پسندی کی وہ شمع روشن کی جس کی تابانی کسی دور میں کم نہ ہوئی۔ اسی سرزمین سے حاجی شریعت اللہ اور تیتو میر اٹھے اور مسلمانوں کی اخلاقی اصلاح کا فریضہ ادا کرنے کے علاوہ انگریز اور ہندو دونوں کے تسلط کے خلاف اپنی تحریکیں جاری کیں۔ اسی سرزمین پر مسلمانانِ ہند کی سب سے بڑی اور منظم جماعت "مسلم لیگ" کا قیام عمل میں آیا جس نے آگے چل کر مسلمانانِ ہند کو آزادی کی نعمت سے بہرہ ور کیا۔ انگریزی سامراج کے خلاف مسلح جدوجہد کا مرکز بھی ہمیشہ بنگال ہی رہا اور یہاں کے حریت پسندوں نے کاروانِ آزادی کی قیادت کی۔ تحریک پاکستان میں بھی بنگال کے مسلمانوں نے بھرپور حصہ لیا۔ مولوی فضل الحق[1]، خواجہ ناظم الدین، مولانا عبدالحمید خان بھاشانی، حسین شہید سہروردی، مولانا اکرم خان، حمید الحق چوہدری، ابو الہاشم خان، خواجہ نور الدین، مولوی تمیز الدین خان، عبدالرحمٰن صدیقی، محمد علی بوگرہ، نور الامین، موہن میاں، فضل الرحمان اور حسن اصفہانی صفِ اول کے وہ مجاہدینِ آزادی ہیں جنہوں نے قائداعظم کے دست و بازو بن کر نہ صرف بنگال بلکہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں میں جذبۂ حریت بیدار کیا اور نظریہ پاکستان کی تبلیغ و تشہیر کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا۔

بنگال کے ان بزرگ سیاستدانوں کے ساتھ ساتھ بنگالی نوجوانوں خصوصاً بنگالی طلبہ نے تحریک پاکستان میں سرفروشانہ کردار ادا کیا۔ اُس وقت کے ان نوجوانوں میں فضل القادر چوہدری، شیخ ظہیر الدین، ابو القاسم خان،

---

[1] افسوس کہ مولوی فضل الحق اور قائداعظم کے درمیان وائسرائے کی ڈیفنس کونسل میں شرکت کے مسئلے پر سخت اختلافات پیدا ہو گئے جو تحریک پاکستان کے اختتام بلکہ قائداعظم کی وفات تک جاری رہے۔ اسلئے وہ تحریک پاکستان میں حصہ نہ لے سکے۔ (مولف)

شاہ عزیز الرحمٰن، مسیح الرحمٰن، شیخ مجیب الرحمٰن، قاضی عبدالقادر، اے۔ ٹی۔ ایم مصطفیٰ، محمد ابراہیم، معین الحق چوہدری اور عبدالشکور کے اسمائے گرامی سرِ فہرست ہیں۔ ان لوگوں نے ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک مختلف ادوار میں وطنِ عزیز کی آزادی کے لئے بڑا کام کیا۔ ۱۹۴۰ء میں جب قرار دادِ پاکستان منظور ہوئی تو ان نوجوان طلبہ کی جدوجہد ایک نئے مرحلے میں داخل ہو گئی۔ "بنگال مسلم اسٹوڈنٹس لیگ" نظریۂ پاکستان کے حامی نوجوانوں کی وہ تنظیم تھی جس نے برصغیر کے دوسرے طلبہ کی تنظیموں کے دوش بدوش تحریکِ پاکستان میں پرجوش حصہ لیا۔ اس تحریک کا مرکز اسلامیہ کالج کلکتہ تھا۔ جس کے پرنسپل مشہور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر آئی۔ ایچ۔ زبیری خود مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کے بہت بڑے حامی تھے۔ اس طرح بنگال کے مسلمان طلبہ کی اور بھی حوصلہ افزائی ہوئی اور وہ قیامِ پاکستان کے لئے میدانِ عمل میں آ گئے۔ بنگال کے مسلمان انگریز اور ہندو دونوں کے متحدہ ظلم و ستم سے پامال ہو رہے تھے۔ ان مسلمان نوجوانوں نے انگریز کے تسلط کے خلاف تحریک چلانے کے ساتھ ساتھ ہندو تمدن کے غلبے کے خلاف بھی بھرپور جدوجہد کی۔ ان طلبہ نے یہ جنگ اسلام کے نام پر لڑی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ اس تحریک کے خلاف سرفروشانہ جہاد ہے جو بنگالی نیشنلزم کے نام پر جاری ہوئی تھی اور جس کا مقصد متحدہ بنگال کی آزادی تھا۔ اس پردے میں بنگال پر ہندو غلبہ برقرار رکھنے کی منظم سازش کی جا رہی تھی۔ قائد اعظم، خواجہ ناظم الدین، مولوی تمیز الدین خان، مولانا اکرام خان، ابوالہاشم خان اور دوسرے بنگالی رہنماؤں کی قیادت میں بنگال کے مسلمان نوجوانوں اور عوام دونوں نے اس سازش کو ناکام بنانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔

نظریۂ پاکستان کی بنیاد پر جب بنگال میں عام انتخابات ہوئے تو بنگال کے مسلمان طلبہ اور عام مسلم لیگی کارکن گاؤں گاؤں پھیل گئے اور بنگالی مسلمانوں کو نظریۂ پاکستان سے روشناس کرانے کے بعد انہیں مسلم لیگی امیدواروں کی حمایت پر آمادہ کیا۔ اس پُرجوش جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ کو انتخابات میں ۹۰ فی صد کامیابی ہوئی اور حسین شہید سہروردی کی مسلم لیگی وزارت برسرِ اقتدار آ گئی۔ اس طرح مسلم اکثریت کے ایک بہت بڑے بلکہ سب سے بڑے صوبے میں پاکستان کا پرچم لہرانے لگا۔

آسام اور تحریکِ پاکستان

بنگال کے بعد آسام دوسرا صوبہ تھا جو ۱۹۴۰ء کی قرار دادِ لاہور کے مطابق پاکستان کے مشرقی بازو کا حصہ بننے والا تھا۔ یہاں مسلمان، ہندو اور پہاڑی اقوام آباد ہیں۔ ان اقوام کی اکثریت عیسائیوں پر مشتمل ہے اور یہ ہمیشہ سے ہندوؤں سے نفور اور مسلمانوں سے قریب رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب انڈیا ایکٹ کے تحت صوبائی انتخابات ہوئے تو یہاں مسلم لیگ بہت بڑی اکثریت سے کامیاب ہوئی اور سر سعد اللہ کی قیادت میں مسلم لیگی وزارت قائم ہو گئی۔ اس کے بعد ایک مرحلہ ایسا آیا جب سر سعد اللہ کی وزارت کو استعفیٰ دینا پڑا اور جب کانگرس

وزارت مستعفی ہوئی تو پھر سر سعد اللہ کی قیادت میں مسلم لیگ نے حکومت قائم کر لی۔ آسام میں سر سعد اللہ، مولانا عبد الحمید خاں بھاشانی، عبد المتین چوہدری، عبد الرؤف وکیل، منور علی، مدبر حسین چوہدری، چوہدری عبد الباسط، محمود علی، عبد الحئی، عبد الہادی اور معین الدین چوہدری مسلم لیگ کے نہایت پر جوش حامی تھے اور تحریکِ پاکستان کے نہایت سرگرم کارکن۔ ان میں مولانا عبد الحمید خاں بھاشانی کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ وہ بنگالی زبان کے شعلہ بیان مقرر اور تحریکِ آزادی کے نہایت تجربہ کار رہنما تھے۔ تحریکِ خلافت کے زمانے سے قومی تحریکوں میں حصہ لیتے چلے آئے تھے۔ ان کا بنگال اور آسام دونوں صوبوں کے عوام پر نہایت گہرا اثر تھا۔ ان کی قیادت میں آسام کے مسلمانوں نے تحریکِ پاکستان میں بھر پور حصہ لیا۔ جلسوں، جلوسوں اور ممبر سازی کی مہم نے آسام میں مسلم لیگ کا پیغام گاؤں گاؤں پہنچا دیا۔ آسام کے مسلمان طلبہ نے تحریکِ پاکستان میں نئی زندگی پیدا کر دی۔ اس مرحلے پر ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ سلہٹ کے ریفرنڈم میں مسلم لیگ کی کامیابی تو تمام تر مولانا عبد الحمید خاں بھاشانی کی مساعیٔ جمیلہ کی رہینِ منت تھی۔

سندھ اور تحریکِ پاکستان

صوبۂ سندھ برصغیر پاک و ہند کا وہ خطہ ہے جہاں مسلمان فاتحین کے قدم سب سے پہلے پہنچے۔ اس سرزمین نے بڑے بڑے علما، صوفیا اور دانشور پیدا کئے۔ سندھ کے مسلمانوں نے ہر تحریکِ آزادی میں برصغیر کے مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ سر عبد اللہ ہارون، محمد ایوب کھوڑو، قاضی فضل اللہ، عبد المجید سندھی، جی ایم سید، سر غلام حسین ہدایت اللہ، سر شاہنواز خاں بھٹو، میر جعفر خاں جمالی، قاضی محمد اکبر، احمد علی تالپور، سید پیر علی محمد راشدی، پیر الٰہی بخش، ہاشم گزدر، آغا غلام نبی پٹھان، جی الانا اور یوسف ہارون سندھ کے وہ ممتاز رہنما ہیں جنہوں نے اس صوبے میں مسلم لیگ کو کامیاب بنانے کی نہایت مؤثر جد و جہد کی۔ افسوس کہ ان میں سے سب سے زیادہ نیک دل اور مسلمانوں کے ہمدرد سندھی رہنما سر عبد اللہ ہارون قرار دادِ پاکستان منظور ہونے کے دو سال بعد یعنی ۱۹۴۲ء میں وفات پا گئے۔ ان کی وفات نہ صرف سندھ کے مسلمانوں بلکہ برصغیر کے سارے مسلمانوں کے لئے بہت بڑا حادثہ تھا۔ اگر ان کی عمر وفا کرتی تو تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں سندھ کی سیاست میں جو پیچیدگیاں پیدا ہوئیں شاید وہ پیدا نہ ہوتیں اور اگر پیدا ہوتیں تو ان پر جلد قابو پا لیا جاتا۔ بہر حال سر عبد اللہ ہارون کی وفات سے سندھ میں مسلم لیگ اپنے ایک بہت بڑے سرپرست سے محروم ہو گئی۔ سندھ کے ایک مسلم رہنما اور سیاستدان اللہ بخش نے مسلمانوں اور مسلم لیگ کے لئے بڑی مشکلات پیدا کیں اور کانگریس سے مل کر سندھ کی وزارتِ عظمیٰ حاصل کر لی۔ مگر دو ہی سال میں ان کی وزارت ختم ہو گئی۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان کی سخت مخالفت کی۔ حتیٰ کہ دہلی جا کر اپریل ۱۹۴۰ء میں مسلم کانفرنس کی صدارت کی اور قراردادِ پاکستان کی مذمت میں ایک سخت تقریر کی۔

جی ایم سید سندھ کے نہایت با اثر اور ذہین سیاستدانوں میں شمار ہوتے ہیں اور بلا شبہ ان کی وجہ سے اس صوبے میں مسلم لیگ کو نہایت مقبولیت حاصل ہوئی۔ انہوں نے تحریک پاکستان کے لئے ٹھوس کام کیا مگر افسوس کہ عام انتخابات کے قریب انہوں نے بھی قائداعظم اور مسلم لیگ کی مخالفت شروع کر دی۔ اور جب صوبائی انتخابات ہوئے تو انہوں نے مسلم لیگی امیدوار کا مقابلہ کیا۔ اس طرح ان کی ذات سے سندھ میں تحریکِ پاکستان کو بڑا نقصان پہنچا۔ بہر حال ان دو چار مسلمان سیاست دانوں کے علاوہ سندھ کے سن رسیدہ اور نوجوان دونوں طبقوں نے تحریک پاکستان میں سرگرم حصہ لیا۔

جب صوبائی انتخابات کا مرحلہ آیا جو مسلم لیگ نے نظریہ پاکستان کی بنیاد پر لڑے تو سندھ کی مسلم سیاست نہایت نازک دور سے گزر رہی تھی۔ سب سے سخت مقابلہ جی ایم سید سے تھا۔ سندھ کی اقتصادیات پر ہندو سیٹھوں کا تسلط تھا اور کانگریس نے اپنی ساری طاقت سندھ میں جمع کر دی تھی تاکہ مسلم اکثریت کے اس صوبے میں مسلم لیگ کامیاب نہ ہونے پائے۔ خود قائداعظم سندھ کے بارے میں سخت فکر مند تھے۔ چنانچہ انہوں نے مسلم لیگی امیدواروں کی اعانت کی غرض سے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ یوسف ہارون اس کے چیئرمین اور جی الانا سیکرٹری مقرر کئے گئے۔ حسن علی عبدالرحمٰن (سندھ یونیورسٹی کے ایک وائس چانسلر) اور ڈاکٹر اے ایچ صدیقی اس کمیٹی کے ممبروں میں شامل تھے۔ انتخابات شروع ہونے سے قبل قائداعظم نے کراچی تشریف لا کر سندھ کے ایک مسلم لیگی رہنما جی الانا سے سندھ کی مسلم سیاست پر گفتگو کی اور جب انہیں بتایا گیا کہ مسلم لیگ کا پروپیگنڈہ کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ رقم کی ہے۔ کیونکہ ٹرانسپورٹ اور پٹرول کے کاروبار پر ہندوؤں کی اجارہ داری ہے۔ جب تک کارکنوں کو گاڑیاں اور پٹرول مہیا نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت تک مسلم لیگ کا پیغام سندھ کے دور دراز علاقوں تک پہنچانا مشکل ہے۔ یہ سن کر قائداعظم نے مسلم لیگ کے فنڈ سے پچاس ہزار روپے جی الانا کو دیئے اور ہدایت فرمائی کہ مسلمانوں کی تمام نشستوں پر لیگی امیدواروں کو کامیاب ہونا چاہیئے۔

سندھ کے انتخابات میں سب سے بڑا معرکہ جی ایم سید کے حلقہ انتخاب میں تھا۔ سید صاحب سندھ کی نہایت با اثر شخصیت ہونے کے علاوہ پیر بھی ہیں اور ان کے مریدوں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ اس محاذ کو فتح کرنے کیلئے قائداعظم کی ہدایت پر متعدد مسلم لیگی رہنماؤں کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک سو طلبہ سندھ پہنچے اور انہوں نے اس انتخاب میں مسلم لیگی امیدوار کی کامیابی کے لئے بھرپور کوشش کی۔ انتخابات ہوئے اور مسٹر جی ایم سید ہار گئے۔[۱]

---

[۱] یہ معلومات مسٹر جی الانا کی کتاب قائداعظم جناح - دی اسٹوری آف اے نیشن سے ماخوذ ہیں اور کچھ چوہدری خلیق الزماں کی کتاب "پاتھ وے ٹو پاکستان" سے۔ (مرتب)

صوبہ سرحد اور پاکستان

برصغیر کے صوبوں میں صوبہ سرحد وہ علاقہ ہے جو اپنی شجاعت اور ایمانی غیرت کے لحاظ سے نہایت درجہ ممتاز ہے۔ اس علاقے کے مسلمان نہایت غیور، خود دار اور اسلام کے نام پر کٹ مرنے والے ہیں مگر بدقسمتی سے مسلم لیگ کو عرصے تک اس صوبے میں اپنی تنظیم قائم کرنے کا موقع نہ ملا۔ کانگرس نے مسلم لیگ کی اس کوتاہی سے فائدہ اٹھایا اور یہاں کے دو بااثر خانوں خان عبدالغفار خاں اور ڈاکٹر خان کو شیشے میں اتار لیا۔ خان عبدالغفار نے خدائی خدمتگار تحریک جاری کی جو کانگرس کا ضمیمہ تھی۔ مسٹر گاندھی کے اصول اہنسا (عدم تشدد) پر انہوں نے اپنی تحریک کی بنیاد رکھی اور گاندھوی طور طریقے اپنا لئے۔ اس طرح وہ افغان جو شجاعت کا پیکر اور وہ صوبہ جو برصغیر کا بازوئے شمشیر زن تھا نہ صرف کانگرس کی آغوش میں چلا گیا بلکہ اسے بزدلی کا سبق سکھایا جانے لگا۔ خان عبدالغفار خان اور ڈاکٹر خاں کی کوششوں سے پہلے صوبائی انتخابات میں یہاں کانگرسی وزارت قائم ہو گئی۔ جس کے سربراہ ڈاکٹر خان صاحب تھے۔ اس صورت حال نے مسلم لیگ کو جھنجھوڑا اور صوبہ سرحد میں لیگ کا نظام قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی بھی تشکیل دی گئی۔ باوجودیکہ صوبہ سرحد میں کانگرس کا طوطی بول رہا تھا مگر اس صوبے میں ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جنہیں تھوڑی سی تحریک سے بیدار کیا جا سکتا تھا۔ سردار اورنگ زیب خاں، خان تقی خاں، میاں ضیاء الدین سجاد احمد جان ایڈووکیٹ (اب جسٹس سجاد احمد جان) اور خان بہادر سعد اللہ خاں تو صوبہ سرحد کے وہ پرجوش اور غیور مسلمان تھے جو کانگرس سے نفور اور مسلم لیگ کی طرف مائل تھے۔ انہی اصحاب کی کوششوں سے ۱۹۳۹ء میں ایبٹ آباد میں مسلم لیگ کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس صوبے میں مسلم لیگ کا یہ پہلا اجتماع تھا۔ اس کانفرنس کی صدارت مشہور مسلم لیگی رہنما چوہدری خلیق الزماں نے کی۔ کانفرنس دو دن جاری رہی۔ اس کانفرنس نے پشاور سے ایبٹ آباد تک صوبہ سرحد کے مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونک دی اور یہاں کے لوگ مسلم لیگ اور قائداعظم کے نام سے روشناس اور ان کے پیغام سے واقف ہوئے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایبٹ آباد کی مسلم لیگ کانفرنس نے صوبہ سرحد میں تحریک پاکستان کے لئے تخم ریزی کا کام کیا۔ [۱]

خان عبدالقیوم کی مسلم لیگ میں شرکت

رفتہ رفتہ مسلم لیگ نے صوبہ سرحد میں ضلعی شاخیں قائم کرنی شروع کر دیں۔ غیور افغان بیدار ہونے لگے،

---

[۱] یہ معلومات چوہدری خلیق الزماں کی کتاب "پاتھ وے ٹو پاکستان" سے ماخوذ ہے۔ (مولف)

خان برادران کا سحر ٹوٹنے لگا۔ تعلیم یافتہ طبقہ خاص طور سے مسلم لیگ کی طرف کھنچنے لگا۔ اب تک خان عبدالغفار خان سادہ لوح پٹھانوں کو یہ کہہ کر گمراہ کرتے تھے کہ خلافت کی تحریک میں کانگرس اور گاندھی نے مسلمانوں کی کی امداد کی تھی۔ مسلم لیگ نے اس مسئلے میں کسی قسم کی سرگرمی نہیں دکھائی۔ اس لئے کانگرس ہی ایسی جماعت ہے جو مسلمانوں کے مفادات کی نگرانی کر سکتی ہے۔ اب مسلم لیگی لیڈروں نے خان عبدالغفار خاں کا سحر یہ کہہ کر توڑنا شروع کیا کہ یہ مسلم لیگ اور قائد اعظم ہی تھے جنہوں نے صوبہ سرحد کو دوسرے صوبوں کے مساوی سیاسی اصلاحات دینے کے لئے حکومت اور کانگرس سے طویل جنگ لڑی جب کہ کانگرس اس مطالبے کی مخالفت پر آخر وقت تک کمر بستہ رہی۔ اگر کانگرس صوبہ سرحد کے عوام کی حقیقی ہمدرد ہوتی تو وہ ان اصلاحات کی کبھی مخالفت نہ کرتی۔ اس نے افغانوں کے جائز حق کی مخالفت کر کے ثابت کر دیا کہ وہ انہیں بدستور پس ماندہ اور ہندوؤں کا زیر دست رکھنا چاہتی ہے۔ یہ دلیل نہایت ٹھوس، ناقابلِ تردید اور واقعات کے عین مطابق تھی اس لئے باشعور افغانوں کے دل میں اتر گئی۔ اس کے بعد ہی پے در پے دو ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے صوبہ سرحد میں مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کو افغان عوام میں مقبول بنا دیا۔ پہلا اور سب سے بڑا واقعہ خان عبدالقیوم خاں کی مسلم لیگ میں شرکت ہے۔ خان موصوف صوبہ سرحد کے نہایت بااثر کانگرسی رہنما تھے۔ ان کی اسی مقبولیت اور اثر و نفوذ کا نتیجہ تھا کہ کانگرس نے انہیں مرکزی اسمبلی میں اپنی پارٹی کا ڈپٹی لیڈر منتخب کیا تھا۔ خان عبدالقیوم خاں نے عرصے تک واقعات کا مشاہدہ کیا اور کانگرس کے مسلم دشمن طرزِ عمل سے دل برداشتہ ہو کر اس فرقہ وارانہ جماعت سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ۱۸ر اگست ۱۹۴۵ء کو جبکہ وہ کسی کام سے لکھنؤ گئے ہوئے تھے انہوں نے قائد اعظم کی خدمت میں ایک خط لکھا جس کے یہ الفاظ تاریخی نوعیت کے حامل ہیں۔

"میرے محترم قائد اعظم:

میں آپ کو اپنی زندگی کے سب سے عظیم الشان فیصلے سے مطلع کرنا چاہتا ہوں۔ یہ فیصلہ مہینوں اور ہفتوں کی دلسوزی اور دماغ سوزی کا نتیجہ ہے۔ میں نے مسلم لیگ میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ آپ نے جو حکمت عملی اختیار کی ہے وہ بالکل درست ہے اور جو مسلمان بھی آپ کی مخالفت کرتا ہے وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔ میں آپ کے حکم کا منتظر ہوں۔ آپ جیسا فرمائیں گے۔ ویسا ہی کروں گا۔ آپ کا مخلص

عبدالقیوم" [1]

---

[1] حیاتِ محمد علی جناح ص ۴۶۸

خان عبدالقیوم کے اس انقلابی فیصلے نے صوبہ سرحد میں حالات کا نقشہ ہی بدل دیا اور صرف ایک سال کے قلیل عرصے میں صوبہ سرحد کے اس مرد آہن کی جد وجہد کی بدولت مسلم لیگ کو ایسی زبردست کامیابی حاصل ہوئی کہ جس کی مثال کم ہی ملے گی۔ اس کے چند ماہ بعد دوسرا واقعہ رونما ہوا جب ڈاکٹر خان صاحب کی کانگرسی وزارت کے وزیر صنعت خان عباس خاں نے ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو کانگرسی وزارت سے استعفیٰ دے کر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور اپنے فیصلے سے قائد اعظم کو مطلع کر دیا۔

قائد اعظم کا دورۂ سرحد

صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی مقبولیت اور تحریک پاکستان میں اس صوبے کے عوام کی ولولہ انگیز شرکت میں قائد اعظم کے دورۂ سرحد کو بھی بڑا دخل ہے۔ ۱۹۳۶ء کے صوبائی انتخابات کے موقع پر بھی قائد اعظم پشاور تشریف لے گئے تھے۔ مگر اس وقت ان کے ساتھ بڑی سرد مہری کا سلوک کیا گیا اور کسی نے ان کی بات تک نہ پوچھی مگر وہی قائد اعظم اسی شہر میں جب دوبارہ یعنی نومبر ۱۹۴۵ء میں تشریف لائے تو صوبہ سرحد کے افغانوں نے ان کا ایسا فقید المثال استقبال کیا کہ آج تک اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اب صوبہ سرحد میں نیشنل گارڈ کی تنظیم بھی قائم ہو چکی تھی۔ اسلامیہ کالج پشاور کے طلبہ ان کے جاں نثاروں میں شامل ہو گئے تھے۔ افغان عوام حتی کہ دیہات کے پٹھان بھی اپنے قائد کا استقبال کرنے کے لئے پشاور ریلوے اسٹیشن پر جمع تھے۔ سارا شہر دلہن کی طرح آراستہ تھا۔ سڑکوں پر ایک سو سے زائد خوبصورت دروازے بنائے گئے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ اپنے گھروں سے نکل کر اس سڑک پر آ کر دو رویہ کھڑے ہو گئے تھے جدھر سے قائد اعظم کی سواری شاہانہ شان و شوکت سے گزرنے والی تھی۔

سرحد کی مسلم سیاست میں یہ انقلاب معمولی نہ تھا۔ قائد اعظم ۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء کو پشاور پہنچے اور ۲۴ نومبر کو آپ نے ایک بہت بڑے اجتماع سے خطاب کیا۔ حاضرین کی تعداد ایک لاکھ تھی اور پشاور میں اتنا بڑا جلسہ اس سے قبل کبھی نہیں ہوا تھا۔ قائد اعظم نے اردو میں تقریر کی۔ ان کی تقریر نہایت توجہ سے سنی گئی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس تاریخی تقریر کے جستہ جستہ حصے یہاں درج کر دیئے جائیں۔

قائد اعظم کی تاریخی تقریر

"آج رات کو انسانوں کے سمندر نے مجھے باور کرا دیا ہے کہ شمال مغربی صوبے کے مسلمانوں میں اب زندگی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ پچھلی دفعہ میں ۱۹۳۶ء میں پشاور آیا تھا۔ اس ..... وقت میں نے یہاں دس دن قیام کیا تھا۔ اب پھر نو برس کے بعد آپ کے پاس آیا ہوں۔ میں بالکل واضح طور پر اس تبدیلی کو دیکھ رہا ہوں جو اس صوبہ میں پیدا ہو گئی ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ کانگرس نے جو جادو کیا تھا وہ ٹوٹ گیا۔

اور ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔ اب آپ کانگرس کے جال سے بالکل نکل چکے ———— وہ کہتے ہیں کہ مسٹر جناح اور مسلم لیگ نے کیا قربانیاں کی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ میں جیل نہیں گیا۔ پرواہ نہیں۔ میں تو ایک برا آدمی ہوں لیکن میں تم سے پوچھتا ہوں کہ ۲۱-۱۹۲۰ء میں قربانیاں کس نے دیں۔ مسٹر گاندھی ہماری کھوپڑیوں کا زینہ بنا کر قیادت کی گدی پر براجمان ہوئے لیکن ہوا کیا؟ علی برادران اسلام کے فدائی اور خادم تھے۔ جب کانگرس کا کام نکل گیا تو ان کو نکال باہر کیا ———— اب میں آپ کے صوبے کی بات کرتا ہوں۔ آپ نے ۳۱-۱۹۳۰ء میں یہاں قربانیاں کیں۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ مسلمانوں کو اس کا ثمر کیا ملا؟ ۱۹۲۴ء میں جب کہ مسلم لیگ آپ کے صوبے کی اصلاحات کے لئے لڑ رہی تھی تو کانگرس نے مرکزی اسمبلی میں اس مسئلہ کی مخالفت کی۔ کہا جاتا ہے کہ ۳۱-۱۹۳۰ء میں کانگرس آپ کی امداد پر کمربستہ ہوئی۔ بیشک وہ اب بھی تو مدد کر رہی ہے۔ کانگرس نے ابھی حال ہی میں خان عبدالغفار خاں کو ۲۵ ہزار روپیہ دیا ہے۔ یہ ہے سیاسی کھیل ———— کانگرسی کہتے ہیں کہ مسلم لیگ نے اگست کی جدوجہد میں ان کے ساتھ شرکت نہیں کی۔ ہم شریک ہوتے کیسے؟ اگست ریزولیشن کے معنی تھے ہندوؤں کی آزادی اور ہماری غلامی۔ ہماری آزادی کے مطالبے کو قبول کر لو۔ پھر دنیا دیکھے گی کہ آزادی کے لئے قربانی کرنے میں کون کس سے زیادہ ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں کسی مسلمان کا ایک قطرۂ خون بھی بیکار نہیں بہنے دوں گا۔ میں کبھی مسلمانوں کو ہندوؤں کا غلام نہیں ہونے دوں گا۔ بھولئے مت آپ کا جرنل خوب جانتا ہے کہ قربانی کا صحیح وقت کون سا ہے"۔ [1]

قائد اعظم کی اس تقریر نے صوبہ سرحد کے عوام میں حصول پاکستان کے لئے غیر معمولی جوش و خروش پیدا کر دیا۔ خان عبدالقیوم خاں، خان عباس خان، سردار اورنگ زیب خان، سردار عبدالرب نشتر، سرحد مسلم لیگ کے سیکرٹری میاں ضیا الدین، پیر صاحب مانکی شریف، سردار بہادر خاں اور دوسرے بہت سے سیاسی رہنماؤں نے اس جذبے کو برقرار رکھنے بلکہ اس میں اضافہ کرنے کے لئے شب و روز کوششیں کیں۔ ڈاکٹر خان کی وزارت نے مسلم لیگ کی جدوجہد کو دبانے کے لئے جلسوں اور جلوسوں پر پابندیاں عائد کر دیں۔

مسلم لیگ کے رضا کاروں نے خان عبدالقیوم خاں کی قیادت میں ان پابندیوں کو توڑنے کا اعلان کیا۔ خان صاحب موصوف گرفتار کئے گئے۔ ان کا گرفتار کیا جانا تھا کہ سارے صوبہ سرحد میں آگ لگ گئی۔ لاٹھی چارج، آنسو گیس اور اندھا دھند گرفتاریوں نے مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کو صوبہ سرحد کے گاؤں گاؤں پھیلا دیا۔

بلوچستان

مسلم اکثریت کا سب سے چھوٹا صوبہ بلوچستان ہے مگر اس صوبہ کی روایات بڑی تابندہ ہیں۔ بلوچ قوم جو پٹھانوں

---

[1] حیات محمد علی جناح صفحہ ۵۲۴ تا صفحہ ۵۲۹

ہی کی ایک شاخ ہے اپنی شجاعت اور دینی غیرت کے اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں میں ہمیشہ ممتاز رہی ہے
یہ درست ہے کہ یہ علاقہ برصغیر کا سب سے زیادہ پس ماندہ علاقہ ہے مگر یہاں کے لوگ ناخواندہ اور غربت زدہ
ہونے کے باوجود نہایت خود دار اور عزت نفس کا پیکر ہیں۔ صوبۂ سرحد کی طرح یہاں بھی مسلم لیگ کی تنظیم بہت دیر
میں قائم ہوئی۔ یہاں بھی کانگرس نے اپنے قدم نہایت مضبوطی سے جمائے اور خان عبدالصمد خاں اچکزئی کی قیادت
میں بلوچستان کے مسلمانوں کا ایک گروہ کانگرس کا ہم نوا بن گیا اور رفتہ رفتہ یہ صوبہ کانگرس کے زیر اثر گیا۔ اسی زمانے
میں بلوچستان کے ایک نوجوان قاضی محمد عیسیٰ لندن سے بیرسٹری کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس آئے اور
۱۹۳۹ء میں مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے ممبر بن گئے۔ اب بلوچستان میں مسلم لیگ کو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پرجوش
رہنما مل گیا۔ انہی کی کوششوں سے بلوچستان میں مسلم لیگ قائم ہوئی۔ میر قادر بخش زہری، میر نبی بخش زہری، غلام محمد
خان ترین، خان جان محمد، سردار باز خاں، شیخ میرک محمد اعظم، سردار عثمان جوگیزئی اور صلاح الدین بلوچستان
کے قبائل کے سردار اور نہایت باثر لوگ تھے۔ یہ سب مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ انہی کی کوششوں سے
بلوچستان میں تمام بڑے بڑے مقامات پر مسلم لیگ کے جلسے ہوئے اور قائد اعظم کا پیغام شہروں سے لے کر دیہات
تک پہنچایا گیا۔ خان قلات نے بھی تحریک پاکستان کی پرزور تائید کی اور اپنی ریاست کو پاکستان میں شامل کرنے کے
لئے ہر ممکن اقدام کا فیصلہ کر لیا۔ قاضی عیسیٰ اور بلوچستان کے ایک تاجر صلاح الدین نے مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے
طرز پر رضاکاروں کی باوردی تنظیم قائم کی جنہیں نہایت عمدہ قواعد بھی سکھائی گئی۔ ان رضاکاروں نے تحریک پاکستان
میں بڑا کام کیا۔

اقلیتی صوبے اور تحریک پاکستان

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بنگال، آسام، پنجاب، سندھ اور سرحد کے مسلمانوں نے مسلم لیگ اور تحریک پاکستان
کے لئے بڑا کام کیا اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر قربانیاں دیں لیکن یہ حقیقت بھی ہر شک و شبہ سے بالا ہے کہ
ان صوبوں کے مسلمانوں کی حقیقی قیادت کا فریضہ اُن صوبوں کے مسلمانوں نے ادا کیا جہاں وہ اقلیت میں تھے۔
مؤرخ یہ دیکھ کر اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو خراج تحسین ادا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں نے
اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہونے کے باوجود مسلم لیگ کی امداد کی اور تحریک پاکستان میں پرجوش حصہ لیا کہ ان کے
صوبے پاکستان میں شامل نہیں ہوں گے۔ انہیں پاکستان سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا اور انہیں ہندو کی غلامی قبول
کرنی پڑے گی ان لوگوں نے تحریک پاکستان کو کامیاب بنانے کے لئے ہر قسم کی قربانی دی اور دوسرے الفاظ میں خود
کو پاکستان میں شامل ہونے والے صوبوں کے مسلمانوں پر قربان کر دیا۔ اس جرم کی سزا وہ آج تک بھگت رہے
ہیں اور اس وقت تک بھگتیں گے جب تک کہ وہ آزادی کی نعمت سے بہرہ ور نہیں ہو جاتے۔

مسلم لیگ کی تنظیم نو کا آغاز بھی ایک اقلیتی صوبہ کے صدر مقام بمبئی میں اپریل ۱۹۳۶ء میں ہوا جب انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کے تحت پہلے عام انتخابات کرانے کا اعلان کیا گیا۔ یہیں مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ اسی سال مسلم لیگ کا دوسرا اجلاس ایک اور اقلیتی صوبہ کے صدر مقام لکھنؤ میں ہوا اور یہیں سے مسلم لیگ کو ایک عوامی تنظیم بنانے کا آغاز کیا گیا۔ اس کے بعد قائداعظم نے صدر مسلم لیگ کی حیثیت سے سارے ملک کے دورے کئے۔ اس وقت قائداعظم کی پذیرائی اور ان کی آواز پر لبیک سب سے پہلے اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں ہی نے کہا جب کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں بنگال کے سوائے اور کسی صوبہ میں مسلم لیگ کے لئے جوش و خروش تو کجا بعض صوبوں میں قائداعظم کے ساتھ نہایت ہی سرد مہری کا سلوک کیا گیا اور جب انڈیا ایکٹ کے تحت انتخابات ہوئے تو جن صوبوں میں مسلم لیگ کو نہایت شاندار کامیابی حاصل ہوئی وہ اقلیت ہی کے صوبے تھے، مثلاً مدراس میں ۲۸ مسلم نشستوں میں سے مسلم لیگ نے ۱۱ حاصل کیں، بمبئی میں ۲۹ میں سے ۲۰ حاصل کیں، یو پی میں ۶۴ میں ۲۷ حاصل کیں جبکہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں پنجاب نے ۸۴ مسلم نشستوں میں سے صرف ایک حاصل کی۔ صوبہ سرحد میں ۳۶ میں سے مسلم لیگ ایک بھی حاصل نہیں کر سکی۔ سندھ میں ۳۵ میں سے مسلم لیگ کو ایک نشست بھی حاصل نہ ہوئی۔ آسام میں ۳۴ میں سے ۹ مسلم لیگ نے حاصل کیں اور بنگال میں مسلمانوں کی ۱۱۷ نشستوں میں سے مسلم لیگ ۴۰ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ گویا مسلم اکثریت کا صرف ایک صوبہ بنگال ایسا تھا جہاں کے مسلمانوں نے مسلم لیگ اور قائداعظم کی آواز پر نہایت پرجوش لبیک کہی۔ اس کے بعد آسام۔ باقی مسلم اکثریت کے صوبوں میں میدان بالکل صاف تھا۔

اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت مسلم لیگ کی قیادت عام طور سے اقلیتی صوبوں کے لوگوں کے ہاتھوں میں تھی اور وہی لوگ مسلم لیگ میں زیادہ دلچسپی لے رہے تھے اور اس جماعت کو عوامی جماعت بنانے میں کوشاں تھے، مثال کے طور پر چوہدری خلیق الزماں (یوپی)، نواب اسماعیل خان (یوپی)، راجہ امیر محمد خاں (محمود آباد۔ یوپی)، حاجی عبدالستار سیٹھ (مدراس)، سید عبدالعزیز (بہار)، سید عبدالرؤف شاہ (سی پی)، سر کریم بھائی ابراہیم (بمبئی)، محمد عاشق وارثی (بہار)، بیگم مولانا محمد علی (یوپی)، مسٹر حسین امام (بہار)، آئی آئی چندریگر (بمبئی)، شعیب قریشی (یوپی)، مولانا جمال میاں فرنگی محل (یوپی)، لطیف الرحمٰن (بہار)، حسین ملک (دہلی) اس دور میں یہی لوگ تھے جن کا اپنے اپنے علاقوں میں بہت اثر تھا اور جو مسلم لیگ کو مقبول عام بنانے کے لئے وقت اور روپیہ دونوں کی قربانی کر رہے تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ انہی علاقوں میں مسلم لیگ کو مقبولیت حاصل ہو رہی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اکثریتی صوبوں میں مسلمان مسلم لیگ سے بالکل ہی قطع تعلق کئے ہوئے تھے یا ان صوبوں میں مسلم لیگ کا کوئی لیڈر رہا ہی نہیں۔ ایسا ہرگز نہ تھا۔ پنجاب میں علامہ اقبال، سر شفیع، مولانا ظفر علیخاں، ملک برکت علی،

میاں بشیر احمد بار ایٹ لا، چوہدری کرامت علی، نواب شاہنواز خان ممدوٹ، ان کے بعد ان کے فرزند نواب افتخار حسین خان ممدوٹ اور محبوب احمد مسلم لیگ کے پرجوش حامیوں میں سے تھے اور انہی اصحاب کی وجہ سے پنجاب کے بعض شہروں میں مسلم لیگ کا پیغام عوام تک پہنچ رہا تھا۔ اسی طرح بنگال اور آسام میں مولوی اے کے فضل الحق، خواجہ ناظم الدین، مولانا اکرم خان، عبد الرحمٰن صدیقی، مرزا ابوالحسن اصفہانی، کے بی عبد المومن مولانا عبد الحمید خاں بھاشانی، سر سعد اللہ، عبد المتین چوہدری، صوبہ سرحد میں سردار اورنگ زیب خان، سردار عبد الرب نشتر، خان بہادر سعد اللہ خاں، سندھ اور بلوچستان میں محمد ایوب کھوڑو، قاضی فضل اللہ، سر غلام حسین ہدایت اللہ، محمد ہاشم گزدر، الحاج سیٹھ عبد اللہ ہارون، یوسف ہارون، جی ایم سید، عبد المجید سندھی اور قاضی محمد عیسیٰ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلم لیگ کو مقبول بنانے کے لئے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی مگر بنگال کے علاوہ باقی مسلم اکثریت کے صوبوں کی مقامی سیاست اور بعض مسلمان رہنماؤں کی خود غرضی کی وجہ سے ان مسلم لیگی رہنماؤں کی کوششوں کے وہ نتائج نہ نکل سکے جو مسلم اقلیت کے صوبوں میں رونما ہوئے۔ بہرحال جب تحریک پاکستان کا آغاز ہوا تو مسلم اکثریت کے صوبوں کے مسلمانوں میں وہ جوش و خروش پیدا ہوا جس نے گزشتہ ساری کوتاہیوں کی تلافی کر دی خصوصاً پنجاب کے مسلمانوں نے جس پامردی اور شجاعت سے پاکستان کی جنگ لڑی اس کی تو نظیر مشکل ہی سے ملے گی۔ اس کے باوجود جہاں تک اقلیتی صوبوں کا تعلق ہے۔ تحریک پاکستان کے آغاز کے ساتھ ہی ان صوبوں کے مسلمانوں میں حرکت و عمل کی لہر دوڑ گئی اور پاکستان کے لئے ان کے دلوں میں والہانہ محبت پیدا ہو گئی۔ دہلی، میرٹھ، شاہجہان پور، لکھنؤ، کانپور، الہ آباد، پٹنہ، کلکتہ، ناگپور، مدراس، بمبئی، آگرہ، سہارنپور، جبل پور، جھانسی، علی گڑھ، احمد آباد حیدر آباد، میسور، تنجور، غرض کہاں تک نام گنوائے جائیں مسلم اقلیتوں کے صوبوں میں سے کوئی صوبہ ایسا نہ تھا جہاں کے بڑے بڑے شہروں میں مسلم لیگ کی کانفرنسیں نہ ہوئی ہوں، جلوس نہ نکلے ہوں۔ مسلم لیگ کے ملک گیر شہرت کے رہنما مثلاً قائد اعظم، نوابزادہ لیاقت علی خاں، مولانا حسرت موہانی، چوہدری خلیق الزماں نواب محمد اسماعیل خان، حسین امام، مولانا جمال میاں فرنگی محلی، راجہ محمود آباد، مسٹر آئی آئی چندریگر اور ایسی مرتبے کے دیگر مسلم لیگی رہنماؤں نے ان کانفرنسوں کی صدارتیں کیں غرض اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے جس جوش و خروش کا مظاہرہ کیا الفاظ ان کا اظہار کرنے سے قاصر ہیں۔

ؔ افسوس کہ عین وقت پر سید صاحب نے قائد اعظم اور مسلم لیگ کی مخالفت پر کمر باندھ لی اور صوبائی انتخابات میں جو نظریۂ پاکستان کی اساس پر لڑے گئے تھے مسلم لیگ کا مقابلہ کیا۔ (مولف)

اقلیتی صوبوں میں طلبہ کی تنظیمیں

اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں میں پاکستان کے لئے جو والہانہ محبت پیدا ہوئی اس میں ان صوبوں کے طلبہ کی خدمات کو بڑا دخل ہے۔ پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرح اقلیتی صوبوں کے طلبہ نے بھی اپنی تنظیمیں قائم کیں اور جہاں یہ تنظیمیں پہلے سے قائم تھیں انہیں تحریکِ پاکستان کو مقبول بنانے کے لئے وقف کر دیا۔ مثال کے طور پر مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین علی گڑھ، عربک کالج اسٹوڈنٹس یونین دہلی، مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کانپور، لکھنؤ مسلم اسٹوڈنٹس یونین، بہار مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن، عثمانیہ یونیورسٹی مسلم اسٹوڈنٹس یونین غرض اسی طرح ہر اقلیتی صوبے کے مسلم طلبہ نے اپنی تنظیمیں قائم کیں۔ اپنے اہتمام سے مسلم لیگ کے جلسے منعقد کئے ان میں قائداعظم نے بطور خاص شرکت کی اور مسلم طلبہ کو پاکستان کا مفہوم ذہن نشین کرنے کے علاوہ انہیں تحریک کی کہ وہ اپنی تعلیم کا حرج کر کے بھی مسلم لیگ کا پیغام پہنچانے کے لئے شہروں اور دیہات کے دورے کریں۔ چنانچہ اپنے قائد کے حکم کی تعمیل میں ہزاروں طلبہ وقتی طور پر اپنی تعلیم ترک کر کے ملک کے طول و عرض میں پھیل گئے اور انہوں نے پنجاب، سرحد اور سندھ کے ریگستانوں کے دشوار گذار اور صبر آزما سفر کر کے نظریۂ پاکستان کی تبلیغ کی اور تحریکِ پاکستان کو ملک کے دور دراز علاقوں تک پہنچا دیا۔

مذہبی رہنما اور تحریکِ پاکستان

تحریکِ پاکستان کی حیرت انگیز مقبولیت میں علماء، صوفیا، مشائخ اور مختلف مسلم فرقوں کے مذہبی رہنماؤں کے تعاون کو بڑا دخل ہے۔ جنہوں نے اپنے گہرے اختلافات کے باوجود متفقہ طور پر مسلم لیگ اور نظریۂ پاکستان کی حمایت کی۔ اس حقیقت میں ذرہ برابر شبہ نہیں کہ مسلمان عوام پر علما، صوفیا اور مشائخ کا ہمیشہ زبردست اثر رہا ہے اور جس دور کا ہم ذکر رہے ہیں اس دور میں تو مسلمان اپنے علماء اور دینی رہنماؤں کا آج کے معاملہ میں کہیں زیادہ احترام کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان حضرات نے یک زبان ہو کر مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کی حمایت کی تو لاکھوں بلکہ کروڑوں مسلمان اس قومی تحریک میں شامل ہو گئے۔ اگرچہ ان علماء و مشائخ میں چند حضرات ایسے بھی تھے جو مسلمانوں کے کلمہ گو رہنما کا ساتھ دینے کی بجائے ہندوؤں کے کافر رہنماؤں کے ساتھ اشتراکِ عمل کو جائز سمجھتے تھے۔ مگر واقعات نے ثابت کر دیا کہ ان کی آواز نہایت بے حقیقت تھی اور مسلمانوں کے سوادِ اعظم نے ان کی تلقین و تحریک پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ ان مٹھی بھر علماء کے علاوہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے علما، مشائخ، صوفیا اور روحانی پیشواؤں کی غالب اکثریت نے مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کی خود بھی پرزور تائید کی اور اپنے معتقدین کو بھی حمایت کرنے کی ہدایت کی۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے فرقوں میں جس فرقے نے مکمل طور پر مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان سے تعاون کیا وہ بریلوی فرقہ ہے۔ اس فرقے کے

عوام، علماء، مشائخ اور سجادہ نشین حضرات نے نہ صرف مسلم لیگ کی حمایت اور تحریکِ پاکستان میں شمولیت اختیار کی بلکہ اس تحریک سے اختلاف کرنے والوں کی نہایت سختی سے مذمت بھی کی۔ پیر جماعت علی شاہ صاحب، پیر مہر علی شاہ صاحبؒ کے خلیفہ سید غلام محی الدین صاحب، پیر فضل شاہ صاحب گجراتی، خواجہ حسن نظامی صاحب، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سجادہ نشین دیوان سید آلِ رسول صاحب، پیر صاحب مانکی شریف، عبدالرشید صاحب سجادہ نشین حضرت بو علی قلندر صاحب پانی پتی، سید محمد احمد صاحب صاحب کچھوچھوی، مولانا سید نعیم الدین صاحب مرادآبادی، مولانا عبدالغفور صاحب ہزاروی، سید قمر الدین صاحب سجادہ نشین سیال شریف، ابوالحسنات سید محمد احمد صاحب، مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی اور پیر صاحب مانکی شریف ان علماء و مشائخ میں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں جن کے لاکھوں مریدوں نے اپنے مرشدین کی ہدایت پر تحریکِ پاکستان کو کامیاب بنایا۔ انہی علماء و مشائخ کے تعاون و تحریک سے اپریل ۱۹۴۶ء میں بمقام بنارس ایک آل انڈیا سنی کانفرنس منعقد ہوئی جس کے روحِ رواں پیر جماعت علی شاہ صاحب اور سید نعیم الدین صاحب مرادآبادی تھے۔ اہلِ سنت کے اس عظیم اجتماع میں ان کے حق میں ایک قرار داد اتفاقِ رائے سے منظور کی گئی جس میں تمام اہلِ سنت مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ تحریکِ پاکستان میں پر جوش حصہ لیں۔[1]

علمائے دیوبند میں مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کے قلیل گروہ کو چھوڑ کر اس فرقے کی اکثریت نے بھی مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کی پر زور تائید و حمایت کی۔ چنانچہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے پٹنہ میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کو جو پیغام بھیجا تھا اس میں آپ نے مسلم لیگ کی تنظیم کو مسلمانانِ ہند کے لئے نیک فال قرار دیا تھا۔ جب تحریکِ پاکستان کا آغاز ہوا تو مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی، مولانا عبدالمالک صاحب کاندھلوی، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی، مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی اور مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری۔ غرض مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے خلفاء اور معتقدین نے تحریکِ پاکستان میں سرگرم حصہ لیا۔ ان حضرات نے اپنی مشترکہ مساعی سے کانگرس کی حاشیہ بردار تنظیم جمعیت العلمائے ہند کے مقابلے میں ایک نئی تنظیم کی بنیاد رکھی جس کا نام جمعیۃ العلمائے اسلام تجویز کیا گیا۔ اس تنظیم کے تحت کلکتہ اور لاہور میں اکتوبر ۱۹۴۵ء اور جنوری ۱۹۴۶ء میں عظیم الشان کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے علی الترتیب ان

---

[1] "تحریکِ پاکستان کی چند گم شدہ کڑیاں" از مولانا قاضی عبدالنبی کوکب مطبوعہ روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۸ اگست ۱۹۶۷ء۔

کانفرنسوں کی صدارت کی۔ ان دونوں کانفرنسوں میں مسلم لیگ کی پالیسی کی پرزور تائید کی گئی۔ قائد اعظم کی ملی خدمات کو خراجِ تحسین ادا کیا گیا اور مسلمانانِ ہند سے پاکستان کے نصب العین کے حصول کے لئے جدوجہد کرنے کی اپیل کی گئی۔ اسی طرح جماعت اہلِ حدیث کے رہنما مولانا داؤد غزنوی کی قیادت میں اس فرقے کی اکثریت نے بھی تحریک پاکستان کو کامیاب بنانے میں سوادِ اعظم کا ساتھ دیا۔ شیعہ حضرات کے قلیل گروہ کو چھوڑ کر اس فرقے کے اکثر و بیشتر علما، سیاست دانوں اور بااثر اصحاب نے قائد اعظم کی قیادت میں تحریکِ پاکستان کی جنگ لڑی چنانچہ راجہ صاحب محمود آباد (راجہ امیر محمد خاں) مولانا کلبِ عباس صاحب، راجہ غضنفر علی خاں، کرنل عابد حسین۔ کلبِ مصطفیٰ صاحب ایڈووکیٹ اور میجر مبارک علی شاہ شیعہ حضرات کے وہ اکابر ہیں جنہوں نے اپنے بیانات میں قائد اعظم کی قیادت پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا اور شیعانِ علیؓ سے اپیل کی کہ وہ تحریکِ پاکستان میں بھرپور حصہ لیں۔ بوہرہ فرقہ کے روحانی پیشوا مولانا طاہر سیف الدین صاحب اور آغا خانی فرقے کے رہنما ہز ہائی نس سر آغا خاں نے بھی اپنی اپنی جماعتوں کو تاکید کی کہ وہ مسلم لیگ سے تعاون کریں اور تحریکِ پاکستان کو کامیاب بنائیں۔

جماعتِ احمدیہ کے امام مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب اور انجمن احمدیہ اشاعت اسلام لاہور کے امیر مولانا محمد علی صاحب نے بھی اپنے اپنے معتقدین کو ہدایت کی کہ وہ اپنی اپنی جگہ پورے زور اور قوت کے ساتھ آئندہ انتخابات میں مسلم لیگ کی مدد کریں[1]۔

مرکزی اسمبلی کے انتخابات

دسمبر ۱۹۴۵ء میں مرکزی اور ۱۹۴۶ء میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے۔ مسلم لیگ نے یہ انتخابات نظریہ پاکستان کی بنیاد پر لڑے اور کانگرس، ہندو مہا سبھا، مجلسِ احرار، خدائی خدمتگار اور جمعیۃ العلما کی متحدہ مخالفت کے باوجود ان انتخابات میں مسلم لیگ کو ایسی شاندار کامیابی ہوئی کہ حکومت اور مخالف جماعتیں سب کی سب حیرت زدہ رہ گئیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان انتخابات میں مسلم اکثریت کے صوبوں ہی میں نہیں بلکہ مسلم اقلیت کے صوبوں میں بھی مسلم لیگ کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی اور اکثر و بیشتر لیگی امیدواروں کے مخالفوں کی ضمانتیں بھی ضبط ہو گئیں۔

سب سے پہلے مرکزی اسمبلی کے لیے انتخابات ہوئے۔ مسلمانوں کے لئے ۳۰ نشستیں مخصوص کی گئی تھیں اور مسلم لیگ نے تیس کی تیس جیت لیں۔ مسلم لیگ کے مخالف امیدواروں میں سے ۷۵ فیصد کی ضمانتیں تک ضبط ہو گئیں۔

---

[1] یہ بیانات تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء، حیات محمد علی جناح، روزنامہ نوائے وقت ۷ اگست ۱۹۴۵ء اور تجلیاتِ عثمانی سے ماخوذ ہیں۔ (مولف)

یومِ فتح

یہ معمولی کامیابی نہ تھی بلکہ نہایت عظیم الشان کامیابی تھی۔ جس کی قوموں کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی یہ کامیابی مسلم لیگ نے اپنے زیرک اور اولوالعزم رہنما قائدِاعظم محمد علی جناح کی قیادت میں صرف سات سال کی قلیل مدت میں حاصل کی تھی۔ چنانچہ قائدِاعظم نے برصغیر کے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ اس عظیم الشان کامیابی پر یومِ فتح منائیں اور مسجدوں میں جاکر بارگاہِ الٰہی میں سجدۂ شکر ادا کریں۔ چنانچہ قائدِاعظم کی ہدایت پر ۱۱ جنوری ۱۹۴۶ء کو ملک کے طول و عرض میں مسلمانوں نے اس عظیم کامرانی کی خوشی میں یومِ فتح منایا اور مساجد میں شکرانے کی نماز ادا کی۔

صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات

۱۹۴۶ء میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے اور ان انتخابات میں بھی مسلم لیگ نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ پہلے ان صوبوں کے نتائج دیکھئے جنہیں پاکستان میں نہیں ہندوستان میں شامل ہونا تھا اور جن صوبوں کے مسلمان باشندے جانتے تھے کہ وہ ہندو کانگرس کی غلامی پر مجبور کئے جائیں گے مگر اس کے باوجود انہوں نے مسلم لیگ کی نہایت پرجوش حمایت کی۔ چنانچہ یوپی میں مسلمانوں کی ۶۵ نشستیں تھیں جن میں سے ۵۵ مسلم لیگ نے حاصل کیں۔ بمبئی میں تیس نشستیں مسلمانوں کی تھیں جن میں سے تیس کی تیس مسلم لیگ نے حاصل کیں۔ بہار میں ۴۰ نشستیں مسلمانوں کی تھیں جن میں سے ۳۴ مسلم لیگ نے حاصل کیں۔ سی پی میں ۱۴ نشستیں مسلمانوں کی تھیں جن میں سے ۱۳ مسلم لیگ نے حاصل کیں۔ اڑیسہ میں ۴ نشستیں مسلمانوں کی تھیں اور یہ چاروں مسلم لیگ نے حاصل کیں۔ مدراس میں ۲۹ نشستیں مسلمانوں کی تھیں اور یہ سب یعنی ۲۹ مسلم لیگ نے حاصل کیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان کا مطالبہ صرف مسلم اکثریت کے صوبوں کے مسلمانوں کا نہ تھا بلکہ یہ سارے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ تھا اور قائدِاعظم اور مسلم لیگی رہنماؤں نے سات سال قبل جو دعویٰ کیا تھا وہ سو فی صد درست تھا۔ ان انتخابات نے اس دعوے کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ پاکستان کا مطالبہ کسی ذاتی غرض یا لالچ پر مبنی نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو مسلم اقلیت کے صوبوں کے مسلمان اس کی تائید نہ کرتے کیونکہ ان کے علاقے تو پاکستان میں شامل نہیں ہو رہے تھے۔ انہیں تو بدستور محکوم ہی رہنا تھا۔ پہلے انگریز کے محکوم تھے اور قیامِ پاکستان کے بعد ہندو کا محکوم بننا تھا۔

اب مسلم اکثریت کے صوبوں کی طرف آئیے۔ بنگال میں مسلمانوں کی ۱۱۹ نشستیں تھیں جن میں سے مسلم لیگ نے ۱۱۳ حاصل کیں۔ آسام میں ۳۴ نشستیں مسلمانوں کی تھیں جن میں سے ۳۱ مسلم لیگ نے حاصل کیں۔ پنجاب میں ۸۶ نشستیں مسلمانوں کی تھیں جن میں سے ۷۹ مسلم لیگ نے حاصل کیں۔ سندھ میں مسلمانوں کی ۳۵ نشستیں تھیں جن میں سے ۳۵ کی ۳۵ مسلم لیگ نے حاصل کیں۔

صوبہ سرحد کا ریفرنڈم

مسلم اکثریت کے صوبوں میں صرف سرحد ایک ایسا صوبہ تھا جہاں مسلم لیگ نے مسلمانوں کی ۳۸ نشستوں میں سے صرف ۱۷ حاصل کیں۔ لیکن جب ۶ جولائی ۱۹۴۷ء کو صوبہ سرحد میں پاکستان کے ساتھ الحاق یا عدم الحاق کے مسئلے پر استصواب رائے عامہ شروع ہوا تو یہاں کے غیور پٹھانوں نے ۲ ہزار ۸ سو ۷۴ کے مقابلے میں ۲ لاکھ ۸۹ ہزار ۲ سو ۴۴ کی کثرت آراء سے پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔ اس طرح ڈاکٹر خان صاحب اور خان عبدالغفار خان کے یہ دعوے باطل ہو گئے کہ صوبہ سرحد کے عوام پاکستان کے خلاف ہیں۔ یہاں ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ اس علاقے میں مسلم لیگ کی یہ عظیم الشان کامیابی صوبہ سرحد کے مرد آہن خان عبدالقیوم خاں کی پامردی، فراست اور شب و روز کی انتھک جدوجہد کی مرہونِ منت تھی۔ جنہوں نے شہر شہر اور گاؤں پھر کر غیور افغانوں کو پاکستان کے حقیقی تصور سے روشناس کیا اور خان برادران کا سحر توڑ کر افغانوں کو حقیقت کی دنیا میں لانے میں کامیاب ہوئے۔ خان عبدالقیوم خان کے بعد دوسری قابلِ ذکر شخصیت پیر صاحب مانکی شریف مرحوم کی تھی جنہوں نے صوبہ سرحد کو پاکستان میں شامل کرنے کے لئے شب و روز جدوجہد کی اور اپنے زبردست اثر و رسوخ سے کام لے کر اس مہم کو سر کیا۔

پختونستان کی حقیقت

اسی دوران میں پختونستان کا نعرہ ایجاد کیا گیا۔ اس نعرے کا پس منظر کیا تھا؟ ہم اس پر کوئی رائے دینے کی بجائے خان عبدالغفار خان کے رفیقِ کار مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے پیش کرتے ہیں کیونکہ وہ رازہائے درونِ پردہ سے ہمارے مقابلے میں کہیں زیادہ واقف تھے اور اس بارے میں ان کی رائے سب سے زیادہ مستند ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ:-

> "تقسیم ملک کی تحریک شروع ہوتے ہی خان برادران کا اثر صوبہ سرحد میں کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ادھر قیام پاکستان کے امکانات صاف دکھائی دے رہے تھے۔ حکومت کے اس اعلان سے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں آزاد خود مختار حکومت قائم کی جائے گی صوبہ سرحد کے عوام میں ایک ایسا انقلاب رونما ہو گیا تھا جو نہایت جذباتی تھا۔ ڈاکٹر خان صاحب نے سوچا کہ سرحد میں ان کی قیادت صرف اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے کہ پختونستان کا مطالبہ کر دیں۔ اس طرح جب صوبہ سرحد کے لوگ دیکھیں گے کہ ان کی اپنی ریاست قائم ہو رہی ہے تو وہ اس کی تائید پر آمادہ ہو جائیں گے۔ ان لوگوں کو اس امر کا بھی خوف تھا کہ پنجاب کے لوگ ان پر تسلط نہ قائم کر لیں۔ چنانچہ خان برادران نے اپنے کانگرسی رفیقوں سے صلاح مشورے کے بعد آزاد پختونستان کا مطالبہ پیش کر دیا۔

آل انڈیا کانگرس کی مجلسِ عاملہ نے اس فیصلے کی توثیق کر دی اور اس سلسلے میں خان عبدالغفار خان کو سارے اختیارات دے دیئے کہ وہ اس مسئلے کو اپنی صوابدید کے مطابق حل کر لیں۔ مگر یہ ایسا مطالبہ تھا کہ جو نہ وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے نہ مسٹر جناح۔ پس لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے خان برادران کو صاف صاف بتا دیا کہ صوبۂ سرحد کے لئے دو ہی راستے ہیں یا تو وہ پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کرے یا ہندوستان میں۔ اسے خود مختار ریاست کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر خان برادران نے اعلان کر دیا کہ وہ استصوابِ رائے عامہ کا مقاطعہ کریں گے۔ انہوں نے پٹھانوں سے بھی اپیل کی کہ وہ اس استصواب میں حصہ نہ لیں مگر ان کی اپیل رائیگاں گئی اور صوبۂ سرحد کے لوگوں نے استصوابِ رائے میں حصہ لیا اور بہت بڑی اکثریت سے پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ [۱]

یہ ہے پختونستان کے نعرے کی حقیقت جو کسی مسلم لیگی نے نہیں بلکہ ایک بہت بڑے کانگرسی رہنما نے ظاہر کی ہے جو خان برادران کا دوست اور ان کا دیرینہ رفیقِ کار تھا۔ ہمارے خیال میں اس پر کسی اضافے یا تبصرے کی قطعاً ضرورت نہیں کیونکہ مولانا آزاد نے اس کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ اور تحریکِ پاکستان

علی گڑھ ــــــــ دو لفظوں کا یہ مجموعہ اپنے اندر کتنی تاریخی، تہذیبی اور سیاسی وسعت رکھتا ہے۔ اس قطرہ نے کتنے طوفانوں کو جنم دیا۔ ان دو لفظوں میں برصغیر کے مسلمانوں کی کتنی ولولہ انگیز داستانیں پوشیدہ ہیں۔ حریتِ فکر و عمل کا یہ گہوارہ، رہنمائے قوم سرسید کی یہ زندۂ جاوید یادگار جو اسی شہر علی گڑھ میں منارۂ نور بن کر ضوفشاں ہے ایک تاریخ اور ایک تحریک کی حیثیت رکھتی ہے، جس نے برصغیر کے مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ میں قائدانہ رول ادا کیا۔ اسی مادرِ علمی نے مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان، نوابزادہ لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین، سردار عبدالرب نشتر، نواب حمید اللہ خان فرمانروائے بھوپال، چوہدری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خان ــــ غرض کتنے ہی صاحبِ فکر و عمل مسلمانوں کو اپنی آغوش میں پروان چڑھا کر قافلۂ آزادی کی قیادت کے لئے تیار کیا ــــــــ ہاں مسلمانانِ پاک و ہند کی اس مادرِ علمی نے اس آڑے وقت بھی مسلمانوں کی امداد کی جب وہ اپنی زندگی اور موت کی سب سے بڑی جنگ لڑ رہے تھے۔

---

[۱] انڈیا ونس فریڈم صفحہ ۱۹۴ تا صفحہ ۱۹۵

قائد اعظم اور علی گڑھ

قائد اعظم محمد علی جناح اگرچہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی آغوش میں پروان نہیں چڑھے لیکن ۱۹۳۵ء کے بعد انہوں نے سرسید ہی کے افکار کو اپنا رہنما بنایا۔ اس طرح وہ بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تحریک کے ایک ممتاز بلکہ ممتاز ترین فرد بن گئے۔ ویسے بھی قائد اعظم کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے دلی لگاؤ تھا۔ اور وہ تحریکِ پاکستان سے قبل بھی اکثر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تقریبات میں شریک ہوتے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں جب قرارداد لاہور منظور ہوگئی تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک استاد ڈاکٹر افضال حسین قادری نے جو مسلم لیگ کے اس تاریخی اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے قائد اعظم کو مسلم یونیورسٹی تشریف لانے کی دعوت دی۔ اس دعوت کے جواب میں قائد اعظم نے جو الفاظ کہے ان سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے اور اس محبت کا بھی جو قائد اعظم کو علی گڑھ سے تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ:۔ IMUST go FOR ZIARAT.

قائد اعظم کا خطاب

چنانچہ لاہور سے واپسی پر قائد اعظم علی گڑھ تشریف لے گئے۔ ان کے اعزاز میں مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین نے استقبالیہ دیا۔ اس موقع پر طلبہ کی طرف سے ان کی خدمت میں جو سپاسنامہ پیش کیا گیا اس میں انہیں "قائد اعظم" کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انہیں اس خطاب سے یاد کیا گیا اور پھر یہ خطاب ان کے نام کا اس طرح جزو بنا کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں وہ قائد اعظم کے نام سے مشہور ہو گئے۔ حالانکہ یہ خطاب سرسید احمد خاں کو بھی دیا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی ان کے ناشرین نے اس خطاب سے مشرف کیا مگر قدرت کی طرف سے یہ خطاب محمد علی جناح کے لئے مخصوص ہو چکا تھا اور یہ سعادت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حصے میں لکھی جا چکی تھی کہ وہ مسلمانانِ پاک و ہند کے سب سے عظیم رہنما کو اس خطاب سے نوازے جو ان کی عظمت کا صحیح آئینہ دار تھا بعد کو لاہور کے ایک قومی کارکن میاں فیروزالدین نے جنہوں نے مسلم لیگ کے جلسوں میں نعرے لگوانے کا فرض اپنے ذمہ لے لیا تھا اس خطاب کو ملک کے طول و عرض میں پہنچا دیا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اس اجتماع میں سپاسنامے کے جواب میں قائد اعظم نے جو تقریر کی تھی۔ اس کے یہ الفاظ یونیورسٹی کے قدیم طلبا اور اساتذہ کو ابھی تک نہیں بھولے کہ:۔

"آج میں آپ کی استقبالیہ دعوت میں شریک ہو کر اپنی عمر دس برس کم محسوس کر رہا ہوں"۔۔۔

قائد اعظم نے فرمایا کہ "اب ہم نے اسلام کی ... خدمت کے لئے جس طرح کمر باندھی ہے مجھے یقین ہے کہ اس میں آپ کی پُر خلوص تائید ہمیں حاصل ہوگی اور پاکستان قائم ہو کر رہے گا"۔

شام کو مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بوائز کی طرف سے قائد اعظم کو عصرانہ دیا گیا۔ اس تقریب میں مسلم یونیورسٹی

کے شعبۂ قانون کے استاد پروفیسر سید امیر الدین قدوائی نے اولڈ بوائز کی طرف سے قائد اعظم کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ :-

"آپ کی قیادت اور صدارت میں لاہور کے تاریخی اجلاس میں جو اسکیم منظور کی گئی ہے اسے ہم سارے ملک میں پھیلائیں گے اور جلد سے جلد جامۂ عمل پہنائیں گے۔ کیونکہ اب اسلام کی عظمت کا انحصار اسی اسکیم کے نافذ العمل ہونے پر ہے۔"

قائد اعظم کا ولولہ انگیز پیغام

قرار داد پاکستان منظور ہونے کے بعد قائد اعظم متعدد مرتبہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تشریف لے گئے اور اپنی ولولہ انگیز تقریروں سے طلبہ کے دلوں کو گرمایا۔ ۱۹۴۵ء میں انہوں نے نواب زادہ لیاقت علی خاں جنرل سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ کو اپنے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے علی گڑھ بھیجا اور نوابزادہ صاحب نے قائد اعظم کی طرف سے مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کو یہ پیغام دیا کہ :-

"میں نے ہمیشہ کہا ہے کہ طالب علموں کو اپنی تعلیم قربان کر کے سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے مگر کبھی ایک قوم کی موت اور زندگی کا وقت آجاتا ہے۔ آج وہی وقت درپیش ہے۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے اسکولوں اور کالجوں سے نکل آؤ خواہ تمہارا ایک سال ضائع ہی کیوں نہ ہو جائے ——— آؤ۔ اور انتخابات میں ہماری مدد کرو۔"

قائد اعظم کے اس ولولہ انگیز بیان نے وہی کام کیا جو جلتی آگ پر تیل کرتا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ پہلے ہی مسلمانوں کی اس تحریک (پاکستان) کو کامیاب بنانے کے لئے بیتاب اور کوشاں تھے جب انہیں قائد اعظم کا یہ ولولہ انگیز پیغام ملا تو وہ سر سے کفن باندھ کر میدان میں آگئے اور اپنی تعلیم کو خیر باد کہہ کر اپنے قائد کے حکم کی تعمیل میں ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو گئے۔

مالی قربانی

انہوں نے اپنا مال بھی قربان کیا اور وقت بھی، اپنی صحت بھی خطرے میں ڈالی اور جانیں بھی۔ جب قائد اعظم کی طرف سے مسلم لیگ کے لئے مالی امداد کی اپیل کی گئی تو اس موقع پر ——— "مسلم یونیورسٹی کا ایک وفد جو مسعود الحسن قریشی (نائب صدر) محمود علی خاں (سیکرٹری) قاضی فضل اللہ عباسی، مسعود زاہدی اور محمود الحسن پر مشتمل تھا ۸؍ نومبر کو قائد اعظم کی خدمت میں بمقام دہلی بارباب ہوا اور مسلم یونیورسٹی یونین کی جانب سے ایک ہزار روپیہ مسلم لیگ نیشنل فنڈ کے لئے پیش کیا۔" [1]

---

[1] حیات محمد علی جناح ص۵۵۲ مولفہ رئیس احمد جعفری (مرحوم) (حوالہ اگلے صفحے پر ملاحظہ ہو)

مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کا یہ آخری عطیہ نہ تھا۔ بلکہ قیام پاکستان تک وقتاً فوقتاً انھوں نے ہزاروں روپیہ مسلم لیگ نیشنل فنڈ میں دیا تاکہ تحریک پاکستان نامی پہلو سے ناکام نہ ہونے پائے۔

مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کی تین تنظیمیں تھیں۔ (۱) مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین۔ یہ مسلم یونیورسٹی کی مرکزی اور سب سے زیادہ موثر تنظیم تھی۔ تمام طلبہ اس کے ممبر تھے۔ (۲) مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن یہ صرف مسلم طلبہ پر مشتمل تھی۔ اور اس نے اپنے آپ کو تحریک پاکستان کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ (۳) مسلم یونیورسٹی مسلم لیگ۔ تنہا یہ واحد تنظیم تھی جو اس نام سے کسی تعلیمی ادارے میں قائم ہوئی تھی۔ ان تینوں تنظیموں کے تحت مسلم یونیورسٹی کے طلبہ نے تحریکِ پاکستان کو پروان چڑھانے میں پُرجوش حصہ لیا۔

مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ اور تحریکِ پاکستان

اس موقع پر ہمیں مسلم یونیورسٹی کے ان اساتذہ اور اسٹاف کے ارکین کو بھی خراجِ تحسین پیش کرنا چاہیے جنھوں نے طلبہ کو مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے تحریکِ پاکستان میں حصہ لینے کے لئے منظم کیا۔ ان قابلِ احترام اساتذہ میں ڈاکٹر ضیاء الدین (وائس چانسلر)، اے بی حلیم (پرو وائس چانسلر) ڈاکٹر سید ظفر الحسن، ڈاکٹر افضال حسین قادری، ڈاکٹر کرنل محمد محمود احمد خاں، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، پروفیسر سید امیر الدین قدوائی، ڈاکٹر ذکی الدین مرحوم، جمیل الدین احمد، ڈاکٹر عزیز احمد، عبدالوہاب خیری اور منظر عالم مرحوم کے نام بہ طور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ یہی اساتذہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کی روح رواں تھے۔ یہی طلبہ کے وفود تشکیل دیتے اور انہیں مختلف صوبوں میں پاکستان کا پروپیگنڈہ کرنے اور مسلم لیگی امیدواروں کو کامیاب بنانے کے لئے روانہ کرتے تھے۔

مسلم یونیورسٹی کے طلبہ اور تحریکِ پاکستان

انتخابات کے موقع پر مسلم یونیورسٹی کے کم و بیش دو ہزار طلبہ نے تحریکِ پاکستان میں نہایت پُرجوش حصہ لیا اور ملک کے طول و عرض میں پھیل گئے۔ ظاہر ہے کہ ان سب کے نام نہ تو ہمارے پاس محفوظ ہیں اور نہ ان سب کو یہاں درج کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ہم صرف چند ناموں پر اکتفا کرتے ہیں۔ اے ٹی ایم مصطفیٰ، شمس الہدیٰ (یہ دونوں بنگال سے تعلق رکھتے تھے) نصرت حسین خاں، شاکر حسین خاں، شتاق حسین خاں راؤ محمد علی خاں، معین اعظم خاں مزاری، الیاس ہمایوں بیگ، مختار آزاد، عشرت علی خاں قیصر، مختار مسعود شفیع اللہ خاں، اے آر کیانی، مسعود زاہدی، شوکت حمید خاں، ریاض احمد، محمود علی خان، عبادت یار خان، آغا خان بابا خان، فرزند رضا، خالد علی (مولانا شوکت علی کے نواسے)، علی احمد فیضل اور عاقل جعفری۔

ٹ مسلم یونیورسٹی گزٹ علی گڑھ ۱۵ ردسمبر ۱۹۴۷ء (گزشتہ صفحہ کا حوالہ)

طلبہ کے ساتھ ساتھ بعض اساتذہ بھی اس تحریک میں شامل ہوئے اور طلبہ کے وفود کے ساتھ سفر کی صعوبتیں برداشت کیں اور وقت کی قربانی دی۔

ان طلبہ نے مختلف وفود کی صورت میں یوپی، بہار، بنگال، پنجاب، سندھ اور سرحد وغیرہ کے دورے کئے اور بعض وفود نے ونٹوں پر اور کبھی پیدل ایک ایک دن میں میلوں کا سفر طے کیا اور مسلم لیگ کا پیغام شہر شہر اور قریہ قریہ پہنچایا۔ تحریکِ پاکستان کے ان بہادر سپاہیوں نے تحریکِ پاکستان میں کس جوش سے حصہ لیا اور اس کی خاطر کتنی تکلیفیں برداشت کیں۔ اس کا اندازہ تحریکِ پاکستان کے ایک سرگرم کارکن مسٹر جی الانا کے بیان سے کیا جا سکتا ہے۔ الانا صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"جب جی ایم سید کی نشست سے مسلم لیگی امیدوار کے مقابلہ کا مرحلہ آیا تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک سو طلبہ قائدِ اعظم کے حکم پر سندھ گئے اور قائدِ اعظم کے پیغام اور نظریۂ پاکستان کی تبلیغ دور دراز علاقوں میں کی۔ ان طلبہ نے اونٹوں پر سفر کیا اور کتنے کتنے دن صرف چنوں اور کھجوروں پر اکتفا کیا۔ ان طلبہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک بنگالی طالب علم اے ٹی ایم مصطفیٰ بھی تھے۔ جو گذشتہ حکومت میں وزیرِ تعلیم بھی رہے تھے۔" [1]

پاکستان پر لٹریچر کی اشاعت

نظریۂ پاکستان سے طلبہ اور تعلیم یافتہ طبقے کو روشناس کرانے اور ان میں اسلامی قومیت کا احساس پیدا کرنے کے لئے ۱۹۴۳ء میں مسلم یونیورسٹی کے مسلمان طلبہ کی طرف سے اردو اور انگریزی زبانوں میں لٹریچر کی اشاعت کا ایک جامع منصوبہ بنایا گیا۔ اس منصوبے کے تحت متعدد کتابچے شائع کئے گئے۔ ان کے سرورق پر قائدِ اعظم کے یہ پُر حکمت اقوالِ ثلاثہ درج ہوتے تھے۔ اتحاد ——— یقین ——— تنظیم۔ انہیں مسلم یونیورسٹی یونین کی طرف سے شائع کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے کا پہلا کتابچہ نیچر آف اسلامک پولٹیکل تھیوری مصنفہ ڈاکٹر عزیز احمد) کے نام سے شائع ہوا جس کے سرورق پر پبلشر کی حیثیت سے محمود علی خاں کا نام درج ہے۔ یہ کتابچے تصنیف کرنے والوں میں مسلم یونیورسٹی کے فاضل اساتذہ شامل تھے۔ یہ لٹریچر دستی بھی تقسیم ہوتا تھا اور ڈاک کے ذریعے بھی ہندوستان کے طول و عرض میں بھیجا جاتا تھا۔

---

[1] قائدِ اعظم جناح دی اسٹوری آف اے نیشن

نوٹ:۔ افسوس کہ تلاشِ بسیار کے باوجود اس سلسلے کا اردو لٹریچر راقم الحروف کو نہ مل سکا۔ اگر یہ لٹریچر کسی صاحب کے پاس موجود ہو تو وہ عاریتہً عنایت فرما دیں۔ (مؤلف)

بلاشبہ ان کتابچوں کی اشاعت سے برصغیر کے مسلم طلبہ اور تعلیم یافتہ طبقے میں اسلامی قومیت کا احساس اور تحریکِ پاکستان کے لئے والہانہ لگاؤ پیدا ہوا۔

انسائیکلوپیڈیا میں پاکستان کا ذکر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں ایک اور کارنامہ بھی ہے جو شاید ابھی تک احاطۂ تحریر میں نہیں آیا اور وہ یہ کہ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر سید افضال حسین قادری اور ان کے رفقائے کار کی کوششوں سے انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے ۱۹۴۵ء کے ایڈیشن میں پاکستان پر ایک جامع نوٹ شائع ہوا۔ اس کے لئے مواد بھی پروفیسر افضال قادری اور ان کے رفقاء نے فراہم کیا۔ اس طرح قیام پاکستان سے قبل ہی پاکستان کا نام دنیا کی اس مشہور ترین کتاب میں آگیا اور یورپ کے اہلِ علم حضرات اس سے علمی رنگ میں متعارف ہوئے۔

مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کے لئے مسلم یونیورسٹی کے طلبہ و اساتذہ کی یہی گراں قدر قربانیاں اور خدمات تھیں جنہیں دیکھ کر قائداعظم نے اس عظیم درسگاہ اور اس کے جاں نثار طلبہ کو ان تاریخی الفاظ میں خراجِ تحسین ادا کیا کہ:۔

"علی گڑھ "مسلم انڈیا" کا اسلحہ خانہ ہے اور اس کے طلبہ بہترین سپاہی"۔ [1]

ہم نے اپنی کتاب کے اس سب سے طویل باب میں تحریکِ پاکستان کے متعلق تمام ضروری معلومات یکجا کر کے ترتیب دیدی ہے۔ گو یہ موضوع بڑا وسیع ہے مگر ان صفحات میں اس سے زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس باب کو ختم کرنے سے قبل تحریکِ پاکستان کے ایک معرکے کا ذکر کر دیا جائے جو شاید تحریکِ پاکستان کا سب سے بڑا معرکہ تھا۔

تحریکِ پاکستان اور خضر وزارت

یہ معرکہ پنجاب میں لڑا گیا اور اسلامیہ کالج لاہور کے طلبہ نے اس معرکے میں ہراول دستے کا رول ادا کیا۔ اگرچہ ۱۹۴۶ء کے صوبائی انتخابات میں مسلم لیگ کو پنجاب میں زبردست اکثریت سے کامیابی ہوئی تھی مگر پنجاب کے گورنر گلینسی اور ملک خضر حیات خاں ٹوانہ وزیراعظم پنجاب کی ملی بھگت نے اس صوبے میں مسلم لیگ کے لئے بڑی مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ ان مشکلات میں اس وقت اور اضافہ ہوا جب جنوری ۱۹۴۷ء کے شروع میں خضر حکومت نے

---

[1] تذکرۂ سرسید ص ۲۹۴ مولفہ مولوی محمد امین زبیری (مرحوم)۔ "علی گڑھ یونیورسٹی اور تحریکِ پاکستان" کے زیرِ عنوان جو تفاصیل درج کی گئی ہیں یہ مجھے اپنے دیرینہ کرم فرما اور تحریکِ پاکستان کی بزرگ شخصیت پروفیسر سید امیر الدین صاحب قدوائی سابق استاد شعبۂ قانون (مسلم یونیورسٹی) اور اپنے محترم دوست نواب زادہ محمود علی خاں سیکرٹری مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین سے حاصل ہوئیں جو اس زمانے میں تحریکِ پاکستان کے نہایت پرجوش اور سرگرم کارکن تھے۔ (مولف)

نیشنل مسلم گارڈ کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ مسلم لیگ کے دفتر پر چھاپہ مارا گیا تاکہ بعض اہم دستاویزات پر قبضہ کر لیا جائے۔

پنجاب کے مسلم لیگی رہنماؤں کی گرفتاری

اس موقع پر پنجاب کے مسلم لیگی رہنما جن میں بڑے بڑے رؤسا شامل تھے اپنا عیش و آرام چھوڑ کر میدان میں آگئے اور انہوں نے پولیس کو مسلم لیگ کے دفتر کی تلاشی لینے سے روک دیا۔ چونکہ یہ پولیس کے فرائض کی انجام دہی میں دخل اندازی تھی۔ اس لئے ان مسلم لیگی رہنماؤں کو گرفتار کرنے کی دھمکی دی گئی۔ مگر ان رہنماؤں نے اس دھمکی کی قطعاً پرواہ نہ کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں پولیس نے موقع ہی پر گرفتار کر لیا۔ ان گرفتار ہونے والے رہنماؤں میں نواب افتخار حسین خاں ممدوٹ، سردار شوکت حیات خاں، میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ، ملک فیروز خاں نون، میاں افتخار الدین مرحوم، بیگم شاہنواز، سید امیر حسین شاہ اور ملک وزیر محمد شامل تھے۔ اس موقع پر اسلامیہ کالج لاہور کے طلبہ نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ایک بڑا کارنامہ سرانجام دیا۔ مسلم لیگ کے دفتر میں بعض ایسے کاغذات تھے کہ اگر وہ پولیس کے ہاتھ آجاتے تو مسلم لیگ اور پنجاب میں تحریک پاکستان کے بعض اہم راز فاش ہو جاتے۔ چنانچہ اسلامیہ کالج کے طلبہ نے جن میں فیاض احمد اور ملک افضال کے نام سرفہرست ہیں جان پر کھیل کر مسلم لیگ کے دفتر سے یہ کاغذات نکالے اور ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیئے اور یہ کارنامہ اس ہوشیاری سے سرانجام دیا کہ پولیس کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی حالانکہ مسلح پولیس نے مسلم لیگ کے دفتر کا چاروں طرف سے محاصرہ کر رکھا تھا۔

اسلامیہ کالج کے طلبہ میدان عمل میں

قائدین کی گرفتاری کے بعد تحریک نہایت نازک دور میں داخل ہو گئی۔ سپاہی موجود تھے مگر کمانڈر جیل کی سلاخوں کے پیچھے مقید تھے۔ ادھر حکومت کی طرف سے نہایت سختی کی جا رہی تھی۔ ان حالات میں اسلامیہ کالج لاہور کے طلبہ آگے بڑھے اور قیادت کا علم اپنے ہاتھ میں لے کر سول نافرمانی کا آغاز کر دیا۔ سب سے پہلا جلوس آفتاب قرشی کی قیادت میں نکلا۔ جس میں دیال سنگھ کالج کے طلبہ نے بھی شرکت کی۔ رفتہ رفتہ اس میں لاہور کے دیگر کالجوں کے طلبہ بھی شریک ہو گئے۔ جلوس شہر کی مختلف سڑکوں سے گزرا اور راستے میں طالبعلم رہنماؤں نے نہایت ولولہ انگیز تقریریں کیں۔ لاہور کے شہری بھی جلوس میں شامل ہونے لگے۔ جب مجمع بہت زیادہ ہو گیا اور جوش و خروش لمحہ بہ لمحہ بڑھنے لگا تو پولیس نے گرفتاریاں شروع کر دیں۔ سب سے پہلے قائد جلوس آفتاب قرشی کو گرفتار کیا گیا۔ سید احمد سعید کرمانی بھی گرفتار ہوئے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین بھی گرفتار ہوئے۔ الغرض شام ہوتے ہوتے کئی سو طلبہ اور لاہور کے شہری گرفتار کر لئے گئے۔

دوسرے دن جب لاہور کے ان واقعات کی خبریں دیگر شہروں میں پہنچیں تو سارے پنجاب میں ہنگامہ برپا

ہو گیا اور پنجاب کے متعدد شہروں میں سول نافرمانی شروع ہو گئی۔ طلبہ نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کرنا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پنجاب کے جیل خانے طلبہ اور شہریوں سے بھر گئے۔

اسلامیہ کالج کے اساتذہ کی گرفتاری

دوسرے دن پولیس نے اسلامیہ کالج لاہور کا محاصرہ کر لیا تاکہ طلبہ جلوس نہ نکال سکیں مگر طلبہ نے جلوس نکالا۔ اب کی بار اس جلوس میں طلبہ کے علاوہ اساتذہ نے بھی شرکت کی اور وہ بھی طلبہ کے ساتھ گرفتار کئے گئے۔ ان گرفتار ہونے والے اساتذہ میں ڈاکٹر غلام علی چوہدری، مرغوب صدیقی اور کالج کے پرنسپل ڈاکٹر عمر حیات ملک شامل تھے۔

اب اسلامیہ کالج لاہور اس تحریک کا مرکز بن گیا۔ اس دوران میں اس کالج کے سرفروش طلبہ نے بعض حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیئے۔ مثال کے طور پر مسلم لیگ کے ترجمان "ڈان" کا داخلہ خضر حیات نے پنجاب میں بند کر دیا تھا۔ یہ اخبار ان دنوں دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ اسلامیہ کالج کے طلبہ کے ایک گروپ کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ دہلی سے ہر روز ڈان کا تازہ پرچہ لے کر آئیں۔ پولیس کی کڑی نگرانی کے باوجود ڈان کا تازہ پرچہ ہر روز لاہور پہنچنے لگا۔ اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ کوئی طالب علم ایک بار بھی پکڑا نہ جا سکا۔ طلبہ کے ایک گروپ کا کام یہ تھا کہ وہ ہر روز صوبائی مسلم لیگ سے تازہ ہدایات لے کر مختلف اضلاع میں جاتے تھے اور ضلعی مسلم لیگ سے رپورٹیں لے کر واپس آتے تھے۔ طلبہ نے یہ کام بھی اتنی ہوشیاری اور احتیاط سے سرانجام دیا کہ ایک طالبعلم بھی گرفتار نہ ہو سکا۔ اس طرح صوبائی مسلم لیگ سے ضلعی مسلم لیگی شاخوں کا رابطہ قائم رہا اور یہ تحریک نہایت منظم طریقے سے جاری رہی۔ تحریک میں مزید سرگرمی اور تنظیم میں رابطہ قائم رکھنے کے لئے پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے "وائس آف اسلام" کے نام سے ایک روزانہ اخبار جاری کیا گیا۔ یہ اخبار سائیکلو اسٹائل ہوتا تھا اور اس میں تحریک پاکستان سے متعلق خبریں درج ہوتی تھیں۔

خضر وزارت کا خاتمہ

یہ تحریک ۳۱ دن جاری رہی، ہر روز جلوس نکلتے، ہنگامے ہوتے، پولیس اشک آور گیس پھینکتی، لاٹھی چارج کرتی، مگر یہ تشدد تحریک کو دبانے میں ناکام رہا بلکہ پولیس کے تشدد میں جتنا اضافہ ہوتا گیا تحریک اتنی ہی زور پکڑتی گئی۔ آخر کار طلبہ کو کامیابی ہوئی۔ مسلم لیگ نیشنل گارڈ سے پابندیاں اٹھالی گئیں۔ شہری آزادیاں بحال کر دی گئیں۔ یہ تحریک برطانوی سامراج کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔ حکومت برطانیہ نے محسوس کر لیا کہ اب مسلمان پاکستان حاصل کر کے ہی رہیں گے۔ اس کے ساتھ ہی خضر وزارت مستعفی ہو گئی۔ [1]

---

[1] یہ معلومات مجھے اپنے کرم فرما جناب آفتاب قرشی سے حاصل ہوئی۔ (مولف)

میدان طلبہ کے ہاتھ رہا۔ پاکستان کے لئے راہ ہموار ہو گئی۔ بلاشبہ اس عظیم الشان کامیابی کا سہرا اسلامیہ کالج لاہور کے طلبا کے سر بندھتا ہے۔ ان طلبا کی فہرست بڑی طویل ہے۔ بعض طلبا کا ذکر ہم ان صفحات میں کر چکے ہیں مگر ان کے علاوہ بھی کچھ طلبا ایسے ہیں جن کا ذکر نہایت ضروری ہے۔ ان میں سے شیخ نورشید احمد مرحوم، احمد سعید کرمانی اور عبدالرؤف شباب مفتی نے تحریک پاکستان میں نہایت پُرجوش حصہ لیا۔ نظریہ پاکستان کا پروپیگنڈہ کرنے کے لئے دور دراز علاقوں کا سفر کرنے کے علاوہ انہوں نے انتخابات میں مسلم لیگی امیدواروں کی کامیابی کے لئے پولنگ اسٹیشنوں پر نہایت مستعدی سے کام کیا اور ان امیدواروں کو کامیاب بنانے میں اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دیں۔

قیامِ پاکستان

مرکزی اور صوبائی انتخابات نے کانگرس اور حکومت دونوں پر روز روشن کی طرح ثابت کر دیا کہ مسلمان مسلم لیگ کے جھنڈے تلے پوری طرح منظم ہو چکے ہیں اور پاکستان کے سوائے کوئی اور فارمولا وہ منظور نہیں کریں گے۔ ادھر ملک کی فضا فرقہ وارانہ کشیدگی کی وجہ سے روز بروز خوفناک صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ حکومت کے لئے نظم و نسق اور امن و امان کا قیام ایک سنگین مسئلہ بن چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برطانیہ اس بوجھ کو جلد سے جلد اپنے سر سے اتار پھینکنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس وقت کے برطانوی وزیر اعظم مسٹر ایٹلی نے ۱۹ فروری ۱۹۴۶ء کو انگلستان کی پارلیمنٹ میں ایک تاریخی اعلان کیا جس میں کہا گیا تھا کہ برطانوی کابینہ کے تین وزیروں پر مشتمل ایک کمیشن ہندوستان بھیجا جائے گا۔ یہ کمیشن ہندوستان کے سیاسی مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے ایک منصوبہ تیار کرے گا۔ اس وزارتی مشن میں برطانیہ کے تین مدبر شامل تھے۔ لارڈ پیتھک لارنس (وزیر ہند) سر اسٹیفورڈ کرپس اور رائے وی الیگزینڈر۔ مسٹر ایٹلی نے اہل ہند کو یہ خوشخبری سنانے کے ساتھ ساتھ مسلمانان ہند کے زخموں پر یہ کہہ کر نمک پاشی بھی فرمائی کہ ہم اقلیتوں کے حقوق سے غافل نہیں۔ انہیں اپنے دل سے ہر قسم کا خوف خطر نکال دینا چاہیئے مگر ...... "کسی اقلیت کو اکثریت کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ بننے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔" گویا برطانیہ کے وزیر اعظم کے دماغ سے ابھی تک متحدہ ہندوستان کا جنون نہیں نکلا تھا اور ان کی کوشش یہی تھی کہ ملک کو تقسیم کئے بغیر وہ اس سرزمین سے رخصت ہو جائیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس کے باوجود کہا جاتا ہے کہ تقسیم ملک کی تجویز انگریزوں کے اشارے پر تیار کی گئی تھی اور محمد علی جناح ان کے ایجنٹ تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

قائد اعظم کا دلچسپ تبصرہ

قائد اعظم نے برطانوی وزیر اعظم کی اس تقریر کا فوراً نوٹس لیا اور ۱۷ مارچ کو یہ بیان جاری کیا کہ:-

"یہاں اختیارِ امتناع برتنے یا اکثریت کی ترقی روکنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس پر ایک مثال چسپاں ہوتی ہے۔ مکڑی نے مکھی سے کہا کہ "میرے محل میں آؤ"۔ اب اگر مکھی انکار کرتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ اختیارِ امتناع برتا جاتا رہا ہے اور مکھی ضدی ہے۔ مگر میں نے دیکھا کہ وزیر اعظم

نے اسی سانس میں یہ بھی کہہ دیا کہ ہم کو اقلیتوں کے حقوق کا خیال ہے اور اقلیت کو اس قابل ہونا چاہیئے کہ وہ خوف سے آزاد ہو کر رہ سکے۔ میں اس کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان اقلیت نہیں ہیں بلکہ قوم ہیں اور خود ارادیت ان کا پیدائشی حق ہے۔ ——— ہماری یہ معین حیثیت ہے کہ ہم ہندوستان کی تقسیم چاہتے ہیں اور پاکستان قائم کرنا چاہتے ہیں اور یہ کہ ہندوستان کے آئینی مسئلے کا حل صرف پاکستان ہے۔ یہ اس برصغیر کی دو مختار دولتوں (ریاستوں) کے لئے خوشی، فلاح اور تحفظ کا باعث ہو گا۔" [۱]

پاکستان کے دونوں حصوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے اور دو مرکز قائم کرنے کا فتنہ اٹھانے والے اصحاب اس تقریر کے آخری حصے کو غور سے پڑھیں اور دیکھیں کہ قائد اعظم نے یہاں بھی برصغیر کو دو ریاستوں میں تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا ہے ایک ہندوؤں کے لئے اور دوسری مسلمانوں کے لئے۔

وزارتی مشن کی برصغیر میں آمد

۲۴ مارچ ۱۹۴۶ء کو وزارتی مشن ہندوستان پہنچ گیا۔ اس دوران میں قائد اعظم کا تنبیہی بیان شائع ہو چکا تھا جس میں انہوں نے مسلمانوں کو صرف ایک اقلیت قرار دینے کے خلاف احتجاج کیا تھا اور کہا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وزارتی مشن پہلے سے ایک فیصلہ کر کے ہندوستان آ رہا ہے جسے وہ ہر قیمت پر نافذ کر دے گا۔ ہندوستان پہنچ کر لارڈ پیتھک لارنس نے اپنے بیان میں معذرت کی اور کہا کہ انہوں نے محض غلط فہمی کی بنا پر مسلم لیگ کو اقلیتی جماعت قرار دیا تھا۔ دراصل مسلم لیگ، مسلمانوں کی عظیم اکثریت کی نمائندہ جماعت ہے۔ مسٹر کرپس نے اپنے بیان میں مسلمانوں کو یقین دہانی کرائی کہ وزارتی مشن کوئی دستوری منصوبہ لے کر ہندوستان نہیں آیا ہے بلکہ اس کے دل و دماغ کی سطح بالکل صاف ہے۔

مسلمانوں کو فریب دینے کی کوشش

ہندوستان پہنچ کر وزارتی مشن نے صوبائی وزرائے اعظم، ریاستوں کے نمائندوں اور ممتاز سیاسی رہنماؤں سے ملاقات کی۔ کانگرس کی طرف سے مولانا آزاد کو وزارتی مشن سے ملاقات کے لئے بھیجا گیا تاکہ ایک مسلمان کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا جا سکے اور وزارتی مشن کے ارکان اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ کانگرس فرقہ وارانہ جماعت نہیں اور پاکستان کی مخالفت ہندو ہی نہیں ممتاز مسلمان رہنما بھی کر رہے ہیں۔ مولانا آزاد نے اس موقع پر وہی رول ادا کیا جس کے لئے کانگرس نے انہیں منتخب کیا تھا۔ انہوں نے وزارتی مشن کے سامنے کانگرس کا یہ موقف پیش کیا کہ ہندوستان

---

[۱] ریسنٹ اسپیچز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح جلد دوم ص ۲۷۴ بحوالہ پاکستان ناگزیر تھا۔ ص ۳۸۳، ۳۸۴

کو متحدہ رکھتے ہوئے آزادی دی جائے۔ ایک دستور اور ایک مرکز قائم کیا جائے۔ مسٹر گاندھی بھی وزارتی مشن سے ملے مگر حسبِ عادت یہ کہہ کر ملے کہ میں ذاتی حیثیت سے آپ سے ملاقات کرنے آیا ہوں۔ کانگرس کا موقف مولانا آزاد آپ کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے دوقومی نظریہ اور مطالبہ پاکستان کی مخالفت کی۔ اور "ذاتی حیثیت" سے وزارتی مشن کو اپنے مشوروں سے نوازتے ہوئے فرمایا کہ سارے سیاسی قیدی رہا کر دیئے جائیں۔ نمک کو ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ مسلمانوں کا یہ مطالبہ درست ہے کہ ان کی تہذیب و تمدن کی حفاظت کی جائے اور ان کی اکثریت کے علاقوں میں انہیں تفوق حاصل ہو مگر میں مسٹر جناح کے مطالبہ پاکستان سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مسلم لیگ اور قائداعظم کے لئے ایک دامِ ہمرنگ زمیں بھی بچھایا۔ یعنی یہ پیش کش کی کہ مسٹر جناح کو دعوت دی جائے کہ وہ حکومت تشکیل دیں اور جن افراد کو پسند کریں مرکزی حکومت میں شامل کر لیں مگر شرط یہ ہے کہ ہندوستان کو تقسیم نہ کیا جائے۔ اگر مسلم لیگ اور قائداعظم عہدوں اور اقتدار کے بھوکے ہوتے تو یہ پیش کش فوراً قبول کر لیتے مگر وہ تو ایک اصول اور نصب العین کی خاطر لڑ رہے تھے جس کے مقابلے میں وزارتوں کی کیا حقیقت تھی؟

قائداعظم کی وزارتی مشن سے ملاقات

دوسرے روز قائداعظم وزارتی مشن سے ملنے کے لئے تشریف لے گئے۔ اس ملاقات میں مشن کے اراکین نے ان سے مطالبۂ پاکستان کی وضاحت چاہی۔ قائداعظم نے انہیں بتایا کہ متحدہ ہندوستان کا نعرہ محض ایک تخیل ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ ہندوستان ہمیشہ کئی حصوں میں منقسم رہا۔ انگریزوں نے اپنے سیاسی مفاد اور انتظامی مصالح کے تحت اسے متحد کر رکھا ہے۔ قائداعظم نے پاکستان کی اسکیم کو ممکن العمل ثابت کرنے کے لئے وزارتی مشن کو بتایا کہ یورپ میں ایک جیسی تہذیب اور ایک جیسے تمدن رکھنے کے باوجود کتنی ہی ریاستیں موجود ہیں جن کا رقبہ پاکستان سے بہت کم ہے۔ انہوں نے مشن کے اراکین کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین گہرے مذہبی اور تمدنی اختلافات کی طرف بھی متوجہ کیا۔ قائداعظم نے ۱۹۰۶ء کی اصلاحات کا ذکر کرتے ہوئے وزارتی مشن کے اراکین کو بتایا کہ اس وقت بھی مسلمانوں نے اپنی مستقل قومیت کی بنیاد پر جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کیا تھا اور حکومت نے اسے تسلیم کیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ۱۹۱۶ء میں کانگرس اور مسلم لیگ دونوں متفقہ طور پر تسلیم کر چکی ہیں کہ ہندو اور مسلمان الگ الگ قومیں ہیں۔ کمیونل ایوارڈ کے تحت حکومت برطانیہ بھی انہیں جداگانہ نیابت کا حق دے چکی ہے۔ اس کے بعد قائداعظم نے وزارتی مشن کے اراکین سے سوال کیا کہ کیا آپ توقع کرتے ہیں کہ دس کروڑ مسلمان ایک ایسے ملک میں آبرومندانہ اور آزادانہ زندگی گزار سکیں گے؟ جہاں سارے اختیارات کے مالک ۲۵ کروڑ ہندو ہوں گے مگر قائداعظم کے ان دلائل کا وزارتی مشن پر کوئی اثر نہ ہوا اور انہوں نے نظریۂ پاکستان سے اتفاق نہیں کیا۔ انہوں نے اس

خیال کا اظہار کیا کہ اگر انتقالِ اقتدار کے مسئلے پر مسلم لیگ اور کانگریس باہم متفق نہ ہو سکی تو بدرجۂ مجبوری حکومت برطانیہ کو از خود کسی فیصلے کا اعلان کرنا پڑے گا۔ گویا پہلے مسلم لیگ اور قائداعظم کو اقتدار کے جال میں اسیر کرنے کی کوشش کی گئی اور انہیں دعوت دی گئی کہ وہ خود وزارت بنالیں اور اپنی پسند کے افراد کو مرکزی کابینہ میں شامل کر لیں لیکن ہندوستان کی تقسیم کے مطالبہ سے دستبردار ہو جائیں مگر جب یہ وار خالی گیا تو انہیں دھمکی دی گئی کہ اگر وہ نظریہ پاکستان ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تو حکومت برطانیہ خود کوئی فیصلہ کر دے گی۔ مگر عزم و ارادہ کے اس پہاڑ پر اس دھمکی کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔

اقلیتی اور مہاسبھائی نمائندوں کی مشن سے ملاقات

قائداعظم کے بعد سکھوں، اچھوتوں اور ہندوؤں کی دوسری بڑی جماعت ہندو مہاسبھا کے لیڈروں نے وزارتی مشن سے ملاقات کی۔ ان میں سے ہندو مہاسبھا کے لیڈر مکرجی نے مطالبۂ پاکستان کی سخت مخالفت کی سکھوں کے نمائندوں ماسٹر تارا سنگھ اور گیانی کرتار سنگھ نے بھی پاکستان کی مخالفت پر سارا زور صرف کر دیا اور مطالبہ کیا کہ سکھوں کے لئے علیحدہ ریاست قائم کی جائے۔ اچھوتوں کے رہنما ڈاکٹر امبیدکر نے متحدہ ہندوستان کے مطالبے کی مخالفت کی اور اس اندیشہ کا اظہار کیا کہ اس صورت میں اعلیٰ ذات کے ہندو چھا جائیں گے۔ جس سے اچھوتوں کے مفادات پامال ہو جائیں گے مگر اچھوتوں کے دوسرے نمائندوں جگ جیون رام اور رادھا ناتھ داس نے پاکستان کے مخالف موقف اختیار کیا۔

مسلم لیگی اراکین کا کنونشن

وزارتی مشن کی ہندوستان میں آمد اور مختلف جماعتوں کے نمائندوں کے ساتھ اس کی گفت و شنید سے جو صورتحال پیدا ہوئی تھی اس پر غور و خوض کرنے کے لئے قائداعظم نے ۱۹ اپریل کو دہلی میں مسلم لیگی نمائندوں کا ایک کنونشن طلب کیا جس میں وہ تمام اصحاب مدعو کئے گئے جو مختلف صوبوں اور مرکزی مجلس قانون ساز سے لیگ کے نمائندے منتخب ہوئے تھے۔ اس کنونشن میں چار سو سے زیادہ افراد نے شرکت کی۔ یہ کنونشن تین دن جاری رہا۔ قائداعظم نے اس کی صدارت کی۔ مختلف صوبوں سے آئے ہوئے ممبروں نے اس تاریخی اجتماع سے خطاب کیا اور مطالبۂ پاکستان کو ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا واحد حل قرار دیا۔ کنونشن میں بنگال کے مسلم لیگی رہنما حسین شہید سہروردی نے ایک قرارداد پیش کی جسے متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ :۔

"مسلمانانِ ہند کے لئے کوئی ایسا دستور قابلِ قبول نہ ہوگا جس کی بنیاد متحدہ ہند کے اصول پر رکھی گئی ہو"۔۔۔۔۔۔ "دو الگ الگ دیوان تشکیل دیئے جائیں۔ ایک ہندوستان کے لئے اور دوسرا پاکستان کے لئے۔ اگر کوئی ایسا دستور مرتب کرنے کی کوشش کی گئی جو مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کے

مطابق نہ ہوا تو ہندوستان کے مسلمان اپنی پوری قوت سے اس کی مخالفت کریں گے"۔ ل

اس اجتماع میں جتنے نمائندے شریک ہوئے تھے ان سب نے ایک عہد نامے پر دستخط کئے جس کا مضمون یہ تھا کہ ان کا اس امر پر ایمان ہے کہ صرف پاکستان ہی برصغیر کے مسلمانوں کے لئے نجات کا راستہ ہے اور وہ اسے حاصل کرنے کے لئے ہر قربانی کریں گے۔ ۱۱ راپریل کے اجلاس میں جو اس کنونشن کا اختتامی اجلاس تھا قائداعظم نے ایک پرجوش تقریر کی جس کے آخر میں حکومت برطانیہ کو متنبہ کیا گیا تھا کہ اگر اس نے پاکستان کا مطالبہ تسلیم کرنے میں تاخیر سے کام کیا تو ہمیں پاکستان حاصل کرنے میں دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی نہیں روک سکے گی"۔ ۲

اس کانفرنس کی ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ قائداعظم نے اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں سے عہد کیا کہ اگر "ہندو انڈیا" میں ان کے ساتھ بدسلوکی روا رکھی گئی تو پاکستان خاموش تماشائی بن کر نہیں بیٹھا رہے گا"۔ ۳

ایک پرفریب منصوبہ

اس دوران میں وزارتی وفد کے اراکین سیر کے لئے کشمیر چلے گئے۔ واپسی پر پھر انہوں نے مسلم لیگی اور کانگرسی رہنماؤں سے ملاقاتیں شروع کیں اور دونوں کے سامنے ایک منصوبہ پیش کیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک عبوری حکومت قائم کی جائے اور تیس دن کے اندر یہ معلوم کیا جائے کہ انتقال اقتدار کے بعد ہندوستان کے لوگ دو ریاستوں کا نظام پسند کریں گے یا ایک ریاست کا۔ ایک آل انڈیا کمیشن کو اس کا فیصلہ کرنا ہوگا جسے مرکزی اسمبلی کے چند اراکین تشکیل دیں گے۔ منصوبے میں کہا گیا تھا کہ اگر اس طرح فیصلہ نہ ہو سکے تو پھر بنگال، پنجاب سندھ اور سرحد کی اسمبلیوں کے مسلمان اراکین کی رائے معلوم کی جائے۔ اگر کسی صوبے کے ۷۵ فی صد نمائندے یہ فیصلہ کر دیں گے کہ وہ متحدہ ہند میں نہیں رہنا چاہتے تو ان کا صوبہ وفاق ہند میں شامل نہیں ہوگا۔

شملہ کانفرنس

ظاہر ہے کہ یہ پرپیچ اور فریب کارانہ اسکیم مسلم لیگ اور قائداعظم کسی حالت میں منظور نہیں کر سکتے تھے اس لئے انہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا مگر اس سے اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ وزارتی مشن ملک کی تقسیم کے مطالبے سے اصولی طور پر متفق ہو گیا ہے۔ یہ پاکستان کی طرف ایک اور قدم تھا۔ اس کے بعد وزارتی وفد نے مسلم لیگ اور کانگرس کو شملہ میں ملاقات کی دعوت دی تاکہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے مزید کوششیں کی جاسکیں۔ وزارتی مشن میں ایک اور رکن کا اضافہ کر لیا گیا تھا اور وہ رکن تھے وائسرائے ہند۔ مسلم لیگ اور کانگرس کو بھی چار چار

ل آل انڈیا مسلم لیگ کی قرار دادیں ۱۹۴۴ء، ۱۹۴۶ء، ص ۴۵ ۲ دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ص ۲۵۲
۳ ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا ص ۲۵۲

اراکین کے وفود تشکیل دینے کی دعوت دی گئی۔ لیگ کی طرف سے قائد اعظم، نوابزادہ لیاقت علی خان، نواب اسماعیل خان اور سردار عبدالرب نشتر کو نامزد کیا گیا اور کانگرس کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل اور خان عبدالغفار خان کو۔ اس طرح کانگرسی وفد میں دو مسلمان اراکین کو شامل کرکے اسے زیادہ سے زیادہ غیر فرقہ وارانہ اور مسلمانوں کا نمائندہ وفد بنانے کی عیارانہ کوشش کی گئی۔

شملہ کانفرنس ۵ مئی کو شروع ہوئی۔ اس کانفرنس میں مسلم لیگ اور کانگرس دونوں کے سامنے دو منصوبے پیش کئے گئے۔ پہلے منصوبے میں کہا گیا تھا کہ مسلم لیگ پاکستان کے لئے جن صوبوں کا مطالبہ کر رہی ہے ان میں بعض ایسے علاقے بھی ہیں جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور وہ پاکستان میں شامل ہونا پسند نہیں کریں گے۔ اس صورت میں صوبوں کی تقسیم عمل میں لائی جائے گی۔ دوسرے منصوبے میں کہا گیا تھا کہ تین وفاق تشکیل دیئے جائیں گے۔ ایک مسلم اکثریت کے صوبوں کا جن میں پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان، بنگال اور آسام (کا صرف سلہٹ ڈویژن) شامل ہوں گے۔ دوسرا ہندو اکثریت کے صوبوں کا اور تیسرا ہندوستانی ریاستوں کا۔ ان پہ ایک مرکزی ادارہ ہوگا جس میں ہندو اور مسلمان اراکین کی تعداد مساوی ہوگی۔ دفاع، کرنسی اور امور خارجہ کے شعبے اس مرکزی ادارے کے پاس ہوں گے۔ جس میں ہندو اور مسلمان اراکین کی تعداد مساوی ہوگی۔ اس منصوبے میں ایسی دفعہ کا اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ ایک مقررہ میعاد مثلاً ۱۵ سال کے بعد اگر کوئی صوبہ چاہے تو اس وفاق سے علیحدہ ہو سکتا ہے۔

قائد اعظم نے اس دوسرے منصوبے پر اعتراض کرتے ہوئے کہا مرکزی ادارے میں مساوی نمائندگی سے معاملات کے فیصلے کرنے میں بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ جب مسلم لیگ کے اجلاس میں یہ منصوبے پیش کئے گئے تو ان پر غور و خوض کے بعد فیصلہ ہوا کہ چونکہ وزارتی مشن کے پیش کردہ منصوبے میں پاکستان کی اساس کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اس لئے مسلم لیگ اس دستور ساز ادارے سے تعاون کرے گی۔ امید کی جاتی ہے کہ اس طرح ہم آخر کار خود مختار اور آزاد پاکستان حاصل کر لیں گے۔ لیکن صدر کانگرس نے وزارتی مشن کی تجاویز قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے خط میں وزارتی مشن کو لکھا کہ ہندوستان کی تقسیم کی کسی تجویز پر غور کرنا اس کے دائرۂ اختیار میں شامل نہیں۔

ایک اور منصوبہ

اس صورت حال نے وزارتی مشن کو سخت مشکل میں مبتلا کر دیا کہ اس کی تجاویز کانگرس نے رد کر دی تھیں اور مسلم لیگ نے منظور کر لی تھیں۔ اب اس کی جانب سے ایک اور فارمولا پیش کیا گیا جس میں کانگرس کی دلجوئی کی پوری کوشش کی گئی تھی۔ منصوبے میں ایک مرکزی مجلس دستور قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی جسے دفاع، کرنسی اور امور خارجہ کے شعبے تفویض کئے جانے تھے۔ باقی تمام شعبے صوبوں کی تحویل میں دے دیئے گئے تھے۔ صوبوں کو گروپ بندی کرنے اور اس امر کا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا تھا کہ وہ کون کون سے امور کا مشترکہ انتظام کریں گے۔ ان صوبائی گروپوں کو مجالس قانون ساز

اور انتظامی ادارے قائم کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ مرکزی مجلس قانون ساز میں ہندو اور مسلم اکثریت کے صوبوں کے نمائندوں کی تعداد مساوی مقرر کی گئی تھی۔ مرکزی مجلس دستور ساز کو ہر دس سال کے بعد دستور پر از سر نو غور و خوض کرنے کا اختیار دیا گیا تھا اور کثرت رائے سے اس میں تغیر و تبدل ہو سکتا تھا۔ ایک ایسے ادارے کے قیام کا اعلان کیا گیا تھا جو ملک کے لئے دستور بنائے گا۔ اس کے لیے یعنی مبہم طریقہ کار مقرر کیا جائے گا۔

قائداعظم نے وزیر ہند کو لکھا کہ وزارتی مشن نے یہ تجاویز اپنے موقف سے ہٹ کر پیش کی ہیں۔ اس پر وزیر ہند نے انہیں ۹ مئی کو کانفرنس کے ایک اور اجلاس میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ قائداعظم نے کانفرنس ۱۱ مئی تک ملتوی کرنے کی اپیل کی تاکہ وہ اس عرصے میں پنڈت جواہر لال سے گفت و شنید کر کے اختلافی امور طے کرنے کی کوشش کر سکیں۔ یہ ملاقات ہوئی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

مسلم لیگ کی تجاویز

۱۲ مئی کو کانفرنس کے اجلاس میں قائداعظم نے مسلم لیگ کی طرف سے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کیں۔ بنگال، آسام پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان پر مشتمل ایک گروپ تشکیل دیا جائے۔ جس کے پاس دفاع، کرنسی، امور خارجہ اور دفاع کے لیے ضروری حد تک مواصلات کے علاوہ باقی تمام شعبے ہوں۔ دفاع، کرنسی اور امور خارجہ وغیرہ کے انتظام و انصرام کے لئے دو آئین ساز ادارے تشکیل دیئے جائیں۔ جن میں سے ایک ادارہ میں مسلم اکثریت کے صوبوں کے نمائندے شامل ہوں۔ اور دوسرے میں باقی صوبوں کے نمائندے۔ یہ دونوں ادارے مل کر ان شعبوں کا انتظام کریں۔ مسلم اکثریت کے صوبوں کے لئے ان کا گروپ آئین وضع کرے گا۔ باقی اعلیٰ اختیارات بھی صوبوں کی تحویل میں رہیں گے۔ مسلم اکثریت کے ان چھ صوبوں کے نمائندے ان کی تناسب آبادی کے لحاظ سے ہوں گے۔ پاکستان کے وفاق کے قیام کے بعد اگر کوئی صوبہ چاہے تو استصواب رائے عامہ کے ذریعہ پاکستانی وفاق سے الگ ہو سکتا ہے۔ مرکزی یونین کے لئے قانون ساز اسمبلی کے ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ مجلس آئین ساز کرے گی۔ اگر مرکزی یونین میں قانون ساز اسمبلی تشکیل دی جائے تو اس میں مساوی نمائندگی کا اصول مقرر کیا جائے۔ فرقہ وارانہ مسائل کے متعلق اس وقت تک کوئی فیصلہ عمل در آمد کے قابل نہیں ہو گا جب تک کہ ہندو اور مسلم وفاقوں کے نمائندے کثرت رائے سے اس کی تائید نہ کریں۔ مرکزی یونین اختلافی امور پر اس وقت تک غور نہیں کرے گی جب تک کہ تین چوتھائی نمائندے اس کی تائید نہ کریں۔ تمام صوبوں اور دو وفاقوں میں ایسے آئین نافذ کئے جائیں گے جن میں ہر فرقے کے بنیادی حقوق، تہذیب و تمدن اور مذہبی حقوق کی حفاظت کا مکمل انتظام ہو گا۔ اگر کوئی صوبہ چاہے تو دس سال کے بعد اپنی مجلس قانون ساز کی اکثریت کے فیصلے کے بعد مرکزی وفاق سے علیحدہ ہو سکتا ہے۔[1]

---

[1] اسپیچز اینڈ ڈاکومنٹس ۱۹۴۶ء جلد ۲

اگر غور سے دیکھا جائے تو مسلم لیگ نے صرف وطن کی جلد آزادی کی خاطر اپنے مطالبات میں بہت حد تک نرمی پیدا کر لی تھی۔ مگر افسوس کہ کانگرس نے اس موقعہ پر بھی نہایت تنگ نظری کا مظاہرہ کیا اور صدر کانگرس نے مسلم اکثریت کے صوبوں کو ایک وفاق کی شکل دے کر ان کی علیحدہ دستور ساز اسمبلی کے قیام کی سخت مخالفت کی۔ انہوں نے صوبہ سرحد کو مسلم اکثریت کے صوبوں کے وفاق میں شامل کرنے سے بھی اتفاق نہیں کیا۔ یہی نہیں انہوں نے صوبوں کے دائرہ اختیار کو بھی کم کرنا چاہا۔ مقصد یہ تھا کہ اسکیم میں پاکستان کا تصور باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ قائد اعظم ایسی ترامیم سے کس طرح اتفاق کر سکتے تھے جن کا مقصد مسلمانوں کو ہندو کا دائمی غلام بنانا تھا۔

اس طرح شملہ کانفرنس ناکام ہوگئی۔ ۱۵ مئی کو اس ناکامی کا اعلان کر دیا گیا۔ اس ناکامی کی ذمہ داری وزارتی وفد نے یہ کہہ کر مسلم لیگ پر عائد کرنے کی کوشش کی کہ ملک کی تمام جماعتیں ہندوستان کو متحدہ رکھنے پر متفق تھیں مگر مسلم لیگ نے اس کی مخالفت کی۔ بیان میں پاکستان کے نظریہ پر اعتراض کیا گیا کہ جو علاقے مسلم لیگ طلب کر رہی ہے ان میں سے بعض علاقوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور وہ پاکستان میں شامل ہونا پسند نہیں کریں گے۔ اگر یہ علاقے پاکستان سے خارج کر دیئے جائیں تو یہ ایک چھوٹا سا اور کمزور ملک ہوگا جس کا تحفظ کرنا اس علاقے کے لوگوں کے لیے مشکل ہوگا۔ اس طرح وزارتی مشن نے پاکستان کا مطالبہ رد کر دیا مگر مسلمانوں کی اشک شوئی کے لئے یہ بھی کہہ دیا کہ مسلمانوں کے یہ خدشات بھی بے بنیاد نہیں کہ متحدہ ہندوستان میں ان پر ہندو اکثریت غالب آجائے گی۔

کابینہ مشن پلان

وزارتی مشن نے اس ناکامی کے اعلان کے دوسرے روز ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو ایک نیا فارمولا پیش کیا۔ جس کے مطابق صوبوں کو مختلف گروپوں میں تقسیم کیا جانا تھا۔ ایک گروپ پنجاب، صوبہ سرحد اور بلوچستان پر مشتمل تھا۔ دوسرا بنگال اور آسام پر اور تیسرا گروپ باقی تمام صوبوں پر۔ ہر ایک گروپ کو اپنی مرضی کے مطابق اپنی اپنی فیڈریشن بنانے کا اختیار دیا گیا تھا۔ لیکن ان تینوں فیڈریشنوں پر ایک آل انڈیا یونین مسلط کرنے کا اعلان کیا گیا تھا جس کی تحویل میں دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے شعبے دیئے جانے تھے۔ ایک دستور ساز اسمبلی تشکیل دی جانی تھی جس میں صوبائی اسمبلیوں کے اراکین کے ووٹوں سے منتخب شدہ نمائندے شامل کئے جانے کی تجویز تھی۔ مسلمانوں اور سکھوں کو اپنے اپنے نمائندے اپنے علیحدہ ووٹ سے منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ ہندوؤں اور باقی اقلیتوں کو اپنے نمائندے اپنے علیحدہ ووٹ سے منتخب کرنے کا حق تفویض کیا گیا تھا۔ دستور ساز اسمبلی میں ہر صوبے کا فرقہ وارانہ کوٹا اس کی آبادی کے تناسب کے مطابق مقرر کیا گیا تھا۔ تجویز کیا گیا تھا کہ پہلے دن تمام صوبوں کے منتخب شدہ نمائندے ایک ہی دستور ساز اسمبلی میں بیٹھیں گے لیکن صدر کا انتخاب اور اس قسم کی رسمی کارروائی کے بعد گروپوں میں بٹ جائیں گے اور اس کے بعد گروپ اپنے اپنے صوبوں کا آئین مرتب کریں گے۔ جب آئین کا یہ حصہ مکمل ہو جائے گا تو اس کے بعد مختلف گروپ پھر پوری دستور ساز

اسمبلی میں بیٹھ کر کل انڈیا یونین کا آئین بنائیں گے۔ یونین کی مجلس قانون ساز کے آئین میں یہ شرط رکھی جائے گی کہ فرقہ وارانہ نوعیت کے امور کے متعلق (اس بات کا فیصلہ یونین کا صدر کریگا) یا آئین میں ترمیم کرنے کے لئے نہ صرف پورے ایوان کی اکثریت کی الگ الگ تائید بلکہ ہندو اور مسلمان ممبروں کی اکثریت کی الگ الگ تائید بھی درکار ہوگی۔ یونین کی حکومت کو اپنے اخراجات کے لئے براہ راست ٹیکس لگانے اور وصول کرنے کا اختیار ہوگا۔ آئین سازی کے زمانے میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کو ازسر نو مرتب کر کے اس میں سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کو شامل کیا جائے گا اور جہاں تک موجودہ آئین کے ماتحت ممکن ہوگا اس عبوری حکومت کو آزادی کیساتھ کام کرنے کا موقع دیا جائیگا۔ عبوری حکومت میں نشستوں کی تقسیم کا سوال گفت و شنید کیلئے کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ [1]

مسلم لیگ نے کیبنٹ پلان قبول کر لیا

۶ جون ۱۹۴۶ء کو قائد اعظم نے امپیریل ہوٹل نئی دہلی میں کیبنٹ پلان پر غور و خوض کرنے کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کیا۔ ۶ جون تک اس پلان پر بحث و تمحیص ہوتی رہی۔ مجلس عاملہ نے اس کے بعض حصوں پر اعتراضات کرنے کے بعد یہ منصوبہ صرف اس خیال سے قبول کر لیا کہ اس میں پاکستان کا اصول موجود تھا۔ اجلاس میں قائد اعظم کی زیر صدارت ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں کہا گیا تھا کہ

> وزارتی مشن نے اپنے پلان میں مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کے متعلق جو طرز گفتگو اختیار کیا ہے اور جو فیصلے دیئے ہیں وہ سراسر خلاف واقعہ اور معقولیت سے بعید ہیں ———— جس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ مسلمانوں کے احساسات کو نظرانداز کر کے محض ہندوؤں کو خوش کرنا چاہتا ہے ————
>
> کونسل ہر قسم کے شبہات کا ازالہ کرنے کے لئے واشگاف طور پر اپنے اس عزم کا اعلان کرتی ہے کہ مسلمانان ہند کا نصب العین آج بھی کامل اور آزاد و خود مختار پاکستان ہی ہے۔ جس کے حصول کے لئے وہ اپنی طاقت کے مطابق تمام ذرائع اختیار کریں گے اور اس مقصد کے لئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ مسلمانوں کی ایذا رسانی کے لئے جو الفاظ پلان کے دیباچے میں مندرج کئے گئے ہیں ان سے قطع نظر صرف اس خیال سے کہ جس قدر جلد ممکن ہو ہندوستان کے دستوری اختلافات امن و امان سے ختم ہو جائیں اور یہ دیکھ کر کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کی وفاق میں شرکت سے پاکستان کی اساس کو وزارتی مشن نے تسلیم کر لیا ہے مسلم لیگ اس نظام میں شریک ہونے کا فیصلہ کرتی ہے جو وزارتی مشن نے اپنے پلان میں پیش کیا ہے۔ مگر اس کی یہ شرکت اس امید کے ساتھ ہے کہ اس کے نتیجے میں ایسے پاکستان کا قیام عمل میں آجائیگا جو خود مختار ہونے کے ساتھ ساتھ کامل بھی ہوگا۔ [2]

---

[1] مارشل لا سے مارشل لا تک صفحہ ۲۴۸، ۲۴۹ مرتبہ سید نور احمد۔ [2] آل انڈیا مسلم لیگ کی قراردادیں جنوری ۱۹۴۴ء، ۱۹۴۶ء

مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ نے یہ فیصلہ کرتے وقت اس امر کی بھی صراحت کر دی تھی کہ اگرچہ لیگ مجلسِ آئین ساز میں شمولیت پر آمادہ ہو گئی ہے لیکن اسے یہ حق حاصل ہو گا کہ حالات کے مطابق وہ اس مجلس سے الگ بھی ہو سکتی ہے قرارداد میں مجلسِ عاملہ نے قائدِ اعظم کو اختیار دیا کہ وہ مرکزی عبوری حکومت میں شرکت کے مسئلے پر مسلم لیگ کے ذی اختیار نمائندہ ہونے کی حیثیت سے وائسرائے سے گفت و شنید کر سکتے ہیں۔ ۶ جون ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کونسل نے مجلسِ عاملہ کے فیصلے کی توثیق کر دی۔

عبوری حکومت اور کانگریس

مسلم لیگ نے تو کیبنٹ پلان منظور کر لیا لیکن کانگریس نے حسبِ عادت اس پلان کی منظوری کے لئے یہ شرط عائد کر دی کہ وہ اس میں اپنی حسبِ منشا تغیر و تبدل کر سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ جب چاہے اور جس دفعہ کو چاہے حذف کر دے اور جس دفعہ کو اپنے مفید مطلب پائے اس میں شامل کر دے۔ عرصے تک اس مسئلے پر وزارتی مشن اور کانگریس کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہی اور کانگریس نے صاف الفاظ میں اس پلان کو نہ منظور کیا اور نہ رد کیا۔

اس کے بعد عبوری حکومت کی تشکیل کا مرحلہ آیا۔ اس مسئلے پر قائدِ اعظم اور وائسرائے کے درمیان گفتگو کے بعد طے ہو گیا تھا کہ عبوری حکومت میں ۵ نمائندے مسلم لیگ کے ۵ کانگریس کے ایک سکھ اور ایک ہندوستانی عیسائی یا اینگلو انڈین شامل کئے جائیں گے۔ چنانچہ قائدِ اعظم نے وائسرائے کو لکھا کہ مسلم لیگ نے وزارتی مشن کا پلان جو ۱۶ مئی کو پیش کیا گیا تھا اسی بنیاد پر قبول کیا تھا۔ اس پلان کے قبول کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ مسلم لیگ کو یقین دلایا گیا تھا کہ عبوری حکومت میں اہم محکمے مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان مساوات کے اصول پر تقسیم کئے جائیں گے۔

وائسرائے نے پنڈت نہرو کو مدعو کیا اور ان سے اس مسئلے پر گفتگو کی مگر پنڈت جی نے یہ اصول تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کانگریس کی طرف سے یہ تجویز پیش کی کہ عبوری حکومت ۱۵ نمائندوں پر مشتمل ہونی چاہیئے۔ ان میں پانچ ہندو، چار مسلم لیگ کے نمائندے ایک غیر مسلم لیگی مسلمان ایک غیر کانگریسی ہندو، ایک اچھوت کانگریسی ایک ہندوستانی عیسائی، ایک کانگریسی خاتون اور ایک سکھ ہو۔ وائسرائے نے پنڈت نہرو کی اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا اور کہا کہ مسٹر جناح اسے تسلیم نہیں کریں گے۔[1]

وائسرائے نے ملک کو بحرانی کیفیت سے بچانے اور کانگریس کو خوش کرنے کیلئے اپنی پہلی تجویز میں پھر ایک تبدیلی کی اور قائدِ اعظم کو لکھا کہ عبوری حکومت کے اراکین کی تعداد ۱۴ ہو گی۔ جس میں ۵ کانگریسی نمائندے ایک کانگریسی اچھوت، پانچ مسلم لیگی۔ ایک ہندوستانی عیسائی، ایک سکھ اور ایک پارسی نمائندہ شامل تھا۔ مسلم لیگی نمائندوں میں قائدِ اعظم، نوابزادہ لیاقت علی خان نواب محمد اسمٰعیل خان، خواجہ ناظم الدین اور سردار عبدالرب نشتر۔

کانگریسی نمائندوں میں پنڈت جواہر لال، راج گوپال اچاریہ، ڈاکٹر راجندر پرشاد، ہریکرشن مہتاب، سردار پٹیل،

---

[1] دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا صفحہ ۲۷۴

اور جگ جیون رام (اچھوت) شامل تھے۔ باقی نمائندوں میں سردار بلدیو سنگھ (سکھ)، ڈاکٹر جان متھائی (عیسائی) سرائن پی انجینئر (پارسی) شامل تھے۔

اس اعلان میں وائسرائے نے اس امر کی صراحت کر دی تھی کہ اگر مسلم لیگ اور کانگریس میں سے کسی پارٹی نے یہ تجاویز رد کر دیں تو حکومت اسے نظر انداز کر کے دوسری پارٹی کو جس نے یہ تجاویز منظور کرلی ہوں گی حکومت تشکیل دینے کے لئے مدعو کرے گی۔ مسلم لیگ نے وائسرائے کی یہ نئی تجاویز منظور کر لیں۔ لیکن جب ۲۵ جون کو دہلی میں کانگریس کی مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا اور اس میں یہ تجاویز رد کر دی گئیں تو اصولاً اور اپنے وعدے کے مطابق وائسرائے کو چاہیئے تھا کہ وہ مسلم لیگ کو عبوری حکومت بنانے کی دعوت دیتے مگر انہوں نے اپنے وعدے کا قطعاً پاس نہ کیا اور عبوری حکومت کی تشکیل کا معاملہ معرض التوا میں ڈال دیا۔ اس سے ایک بار پھر ثابت ہو گیا کہ کانگرس اور حکومت برطانیہ مسلم لیگ کو ناکام بنانے کے لئے پوری طرح متحد ہو چکے ہیں۔ پھر بھی طعنہ قائد اعظم کو دیا جاتا تھا کہ وہ انگریز کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ آخر کار ایک سیاسی ڈرامہ کھیل کر اواخر جون میں وزارتی مشن انگلستان واپس چلا گیا اور اپنی مسلم دشمنی کی ناخوشگوار یاد چھوڑ گیا۔

راست اقدام کا فیصلہ

اب صورت حال واضح ہو کر سامنے آگئی تھی کہ کانگرس اور حکومت دونوں مل کر مسلمانان ہندوستان کے خلاف ایک خطرناک کھیل کھیل رہے تھے۔ جس کا مقصد مسلمانوں کو ہندوؤں کی غلامی پر مجبور کرنا اور پاکستان کے مطالبے کے خلاف فضا ہموار کرنا تھا۔ ان حالات میں قائد اعظم کی زیر قیادت مسلم لیگ نے اپنی تاریخ کا سب سے بڑا فیصلہ کیا جس نے کانگرس اور حکومت دونوں کو لرزہ براندام کر دیا۔ ۲۷ جولائی کو آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس بمبئی میں طلب کیا گیا۔ قائد اعظم نے اس اجلاس کی صدارت کی۔ اس موقع پر قائد اعظم نے اپنی طبیعت اور عادت کے خلاف ایک سخت تقریر کی جس میں حکومت برطانیہ کے نمائندوں کو شعبدہ باز، عہد شکن اور ناقابل اعتبار قرار دیا۔ انہوں نے کانگرس کے رویہ پر کڑی نکتہ چینی کی اور کہا کہ کانگرس کا خیال ہے کہ وہ تنہا عبوری حکومت بنائے گی۔ ضرور بنائے، ہم اس سے خوفزدہ نہیں بلکہ اس کا علاج کریں گے۔ قائد اعظم نے اپنی تقریر کے آخر میں کہا کہ ان حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان کی سیاسی پیچیدگیوں کا حل صرف ایک ہے اور وہ ہے پاکستان۔ اس کے بعد مجلس عاملہ کو ڈائرکٹ ایکشن کا اختیار دے دیا گیا اور مسلم لیگی نمائندوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ حکومت برطانیہ کی عہد شکنی اور مسلم دشمنی کی پالیسی کے خلاف بطور احتجاج اپنے خطابات واپس کر دیں۔ چنانچہ اسی اجلاس میں شریک نمائندوں نے جن میں جبت سے خان بہادر اور سر شامل تھے اسی وقت اپنے خطابات واپس کر دیئے۔ آخر میں قائد اعظم نے اپنی اختتامی تقریر میں کہا کہ آج ہم آئینی طریقوں کو خدا حافظ کہتے ہیں۔ اب ہم ہتھیار استعمال کریں گے۔ جو ہمارے ہاتھ میں موجود ہے ہم الفاظ کے گورکھ دھندے میں پڑنے کے قائل نہیں۔ ہم نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل کر کے دکھائیں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ قائداعظم نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ کشت و خون ریزی سے اجتناب کریں اور اپنی جدوجہد کو پرامن رکھیں۔ انہوں نے کہا کہ اب مفاہمت کے سارے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ کانگرس اور انگریز دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا کہ ہم امن پسند ہیں، جنگ نہیں چاہتے لیکن اگر آپ جنگ کرنا ہی چاہتے ہیں تو ہم بلا تامل اسے قبول کر لیں گے۔

کلکتہ کا ہولناک فساد

آل انڈیا مسلم لیگ کی ہدایت پر ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو سارے ہندوستان کے مسلمانوں نے یوم راست اقدام منایا۔ جلوس نکالے، جلسے کئے، قراردادیں پاس کیں اور حصول پاکستان کے لئے ہر قربانی دینے کا عہد کیا۔ بنگال اور سندھ کی مسلم لیگی حکومتوں نے اس روز عام تعطیل کا اعلان کیا۔ مسلم لیگ اور اس کے رضاکاروں نے یہ دن نہایت پرامن طریقے سے منایا اور اپنی طرف سے کسی بدنظمی یا ہنگامے کی ابتدا نہیں کی مگر بنگال کی مسلم لیگی وزارت کو بدنام کرنے کے لئے کلکتہ کے ہندوؤں نے کانگرس کے ایماء پر اس تحریک راست اقدام کے خلاف سخت ہنگامہ کیا۔ بلوے شروع ہو گئے اور انہوں نے اتنی نازک صورت اختیار کر لی کہ پانچ ہزار آدمی قتل اور بیس ہزار زخمی ہوئے۔

ایک انگریز نے ان فسادات کا چشم دید حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "پولیس کے مردہ خانے میں اس وقت تک داخل ہونا محال تھا جب تک کہ سانس لینے کا مصنوعی آلہ استعمال نہ کیا جاتا۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ سڑی ہوئی لاشوں کے ڈھیر تھے جو چھت تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے ملٹری پولیس کے انگریز افسروں کی معیت میں جیپ میں بیٹھ کر تین گھنٹے تک شہر کا دورہ کیا۔ میں اس دورے میں جو منظر دکھائی دیا وہ میدان جنگ میں بھی نظر نہیں آسکتا۔" ؎۱

غیر نمائندہ عبوری حکومت

آخر جولائی میں مجلس دستور ساز کے انتخابات ہوئے۔ مسلم لیگ نے ۸۰ میں سے ۷۴ نشستیں حاصل کر لیں۔ گویا اس کی کامیابی کا تناسب ۹۴ فی صد تھا۔ یہ مسلم لیگ کی اتنی بڑی فتح تھی کہ اس کے بعد اس امر کے ثبوت کی ضرورت ہی باقی نہ رہی تھی کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور کسی جماعت کو مسلمانوں کی نیابت کا حق نہیں پہنچتا۔ اب عبوری حکومت بنانے کی دعوت اصولاً کانگرس اور مسلم لیگ کو دی جانی چاہیے تھی مگر لارڈ ویول وائسرائے ہند نے جو اقتدار ہر قیمت پر کانگرس کو منتقل کرنے کا تہیہ کئے بیٹھے تھے ایک نہایت غیر معقول طریقہ اختیار کیا۔ انہوں نے ۶ اگست ۱۹۴۶ء کو مسٹر نہرو کے نام ایک خط لکھا اور اس میں انہیں مخلوط عبوری حکومت میں شرکت کی دعوت دی۔

؎۱ قائداعظم جناح ــــ دی اسٹوری آف اے نیشن ص ۴۱۶

اور انہیں لکھا کہ آپ مسٹر جناح سے مشورہ کر کے مسلم لیگ کو بھی حکومت میں شامل کر لیں۔ اس کے جواب میں مسٹر نہرو نے وائسرائے کو لکھا کہ کانگرس عبوری حکومت میں شرکت کیلئے تیار ہے مگر اس کی شرط یہ ہے کہ وزارت بنانے کی دعوت کانگرس کو دی جائے۔ اسکے بعد کانگرس مسلم لیگ کو اس میں شرکت کی دعوت دے گی۔ لارڈ ویول نے مسٹر نہرو کا یہ مطالبہ منظور کر لیا اور ۱۲ اگست ۱۹۴۶ء کو اس کا سرکاری طور پر اعلان کر دیا گیا۔

یہ مسلم لیگ اور ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی بہت بڑی توہین تھی کہ عبوری حکومت بنانے کی دعوت کانگرس کو دی جائے اور پھر کانگرس مسلم لیگ کو دعوت دے۔ چنانچہ قائداعظم نے یہ دعوت رد کر دی اور جب مسٹر نہرو نے قائداعظم کو مخلوط حکومت میں شرکت کیلئے خط لکھا تو انہوں نے اس دعوت کو نہ صرف رد کر دیا بلکہ انہیں لکھا کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ وائسرائے اور آپ کے درمیان کیا معاملات طے ہوئے ہیں۔ اگر تمام امور آپ کے اور ان کے درمیان پہلے ہی طے پا چکے ہیں تو اس صورت میں مسلم لیگ کیلئے اس عبوری حکومت میں شرکت کرنا ممکن نہیں۔ البتہ اگر آپ چاہیں تو ہندو مسلم مسئلہ پر مجھ سے گفتگو کر سکتے ہیں۔ چنانچہ دونوں رہنماؤں میں گفتگو ہوئی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر کار پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق وائسرائے نے صدر کانگرس سے صلاح و مشورے کے بعد ۲۴ اگست ۱۹۴۶ء کو عبوری وزارت کے شرکاء کے ناموں کا اعلان کر دیا۔ اس وزارت کی تشکیل کے سلسلے میں ایک صریحاً ناانصافی یہ ہوئی کہ کانگرس کو نہ صرف اس کے نمائندوں کے انتخاب کا حق دیدیا گیا بلکہ مسلم لیگی نمائندوں کی نشستیں بھی کانگرسی نمائندوں سے پر کر دی گئیں صرف دو نام باقی رہ گئے جن کے متعلق فیصلہ کیا گیا کہ ان کا اعلان بعد میں کیا جائیگا۔ وائسرائے نے شاہ برطانیہ کی منظوری سے عبوری حکومت کے جن ناموں کا اعلان کیا تھا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فہرست ذیل میں درج کر دی جائے تاکہ یہ نام اور حکومت اور کانگرس کی صریح ناانصافی کا ثبوت تاریخ میں محفوظ ہو جائے۔

عبوری حکومت کے اراکین

(۱) پنڈت جواہر لال (۲) ڈاکٹر راجندر پرشاد (۳) سردار ولبھ بھائی پٹیل (۴) راج گوپال اچاریہ (۵) سرت چندر بوس (۶) آصف علی (۷) سر شفاعت احمد (۸) سید علی ظہیر (۹) سردار بلدیو سنگھ (۱۰) ڈاکٹر جان متھائی (۱۱) جگ جیون رام۔ (۱۲) کاؤس جی بھابھا جی۔ ان میں سے آصف علی، سر شفاعت احمد خان اور علی ظہیر کو مسلمانوں کے نمائندوں کی حیثیت سے شامل کیا گیا تھا اور افسوس کہ ان لوگوں نے وزارت اور اقتدار کے لالچ میں مسلمانوں کے مفادات کو یکسر نظر انداز کر دیا اور قائداعظم اور مسلم لیگ کے وقار کو سخت ٹھیس پہنچائی۔

اس اعلان کے بعد قائداعظم نے ایک طویل اور مدلل بیان جاری کیا۔ جس میں اس موقع پر وائسرائے نے جو تقریر کی تھی اس کی دھجیاں بکھیر دیں اور مسلم لیگ اور مسلمانوں کے ساتھ عہد شکنی اور خطرناک سازش کے خلاف سخت احتجاج کیا اور کہا کہ وائسرائے کی تقریر اور عبوری حکومت کے قیام کے بعد میں نے جو تاثر قبول کیا ہے وہ یہ ہے کہ مسلم لیگ اور مسلم انڈیا کے مفادات پر

کاری وار کیا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ مسلم انڈیا اس صدمے کو صبر اور اولوالعزمی سے برداشت کرے گا۔ عبوری حکومت اور مجلس دستور ساز میں شرکت کے معاملے میں مسلم انڈیا کو حصولِ انصاف میں جس ناکامی سے دوچار ہونا پڑا ہے وہ اس کے لئے سبق آموز ثابت ہوگا۔ اس عبوری حکومت میں جن تین مسلمانوں کو شامل کیا گیا تھا۔ ان کی شخصیت کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ان لوگوں کو مسلمانوں کا ہرگز اعتماد حاصل نہیں اور نہ مسلمانوں میں ان کی کوئی عزت و وقعت ہے۔ ان لوگوں کو منتخب کر کے وائسرائے نے مسلمانوں کی ہتک کی ہے اور ان کے دلوں کو زخمی کر دیا ہے۔ [لہ]

۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو اس غیر نمائندہ عبوری وزارت نے حلفِ وفاداری اٹھایا اور اس کے بعد ہی ہندوستان میں شدید ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ جن میں بمبئی اور احمد آباد کے فسادات نہایت ہولناک تھے اور ان میں مسلمانوں کا وسیع پیمانے پر جانی و مالی نقصان ہوا۔ یہ جمہوری حکومت کا پہلا تحفہ تھا جو مسلمانوں کو دیا گیا۔ اب کانگرس مرکزی حکومت پر قابض ہو چکی تھی۔ اسے سیاہ و سپید کا اختیار مل گیا تھا۔ ہندوؤں کے حوصلے بلند ہو چکے تھے۔ اسلئے اب وہ مسلمانوں پر جو ستم کرتے کم تھا۔

نواب بھوپال کا عظیم کارنامہ

اسی دوران میں ایک معجزہ رونما ہوا جس نے سارے ہندوستان کو حیرت زدہ کر دیا۔ قائداعظم اور مسٹر گاندھی کے اختلافات دور کرنے کے لئے بھوپال کے حکمران ہز ہائی نس نواب حمید اللہ خاں نے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔ انہوں نے قائداعظم اور مسٹر گاندھی سے متعدد ملاقاتیں کیں اور معلوم نہیں مسٹر گاندھی پر کیا سحر کیا کہ ان سے یہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ کانگرس کو اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ اب مسلم لیگ ہی ہندوستان کے مسلمانوں کی سب سے بڑی اکثریت کی نمائندہ تنظیم ہے اور اس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ صرف اسی کو ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی کا حق حاصل ہے۔

مسٹر گاندھی کی اس تحریر کا جب کانگرس اور خصوصاً پنڈت جواہر لال کو علم ہوا تو انہوں نے اپنا سر پیٹ لیا اور اعلان کر دیا کہ مسٹر گاندھی کا یہ خیال ان کی ذاتی رائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ کانگرس اسے تسلیم نہیں کرتی۔ اس صورت حال سے مسٹر گاندھی بھی گھبرا گئے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ تحریر دے کر وہ اپنے ہاتھ کٹوا چکے تھے۔ آخر مسٹر نہرو اور کانگرس کے دباؤ میں آکر انہوں نے ایک بیان دیا کہ "یہ تحریر لکھتے وقت مجھ سے غلطی ہو گئی تھی اور میں نے بغیر سوچے سمجھے لکھ دی تھی" دوسرے الفاظ میں مسٹر گاندھی نے نواب حمید اللہ خاں کے مقابلے میں اپنی شکست اور عدم تدبر کا اعتراف کرنے کے علاوہ یہ بھی ثابت کر دیا تھا کہ ان کے کسی قول و قرار حتیٰ کہ انکے اپنے قلم کی لکھی ہوئی تحریر کا بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسٹر گاندھی نے اپنی طویل سیاسی زندگی میں اگر کسی سے کھلم کھلا مات کھائی تو وہ نواب حمید اللہ خاں آف بھوپال تھے۔

عبوری حکومت میں مسلم لیگ کی شرکت

کہتے ہیں کہ ہر شر میں خیر کا بھی ایک پہلو ہوتا ہے۔ مسلم لیگ کی طرف سے یوم راست اقدام (ڈائرکٹ ایکشن ڈے) منانے

[لہ] ریسنٹ اسپیچز اینڈ رائٹنگز آف مسٹر جناح ۱۹۴۷ء، ص ۴۴۶، جلد ۲

کے موقع پر کانگرس کے ایماء سے کلکتہ کے ہندوؤں نے فسادات محض اس لئے شروع کئے تھے تاکہ بنگال کی مسلم وزارت کیلئے مشکلات
پیدا کی جائیں اور اسے بدنام کیا جائے مگر انہی فسادات نے ہندوستان کی سیاست میں بہت بڑا تغیر پیدا کر دیا اور لارڈ ویول کو اپنی اس
کوتاہی کا احساس ہو گیا کہ انہوں نے مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے کانگرس کو عبوری حکومت تشکیل دینے کی دعوت دیکر بہت بڑی غلطی
کی ہے مسلم لیگ نے عبوری حکومت کا مقاطعہ کر کے وائسرائے کیلئے سخت فکری بحران پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مسٹر گاندھی اور
جواہر لال نہرو کو بلا کر اس مسئلے پر گفتگو کی اور کہا کہ مسلم لیگ کی شرکت کے بغیر کانگرس کو حکومت تشکیل دینے کی دعوت موجودہ حالات
میں دانشمندی کے خلاف ہے۔ اس پر مسٹر گاندھی اور پنڈت نہرو نے وائسرائے سے کہا کہ آپ کانگرس کو وزارت بنانے کی دعوت
دیکر ایک وعدہ کر چکے ہیں کیا اب آپ اس وعدے سے منحرف ہو جائیں گے۔ اس پر وائسرائے نے کہا کہ اسوقت یہ حالات نہیں تھے۔
کلکتہ کے فسادات اور مسلم لیگ کے ڈائرکٹ ایکشن کے فیصلے نے ہندوستان کو خانہ جنگی کے دروازے پر پہنچا دیا ہے۔ اگر اس مرحلے
پر مسلم لیگ کو عبوری حکومت میں شریک نہ کیا گیا تو پھر انہی حالات کا اعادہ ہوگا اور میں ان حالات کا اعادہ نہیں چاہتا۔ مسٹر گاندھی اور
پنڈت نہرو نے وائسرائے سے اتفاق نہ کیا اور یہ ملاقات کسی فیصلے کے بغیر ختم ہو گئی۔ اسکے بعد مسٹر گاندھی اور پنڈت نہرو نے انگلستان
کی پارلیمنٹ کے بعض ارکین سے رجوع کیا جو ان کے ذاتی دوست تھے خطوط اور تاروں کے ذریعے انہوں نے کوشش کی کہ وزیر ہند
اور برطانوی وزیر اعظم پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ مسلم لیگ کو نظر انداز کر دیں۔ لیکن ان کی یہ کوششیں کامیاب نہ ہوئیں اور لارڈ ویول نے
وزیر ہند کو صحیح صورتحال سے مطلع کرنیکے بعد انہیں اس امر پر آمادہ کر لیا کہ مسلم لیگ کو عبوری حکومت میں شرکت کی پھر دعوت دی جائے۔
اس کے ساتھ ساتھ قائد اعظم کو بھی اس حقیقت کا احساس ہو گیا تھا کہ اگر عبوری حکومت میں صرف کانگرس سیاہ و سپید کی مالک بنی
رہی تو برصغیر کے مسلمانوں کے مفادات کو اور نقصان پہنچے گا۔ ادھر دشواری یہ تھی کہ قائد اعظم کی زیر قیادت مسلم لیگ یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ
کانگرس کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی مسلمان کو اپنے کوٹے میں عبوری حکومت کا رکن نامزد کرے۔ اسی دوران میں وائسرائے نے ۱۶ ستمبر
۱۹۴۶ء کو قائد اعظم سے ملاقات کی۔ اس کے بعد پنڈت نہرو اور وائسرائے اور قائد اعظم کے درمیان گفت و شنید ہوئی تاکہ مسلم لیگ
اور کانگرس کے اختلافات ختم ہو جائیں۔ ۲ اکتوبر کو قائد اعظم نے عبوری حکومت میں شرکت کیلئے مسلم لیگ کی شرائط سے وائسرائے
کو مطلع کر دیا۔ جن میں سے اہم شرائط یہ تھیں۔

وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل ۱۴ ارکین پر مشتمل ہوگی۔ کانگرس ۶ ارکین نامزد کریگی جن میں سے ایک اچھوت ہوگا۔ کانگرس
کو کسی مسلمان رکن کے نامزد کرنیکا اختیار نہ ہوگا۔ فرقہ وارانہ مسئلہ کا اسوقت تک فیصلہ نہ کیا جائے جب تک کہ ہندو اور مسلمان ارکین
کی اکثریت اس سے اتفاق نہ کرے۔ اہم شعبوں کی تقسیم مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان مساوی طور پر عمل میں لائی جائے۔ مندرجہ بالا
شقوں میں مسلم لیگ اور کانگرس کی رضامندی کے بغیر کوئی تغیر و تبدل نہ کیا جائے۔

وائسرائے نے ان میں سے بیشتر شرائط منظور کر لیں۔ البتہ یہ شرط تسلیم نہیں کی کہ کانگرس کو مسلمان رکن نامزد کرنیکا اختیار نہ دیا
جائے۔ اسکے ساتھ ساتھ وائسرائے نے قائد اعظم کو لکھا کہ ان شرائط کو تسلیم کرنے اور بمبئی کے اجلاس میں مسلم لیگ نے عبوری حکومت

میں شرکت کے خلاف جو قرارداد منظور کی تھی اس پر نظرِ ثانی کرنے کے لئے مسلم لیگ کونسل کا اجلاس بلایا جائے۔ ؎

اس کے بعد قائدِ اعظم وائسرائے سے ملے اور انہوں نے ایک عجیب تجویز پیش کی جو کانگرس کے قصرِ تدبر اور ایوانِ سیاست کیلئے ایک کاری ضرب کی حیثیت رکھتی تھی۔ انہوں نے وائسرائے سے کہا کہ اگر کانگرس کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اقلیتی فرقوں کی بھی نمائندگی کر سکتی ہے اور عبوری حکومت میں ایک اقلیتی نمائندہ نامزد کر سکتی ہے تو یہ حق مسلم لیگ کو بھی دیا جائے کہ وہ بھی عبوری حکومت میں کسی بھی اقلیتی فرقہ سے ایک نمائندہ نامزد کرے۔ وائسرائے نے قائدِ اعظم کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس طلب کیا گیا جو ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۶ء سے ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۶ء تک دہلی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت قائدِ اعظم نے کی۔ اس اجلاس میں جو فیصلہ کیا گیا ۱۳ اکتوبر کو اس کی ایک نقل وائسرائے کو بھیج دی گئی۔ فیصلہ میں کہا گیا تھا کہ اگرچہ وائسرائے نے جو طریقِ کار اختیار کیا ہے وہ ۸ اگست ۱۹۴۰ء کے اعلان کے خلاف ہے لیکن یہ خیال کر کے کہ اگر عبوری حکومت میں کانگرس کو ملک کے سیاہ و سپید کا مالک بنا دیا گیا تو اس سے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے مفادات کو سخت نقصان پہنچے گا نیز عین ممکن ہے کہ عبوری حکومت میں ایسے مسلمانوں کو شامل کر لیا جائے جو مسلمانوں کے اعتماد سے محروم ہوں بغرض یہ اور بعض دیگر وجوہ کی بنا پر جو سب پر واضح ہیں مسلم لیگ نے وائسرائے کی ۲۴ اگست کی نشری تقریر اور ان کے ۱۲ اور ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۶ء کے خطوط میں بیان کی ہوئی شرائط کے مطابق عبوری حکومت میں شرکت کا فیصلہ کیا ہے مسلم لیگ پانچ اراکین کا تقرر کرے گی۔ چنانچہ وائسرائے کی درخواست پر قائدِ اعظم نے اسی دن مندرجہ ذیل پانچ افراد کے نام عبوری حکومت کے لئے وائسرائے کو بھیج دیئے۔

(۱) نوابزادہ لیاقت علی خان (۲) آئی آئی چندریگر (۳) سردار عبدالرب نشتر (۴) راجہ غضنفر علی خان (۵) جگندر ناتھ منڈل (اچھوت رہنما) وائسرائے نے یہ نام منظور کر لئے اور انہیں مندرجہ ذیل شعبے تفویض کر دیئے۔

خزانہ (نوابزادہ لیاقت علی خاں) تجارت (آئی آئی چندریگر) قانون (جگندر ناتھ منڈل) صحت (راجہ غضنفر علی خاں) مواصلات (سردار عبدالرب نشتر)

لیاقت علی خاں کا بجٹ

ہندوستان کی اس عبوری حکومت کا قابلِ ذکر واقعہ نوابزادہ لیاقت علی خاں کا وہ بجٹ ہے جس نے کانگرس اور پنڈت نہرو کے اس دعوے کی قلعی کھول دی کہ وہ سوشلسٹ ہیں اور غریبوں کے مفادات کے محافظ۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں نوابزادہ صاحب نے مرکزی اسمبلی میں بجٹ پیش کیا۔ اس بجٹ کو غریب آدمی کا بجٹ قرار دیا گیا۔ کیونکہ اس میں ایک لاکھ سے زائد آمدنی پر ۲۵ فی صد کی شرح سے کاروباری ٹیکس عائد کیا گیا تھا۔ اس طرح بجٹ کو متوازن

؎ ریسنٹ اسپیچز اینڈ رائٹنگز ص ۴۵۱ جلد ۲

بنانے کے ساتھ ساتھ غریب آدمی کو ٹیکس کے بارے بھی بچا لیا گیا تھا۔ چونکہ اس وقت تجارت عام طور پر ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی بڑے بڑے سیٹھ، ساہوکار، مہاجن اور ملوں کے مالک ہندو ہی تھے اور وہی کانگرس کو کروڑوں روپیہ دے کر اس کی امداد کر رہے تھے۔ گویا اس بجٹ سے ایک طرف تو ہندو سرمایہ داری کے مفادات پر زد پڑتی تھی اور دوسری طرف یہ بجٹ پاس ہو جانے کی صورت میں کانگرس کو ہندو سیٹھوں کے تعاون سے محروم ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے اس نے اس بجٹ کی سخت مخالفت کی اور پنڈت نہرو جیسے سوشلسٹ نے بھی اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

نوابزادہ لیاقت علی خاں کو خزانہ کا محکمہ دے کر کانگرس اور ہندو سرمایہ داروں کو صرف یہی نقصان نہیں ہوا بلکہ اب ایک چپراسی کے تقرر کے لئے بھی وہ مسلم لیگی وزیر خزانہ کے محتاج ہو گئے۔ نوابزادہ لیاقت علیخاں کے اس بجٹ نے انگریز مدبروں سے بھی خراج تحسین حاصل کیا۔ انہیں بہت بڑا ماہر مالیات اور غربا کا ہمدرد قرار دیا گیا۔

خون ریز فسادات

عبوری حکومت میں مسلم لیگ کی شرکت کے ساتھ ہی ہندو فرقہ پرستوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ کانگرسی لیڈروں خصوصاً پنڈت نہرو اور سردار پٹیل نے سخت اشتعال انگیز تقریریں کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہار سے لے کر یوپی اور پنجاب تک مسلمانوں پر حملوں اور ان کے قتل و غارت کا ہولناک سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس سے قبل نواکھالی میں فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا جس میں مسلمانوں کی بہ نسبت ہندو کچھ زیادہ تعداد میں مارے گئے تھے۔ ہندو تنظیموں نے اس کا انتقام لینے کے لئے ۲۵ اکتوبر کو بہار میں یوم نواکھالی منایا۔ ہندوؤں کے گروہ جو ہزاروں افراد پر مشتمل ہوتے تھے مسلمانوں کے دیہات اور محلوں پر حملے کرنے لگے۔ ایک اندازے کے مطابق صرف ایک ماہ میں ۵۰ ہزار مسلمان ایک صوبہ یعنی بہار میں قتل کر دیئے گئے۔ اور زخمیوں کا تو کوئی شمار نہیں۔ ڈیڑھ لاکھ مسلمان وطن سے بے وطن ہوئے۔ ان مقتول، زخمیوں اور پناہ گزینوں پر جو مظالم کئے گئے ان کی تفصیل سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اس کے بعد یوپی کے مقام گڈھ مکتیشر میں جہاں ہندو اشنان کرنے جاتے ہیں ہولناک فساد ہوا۔ اشنان سے واپس جاتے ہوئے مسلح ہندوؤں نے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق راستے کے دیہات میں مسلمانوں کا قتل عام کیا اور بعض جگہ مسلمان عورتوں کو بے آبرو کر کے اپنی خباثت کا ثبوت فراہم کیا۔

ماسٹر تارا سنگھ کا نعرۂ جنگ

اس کے بعد ہی سکھوں کے مشہور و مقبول رہنما ماسٹر تارا سنگھ نے پاکستان کی مخالفت میں اپنی مہم تیز کر دی۔ انہوں نے ہندوؤں سے مل کر متحدہ محاذ بنایا اور ایک منصوبے کے مطابق پنجاب میں مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگنا شروع کر دیئے۔ حالانکہ مسلم لیگ اور قائد اعظم نے سکھوں کے رہنماؤں سے بار بار مصالحت کی کوشش کی اور انہیں یقین دلایا کہ پاکستان میں ان کے حقوق کا خاص خیال رکھا جائیگا اور انہیں مخصوص مراعات ملیں گی مگر انہوں نے قائد اعظم کی پیشکش رد کر دی۔

۴ مارچ کو ماسٹر تارا سنگھ اپنے رفقار کیساتھ اس کمرے سے برآمد ہوئے جس میں اسمبلی پارٹی کے جلسے ہوتے تھے انہوں نے پنجاب اسمبلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر، تلوار گھما کر یہ نعرے بلند کئے۔ پاکستان مردہ باد۔ ست سری اکال اسکے بعد انہوں نے فرمایا کہ "وقت آگیا ہے کہ بس اب تلوار کی طاقت سے فیصلہ ہوگا سکھ تیار ہیں ہمیں مسلمانوں کے حواس درست کرنے ہیں"

اسی دن ایک جلسہ عام میں ماسٹر تارا سنگھ نے کہا کہ "اے ہندو! اور سکھو تمہارے امتحان کا وقت آگیا ہے۔ بھائیوں اور تازیوں کی طرح جانیں دینے کیلئے تیار ہوجاؤ۔ مادر وطن خون مانگ رہی ہے اور ہم خون سے اسکی پیاس بجھائیں گے ...... میں نے بگل بجادیا ہے۔ مسلم لیگ کو ختم کردو۔ ؎

ان اشتعال انگیز تقریروں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکھوں نے منظم و مسلح ہوکر سارے پنجاب خصوصاً مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر ایسے مظالم توڑے کہ بندا بیراگی اور چنگیز کی یاد تازہ ہوگئی۔ یقیناً لاکھوں مسلمانوں کے قتل اور ہزاروں مسلمان عورتوں کی عصمت دری کا ذمہ دار تارا سنگھ اور اس کے سکھ پیروکار ہیں۔ لوگ ان دردناک واقعات کو بھلا دیں اور سیاسی مصلحتیں سیاہ کو سپید اور سپید کو سیاہ بنادیں لیکن تاریخ نویس ان حقائق کو نہ چھپا سکتا ہے اور نہ جھٹلا سکتا ہے کہ پاکستان کے لئے جتنے مصائب ماسٹر تارا سنگھ اور ان کے حامی سکھوں نے پیدا کئے وہ اس مملکت کو تباہ کر دیتے اگر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ اس مملکت کے قیام میں کارفرما نہ ہوتا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا تقرر

عبوری حکومت میں مسلم لیگ کی شرکت کے بعد کانگرس خصوصاً پنڈت نہرو نے نہایت افسوسناک طرزعمل اختیار کیا۔ انہوں نے اپنی پوزیشن وزیر اعظم کی قرار دی اور مسلم لیگی اراکین کو اپنے تابع فرمان بنانیکی کوشش شروع کردی۔ اس صورتحال نے کئی بار عبوری حکومت کو خطرے میں ڈال دیا۔ ایک موقع پر پنڈت نہرو نے وائسرائے کو یہاں تک مشورہ دیدیا کہ مسلم لیگی اراکین کو مجبور کیا جائے کہ وہ عبوری حکومت سے الگ ہوجائیں۔ ایسا موقع بھی آیا جب قائد اعظم نے کانگرس کے طرزعمل سے مجبور ہوکر مسلم لیگی نمائندوں کو اسمبلی کے اجلاس کے مقاطعہ کا حکم دیا۔ کشمکش کے اس دور میں نوابزادہ لیاقت علی خاں نے مسٹر نہرو اور کانگریسی اراکین کا نہایت پامردی اور ناقابل شکست دلائل سے مقابلہ کیا اور ان کی ہر سازش اور کوشش کو ناکام بنادیا۔ ہندوستان میں سیاسی اور انتظامی صورتحال جس تیزی سے بگڑ رہی تھی۔ اسی تیزی سے حکومت برطانیہ اقتدار ہندوستانی نمائندوں کو منتقل کرنیکی کوشش کررہی تھی کیونکہ اسے یقین ہوچکا تھا کہ اب معاملہ اسکے اختیار سے باہر ہوتا جارہا ہے اور مزید کشت وخون ریزی کی ذمہ داری وہ اپنے سر لینے کو تیار نہ تھی۔ چنانچہ ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو وزیر اعظم برطانیہ لارڈ اٹیلی نے اعلان کیا ہندوستان میں جو سیاسی اختلافات پیدا ہوگئے ہیں ان کا دستور ساز اسمبلی پر نہایت ناخوشگوار اثر پڑ رہا ہے۔ یہ غیر یقینی صورتحال نہایت خطرناک ہے اور اسے زیادہ طول نہیں

؎ سکھ منصوبہ صفحہ ۸۶، ص ۸۸ بحوالہ پاکستان ناگزیر تھا ص ۲۸۱

دیا جا سکتا۔ اس لئے حکومت برطانیہ نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جون ۱۹۴۸ء سے قبل ہی ملک کا اقتدار اہلِ ہند کے نمائندوں کو منتقل کر دیا جائے۔ ۱۹۳۵ء کا ایکٹ ختم کیا جا رہا ہے اور انتقالِ اقتدار کے سلسلے میں عنقریب ایک قانونی دستاویز اہلِ ہند کے نمائندوں کے سامنے پیش کر دی جائے گی۔ لارڈ ویول کو ان کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر کے ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا جا رہا ہے جو ہندوستانی نمائندوں کو حکومت کی ذمہ داریاں تفویض کریں گے۔

وزیرِ اعظم برطانیہ کی یہ تاریخی تقریر گویا ہندوستان سے برطانوی اقتدار کے خاتمے کا اعلان تھا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے آخری وائسرائے تھے۔ برطانوی وزیرِ اعظم کی تقریر کا اہلِ ہند نے دل کی گہرائیوں سے خیر مقدم کیا۔ اسکے ساتھ ہی ملک میں سیاسی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ ۲۴ مارچ ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن نے وائسرائے ہند کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ انہوں نے ہندوستان آتے ہی جس تیز رفتاری سے انتقالِ اقتدار کی کارروائی شروع کی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ہندوستان کے نمائندوں کو جلد سے جلد امورِ حکومت تفویض کرنیکے علاوہ ایک مقصد یہ بھی تھا کہ انہیں ہندوستان اور پاکستان دونوں اپنا گورنر جنرل تسلیم کر لیں یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم ہندوستان ہی انہیں گورنر جنرل کے طور پر قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ ان کا رجحان شروع ہی سے کانگرس کی طرف تھا اور اس حقیقت سے خود انگلستان کی پارلیمنٹ کے اراکین اور برطانوی وزیرِ اعظم بھی واقف تھے۔ چنانچہ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان آتے ہی کانگرس کی طرف اپنے جھکاؤ کا ثبوت دینا شروع کر دیا اور ان کے عہدِ اقتدار میں ملک کی تقسیم جس طرح عمل میں آئی اور اس سے جو نت نئے اور پیچیدہ مسائل پیدا ہوئے اس نے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح ثابت کر دی کہ وہ کانگرس کے دوست اور مسلم لیگ اور قائدِ اعظم کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے ہندوستان آتے ہی مسٹر گاندھی، پنڈت نہرو، سردار پٹیل اور قائدِ اعظم سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ قائدِ اعظم سے ملاقاتوں میں انہوں نے سخت رویہ اختیار کیا اور پوری کوشش کی کہ دس کروڑ مسلمانوں کے اس عظیم رہنما کو اپنے فکر و خیال کے سانچے میں ڈھال لیں مگر اس مقصد میں انہیں کامیابی نہ ہوئی کیونکہ جس شخص سے ان کا سابقہ پڑا تھا وہ معمولی انسان نہ تھا۔ اس نے اپنی طویل سیاسی زندگی میں بڑے بڑے جابر انگیز حکمرانوں کے کس بل نکال دیئے تھے۔

قائدِ اعظم اور ماؤنٹ بیٹن کے درمیان جتنی ملاقاتیں ہوئیں ان میں قائدِ اعظم نے پوری قوت سے ایک ہی موقف پیش کیا کہ ہندوستان متحد نہیں رہ سکتا۔ پاکستان دس کروڑ مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ ہے اور وہ اس کے حصول کیلئے ہر قربانی دیں گے۔ آزاد و خود مختار پاکستان کے علاوہ مسلمان کسی فارمولے سے اتفاق نہیں کریں گے۔ ان ملاقاتوں میں ماؤنٹ بیٹن نے اندازہ کر لیا بلکہ انہیں یقین ہو گیا کہ ہندوستان متحد نہیں رہ سکتا اور دو آزاد و خود مختار مملکتوں کا قیام ناگزیر ہو گیا ہے چنانچہ انہوں نے ۱۵ اپریل کو صوبائی گورنروں کا ایک اجلاس طلب کیا اور ان سے گفت و شنید کے بعد ہندوستان کی تقسیم کا ایک منصوبہ تیار کیا جس کے مطابق بعض صوبوں کی بھی تقسیم عمل میں لائی جانی تھی۔

سردار پٹیل کے عزائم

حقیقت یہ ہے کہ ماؤنٹ بیٹن کی آمد سے قبل ہی صورت حال ایسی پیدا ہوئی تھی کہ خود کانگریسی رہنماؤں کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ ہندوستان متحدہ نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے اپنے ایک دوست کانجی دوار کا داس کو جو خط لکھا تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود کانگریسی لیڈر بھی تقسیم ملک کو قبول کرنے لگے تھے مگر بادل ناخواستہ۔ اسکے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کو ایسا پاکستان دینا چاہتے تھے جو کمزور اور کٹا پھٹا ہو اور جس کے متعلق انہیں یقین تھا کہ یہ زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکے گا۔ سردار پٹیل کے مندرجہ ذیل خط سے اندازہ ہو سکے گا کہ پاکستان کی اسکیم وہ کس رنگ میں قبول کرنا چاہتے تھے اور کیوں؟

"اگر مسلم لیگ پاکستان قائم کرنے پر مصر ہی ہے تو اسکا کوئی اور طریقہ نہیں سوائے اس کے کہ بنگال اور پنجاب کو تقسیم کیا جائے۔ مسلم لیگ کو سارا بنگال اور سارا پنجاب نہیں دیا جا سکتا۔ میرا خیال ہے کہ برطانوی حکومت ملک کی تقسیم پر آمادہ نہیں ہوگی اور وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گی کہ عقلمندی کا تقاضا یہی ہے کہ ہندوستان کا اقتدار سب سے بڑی اور مضبوط جماعت کے سپرد کر دیا جائے لیکن اگر ایسی صورت عمل میں نہ آئی اور ملک تقسیم ہو گیا تو مشرقی بنگال، پنجاب کا ایک علاقہ، سندھ اور بلوچستان کے علاوہ، جو مرکزی حکومت قائم ہو گی وہ اتنی مضبوط ہو گی کہ ایک دن یہ علاقے از خود اسمیں شمولیت اختیار کر لیں گے"[1]

سردار پٹیل نے اس مسئلے پر نجی خط و کتابت ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ۵ مارچ ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی مجلس عاملہ سے ایک تجویز پاس کرا دی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ پنجاب کی غیر مسلم اقلیت کو اکثریت کے مظالم سے محفوظ کرنے کے لئے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک علاقہ مسلم اکثریت کا دوسرا غیر مسلم اقلیت کا۔ اس طرح گویا انہوں نے ملک کی تقسیم کا اصول منظور کر لیا۔

کانگریسی رہنماؤں نے پاکستان قبول کر لیا

ماؤنٹ بیٹن اور پنڈت نہرو میں نہایت مخلصانہ روابط پیدا ہو گئے تھے اور وہ اپنے منصوبے کی تشکیل اور اس کے مختلف مراحل سے اپنے عزیز دوست کو پوری طرح باخبر رکھ رہے تھے۔ پنڈت نہرو نے اس منصوبے سے اتفاق کر لیا تھا اور وہ پاکستان قبول کرنے پر آمادہ ہو چکے تھے مگر اس شرط کے ساتھ کہ صوبوں کی تقسیم عمل میں لائی جائے۔ ہندوستان کے دوسرے کانگریسی رہنما بھی اس سے متفق ہو چکے تھے لیکن مسٹر گاندھی کانگریس کے اس طرز فکر پر نہایت برہم ہوئے مگر پنڈت جواہر لال نے انہیں بھی تقسیم ملک کا فارمولا قبول کرنے پر آمادہ کر لیا۔

قائداعظم اور صوبوں کی تقسیم

کانگرس کی طرف سے ملک کی تقسیم قائداعظم اور ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی بہت بڑی فتح تھی مگر اسکے ساتھ ساتھ صوبوں کی تقسیم کا فتنہ مسلم لیگ کے اس مطالبے کو نقصان پہنچانے کی ایک بھرپور اور مذموم کوشش تھی۔ قائداعظم نے فوراً اس کا نوٹس لیا اور ایک بیان میں اس شرارت کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ :-

---

[1] مہاتما گاندھی، دی لاسٹ فیز ص ۸۳ جلد ۲ مولفہ پیارے لال

"بنگال اور پنجاب کے صوبوں کو تقسیم کرنے کی تجویز (سارے ملک کیلئے) تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ اسکی تہہ میں بغض و عداوت اور غیظ و غضب کے جذبات کارفرما ہیں۔ مسلمانوں نے پاکستان کا مطالبہ اس لئے کیا ہے کہ انہیں ایک قومی وطن میسر آجائے اور اس میں انہیں قومی دولت سے بہرہ ور ہونے کا موقع ملے۔ انکا مطالبہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان، بنگال اور آسام کے لیے ہے۔ اگر پنجاب اور بنگال کی تقسیم عمل میں آئی تو پھر باقی صوبوں کو بھی تقسیم کرنا ہوگا۔ اس طرح صوبوں کی سیاسی، اقتصادی اور انتظامی حیثیت کو سخت نقصان پہنچے گا۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے اور ذخائر کو بھی، نیز ہندوستان اور پاکستان کو مکمل طور پر خود مختار اور آزاد مملکتوں میں تبدیل کیا جائے۔" لے

قیام پاکستان کا منصوبہ

بہر حال لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے صوبائی گورنروں اور ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں سے تبادلہ خیال کے بعد تقسیم ملک کا منصوبہ انگلستان بھیج دیا۔ کہا جاتا ہے کہ انگلستان میں اس صوبے میں بعض ایسی ترامیم کی گئیں جو مسلمانوں کے حق میں مفید تھیں مگر جب یہ منصوبہ وائسرائے کے پاس پہنچا اور انہوں نے اسے مسٹر نہرو کو دکھایا تو انہوں نے اس پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا چنانچہ ماؤنٹ بیٹن نے اس میں بعض ترامیم کیں جو کانگرس کے نقطۂ نگاہ سے نہایت مفید تھیں اور پھر یہ منصوبہ انگلستان بھیج دیا۔ اس منصوبے کی خاص باتیں یہ تھیں (۱) ہندوستان کے سیاسی راہنماؤں کو اس امر سے اتفاق ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کے بارے میں عوام کی رائے معلوم کی جائے۔ (۲) اگر اہل ہند نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ایک مرکزی حکومت کے تحت رہیں گے تو موجودہ مجلس دستور ساز کو درجۂ نوآبادی کی بنیاد پر اقتدار منتقل کر دیا جائیگا۔ (۳) اگر انہوں نے دو خود مختار مملکتوں کے قیام کا فیصلہ کیا تو دونوں ملکوں کی دستور ساز اسمبلیوں کو درجۂ نوآبادی کے تحت اختیارات منتقل کر دیئے جائیں گے (۴) دونوں مملکتوں کا ایک ہی گورنر جنرل ہوگا اور اسکا از سر نو تقرر کیا جائیگا۔ (۵) ملک کی تقسیم کے فیصلے کی صورت میں سرحدوں کے تعین کیلئے ایک باؤنڈری کمیشن کا تقرر کیا جائیگا۔ (۶) دو مملکتوں کے قیام کے بعد ہندوستان کی فوجوں کو دونوں مملکتوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائیگا۔ (۷) مخلوط یونٹوں کی تقسیم کیلئے ایک کمیٹی قائم کی جائے گی جس میں فیلڈ مارشل آکن لک اور دونوں مملکتوں کے چیف آف جنرل اسٹاف شامل ہوں گے۔ اس کمیٹی کی نگرانی ایک کونسل کریگی جو دونوں مملکتوں کے گورنروں اور دونوں مملکتوں کے وزرائے دفاع پر مشتمل ہوگی۔ یہ ادارے اسوقت ختم کر دیئے جائیں گے جب دونوں مملکتوں کے درمیان افواج کی تقسیم کا کام مکمل ہو جائے گا۔" ے

ماؤنٹ بیٹن نے قائد اعظم کو مدعو کر کے ان کے سامنے اپنی تجاویز پیش کیں اور انہیں دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ اگر مسلم لیگ نے یہ تجاویز منظور نہ کیں تو حکومت جس جماعت کو چاہے گی اختیارات حکومت منتقل کر دیگی۔ ظاہر ہے کہ وائسرائے کا اشارہ صاف طور پر کانگرس کی طرف تھا مگر قائد اعظم پر اس دھمکی کا ذرہ برابر اثر نہ ہوا اور وہ اپنی جگہ پہاڑ کی طرح قائم رہے۔ انہوں نے ماؤنٹ بیٹن کو ایک ہی جواب دیا کہ "ہندوستان میں دو آزاد اور خود مختار ریاستیں قائم کی جائیں"۔ ماؤنٹ بیٹن کے سامنے

لے ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا صفحہ ۳۵۵ ے ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا صفحہ ۳۶۶

قائد اعظم نے جس تدبر و فراست اور پامردی کا مظاہرہ کیا اسے دیکھ کیمبل جانسن نے انہیں ان الفاظ میں خراج تحسین ادا کیا کہ
"حالات کے اتار چڑھاؤ نے ثابت کر دیا ہے کہ جناح نہایت مضبوط اعصاب کے مالک ہیں۔ اسکے بعد وائسرائے انگلستان
روانہ ہو گئے تاکہ تقسیم کے منصوبے پر وہاں کے ارباب حکومت سے گفتگو کر کے اس کی منظوری حاصل کر سکیں۔

گزرگاہ کا مطالبہ

اسی اثناء میں قائد اعظم نے ایک اور مطالبہ کیا جس نے کانگریسی کیمپ میں کھلبلی ڈال دی۔ انہوں نے ۲۲ مئی ۱۹۴۷ء کو
رائٹر کے نامہ نگار سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے دونوں حصوں کو باہم ملانے کیلئے ہندوستان کو ایک گزرگاہ دینی ہوگی۔
اس پر پنڈت نہرو اور ڈاکٹر راجندر پرشاد نے نہایت برہمی کا اظہار کیا اور پنڈت نہرو نے تو تہذیب و اخلاق کا دامن چھوڑ کر
اس مطالبے کیلئے "بیہودہ مطالبے" کے نازیبا الفاظ استعمال کئے۔ اس پر کانگرس اور مسلم لیگی اخباروں میں بڑی گرما گرم بحث رہی۔

ماؤنٹ بیٹن ۳۱ مئی کو ہندوستان واپس آگئے اور انہوں نے ۲ جون ۱۹۴۷ء کو مسلم لیگی اور کانگریسی رہنماؤں کو
ملاقات کیلئے طلب کیا۔ مسلم لیگ کی طرف سے قائد اعظم، نوابزادہ لیاقت علی خاں اور سردار عبدالرب نشتر، کانگریس کی طرف
سے پنڈت جواہر لال، سردار ولبھ بھائی پٹیل اور اس وقت کے صدر کانگرس آچاریہ کرپلانی اور سکھوں کی طرف سے سردار بلدیو سنگھ
نے اس گفت و شنید میں حصہ لیا۔ اس ملاقات میں وائسرائے نے یہ خوشخبری سنائی کہ ہندوستان میں جو واقعات پیش آئے ہیں انہیں
مدنظر رکھتے ہوئے حکومت برطانیہ نے فیصلہ کیا ہے کہ اقتدار کی منتقلی جون ۱۹۴۸ء کی بجائے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تک کر دی جائے۔

اس موقع پر وائسرائے نے جو منصوبہ ہندوستانی رہنماؤں کے سامنے پیش کیا اس میں کہا گیا تھا کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان
کی تقسیم کا اصول منظور کر لیا ہے۔ دو مملکتوں کو الگ الگ اختیارات تفویض کئے جائیں گے۔ انکی حیثیت آزاد ڈومینین کی
ہو گی اور انہیں دولت مشترکہ سے الگ ہونے کا اختیار حاصل ہوگا۔ بنگال اور پنجاب کی صوبائی اسمبلیوں کے مسلم اور غیر
مسلم نمائندے الگ الگ اجلاس منعقد کر کے صوبوں کی تقسیم کے حق یا موافقت میں فیصلہ کریں گے۔ اسی طرح سندھ کی اسمبلی
کے اراکین دونوں مملکتوں میں سے کسی ایک مملکت میں شامل ہونیکے بارے میں فیصلہ کریں گے۔ آسام کے سلہٹ ڈسٹرکٹ میں
استصواب کے ذریعے وہاں کے باشندوں کی رائے معلوم کی جائیگی کہ وہ ہندوستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا پاکستان میں؟
اگر پاکستان میں شامل ہونے والے مجوزہ صوبوں کے لوگوں نے ملک کی تقسیم کا فیصلہ کیا تو ایک باؤنڈری کمیشن مقرر کیا جائیگا
جو سرحدوں کا تعین کریگا۔ آخر میں ایک تجویز بطور ضمیمہ اس منصوبہ میں شامل کی گئی تھی جس میں ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کیمطابق
بنگال اور پنجاب کے مسلم اکثریت کے اضلاع کے نام درج تھے۔

کانگرس نے اسی روز یعنی ۲ جون کو یہ تجاویز منظور کر لیں اور وائسرائے کی خواہش کیمطابق ۱۲ بجے شب سے قبل انہیں
منظوری کی اطلاع دیدی۔ اسی قسم کی خواہش وائسرائے نے قائد اعظم سے بھی کی لیکن قائد اعظم نے فرمایا کہ میں ذاتی طور پر
ان تجاویز کو منظور کرتا ہوں لیکن آخری اور قطعی فیصلہ آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کریگی جس کا اجلاس میں فوری طور پر طلب کر

رہا ہوں مگر ماؤنٹ بیٹن کو سخت گھبراہٹ اور عجلت تھی۔ انہیں یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں مسلم لیگ ان تجاویز کو رد نہ کر دے۔ اسلیئے انہوں نے قائد اعظم سے کہا میں کل یعنی ۳ جون کو پھر سیاسی رہنماؤں کی کانفرنس بلا رہا ہوں۔ اس کانفرنس میں جملہ سیاسی پارٹیوں کی طرف سے ان تجاویز کی منظوری کا اعلان کیا جائیگا۔ آپ کی طرف سے میں اعلان کر دوں گا کہ مسٹر جناح نے بھی یہ تجاویز منظور کر لی ہیں۔ اس موقع پر آپ صرف اثبات میں سر ہلا دیجئے گا۔ قائد اعظم نے وائسرائے کی یہ خواہش پوری کر دی اور ۳ جون کی کانفرنس میں ہندوستان کے نمائندہ سیاسی رہنماؤں نے اس منصوبے کی منظوری کا اعلان کر دیا۔

پاکستان زندہ باد

طے شدہ پروگرام کے مطابق ۳ جون کی شام کو وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن، پنڈت جواہر لال نہرو اور قائد اعظم نے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے اہل ہند کو مخاطب کیا اور اس منصوبے کی منظوری کا اعلان کیا۔ وائسرائے نے اپنی تقریر میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ ان کی دیرینہ خواہش کے مطابق متحدہ ہندوستان کا قیام عمل میں نہ آسکا اور مسلم لیگ نے تقسیم ہند کے علاوہ اور کسی منصوبے پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔ اسکے بعد انہوں نے اسی منصوبے کے بعض نکات دہرائے۔

پنڈت نہرو نے اپنی تقریر میں تقسیم ہند پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا اور کہا کہ میں ان تجاویز کی منظوری کا اعلان مسرت کے ساتھ نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے یہ گوارا نہ تھا کہ ہندوستان کی کانٹ چھانٹ کی جائے مگر کشت و خون ریزی روکنے کیلئے اس کے سوائے اور کوئی چارہ کار نہیں اسلیئے کانگریس اس منصوبے کو منظور کرتی ہے۔

سب سے آخر میں قائد اعظم نے اہل ہند کو مخاطب کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ مجھے خوشی ہے کہ آج میں آل انڈیا ریڈیو پر آپ سے خطاب کر رہا ہوں ——— اگرچہ یہ منصوبہ مسلم لیگ کے مطالبات کے مطابق نہیں اس لیئے میں اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ دہلی کے مسلم لیگی حلقوں میں اسکا خوشگوار ردعمل ہوا ہے لیکن اس کے باوجود اس کی منظوری یا نامنظوری کا فیصلہ مسلم لیگ کی کونسل ہی کرے گی جس کا اجلاس ۹ جون کو طلب کیا گیا ہے۔ اس موقع پر قائد اعظم نے قوم کے ان جانباز افراد کو خراج عقیدت ادا کیا جنہوں نے پاکستان کیلئے سخت مصائب برداشت کئے اور اپنی جانیں تک قربان کر دیں۔ اس کے بعد انہوں نے مسلمانان ہند سے اپیل کی کہ وہ نظم و ضبط کا دامن کسی حالات میں نہ چھوڑیں تاکہ اقتدار کی منتقلی کا عمل پُرسکون فضا میں جاری رہ سکے۔ انہوں نے صوبہ سرحد کی مسلم لیگ کو ہدایت کی کہ وہ کانگرسی حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن ختم کر دے۔ قائد اعظم نے اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی ——— "پاکستان زندہ باد"۔

آل انڈیا ریڈیو سے یہ الفاظ تاریخ میں پہلی بار نشر ہوئے اور ان کی گونج ساری دنیا میں سنی گئی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا آخری اجلاس

۹ جون کو امپیریل ہوٹل دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کا وہ تاریخی اجلاس منعقد ہوا جس میں ۲ جون کے منصوبہ پر لیگ کو اپنا فیصلہ دینا تھا۔ اجلاس کی صدارت قائد اعظم نے کی۔ اپنی تقریر میں انہوں نے اس منصوبے کے نکات پر

اظہار خیال کیا اور بعض امور کی وضاحت فرمائی۔ ان کی تقریر کے بعد شرکائے اجلاس نے منصوبے کی توثیق کر دی۔ ابھی اجلاس جاری ہی تھا کہ خاکساروں نے امپیریل ہوٹل پر چڑھائی کر دی اور قائد اعظم کے خلاف نہایت اشتعال انگیز نعرے لگانے لگے۔ مسلم لیگ کے نیشنل گارڈ نے آگے بڑھ کر انہیں روکنا چاہا مگر وہ سیڑھیوں پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس پر دونوں میں سخت تصادم ہوا اور بہت سے لوگ زخمی ہو گئے۔ پولیس نے موقع پر پہنچ کر اشک آور گیس پھینکی اور خاکسار بھاگ نکلے۔ اس سے پہلے ۱۹۴۳ء میں بھی ایک خاکسار نے قائد اعظم کی جان لینے کی کوشش کی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں معجزانہ طور پر بچا لیا تھا کیونکہ وہ ان سے ایک عظیم کام لینا چاہتا تھا۔ اس ہنگامے کے بعد جب خاکساروں کے سالار سے جسے پولیس نے گرفتار کر لیا تھا، اس ہنگامے کے بارے میں پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے بتایا کہ ہمیں ہمارے امیر نے حکم دیا تھا کہ اس اجلاس میں جا کر شرکائے اجلاس کو بتا دو کہ مسلمان اس منصوبے کی منظوری کے حق میں نہیں ہیں۔

پاکستان قائم ہو گیا

۲ جون ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک متعدد ایسے واقعات پیش آئے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وائسرائے اور کانگرس پاکستان کی راہ میں روڑے اٹکانے سے اب بھی باز نہیں آئے اور ان کی ہر ممکن کوشش یہی ہے کہ مسلم لیگ، مسلمانوں اور مستقبل قریب میں قائم ہونے والی اسلامی مملکت کیلئے زیادہ سے زیادہ دشواریاں پیدا کریں۔ اس سلسلے میں ایک کوشش یہ کی گئی کہ مسلم لیگ کو عبوری حکومت سے نکال دیا جائے مگر قائد اعظم کی قانون دانی اور مستقل مزاجی نے اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔ اسی دوران میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سری نگر جا کر مہاراجہ کشمیر کو اس امر پر آمادہ کر لیا کہ وہ ریاست کی آزادی کا اعلان نہ کریں بلکہ دونوں میں سے کسی ایک ملک کے ساتھ الحاق کر لیں۔ اس کے بعد مہاراجہ کو گھیٹنے میں اتار لیا گیا اور اس نے بھارت کے ساتھ "الحاق" کا فیصلہ کر لیا۔ یہ تاریخ پاک و ہند کا بہت بڑا المیہ تھا کہ ریاست کے باشندوں کے حقوق کو پامال کیا گیا اور مہاراجہ نے ان کی رائے معلوم کئے بغیر ریاست کو بھارت کے ساتھ ملحق کر دیا۔ اس صریح ظلم اور ناانصافی نے سرزمین کشمیر کو مسلمانوں کے خون سے لالہ زار بنا دیا۔

اسی دوران میں کانگرس نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو انکی "خدمات" کے صلے کے طور پر ہندوستان کا گورنر جنرل بنانا منظور کر لیا مگر اسکے برعکس مسلم لیگ نے قائد اعظم کو اپنا گورنر جنرل مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔

قائد اعظم ۷ اگست کو دہلی سے کراچی روانہ ہوئے۔ روانگی سے قبل انہوں نے اپنے الوداعی پیغام میں کہا کہ میں دہلی کے باشندوں کو الوداع کہتا ہوں جہاں ہر فرقے سے تعلق رکھنے والے میرے بہت سے دوست ہیں۔ اب ہمیں ماضی کو دفن کر دینا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ ہندوستان اور پاکستان دو آزاد حکومتوں کی طرح اپنی زندگی کا نیا دور شروع کر سکیں۔[1]

۵ بجے شام کو قائد اعظم کا طیارہ کراچی کے ہوائی اڈے پر اترا ہزاروں افراد اپنے محبوب رہنما کا استقبال کرنے اور اس کی

---

[1] حیات محمد علی جناح ص۴۸۳

ایک جھلک دیکھنے کیلئے ہوائی اڈے پر جمع تھے، اگرچہ پولیس اور مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے دستوں نے بہت سخت حفاظتی انتظامات کئے تھے مگر وہ سب درہم برہم ہو گئے اور لوگ قائد اعظم کے طیارے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہوائی اڈے سے گورنمنٹ ہاؤس تک کئی لاکھ انسان سڑک کے دونوں طرف قائد اعظم کا استقبال کرنے کیلئے جمع تھے، فضا اللہ اکبر، قائد اعظم زندہ باد اور پاکستان زندہ باد کے پرجوش نعروں سے گونج رہی تھی۔ شہر کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔

۱۱/اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی پہلی مجلس دستور ساز کا اجلاس منعقد ہوا۔ جوگندر ناتھ منڈل نے صدارت کی ایوان نے مستقل صدارت کے لئے قائد اعظم کو منتخب کیا۔ اس کے بعد مسٹر منڈل نے کرسئ صدارت قائد اعظم کے لیے خالی کر دی۔ اس پہلی مجلس دستور ساز سے خطاب کرتے ہوئے قائد اعظم نے سب سے پہلے امن و امان کے قیام پر زور دیا اور اہل پاکستان کو ہدایت فرمائی کہ گذشتہ واقعات اور فرقہ وارانہ تنازعات کو فراموش کر دیں۔ ہر شخص کو اس کے مذہب اور عقیدے کی مکمل آزادی ہے۔ حکومت کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ آپ کا کیا عقیدہ ہے۔ اگر آپ نے اس جذبہ سے کام کیا تو آپ غیر معمولی ترقی کریں گے۔ [۱]

۱۳/اگست ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کراچی پہنچے تاکہ شہنشاہ برطانیہ کی طرف سے انتقالِ اقتدار کا رسمی اعلان کر دیں۔ ۱۴/اگست کو اسمبلی میں نہایت پروقار تقریب منعقد ہوئی، قائد اعظم اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن چھ گھوڑوں کی گاڑی میں شاہی جلوس کی صورت میں گورنمنٹ ہاؤس سے روانہ ہوئے، راستے میں لاکھوں افراد اس تاریخی منظر کو دیکھنے کیلئے جمع تھے اور پرجوش نعروں سے قائد اعظم کیساتھ عقیدت و محبت کا اظہار کر رہے تھے۔

اسمبلی کی عمارت کے سامنے شاہی سواری رکی گئی۔ قائد اعظم اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس تاریخی ہال میں داخل ہوئے جہاں بہت بڑی تعداد میں معززین جن میں ہر فرقے کے لوگ تھے معزز مہمانوں کا انتظار کر رہے تھے۔ اس موقع پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے شہنشاہ برطانیہ کا وہ پیغام پڑھ کر سنایا جس میں پاکستان کو ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا تھا۔ اور اس کی فلاح و بہبود کے لئے دعا کی گئی تھی۔ اسکے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی مختصر تقریر میں پاکستان کے عوام کیلئے نیک تمناؤں کا اظہار کیا اور اہلِ پاکستان کو یہ زریں مشورہ دیا کہ وہ مغل بادشاہ اکبر اعظم کے نقش قدم پر چل کر رواداری کا مظاہرہ کریں۔

قائد اعظم کی تقریر

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقریر کے بعد قائد اعظم نے خطاب فرمایا اور اکبر اعظم کی رواداری کے بجائے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات اور حضور کی عملی رواداری کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آج سے تیرہ سو سال قبل صرف زبانی نہیں بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں پر فتحیاب ہونے کے بعد ان کے ساتھ عملاً

---

[۱] ریسنٹ اسپیچز۔ قائد اعظم محمد علی جناح اگست ۱۹۴۷ء، ۱۹۴۸ء ص۵

رواداری اور اپنی عالی ظرفی کا مظاہرہ کیا۔ آپ نے ان کے مذہبی عقائد کا احترام کیا۔ مسلمانوں کی ساری تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے جس ملک اور قوم پر حکومت کی وہاں انسانیت نوازی کے انہی اعلیٰ اصولوں کو پیش نظر رکھا۔ ہمیں بھی انہی اصولوں پر عمل کرنا چاہیئے" ؎۱

اس طرح ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے تاریخی شہر میں پاکستان کے قیام کا جو مطالبہ کیا گیا تھا ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو یعنی صرف ۷ سال کی قلیل مدت میں ایک مردِ آہن کے عزم و عمل، تدبر و فراست اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے نہایت شاندار طریقے سے پورا ہو گیا۔ غلامی کی شبِ تاریک ختم ہو گئی۔ آزادی کا سورج نکل آیا۔ ایک نئے ملک نے جنم لیا ——— ایک نئی قوم معرضِ وجود میں آئی ——— آزاد، خوددار اور باوقار قوم، جسے تاریخِ عالم میں قائدانہ کردار ادا کرنا ہے۔ انشاء اللہ !

آگ اور خون

الحمد للہ کہ پاکستان تو قائم ہو گیا مگر اس کے قیام سے پہلے ہی ہندوؤں اور سکھوں نے قیامِ پاکستان کا مطالبہ کرنے والوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ پنجاب میں مارچ ۱۹۴۷ء ہی میں سکھوں نے پہلے اکا دکا اور پھر جتھوں کی شکل میں بے خبر اور نہتے مسلمانوں پر حملوں کا آغاز کر دیا۔ راشٹریہ سیوک سنگھ کے تربیت یافتہ جوان کمک کے طور پر ان کی امداد کے لئے موجود تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان حملوں کا دائرہ جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے لگا۔ اور انبالہ سے لے کر امرتسر تک مشرقی پنجاب مسلمانوں کے لئے قتل گاہ بن گیا۔ اگست ۱۹۴۷ء تک مشرقی پنجاب کا شاید ہی کوئی علاقہ ایسا ہو جو مسلح سکھ جتھوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بننے سے محفوظ رہا ہو اگر معاملہ ان جتھوں تک محدود رہتا پھر بھی غنیمت تھا۔ ستم تو یہ ہوا کہ مشرقی پنجاب کی سکھ ریاستوں کی فوج اور پولیس بھی ان جتھوں میں شامل تھی گویا امن و قانون کے محافظ ہی امن و قانون کو غارت کر رہے تھے۔ ان جتھوں نے "شجاعت" کے کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے؟ یہ ایک الگ موضوع ہے اور اس پر ایک نہیں کئی مستقل کتابوں کی ضرورت ہے۔ ان بزدلوں نے ان دیہات پر حملے کئے جن میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ یہ حملے اتنے اچانک ہوتے تھے کہ مظلوموں کو سنبھلنے اور بھاگنے کا بھی موقع کم ہی ملتا تھا۔ بوڑھوں، بچوں، بیماروں اور معذوروں کو بھی معاف نہ کیا گیا۔ جوانوں کو چن چن کر قتل کیا گیا۔ عورتوں کی آبروریزی کی گئی۔ ہزاروں مسلمان عورتوں کو اغوا کیا گیا۔ بعض عورتوں کے پستان کاٹ لئے گئے۔ آج بھی پاکستان کے مختلف علاقوں میں سینکڑوں اعضا بریدہ لوگ موجود ہیں جو سکھوں اور ہندوؤں کے لرزہ خیز مظالم کی زندہ شہادت ہیں۔ مسلمانوں کی آبادیاں نذر آتش کر دی گئیں۔ ان کے مکان اور دکانیں لوٹ لی گئیں یہی حشر دہلی کے مسلمانوں کا ہوا۔ خون اور آگ کا یہی ڈرامہ یو پی اور بہار میں کھیلا گیا۔ مولانا آزاد جیسا کٹر کانگریسی رہنما بھی

؎۱ ریسنٹ اسپیچز، قائداعظم محمد علی جناح جون ۱۹۴۷ء تا اگست ۱۹۴۷ء صہ ۹

دہلی کے مسلمانوں کے قتل عام پر آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکا۔ انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا کہ "یہاں مسلمانوں کا قتل عام جاری ہے۔ سکھ اس میں نمایاں حصہ لے رہے ہیں اور انڈین آرمی مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کرنے سے گریز کر رہی ہے۔ کیونکہ اسکی اکثریت ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل ہے۔ جن مجسٹریٹوں کو امن و امان کے قیام کے لئے مقرر کیا گیا انہوں نے اپنے فرائض ادا نہیں کئے[1] (کیونکہ وہ سب ہندو تھے اور مسلمانوں کے قتل و غارتگری کا تماشہ دیکھتے رہے)

خود پنڈت نہرو اور مسٹر گاندھی نے دہلی کے فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا اور مسلمانوں کی حالت زار دیکھ کر بقول ان کے شرم سے سر جھکا لیا۔ پیارے لال نے اپنی تصنیف "مہاتما گاندھی" میں بھی اس ندامت اور مسلمانوں کے قتل عام کا تذکرہ کیا ہے۔

مشرقی پنجاب اور مضافات کے لاکھوں مسلمان جو اپنی جان بچا کر مختلف کیمپوں میں پناہ گزین ہوئے، سکھوں کے مسلح جتھوں نے ان پر بھی حملے کئے اور نہایت سفاکی سے ان کا خون بہایا۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے جو مسلمان نقل وطن کرکے اسپیشل ٹرینوں میں پاکستان روانہ ہوئے۔ ان مسلم کش جتھوں نے راستے میں جگہ جگہ ان ٹرینوں پر حملے کئے چنانچہ لدھیانہ اور امرتسر کے درمیان سکھوں کے مسلح جتھوں نے دو اسپیشل ٹرینوں کو روک لیا۔ ان ٹرینوں میں محکمہ دفاع کا عملہ اور ان کے اہل و عیال پاکستان آرہے تھے۔ ان حملوں میں سیکڑوں مسلمان شہید ہوئے اور معلوم نہیں کتنی عورتوں کو اغوا کر لیا گیا۔ لاہور پہنچنے کے بعد جب لوگ ان ٹرینوں میں داخل ہوئے تو انہوں ۹۵ مسلمانوں کی لاشیں خون میں نہائی ہوئی پائیں جن میں ۵۰ بچے اور ۱۰ عورتیں بھی تھیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق پاکستان آنیوالے مہاجرین کی ٹرینوں پر دلی سے لاہور تک راستے میں ۴۸ حملے ہوئے۔

دہلی اور مشرقی پنجاب میں مسلمان پناہ گزینوں کے جو کیمپ قائم کئے گئے ان میں ہزاروں افراد بھوک متعدی امراض اور غلاظت کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہلاک ہوگئے۔ لاکھوں مسلمان جو قافلوں کی صورت میں پیدل روانہ ہوئے تھے امرتسر کے نواح میں سکھوں کے مسلح جتھوں کی بربریت کا نشانہ بنے اور سیکڑوں راستے کی صعوبتوں کی تاب نہ لاکر جاں بحق ہوگئے اسطرح تقریباً دو لاکھ مسلمان پاکستان کی خاطر شہید ہوگئے اور پچاس لاکھ گھر سے بے گھر ہوئے پچاس ہزار عورتیں ہندوؤں اور سکھوں کے قبضے میں چلی گئیں گویا آزادی کا سورج مسلمانوں کے خون میں نہاکر طلوع ہوا اور اتنی عظیم قربانیوں کے بعد یہ مملکت عالم وجود میں آئی۔

پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا گیا؟

کتاب ختم کرنے سے قبل اب ہم آخری اور اہم ترین سوال کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا؟ مختلف لوگ اسکے مختلف جواب دیتے ہیں بعض کا خیال ہے کہ یہ ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا۔ بعض کی رائے ہے کہ اقتصادی ضرورتوں کے پیش نظر اسکا قیام عمل میں آیا۔ بعض کہتے ہیں کہ پاکستان کے مطالبے کا سرے سے اسلام سے کوئی تعلق تھا ہی نہیں۔ ہم اس کتاب کو متنازعہ فیہ مسائل کی دستاویز نہیں بنانا چاہتے۔ اسلئے ان مباحث سے گریز کریں گے جو ایک نئی بحث کا دروازہ کھولتے

---

[1] انڈیا ونس فریڈم صفحہ ۲۰۹

کا موجب ثابت ہوں، البتہ صرف حقائق پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

ملک کی تقسیم کا نظریہ پیش کرنے والوں میں سر سید احمد خان، مولانا عبد الحلیم شرر، علامہ اقبال، چوہدری رحمت علی اور قائد اعظم کے اسمائے گرامی سر فہرست ہیں۔ ان ممتاز مفکروں کے بیانات ہمارے سامنے ہیں جن میں سے متعدد بیانات ہم اس کتاب میں درج کر چکے ہیں۔ انکے مطالعہ سے جو حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے لئے ایک علیحدہ مملکت کا مطالبہ اسلئے کیا تھا کہ انکے اور ہندوؤں کے تعلقات روز بروز خراب ہوتے چلے جا رہے تھے اور یہ حقیقت کسی ثبوت یا حوالے کی محتاج نہیں کہ فسادات کسی کھیت، زمین یا کارخانے کے بٹوارے پر نہیں بلکہ صرف اور صرف مذہب کے نام پر ہوتے تھے انسداد گاؤکشی، عید قرباں، ہولی، دسہرہ، اذان، نماز اور باجہ ان فسادات کا اصل باعث تھے سوامی دیانند اور شردھانند کی تحریکیں جن کے ذریعے مسلمانوں کو ہندو بنانے کی کوششیں کی گئیں اور ملکانے کے ہزاروں مسلمانوں کو ان کے دین سے منحرف کر لیا گیا اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہے کہ مسلمانوں کو متحدہ ہندوستان میں اپنا مذہب خطرے میں محسوس ہو رہا تھا۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ ان کیلئے ایک الگ مملکت قائم کی جائے تاکہ وہ غیر مسلموں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ ہو جائیں چنانچہ علامہ اقبال کے خطبۂ الٰہ آباد کے یہ الفاظ خاص طور سے قابلِ مطالعہ ہیں۔

"یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ بحیثیت ایک اخلاقی نصب العین اور نظامِ سیاست کے اسلام ہی وہ سب سے بڑا جزو ترکیبی تھا جس سے مسلمانانِ ہند کی تاریخِ حیات متاثر ہوئی۔ اسلام ہی کی بدولت مسلمانوں کے سینے ان جذبات وعواطف سے معمور ہوئے جن پر جماعتوں کی زندگی کا دارومدار ہے ـــــ حقیقت میں یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ دنیا بھر میں شاید ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہوا ہے ـــــ اسلام پر ابتلاء و آزمائش کا کبھی ایسا وقت نہیں آیا جیسا کہ آج درپیش ہے۔"[1]

علامہ اقبال کے ان الفاظ سے صاف طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۹۳۰ء کے خطبۂ الٰہ آباد میں جب انہوں نے مسلمانوں کیلئے ایک الگ آزاد و خود مختار ریاست کا مطالبہ کیا تو ان کے پیشِ نظر یہی حقیقت تھی کہ اسلام سخت خطرات سے گزر رہا تھا اور اسے ان خطرات سے بچانے کیلئے ضروری تھا کہ ہندوستان کے مسلم اکثریت کے صوبوں کو باہم ملا کر ایک آزاد و خود مختار حکومت قائم کر دی جائے، جہاں وہ اپنے مذہب، اپنی تہذیب اور اپنی زبان کی حفاظت کر سکیں اور اس آزاد فضا میں اسلام پروان چڑھ سکے علامہ اقبال کے اسی خطبہ پر منحصر نہیں ان کے متعدد خطوط اور تحریریں اس بات کی شاہد ہیں کہ انہوں نے جہاں بھی مسلمانوں کیلئے آزاد ریاست پر اظہارِ خیال کیا ہے وہاں مسلم قوم کی مذہبی اور تہذیبی زندگی کے لئے جو خطرات درپیش تھے ان کا حل پاکستان ہی کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں قائد اعظم کو لکھتے ہیں۔

"ہندوستان کے اندر اور ہندوستان کے باہر دنیا کو یہ بتا دینا انتہائی ضروری ہے کہ ملک میں معاشی مسئلہ ہی محض ایک مسئلہ نہیں ہے۔

---

[1] خطباتِ اقبال پیش کردہ غلام احمد پرویز

مسلمان کے نقطۂ نگاہ سے ہندوستان کے بیشتر مسلمانوں کے نزدیک تہذیبی مسئلہ کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے[1]۔" آگے چل کر اسی خط میں لکھتے ہیں کہ، "اس ملک میں اسلامی شریعت کا نفاذ اور ترقی مسلمانوں کی آزاد مملکت کے بغیر ناممکن ہے۔" اس خط سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ علامہ اقبال برصغیر کے مسلمانوں کیلئے ایک ریاست کا مطالبہ اسلئے کر رہے تھے تاکہ اس میں اسلامی قانون نافذ کیا جائے اور اس میں ان کے مذہب اور تہذیب کو پروان چڑھنے کا موقع ملے۔ ان کی قومی زبان اردو کی سرکاری طور پر سرپرستی کی جائے جسے ہندوستان میں کند چھری سے ذبح کیا جا رہا تھا۔ علامہ اقبال کے بعد قائداعظم دوسری بڑی اور سب سے بڑی شخصیت تھے۔ جنہوں نے برصغیر کی تقسیم کا مطالبہ کیا۔ یہ مطالبہ بھی بہت حد تک اسلام کے نام پر کیا گیا۔ چنانچہ قائداعظم نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا کہ "پاکستان اسلامی اصولوں کی ایک عملی تجربہ گاہ ہوگی۔ جہاں ہم دنیا کو دکھا سکیں گے کہ اسلام آج بھی نافذ العمل ہو سکتا ہے۔" سلہٹ اور صوبہ سرحد میں استصواب رائے کے موقع پر ایک وفد قائداعظم سے ملنے گیا جس میں مولانا شبیر احمد عثمانی بھی شامل تھے اس وفد سے گفتگو کرتے ہوئے قائداعظم نے جو الفاظ کہے تھے وہ اس تنازع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے کو کافی ہیں کہ پاکستان کن مقاصد کیلئے قائم کیا گیا۔ قائداعظم نے فرمایا کہ "پاکستان بن جائے اور جمہوری طریقے سے اسمبلی میں اقلیت اور اکثریت کے نمائندے آ جائیں تو اسکو تحقیق کیساتھ واضح کر دیا جائیگا کہ آئین تو اسلامی ہوگا مگر آئین اسلام میں ہر فرقے کو مذہبی آزادی ہوگی۔ دستور پاکستان کے غیر اسلامی ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آپ میری طرف سے قوم کو کہہ دیں کہ میں نے کبھی قوم کو دھوکا نہیں دیا جو میں کہہ رہا ہوں، ہو کر رہے گا[2]۔" قائداعظم کے اس ارشاد اور اسکے علاوہ بیشمار ارشادات کی روشنی میں جنہیں ہم نے اختصار کے مدنظر قلم انداز کر دیا ہے، یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کیلئے ایک آزاد و خود مختار ریاست قائم کرنا چاہتے تھے جہاں نہ صرف ان کا مذہب اور انکی تہذیب و تمدن محفوظ ہو جائے بلکہ وہ اس مملکت میں اسلامی تعلیمات اور اسلامی قوانین کیمطابق زندگی گزار کر دنیا کو بتا سکیں کہ اسلام کوئی فرسودہ نظام حیات نہیں جو اب ساقط العمل ہو چکا ہے بلکہ چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود آج بھی اسی طرح ممکن العمل ہے۔ وہ پاکستان کو اسکی عملی تجربہ گاہ بنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی متعدد تقریروں میں اس امر پہ بار بار زور دیا کہ پاکستان میں اسلامی تہذیب و تمدن اور مسلمانان پاک و ہند کی قومی زبان اردو کو پروان چڑھانے کے مواقع دیئے جائیں گے کیونکہ اردو زبان میں عربی کے بعد اسلامی علوم کا سب سے زیادہ سرمایہ موجود ہے اور اردو کے تحفظ اور اسے پاکستان کی قومی اور دفتری زبان بنانے کا لازمی نتیجہ اسلامی علوم کی اشاعت ہوگا۔ پاکستان کے مطالبے کی دوسری وجہ اقتصادی حالات تھے۔ ملک کی تجارت و صنعت پر کم از کم دو سو سال سے ہندوؤں کی اجارہ داری قائم تھی۔ بڑے بڑے سیٹھ، ساہوکار اور مہاجن دولت کے وسائل پر قابض تھے۔ بڑی بڑی ملیں انکے قبضے میں تھیں۔ پنجاب اور بنگال کے مسلمان نہ صرف اقتصادی لحاظ سے پسماندہ تھے بلکہ ہندو مہاجنوں کے قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے اس تشویشناک اقتصادی بدحالی سے وہ قیام پاکستان تک چھٹکارا نہیں پا سکتے تھے جب تک کہ وسائل معاش مکمل طور پر انکے قبضے میں نہ آ جاتے۔ ان حالات کے پیش نظر بھی علامہ اقبال اور قائداعظم دونوں نے مسلمانوں کیلئے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا تاکہ وہ ہندوؤں کے معاشی استحصال سے نجات پا کر اس آزاد اسلامی مملکت میں اپنی معاشی حالت بہتر بنا سکیں۔ گویا پاکستان کا مطالبہ اسلام کے تحفظ، اسلامی تعلیمات کو بروئے کار لانے اور مسلمانوں کو اقتصادی بدحالی سے نجات دلانے کیلئے کیا گیا تھا۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس مملکت کو اسلام کی عملی تجربہ گاہ بنا کر تمام ادیان عالم پر اسلام کی برتری ثابت کریں اور پاکستان کا اقتصادی نظام اسلامی بنیادوں پر استوار کر کے ملک سے فلاکت و غربت کو دور کریں۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو یہ نظریہ پاکستان کی خامی نہیں بلکہ صرف اور صرف ہمارا قصور ہے اور ہم اس کیلئے خداوند تعالیٰ اور آئندہ نسلوں کے سامنے جوابدہ ہیں۔

(ختم شد)

---

[1] اقبال کے خطوط جناح کے نام ص ۱۲-۱۱ [illegible] کراچی نومبر ۱۹۶۸ء بحوالہ مضمون "قیام پاکستان" تحریر انوار الحق سہتی مطبوعہ ہفت روزہ چٹان لاہور ۲۵ اگست ۱۹۶۹ء)

پیام شاہجہان پوری
کی دیگر تصانیف

مقام حسینؓ

علیؓ اور ان کی خلافت

حیات حسنؓ

عثمانؓ اور خلافت عثمانؓ

عائشہؓ اور خلافت علیؓ

آفتاب ہجویرؒ

تذکرۂ شاہ محمد غوثؒ

ہماری تاریخ (بچوں کے لئے)

روح نگارش
(مصنف کے علمی و ادبی مقالات کا مجموعہ)

جنوبی ہند میں اُردو

میخانۂ عجم (ایران کا فارسی ادب)

شعلۂ احساس
(مصنف کی قومی نظموں کا مجموعہ)

طباعت سرورق ربن پریس لمیٹڈ، لاہور